پاکستان کی سیاسی تاریخ 6

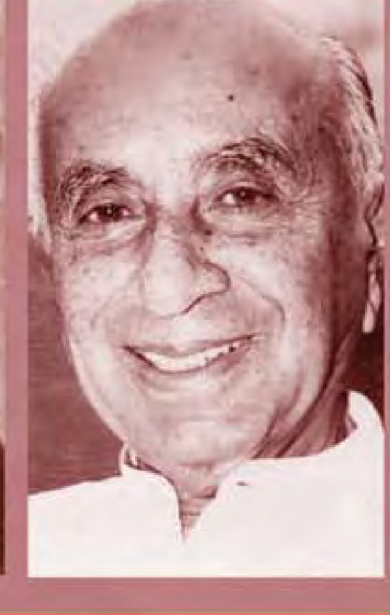
سندھ

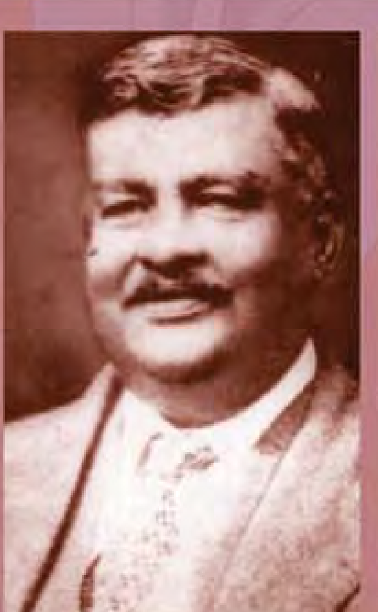
مسئلہ خود مختاری کا آغاز

زاہد چودھری

تکمیل و ترتیب: حسن جعفر زیدی






ادارہ مطالعہ تاریخ

پاکستان کی سیاسی تاریخ
جلد 6

سندھ

مسئلہ خود مختاری کا آغاز

زاہد چودھری

تکمیل و ترتیب:
حسن جعفر زیدی

ادارہ مطالعہ تاریخ

ایڈیشن دوم

ISBN 978-969-9806-28-5

ناشر: ادارہ مطالعہ تاریخ: 66-H/2، واپڈا ٹاؤن، لاہور

Ph: + 92(0)42-35182835, **Fax:** + 92(0)42-35183166
E-mails: hjzaidi@gmail.com
khalidmehboob@tehqeeq.org
Website: www.tehqeeq.org

مطبع: شرکت پرنٹنگ پریس، نسبت روڈ، لاہور

سال اشاعت: 2013ء

قیمت: 550/- روپے

قیمت بیرون ملک: $ 30/-

فہرست

جزو دوم......قیام پاکستان کے بعد (1947ء-1951ء)

دیباچہ ایڈیشن دوم

ہمارے حال کی جڑیں ہمارے ماضی میں پیوستہ ہوتی ہیں۔ سندھ اور بالخصوص شہر کراچی آج جن مسائل سے دوچار ہے، وہ ایک دو دن میں پیدا نہیں ہوئے بلکہ وہ مختلف متحارب قوتوں کے مابین ایک تاریخی جدل کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ سندھیوں کا غیر سندھیوں کے ساتھ تضاد اور سندھ کا مرکزی سول اور فوجی اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ تضاد گہرا تاریخی پس منظر رکھتا ہے جس کو سمجھے بغیر آج کے مسائل کا پوری طرح ادراک نہیں ہوسکتا۔

زیر نظر کتاب پاکستان کی سیاسی تاریخ کے سلسلہ کی چھٹی جلد ہے جس کا پہلا ایڈیشن 1994ء میں شائع ہوا تھا۔ اب جبکہ دوسرا ایڈیشن پیش کیا جارہا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ سندھ کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی مسائل میں مزید اضافہ ہوا ہے، کمی نہیں ہوئی۔ اس دوران پیپلز پارٹی جو اگرچہ ملک کی سب سے بڑی پارٹی کہلاتی ہے، مگر اس کی گہری جڑیں سندھ کی صوبائی اور قومیتی خودمختاری میں پیوست ہیں، جس سیاسی اُتار چڑھاؤ کے عمل سے گزری اس میں پارٹی قائدین کی سندھ سے وابستگی کا اہم کردار رہا ہے۔ بینظیر بھٹو کی جلاوطنی، واپسی، قاتلانہ حملے اور بالآخر قتل پر انجام، پھر پیپلز پارٹی کے دور اقتدار (2008-13ء) میں این آر او، اور سوئس بینکوں کے حوالے سے اعلیٰ عدلیہ کا آصف زرداری کے ساتھ مسلسل ٹکراؤ، سندھ میں سندھی قومیت کے حوالے سے دیکھا اور سمجھا گیا۔ یہ بھی تاثر قائم ہوا کہ سندھ کی قیادت کو مختلف غیر جمہوری ہتکنڈوں سے اقتدار سے محروم کیا گیا اور اگر کسی سیاسی جوڑتوڑ کے بندوبست کے تحت ان کی حکومت بن بھی گئی تو اقتدار میں ہونے کے باوجود انہیں حقیقی اختیار و اقتدار کبھی حاصل نہیں ہوا۔

سندھ کی جاگیردارانہ سیاسی قیادت کی خودغرضی، کوتاہ اندیشی، نااہلی اور کرپشن کو بعض دفعہ عام سندھی بھی سندھ کارڈ کی وجہ سے درگزر کر دیتا ہے۔ سندھی عوام الناس تاریخ کے اس بھاری جبر سے نجات حاصل نہیں کر سکے کیونکہ غیر سندھی مرکزی اسٹیبلشمنٹ بار بار سندھی جاگیردار

حکمران طبقوں سے امتیازی سلوک اور معاندانہ رویہ اختیار کرتی ہے جس کے نتیجہ میں سندھ کارڈ کے کریڈٹ میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ لاپتہ افراد کا مسئلہ اس پر مستزاد ہے۔ جس سے سندھ کی قوم پرست تحریکوں کو تقویت ملتی ہے۔

سندھ کے مسئلہ خودمختاری اور قومی سوال کا آغاز کیسے ہوا، اس پر زیر نظر کتاب کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد اب تک گزشتہ 20 برس میں کوئی خاص کتاب شائع نہیں ہوئی۔ ہمیں امید ہے کہ یہ دوسرا ایڈیشن تاریخ اور حالات حاضرہ کے سنجیدہ قارئین کی اس ضرورت کو پورا کرے گا۔

نومبر 2013ء

حسن جعفر زیدی

لاہور

دیباچہ ایڈیشن اول

پاکستان کی سیاسی تاریخ کے سلسلے کی چھٹی جلد حاضر ہے۔ پہلی دو جلدوں میں پاکستان کے قیام اور تیسری جلد میں اس ملک کو درپیش بیرونی تضادات یعنی پاک بھارت تنازعہ اور مسئلہ کشمیر کے موضوعات کا احاطہ کرنے کے بعد اگلی جلدوں میں پاکستان کے اندرونی تضادات کا تجزیہ شروع کیا گیا ہے۔ ہمارے ملک کا سنگین ترین اندرونی سیاسی مسئلہ صوبوں کی خودمختاری یعنی قومیتی حقوق کا مسئلہ ہے جس نے ہماری سیاسی تاریخ پر ایسے ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں جنہیں ہم اپنے جسد سیاسی پر بدنما داغ قرار دے سکتے ہیں۔ بار بار آئین ٹوٹنا، مارشل لاؤں کا نفاذ، اسمبلیوں کا ٹوٹنا اور خود ملک کا ٹوٹنا...... ان کے پس پشت سب سے فعال محرک صوبائی یا قومیتی تضاد رہا ہے...... تاریخ کا جدلیاتی اصول یہ بتاتا ہے کہ تضاد ہمیشہ تب پیدا ہوتا ہے جب ایک غالب ہو، دوسرا مغلوب۔ ایک بالادست ہو، دوسرا تہی دست۔ ایک مراعات یافتہ ہو اور دوسرا محروم...... چنانچہ پاکستان میں موجود صوبوں یا یہاں آباد مختلف علاقائی، لسانی اور نسلی گروہوں کے مابین تضاد کی موجودگی واضح طور پر ان صوبوں یا گروہوں کے مابین غالب و مغلوب یا حاکم و محکوم کے امتیاز کی موجودگی کا پتہ دیتی ہے۔ پاکستان بنتے ہی جن دو قومیتوں کو اپنے برتر و بالا ہونے کا زعم تھا وہ مہاجر اور پنجابی تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے ان کی آپس میں ٹھنی، یہاں تک کہ لیاقت علی خان کا قتل ہو گیا۔ اس کے بعد عسکری قوت کے بل پر برتر و بالا حیثیت منوانے میں پنجابی شاونزم (Chauvinism) کے علمبردار آگے نکل گئے۔ ''اسلام'' ''اردو'' اور ''نظریہ پاکستان'' کے نعروں پر مہاجروں نے ان کے ساتھ اتحاد کر لیا اور پھر انہوں نے مل کر بنگالیوں، سندھیوں، پختونوں اور بلوچوں کو سیاسی، معاشی اور معاشرتی طور پر محروم و محکوم رکھنے کے ایسے ابلیسی منصوبے پر عمل شروع کیا کہ جس کی وجہ سے یہ ملک جس میں ترقی و عروج پانے کے تمام تر وسائل موجود تھے، اپنی تباہی اور زوال کے راستے پر چل پڑا اور بدستور چل رہا ہے۔ اسلام پسند پنجابی

شاؤنسٹوں کے اسی رویئے کی بدولت باقی تمام صوبوں کی جانب سے پنجاب کو غاصب اور ظالم قرار دیا گیا اور دیا جا رہا ہے...... پاکستان کی سیاسی تاریخ کی چوتھی جلد پنجابی شاؤنزم اور مہاجر ''اعلیٰ تہذیب'' کے مابین تضاد کی داستان بیان کرتی ہے جب کہ پانچویں جلد میں مسلم پنجاب کے سیاسی ارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان عوامل کا مطالعہ کیا گیا ہے جو پنجابی شاؤنزم کی تاریخی بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔

زیر نظر چھٹی جلد سے ان صوبوں یا قومیتوں کی تاریخ شروع کی جا رہی ہے جن میں مرکز گریز رجحانات کو فروغ حاصل ہوا، علیحدگی پسندوں کو ہوا ملی، یہاں تک کہ سب سے بڑا صوبہ علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور ہوا۔ ان صوبوں کو محروم، مغلوب و محکوم صوبے یا مظلوم قومیتیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس وقت حالات کی سنگینی کے پیش نظر سب سے پہلے صوبہ سندھ کو موضوع بنایا گیا ہے۔

سندھ کی تہذیب دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک ہے۔ ہزارہا سال پر محیط اپنی تاریخ میں یہ خطہ زیادہ تر بیرونی حکومتوں کے اثر سے آزاد رہا ہے اور یہاں ایک یا ایک سے زیادہ خودمختار ریاستیں موجود رہی ہیں۔ تاہم تاریخ میں بعض مختصر وقفے ایسے بھی ہوئے جب یہاں کے حکمران بیرونی حملہ آوروں کی قوت سے مغلوب ہو کر ان کی سلطنتوں کے باج گزار بن گئے۔ یونان اور ایران سے لیکر ٹیکسلا، پشاور، دہلی اور کابل کے پایہ ہائے تخت اس خطہ پر مختلف ادوار میں غلبہ قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ سندھ کو پہلی مرتبہ مغل شہنشاہ اکبر نے اپنی سلطنت میں شامل کر کے باقاعدہ صوبہ بنایا۔ اس حیثیت میں کم وبیش ایک سو سال رہنے کے بعد جب مغل دربار کی اپنے صوبوں پر سے گرفت ڈھیلی پڑنی شروع ہوئی تو یہ خطہ پھر خودمختار ہو گیا۔ 1843ء میں انگریزوں نے یہاں قبضہ کیا تو نہ صرف اس کی یہ خودمختاری جاتی رہی بلکہ اسے صوبہ کا درجہ بھی نہ ملا اور اسے صوبہ بمبئی پریذیڈنسی کا حصہ بنا دیا گیا۔ چونکہ سندھ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور بمبئی پریذیڈنسی ہندو اکثریت پر مشتمل تھی، اس لئے اس دوران یہاں ہندو۔ مسلم تضاد بہت شدت اختیار کر گیا۔ چنانچہ بمبئی سے علیحدگی سندھ کے مسلمانوں کا مستقل مطالبہ بن گیا اور آل انڈیا مسلم لیگ کے چارٹر کا ایک اہم نکتہ قرار پا گیا۔ یہاں تک کے 1935ء کی آئینی اصلاحات کے نتیجے میں اسے علیحدہ صوبہ کا درجہ حاصل ہوا۔

1937ء میں سندھ میں پہلی منتخب صوبائی اسمبلی اور صوبائی وزارت کی تشکیل ہوئی۔ ہندو جو کہ اقلیت میں ہونے کے باوجود معاشی و معاشرتی سطح پر ترقی یافتہ تھے، یہاں کے پسماندہ مسلم جاگیرداروں کی باہمی رقابتوں سے فائدہ اٹھا کر اس اسمبلی اور وزارت کو اپنے اشاروں پر نچاتے تھے۔ یہ صورتحال 46-1945ء تک جاری رہی۔ سندھ مسلم لیگ سب سے پہلی صوبائی مسلم لیگ تھی کہ جس نے 1938ء میں مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا اور پھر 1943ء میں سندھ اسمبلی میں کثرت رائے سے مسلمانوں کی آزاد قومی ریاستوں کے قیام کی قرارداد منظور کی گئی۔ اسی پس منظر میں 1947ء میں اسمبلی نے کثرت رائے سے پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کیا اور یوں سندھ، پاکستان میں ایک خودمختار صوبے کے طور پر شامل ہوا۔

3رجون 1947ء کو وائسرائے ماؤنٹ بیٹن نے آزادی ہند اور تقسیم ہند کا جو ایوارڈ جاری کیا اور جس کے مطابق پاکستان وجود میں آیا، اس میں تبادلہ آبادی کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ لیکن سکھوں کی جماعت شرومنی اکالی دل کے ناعاقبت اندیش رہنماؤں نے کانگرسی رہنماؤں کے جھانسے میں آکر پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ کر دیا اور جبراً تبادلہ آبادی کے ایسے خوفناک منصوبے پر عمل کیا جس کے نتیجے میں اگست 1947ء میں پنجاب کے دونوں حصوں میں قتل و غارت گری کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ دونوں جانب ہزاروں افراد قتل ہوئے اور لاکھوں افراد بے گھر ہو کر ہجرت اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس جبری ہجرت کے نتیجے میں پاکستان آنے والوں کا تعلق مشرقی پنجاب سے تھا جن میں انبالہ ڈویژن کے اردو بولنے والے بھی شامل تھے۔ ان کی زیادہ تر آبادکاری مغربی پنجاب میں ہوئی۔ لیکن کراچی اور سندھ کے شہروں میں اردو بولنے والوں کی کثیر تعداد یو۔ پی سے آکر آباد ہوئی جہاں جبری ہجرت کی وہ صورت نہیں تھی جو کہ سکھوں نے مشرقی پنجاب میں پیدا کر دی تھی۔ قائداعظم اور سندھ کے پہلے وزیراعلیٰ ایوب کھوڑو کی جانب سے اقلیتوں کے تحفظ کی یقین دہانی کرائے جانے کے باوجود کانگرس کی شہ پر سندھ سے ہندو اپنی جائیدادیں اور کاروبار چھوڑ چھوڑ کر ہندوستان بھاگ گئے۔ کروڑوں روپے کی متروکہ جائیدادوں کے بارے میں جب یہ فیصلہ ہوا کہ یہ مہاجروں کو دے دی جائیں گی تو یو۔ پی کے مسلمان اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کے لئے جوق در جوق سندھ کا رخ کرنے لگے۔ وزیراعظم لیاقت علی خان اور ''اہل زبان'' سول افسروں نے یو۔ پی سے آنے والے مسلمانوں کے لئے متروکہ جائیدادوں کے علاوہ نئے

دارالحکومت میں ملازمتوں کے بھی بے بہا مواقع فراہم کر دیئے تھے۔ چنانچہ ان کا سب سے زیادہ رخ کراچی اور سندھ کے شہروں کی جانب ہوا۔ سندھ کی بدقسمتی یہ تھی کہ اس کے وسائل اپنی آبادی کی نسبت زیادہ تھے اور یہی امر اس کے عوام پر غیروں کے تسلط کا سبب بنا۔ یو۔ پی کے مسلمانوں کی اس ہجرت کا نہ تو علامہ اقبال کے 1930ء کے خطبہ الہ آباد کے ''تصور پاکستان'' میں کوئی ذکر تھا اور نہ ہی 23 ر مارچ 1940ء کی قرارداد لاہور میں اس بارے میں کچھ کہا گیا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد صوبہ سندھ کے پہلے مسلم لیگی وزیر اعلیٰ ایوب کھوڑو نے صوبہ میں مہاجرین کی اس کثرت کے ساتھ آبادکاری کے خلاف مزاحمت کی۔ چنانچہ اسے برطرف کر دیا گیا اور پھر لیاقت علی خان نے صوبہ کے جاگیرداروں کی باہمی رقابتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک کو دوسرے کے خلاف استعمال کیا اور یوں صوبہ میں 1947ء سے 1951ء تک چار سال میں پانچ وزرائے اعلیٰ برسر اقتدار آئے اور سات وزارتیں تشکیل پائیں۔ دقیانوسی جاگیرداروں، میروں اور پیروں کی سیاسی موقع پرستی نے ابتدا ہی میں صوبہ کے عوام کے مفادات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا دیا تھا۔ سیاسی عدم استحکام کی اسی کیفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لیاقت علی خان کراچی اور سندھ کے دوسرے شہروں میں لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین کی آبادکاری کو بروئے کار لانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس طرح وہ اپنے اور یو۔ پی کے بعض دوسرے جاگیرداروں کے لئے مستقل حلقہ ہائے نیابت وضع کرنا چاہتا تھا۔

سندھ کے درمیانہ طبقہ نے روز اول ہی سے مہاجرین کی اس کثرت سے آبادکاری کے خلاف مزاحمت شروع کر دی تھی لیکن ابھی یہ طبقہ تعداد میں اس قدر کم تھا کہ ایک بھرپور قوم پرست تحریک کو جنم نہیں دے سکتا تھا۔ دقیانوسی جاگیرداروں نے یہاں فروغ تعلیم کی اس قدر حوصلہ شکنی کی تھی کہ یہاں پڑھا لکھا درمیانہ طبقہ بہت دیر سے اور بہت کم تعداد میں جنم لینے میں کامیاب ہوا تھا۔ سندھ کے کسان جنہیں ہاری کہا جاتا تھا اور جو صدیوں سے جاگیرداری نظام کے شکنجے میں پھنسے ہوئے تھے، انہوں نے زیادہ مؤثر مزاحمت کی راہ اختیار کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سندھی وڈیرے اپنے جاگیردارانہ مفادات کے تحفظ کے لئے لیاقت علی خان کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے اور انہوں نے مہاجرین کی آبادکاری کی مخالفت ترک کر دی۔ انہوں نے اپنے طبقاتی مفادات کی خاطر اپنے عوام کو دھوکہ دیا۔ عوام بدستور محکوم و محروم رہے۔ بنگالیوں کی طرح، فوج اور پولیس میں

سندھ کے ہاریوں کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی جب کہ پنجاب کے کسان فوج اور پولیس میں دھڑا دھڑ بھرتی کئے جاتے تھے۔ روزِ اول سے سندھ کے درمیانہ طبقہ اور ہاریوں کو یہ احساس دلا دیا گیا تھا کہ وہ اپنے ہی آبائی وطن میں دوسرے درجے کی شہری بنا دیئے گئے ہیں۔

زیرِ نظر جلد کے جزِ دوم میں قیام پاکستان کے بعد سے لیاقت علی خان کے قتل تک یعنی صرف چار سال کے واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ دراصل وطنِ عزیز پاکستان کی تباہی و بربادی کی تمام بنیادیں اسی دور میں استوار کی گئی تھیں۔ بعد میں آنے والوں نے ان کو مزید گہرا کیا، کسی نے ان کو اکھاڑ پھینکنے کی کوشش نہیں کی۔ ان چار برس کے تفصیلی تجزیے سے پتہ چل جاتا ہے کہ قیام پاکستان کے فوراً بعد سندھ کے وڈیروں، میروں اور پیروں نے اپنے عوام کے ساتھ کیسے غداری کی اور مرکزی حکمرانوں کے ساتھ مل کر کیسے اپنے مشترکہ مفادات کو تحفظ دیا؟ جزو اول میں بیان کردہ سینکڑوں برس کے تاریخی پس منظر کے بعد ان چار برس میں جو کچھ ہوا، وہ ان سوالوں کے جواب دینے کے لئے کافی ہے کہ سندھ میں خودمختاری اور قوم پرستی کی تحریک نے کیوں، کیسے اور کب جنم لیا؟ اس کے محرکات کیا تھے؟ اور اس کو کچلنے کے لئے کیوں اور کس طرح اسلام، نظریہ پاکستان اور قومی زبان ''اردو'' کے نعروں کو استعمال کیا گیا۔

حسب سابق اس جلد کی تیاری میں بھی میرے سب سے عزیز دوست خالد محبوب کی معاونت ہر قدم پر حاصل رہی۔ اخبارات کی فائلوں سے تحقیقی مواد جمع کرنے سے لے کر پروف ریڈنگ اور اشاریہ کی تیاری ان کی اعانت کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی تھی۔ ماضی کی طرح ڈاکٹر مبشر حسن کی شفقت بھی ہر لمحہ میسر رہی۔ سمیع اللہ ظفر کے مفید مشورے اور پرخلوص اعانت حاصل نہ ہوتی تو شاید کامیابی کا یہ مرحلہ سر نہ ہوتا۔ معروف قانون دان جناب ثائر علی اور ان کے معاون مسعود نقوی صاحب نے تحقیق و تالیف کے اس منصوبے کو درپیش ایک بے بنیاد مقدمہ سے نجات دلانے کے لئے جس لگن، محنت اور خلوص کے ساتھ کام کیا اور اس محاذ پر کامیابی حاصل کی اس کے لئے جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ ان کے علاوہ جن احباب اور سرپرستوں نے مجھے مسلسل اپنی شفقت، محبت اور خلوص سے نوازا ان میں صدیق درانی صاحب، میاں دلاور محمود صاحب، خورشید عالم صاحب، حسین نقی صاحب، اطہر ندیم صاحب، ڈاکٹر مہدی حسن صاحب اور قمر عباس صاحب شامل ہیں۔ علاوہ ازیں محترم کے۔ کے۔ عزیز صاحب نے تحقیق و تالیف میں حوالہ جات، کتابیات

اور بعض دوسرے تکنیکی پہلوؤں کے مستند اصولوں کے بارے میں میری جو رہنمائی کی ہے اس کا اندازہ قارئین کو ان خامیوں کی عدم موجودگی سے ہو جائے گا جو گزشتہ جلدوں میں رہ گئی تھیں۔

مصطفی وحید صاحب کی عالی ہمتی، استقامت اور جذبۂ شوق، ان کی علالت اور ان کے گونا گوں مسائل کو آڑے نہیں آنے دیتے اور پوری لگن اور کومٹ منٹ کے ساتھ اس تحقیق و تالیف کے صبر آزما سلسلے کو طباعت و اشاعت کے مراحل سے گزار کر قارئین تک پہنچانے کا کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔ ان کے برادر عزیز آصف جاوید اور ان کے ادارہ کے سرگرم رکن نعیم احسن بھی اسی جذبہ اور شوق سے شریک سفر ہیں۔

اس جلد کے تحقیقی مواد کے حصول میں جن لائبریریوں کے عملہ کی جانب سے بھرپور تعاون حاصل ہوا ان میں پنجاب پبلک لائبریری لاہور، نوائے وقت ریکارڈ آفس لاہور، پاکستان ٹائمز ریفرنس سیکشن لاہور، کراچی یونیورسٹی لائبریری اور لیاقت میموریل لائبریری کراچی شامل ہیں۔

قارئین نے جس سنجیدگی کے ساتھ گزشتہ پانچ جلدوں میں دلچسپی کا اظہار کیا ہے، اس سے حوصلہ پا کر ہی میں اگلی منازل طے کر رہا ہوں۔ میری پوری کوشش کے باوجود اگر کچھ خامیاں رہ گئی ہوں تو اسے میری کوتاہی سمجھئے۔ خوب سے خوب تر کا سفر جاری رہے گا۔

جنوری 1994ء

حسن جعفر زیدی

لاہور

جزو اول

قیام پاکستان تک

(1843ء تا 1947ء)

باب: 1

سندھ......انگریزوں کے قبضے تک

قدیم تاریخی پس منظر

موہنجوداڑو، ہڑپہ اور بعض دوسرے علاقوں کے آثار قدیمہ سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً پانچ ہزار سال قبل وادیٔ سندھ کی سیاست، معاشرت، معیشت، ثقافت اور تہذیب کا معیار بہت بلند تھا۔ چونکہ زرعی معیشت خاصی ترقی یافتہ تھی اس لئے خواص اور عوام کی زندگی کے دوسرے شعبے بھی اسی تناسب سے ترقی یافتہ تھے۔ موہنجوداڑو جو ضلع لاڑکانہ میں واقع ہے اور ہڑپہ جو ضلع ساہیوال میں واقع ہے، سے حاصل شدہ اشیاء کے مابین گہری مماثلت پائی جاتی ہے جس سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ وادیٔ سندھ کے بالائی حصے یعنی موجودہ پنجاب اور زیریں حصے یعنی موجودہ سندھ کے مابین اگر سیاسی نہیں تو کم ازکم تجارتی اور ثقافتی رشتے ضرور موجود تھے۔

وادیٔ سندھ کی یہ قدیم تہذیب 2000ق۔م سے 1000ق۔م کے درمیانی عرصہ میں وسط ایشیا کی جانب سے آریاؤں کی یلغار کے دوران زوال کا شکار ہوئی۔ رگ وید کے مطابق آریاؤں اور مقامی باشندوں کے مابین لڑائیاں سپت سندھو یعنی سات دریاؤں کی سرزمین میں ہوئیں جو موجودہ پنجاب اور سندھ کے علاقے پر مشتمل تھی۔ زیریں وادیٔ سندھ یا موجودہ صوبہ سندھ کے علاقے پر آریاؤں کی یلغار کے براہ راست اثرات زیادہ نہیں ہوئے کیونکہ انہوں نے پنجاب سے آگے بڑھ کر گنگا جمنا کی سرسبز وشاداب وادی میں جا کر بسیرا کر لیا تھا۔ تاہم آریاؤں کی اس شاخ نے جو ایران میں بس گئی تھی چھٹی صدی قبل مسیح میں ایران میں ایک وسیع وعریض سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس کے فرمانروا دارا (486۔522ق۔م) کی قلمرو کی حدود وادیٔ نیل سے لے کر وادیٔ سندھ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کا ایک صوبہ ہندوش تھا جو موجودہ پنجاب اور سندھ پر مشتمل تھا۔ ایرانی سلطنت کے غلبے سے پہلے وادیٔ سندھ کا علاقہ بڑی سلطنت کے قیام کے تصور

سے نا آشنا تھا۔ یہاں کا نظام یا تو قبائلی یا چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور رجواڑوں پر مشتمل تھا۔

327 ق۔م میں یونانیوں نے ایرانی سلطنت کو چیلنج کیا اور وہ مقدونیہ کے فرمانروا سکندر اعظم کی قیادت میں ایرانی سلطنت کو تہہ و بالا کرتے ہوئے اس سلطنت کی آخری حدود یعنی وادیٔ سندھ تک پہنچ گئے۔ سکندر پنجاب کو فتح کرتا ہوا سندھ و مکران کے راستے واپس چلا گیا اور وہ پنجاب کی طرح سندھ میں بھی یونانی انتظامیہ اور فوج چھوڑ کر گیا۔ سندھ پر یونانی غلبہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا اور یہ علاقہ ماضی کی طرح مختلف چھوٹی جاگیری ریاستوں میں منقسم ہوگیا۔ ایک روایت کے مطابق یونانیوں نے یہاں سے فرار ہو کر کاٹھیاواڑ میں سکونت اختیار کی اور جونا گڑھ کو آباد کیا جو دراصل یونا گڑھ تھا یعنی یونانیوں کا گڑھ کیونکہ برصغیر میں یونانیوں کو یونا کہا جاتا تھا۔

قبل مسیح دور کے اواخر کی صدیوں میں برصغیر میں بعض اہم واقعات رونما ہوئے جنہیں یہاں کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہوئی۔ ایک تو یہ کہ برہمن ازم کے خلاف ایک زبردست عوامی تحریک بدھ مت کی صورت میں کامیاب ہوئی۔ سندھ میں بھی اسے بہت فروغ حاصل ہوا۔ دوسرے یہ کہ سکندر اعظم کی واپسی کے بعد برصغیر میں بھی وسیع شہنشاہیت کے قیام کے تصور نے عملی شکل اختیار کی اور موریہ سلطنت کی بنیاد پڑی۔ اس کے بانی چندر گپت نے یونانیوں کو ٹیکسلا سے بے دخل کر کے اسے اپنی سلطنت کا مرکز بنایا۔ اس سلطنت کو سب سے زیادہ وسعت اشوک اعظم کے زمانے میں حاصل ہوئی۔ اس نے بدھ مت اختیار کیا اور اس کے زمانے میں وسط ایشیا سے بنگال تک بدھ مت کو فروغ حاصل ہوا۔ سندھ بھی کچھ عرصہ کے لئے اس کے زیرنگیں رہا۔ تیسرا اہم واقعہ یہ ہوا کہ موریہ سلطنت کے زوال کے بعد وسط ایشیا کے حملہ آوروں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا جو عیسوی کیلنڈر کی ابتدائی صدیوں میں بھی جاری رہا۔ انہوں نے موریہ سلطنت کے ڈھانچے پر قبضہ کیا اور یہاں کے مقبول عام مذہب بدھ مت کو اختیار کیا۔ ان میں ساکا اور کشان قابل ذکر ہیں۔ ان کی سلطنت کا مرکز ہمیشہ بالائی وادیٔ سندھ میں رہا......یعنی پہلے ٹیکسلا اور پھر پشاور۔ بدھ مت کے پیروکار فرمانرواؤں کی یہ وسیع و عریض سلطنت وسط ایشیا سے وسطی اور جنوبی ہند تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی بدولت بدھ مت کو وسط ایشیا اور چین تک فروغ حاصل ہوا۔ زیریں وادیٔ سندھ یعنی موجودہ صوبہ سندھ کا علاقہ بھی اس کے زیر اثر رہا اور یہاں بدھ مت کو مزید مقبولیت حاصل ہوئی۔ ساکاؤں کی ایک شاخ جو سیستان پر قابض تھی وہاں سے یلغار کر کے

سندھ و گجرات پر قابض ہوگئی اور 400ء تک انہیں یہاں غلبہ حاصل رہا جب مالوہ کے حاکم چندر گپت بکر ماجیت نے انہیں شکست دے کر گجرات پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس کے بعد سندھ کچھ عرصہ تک ایران کے ساسانی شہنشاہوں کے زیرِ تسلط رہا۔

پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں چین کے سرحدی علاقوں پر آباد ہن قبائل نے برصغیر کا رخ کیا۔ انہوں نے ایک جانب ایران کے بادشاہوں کی وسعت کو محدود کیا اور دوسری جانب برصغیر میں مالوہ اور سندھ تک چھا گئے۔ یہ بدھ مت کے پیروکار نہیں تھے۔ انہوں نے برہمن ازم کی حوصلہ افزائی کی اور بدھ مت کی بیخ کنی کی کوشش کی اور اس کے پیروکاروں پر بڑے ظلم ڈھائے۔ تاہم بدھ مت کے اثر ورسوخ کا خاتمہ نہ ہوسکا۔ البتہ برہمن ازم نے دوبارہ غلبہ حاصل کرنا شروع کر دیا۔ اس دوران سندھ اور ملتان ایک ہن سردار رائے سحارا کی اولاد کے قبضہ میں چلے گئے۔ اس کے بعد پھر بدھ مت کو کچھ عرصہ کے لئے عروج حاصل ہوا۔ ساتویں صدی میں یہاں سے گزرنے والے ایک چینی سیاح ہوان ژانگ (Hsuan Tsang) نے اپنے سفر نامہ میں سندھ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''یہاں کے اکثر لوگ بدھ مت کے پیروکار ہیں۔ ان کے سینکڑوں سنگھر ام موجود ہیں جن میں دس ہزار کے لگ بھگ بھکشو موجود رہتے ہیں۔'' وہ یہاں ہندوؤں کے 30 مندروں کی موجودگی کا ذکر بھی کرتا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ ''یہاں کا بادشاہ شودر یعنی نچلی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ فطرتاً دیانتدار اور مخلص ہے اور بدھ مت سے عقیدت رکھتا ہے۔''[1] اس کے بعد یہاں نچلی ذات اور بدھ مت کے پیروکاروں کا غلبہ ختم ہوگیا اور برہمن ازم کو غلبہ حاصل ہوا اور یہاں ایک برہمن سیلائج کے بیٹے چچ نے اپنی حکومت قائم کر لی اور پھر اسے ملتان سے مکران تک وسعت دی۔ 711ء میں جب عرب لشکر محمد بن قاسم کی سرکردگی میں یہاں حملہ آور ہوا تو یہاں چچ کے بیٹے داہر کی حکومت قائم تھی۔

مسلمانوں سے ماقبل کے دور میں سندھ کی تاریخ کے بعض خصائص جن کی نشاندہی ہوتی ہے، یہ ہیں:۔

1۔ سندھ سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے زیادہ تر خودمختار رہا۔ بہت تھوڑے وقفے ایسے آئے کہ جن میں اس پر یونانیوں، ایرانیوں یا وسط ایشیائیوں کا غلبہ قائم ہوا۔

2۔ سندھ پر جن بیرونی مراکز کا غلبہ قائم ہوا وہ بالعموم پنجاب یا سرحد میں تھے۔ گویا اس

علاقے کا زیادہ تر سیاسی وتہذیبی تعلق بالائی وادیٔ سندھ کے ساتھ رہا۔ اس کا گنگا جمنا کی وادی کے ساتھ کبھی کوئی سیاسی تعلق قائم نہیں ہوا۔

3۔ برہمن ازم اور بدھ مت کے ماننے والوں کے درمیان تضاد پیدا ہوا جو عربوں کی آمد کے وقت تک موجود تھا۔

مسلم دور

کشمیر اور بنگال کی طرح سندھ میں مسلمانوں کے اثر ونفوذ میں برہمن، بدھ تضاد نے اہم کردار ادا کیا اور بدھ مت کے پیروکاروں نے مسلمانوں کو خوش آمدید کہا۔ چچ نامہ کے مطابق محمد بن قاسم دیبل پر اپنا قبضہ مستحکم کرنے کے بعد نیرون کوٹ (موجودہ حیدرآباد) پہنچا جو زیادہ تر بدھوں کی آبادی پر مشتمل تھا اور یہاں کا حاکم جس کا نام سندر تھا، ایک شمنی (بدھ پروھت) تھا۔ انہوں نے عرب لشکر کا نہ صرف استقبال کیا بلکہ اس کے لئے رسد اور گھاس کا بھی بندوبست کیا۔ اس کے بعد راجہ داہر کے خلاف عملاً لڑائی میں حصہ لینے کے لئے عرب لشکر کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ اس لشکر کی اگلی منزل سیوستان (سیوھن) تھی۔ یہاں راجہ داہر کا چچازاد بھائی بجھرائے حاکم تھا لیکن رعایا بدھ تھی۔ یہاں کے شمنیوں (پروھتوں) اور بدھ آبادی نے بجھرائے کے برخلاف محمد بن قاسم کا ساتھ دیا اور بجھرائے کو راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔ اس کے بعد عرب لشکر بدھیہ پہنچا۔ وہاں کا حاکم کاکہ کوتل بدھ مت کا پیروکار تھا۔ اس نے نہ صرف یہ کہ خود محمد بن قاسم کا ساتھ دیا بلکہ گرد ونواح کے سرداروں کو بھی اس کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ کیا۔ نیرون، سیوستان اور بدھیہ سے بدھ مت کے پیروکاروں کی بھاری تعداد اپنے ہمراہ لیتا ہوا محمد بن قاسم آگے بڑھا تو اسے راجہ داہر کے مخالف ہندوؤں کی حمایت بھی حاصل ہوگئی۔ نچلی ذات کے جت دیہاتیوں نے عربوں کے خلاف اشبہار کے قلعہ دار کا ساتھ نہ دیا اور اسے عربوں کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانا پڑی۔ بعدازاں یہ جت بھی راجہ داہر کے خلاف مہم میں عرب لشکر کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اس طرح یہ لشکر مقامی سندھی باشندوں کو ہمراہ لیتا ہوا اپنی منزل یعنی راجہ داہر کی راجدھانی اروڑ کی جانب بڑھتا رہا اور بیٹ کے علاقے پہنچ گیا۔ یہاں کا قلعہ دار موکو بن وسایو بظاہر داہر کے معتمد افراد میں شمار ہوتا تھا مگر حقیقتاً وہ بھی داہر سے بدظن ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ علاقہ بیٹ کے بیس

(20) ٹھاکروں کے ہمراہ محمد بن قاسم کے ساتھ آ کر شامل ہو گیا۔ اس نے لشکر کو دریا عبور کرنے کے لئے کشتیاں بھی فراہم کیں۔ چنانچہ دریا کے پار جب جون 712ء میں محمد بن قاسم اور راجہ داہر کے لشکر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوئے تو محمد بن قاسم کے لشکر میں موکو بن وسایو، اس کا بھائی راسل، بیس (20) بھٹی ٹھاکر، دریائے سندھ کے مغربی کنارے کے جت، سیوستان کے بدھ اور ساکرے کے سردار شامل تھے۔ ان میں سے کسی نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے مذہب پر رہتے ہوئے راجہ داہر کے خلاف عرب حملہ آوروں کا ساتھ دے رہے تھے۔ چنانچہ یہ ''اسلامی لشکر'' اب ایک سیکولر لشکر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اسی طرح راجہ داہر کے لشکر میں بھی مسلمان عربوں کا ایک گروہ شامل تھا۔ یہ حجاج بن یوسف کے مخالف اومان کے علافی قبیلے کے افراد تھے جن کی قیادت محمد علافی کر رہا تھا۔ انہوں نے حجاج کی استبداد سے بچنے کے لئے داہر کے پاس پناہ لے رکھی تھی اور حجاج نے محمد بن قاسم کی مہم دراصل ان کی سرکوبی کے لئے بھیجی تھی۔ اس مہم کے لئے اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک نے بڑی مشکل سے حجاج کو اجازت دی تھی کیونکہ ولید کو اس مہم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ چنانچہ داہر اور محمد بن قاسم کے مابین معرکہ آرائی کفر و اسلام کی جنگ نہیں تھی بلکہ ایک سیدھی سادھی سیاسی جنگ تھی جس میں داہر مارا گیا۔ اس کے مخالف ہندو سرداروں اور بدھوں کو اس کی استبداد سے نجات حاصل ہوئی۔ محمد بن قاسم نے ملتان تک کا علاقہ فتح کیا اور 715ء تک اس کی مہم جاری رہی۔[2]

محمد بن قاسم کے جانے کے بعد سندھ کے مختلف علاقے خود مختار ہو گئے۔ نئے اموی خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے حبیب بن مہلب کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا۔ اس نے داہر کے جانشینوں کے خلاف جنگ کر کے پایۂ تخت اروڑ کو دوبارہ فتح کیا۔ سلیمان کے بعد عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوا تو اس نے سندھ کے ہندو سرداروں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی اور لکھا کہ تمہاری بادشاہی سے تعرض نہ کیا جائے گا اور تمہارے وہی حقوق و فرائض ہونگے جو مسلمانوں کے ہیں۔ چنانچہ راجہ داہر کے بیٹوں سمیت بہت سے ہندو سرداروں نے اسلام قبول کر لیا لیکن بلاذری کے مطابق عمر بن عبدالعزیز کے بعد آنے والے اموی خلفاء نے بدعہدی کی اور سندھ کے نومسلم ہندو سرداروں پر جزیہ نافذ کر دیا اور ان کی علاقائی خود مختاری سے بھی تعرض کیا۔ سندھ کے اموی گورنر جنید بن عبدالرحمن نے داہر کے نومسلم بیٹوں کے خلاف لشکر کشی کی اور انہیں لڑائی پر مجبور کیا۔ لڑائی

میں نومسلموں کو شکست ہوئی۔ داہر کا ایک بیٹا لڑتا ہوا مارا گیا۔ دوسرے بیٹے کو ''جنید نے پر چالیا اور جب اس نے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا تو اس کو قتل کر دیا۔''

اس کے بعد جنید نے کیرج (کچھ) کے علاقے پر چڑھائی کی حالانکہ یہاں کے لوگوں کو محمد بن قاسم سے بے پناہ عقیدت تھی اور انہوں نے اس کی مورتی بھی بنا کر رکھی ہوئی تھی۔ ''جنید نے یہاں کے تمام قابل جنگ مردوں کو قتل کیا۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو لونڈی، غلام بنایا اور مال غنیمت حاصل کیا۔'' اس کے بعد اس نے گجرات، مارواڑ اور وسطی ہند تک لوٹ مار مچائی اور بے پناہ مال غنیمت لے کر واپس ہوا۔ بلاذری کے مطابق ''سب کا حصہ دینے کے بعد بھی چار کروڑ درہم اس کے پاس بچا رہا۔ اتنا ہی اس نے دارالحکومت بھیجا۔ 740ء میں اسے واپس بلا لیا گیا۔''[3]

جنید کے چلے جانے کے بعد پورے سندھ میں عربوں کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑک، اٹھی۔ جو سندھی مسلمان ہوئے تھے ان میں سے بیشتر اسلام سے منحرف ہو گئے اور عربوں کا اقتدار ختم کرنے کے لئے جو تحریک شروع ہوئی تھی اس میں غیر مسلموں کے ساتھ مل گئے۔ بلاذری نے جب ڈیڑھ سو برس بعد ''فتوح البلدان'' لکھی تو اس نے اس بغاوت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ''ہند کے اکثر علاقے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اپنے مرکز انہیں چھوڑنے پڑے جو اب تک دوبارہ فتح نہیں ہو سکے۔'' عرب مسلمان جنوبی سندھ کے صرف ایک کونے تک محدود رہ گئے جسے انہوں نے محفوظہ کا نام دیا۔ بعد میں کچھ کے علاقے پر ان کا قبضہ دوبارہ مستحکم ہوا تو یہاں ایک شہر منصورہ کے نام سے آباد کیا اور اسے اپنا مرکز بنایا۔ 760ء تک بنی امیّہ کا عہد رہا۔ اس دوران یہاں جو بھی حاکم مقرر ہو کر آیا مقامی سرداروں کے ساتھ برسرِ پیکار رہا۔ اس عربی۔ سندھی تضاد کی معرکہ آرائی میں بنی امیّہ کا ایک گورنر حکم بن عوانہ الکلبی قتل بھی ہوا۔[4]

750ء میں مسلم سلطنت میں، عجمیوں نے بنی امیّہ کا تختہ الٹ دیا اور ان کی جگہ بنو عباس کا اقتدار قائم کر دیا۔ 751ء میں عباسی خلافت کی جانب سے موسیٰ بن کعب کو لشکر دے کر سندھ بھیجا گیا۔ سندھ کے اموی گورنر منصور نے اس کا مقابلہ کیا لیکن مارا گیا۔ بہت سے اموی قتل ہوئے باقی بھاگ گئے۔ نئے گورنر موسیٰ نے بنی امیّہ کے تمام ملازموں کو نکال باہر کیا۔ اس کے بعد یہاں نویں صدی عیسوی کے اواخر تک عباسیوں کی طرف سے گورنر مقرر ہو کر آتے رہے لیکن سلطنت کے کنارے پر ہونے کی وجہ سے یہاں کوئی مستحکم صوبائی حکومت قائم نہ ہو سکی۔ اس دوران مقامی

آبادی میں قبول اسلام کا بھی کوئی خاص رجحان دیکھنے میں نہیں آتا۔ جو مسلمان تھے وہ زیادہ تر عرب یا عجم سے آئے تھے۔ تاہم ان میں سے بیشتر کا تعلق عراق، حجاز، یمن اور اومان سے تھا۔ یہ لوگ عباسی سلطنت میں جاری وساری قبائلی اور فرقہ وارانہ چپقلش سے براہ راست اثر قبول کرتے کیونکہ ان کی قبائلی اور فرقہ وارانہ وابستگیاں بڑی مضبوط تھیں۔ بہت سے متحارب گروہ فرار ہو کر سندھ میں آ کر پناہ لے لیتے اور تازہ دم ہو کر واپس جزیرہ نمائے عرب وعراق کا رخ کرتے اور وہاں جنگ وجدال کرتے۔ اس باہمی آویزش میں سندھ کے بعض گورنر قتل بھی ہوئے۔ [5]

اس دوران عباسی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ مصر اور شمالی افریقہ میں اسماعیلیوں نے دولت فاطمیہ کے نام سے علیحدہ سلطنت قائم کر لی تھی۔ ان کے پیروکاروں کو قرمطی بھی کہا جاتا تھا۔ انہوں نے عباسی سلطنت کے مقبوضات کو غیر مستحکم کرنے کے لئے وہاں خفیہ سرگرمیاں بھی جاری کیں جس وجہ سے ان کو باطنی بھی کہا جاتا تھا۔ ان کی سرگرمیوں کا دائرہ سندھ میں بھی پھیل گیا۔ ان کا تبلیغ کا انداز بہت مؤثر تھا۔ وہ یہاں کی غیر مسلم آبادی میں گھل مل گئے یہاں تک کہ وہ اپنے نام بھی غیر مسلموں سے ملتے جلتے رکھتے تھے۔ انہوں نے عربی زبان یا عربی ثقافت کو مقامی لوگوں پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اسماعیلی داعیوں کی تبلیغ نے نویں صدی کے اواخر میں زور پکڑا اور سومرہ قبیلہ جس نے ان کی دعوت قبول کر لی تھی، عباسی حکومت کا ڈھیلا ڈھالا کنٹرول ختم کر کے یہاں اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ سومرہ حکمرانوں نے ٹھٹھہ کو اپنا دارالحکومت بنایا اور کم وبیش پانچ سو سال تک جنوبی سندھ کے وسیع علاقے پر برسرِ اقتدار رہے۔ اس طرح سندھ میں سب سے پہلے مسلمانوں کے جس فرقے کو پزیرائی ملی وہ قرمطی یا اسماعیلی تھے۔ ادھر قرمطی داعی جلم بن شیبان نے 977ء میں ملتان کے عباسی حاکم کو قتل کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور یہاں قرمطی حکومت قائم کر دی۔ گیارھویں صدی کے اوائل میں جب غزنی کے فرمانروا سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر یلغاریں شروع کی تو سب سے پہلے اُس نے ملتان کی قرمطی حکومت کو نشانہ بنایا اور قرمطیوں کو شکست دے کر یہاں قبضہ کر لیا۔ غزنوی کے جانشین اس قبضے کو قائم نہ رکھ سکے اور یہاں کی قرمطی حکومت دوبارہ بحال ہو گئی۔ اس کا حتمی خاتمہ شہاب الدین غوری نے بارھویں صدی کے اواخر میں ہندوستان پر فوج کشی کے دوران کیا۔ چند برس بعد شہاب الدین غوری خود بھی ایک باطنی فدائی کے ہاتھوں قتل ہوا۔ ملتان سے قرمطیوں یا

اسماعیلیوں کی کثیر تعداد نقل مکانی کر کے جنوبی سندھ کی جانب چلی گئی جہاں پہلے سے ان کے ہم مذہب برسر اقتدار تھے اور وہاں ان کی خاصی تعداد آباد تھی۔ بعد میں ان کا دائرہ کچھ، کاٹھیاواڑ اور گجرات تک پھیل گیا۔ یاد رہے کہ قائداعظم محمد علی جناح بھی ان میں سے تھے۔

تیرھویں صدی کا آغاز برصغیر میں مسلمانوں کی پہلی باقاعدہ سلطنت کے قیام سے ہوا۔ سلطان شہاب الدین غوری نے 1192ء میں ترائن کی دوسری لڑائی میں پرتھوی راج اور اس کے اتحادی راجپوت مہاراجاؤں کو شکست دے کر شمالی ہند میں مسلم غلبے کو مستحکم کر دیا جس کے بعد غوری کے غلام برصغیر کے طول و عرض میں پھیل گئے، بختیار خلجی نے بنگال و آسام کو فتح کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کر لی، قطب الدین ایبک نے دہلی کو اپنا مرکز حکومت بنایا اور ناصر الدین قباچہ نے ملتان، اوچ اور بالائی سندھ یعنی سکھر قدیم (بکھر) پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ 1206ء میں غوری کے انتقال کے بعد یہ تینوں اپنے اپنے علاقوں کے خود مختار بادشاہ بن گئے۔ 1212ء میں قطب الدین ایبک کے انتقال کے بعد دہلی تخت پر اس کا غلام شمس الدین التمش قابض ہو گیا۔ 1226ء میں التمش نے ناصر الدین قباچہ کے خلاف فوج کشی کی۔ قباچہ پسپا ہو کر فرار ہوتے ہوئے دریا میں ڈوب کر ہلاک ہو گیا۔ اس طرح ملتان، اوچ اور سکھر کا علاقہ سلطنت دہلی کا حصہ بن گیا۔ سکھر زیادہ دیر تک سلطنت دہلی کا حصہ نہ رہ سکا۔ یہ کبھی ٹھٹھہ کے حکمرانوں اور کبھی سلاطین دہلی کے ماتحت رہا۔ اوچ کو سلطنت دہلی کی سرحد سمجھا جاتا تھا لیکن بعض وقفوں کے دوران سلطنت پھیل کر سکھر کو اپنی تحویل میں لے لیتی اور بعض اوقات اتنا سکڑ گئی کہ ملتان بھی اس کے قبضہ سے نکل گیا۔ تاہم سندھ کا بیشتر علاقہ زیادہ تر ٹھٹھہ کے سندھی حکمرانوں کے زیر نگیں رہا اور سلاطین دہلی کبھی بھی اسے اپنا باقاعدہ صوبہ نہیں بنا سکے۔ مغلیہ سلطنت کے قیام سے پہلے برصغیر کی مسلم سلطنتوں اور ریاستوں میں سندھ کو ایک خصوصی مقام یہ حاصل رہا ہے کہ یہاں کے مسلمان فرمانروا یہاں کے مقامی لوگ تھے جو یہاں مسلمانوں کی آمد سے پہلے سے آباد تھے اور جنھوں نے دائرۂ اسلام میں آنے کے بعد عربوں کے غلبہ کو ختم کر کے اپنی خود مختار حکومت قائم کی جبکہ بقیہ تمام مسلم سلطنتوں اور ریاستوں کے فرمانروا وسط ایشیائی نسلوں کے ترک، افغان یا مغل خاندان سے تھے۔

ٹھٹھہ کے تخت پر سومرہ (سومرو) خاندان کی حکمرانی کم و بیش پانچ سو سال تک رہی۔ ان کا تعلق راجپوتوں کی ایک شاخ سے تھا۔ ان کا اقتدار 1351ء میں ختم ہوا اور ان کی جگہ ایک اور

مقامی قبیلے سمہ (سمو) کے سردار جام انہڑ نے ٹھٹھہ کے تخت پر قبضہ کر لیا اور سمہ خاندان کے اقتدار کی بنیاد ڈالی۔ اس قبیلے کا تعلق کچھ اور زیریں سندھ کی راجپوت شاخ جاڑیجہ سے تھا۔[6]

سلاطین دہلی میں سے تغلقوں نے سندھ پر یورش کی۔ 1351ء میں سلطان محمد تغلق گجرات میں اپنی سلطنت کے باغیوں کی سرکوبی میں مصروف تھا کہ ان باغیوں نے فرار ہو کر سندھ کی راہ لی۔ یہاں سومرہ، جاڑیجہ اور سمہ قبائل نے ان باغیوں کو پناہ دی اور ان کے ساتھ تعاون کیا۔ محمد تغلق بھی پیچھا کرتا ہوا پہنچا اور ٹھٹھہ سے چودہ کوس دور منزل انداز ہوا۔ مگر اس سے پیشتر کہ سندھیوں کے ساتھ لڑائی ہوتی، محمد تغلق بیمار پڑ گیا اور تین چار روز میں انتقال کر گیا۔ اس کے بعد اس کے لشکر میں پھوٹ پڑ گئی اور امراء نے فوری طور پر سلطان محمد کے چچازاد بھائی فیروز شاہ کو تخت نشین کر دیا اور واپس دہلی کا رخ کیا۔ پسپا ہوتے ہوئے اس لشکر کے پچھلے حصہ پر ٹھٹھہ اور اس کے گردونواح میں آباد سومرہ اور سمہ قبائل نے حملے کئے اور جو ہاتھ آیا لوٹ لیا۔ اس واقعہ کے 20 سال بعد سلطان فیروز شاہ تغلق نے دہلی سے ٹھٹھہ پر چڑھائی کر دی۔ اس موقع پر اوچ کے بزرگ مخدوم جہانیاں جہاں گشت سید جلال الدین بخاری نے ٹھٹھہ کے سمہ حکمران جام صدرالدین بانجیہ کی حمایت کی اور بیچ میں پڑ کر فیروز شاہ اور جام کے مابین صلح کروا دی۔ تغلق حکمران کے بعد سلطنت دہلی کمزور ہو کر سکڑ گئی اور پھر مغلیہ عہد تک کسی سلطان دہلی نے سندھ کا رخ نہیں کیا۔[7]

سندھ پر سمہ (سمو) خاندان نے 1351ء سے 1521ء تک کم و بیش 170 سال حکومت کی۔ ان کے ملک کا دائرہ بالائی سندھ میں (سکھر)، سبی اور سیہون سے لے کر جنوبی اور زیریں سندھ میں ایک طرف کچھ اور دوسری جانب مکران تک پھیلا ہوا تھا۔ ان کا پایۂ تخت ٹھٹھہ تھا جہاں یکے بعد دیگرے 16 جام حکمران ہوئے۔ ان کے نام اور ادوار یہ ہیں:

1۔ جام انڑ	1351-55ء
2۔ جام جونان	1355-59ء
3۔ جام صدرالدین بانبھیہ	1359-74ء
4۔ جام تماچی	1374-87ء
5۔ جام صلاح الدین	1387-98ء
6۔ جام نظام الدین	1398-1400ء

7۔جام علی شیر	1400-06ء
8۔جام کرن	(دودن)۔1406ء
9۔جام فتح خان	1406-20ء
10۔جام تغلق	1420-48ء
11۔جام مبارک	1448-50ء
12۔جام سکندر	1450-52ء
13۔جام سنجر	1452-61ء
14۔جام نظام الدین عرف جام نندو	1461-1508ء
15۔جام فیروز	1508-10ء
16۔جام صلاح الدین	1510-11ء
17۔جام فیروز (دوبارہ)	1511-21ء

ان میں جام نظام الدین عرف جام نندہ کا دور سب سے طویل، پرسکون اور سنہرا دور تھا۔اس کے عہد میں سمہ دور اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا جس کے بعد اس خاندان کی حکمرانی بہت تیزی سے زوال پزیر ہوگئی۔قندھار کے مغل ارغون فرمانرواؤں نے سندھ پر یلغاریں شروع کر دیں۔انہوں نے پہلا حملہ 1494ء میں جام نندہ کے دور میں کیا اور سبی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔جام نندہ کے بعد ان کی یلغاریں بڑھ گئیں اور ان میں شدت آ گئی جن کا مقابلہ جام فیروز اور جام صلاح الدین نہ کر سکے یہاں تک کہ 1521ء میں اقتدار سے بے دخل کر دیئے گئے۔اس کے ساتھ ہی سندھ ایک طویل عرصے کے لئے مقامی حکمرانوں کی حکومت سے محروم ہو گیا۔

قندھار کے ارغون حکمران چنگیز خان کی نسل سے تھے۔ وسط ایشیا میں منگولوں کی بالادستی کو زوال آ چکا تھا اور تیمور سلطنت بھی چھوٹی بڑی کئی ریاستوں میں بٹ چکی تھی۔ان ریاستوں کے فرمانروا باہمی لڑائیوں میں مصروف تھے۔اسی شکست وریخت کے عمل میں پندرھویں صدی کے اواخر میں ولایت خراسان کے بادشاہ سطان حسین مرزا کے ایک امیر ذوالنون ارغون نے قندھار میں اپنی خودمختار ریاست قائم کر لی۔ 1507ء میں ذوالنون ازبکوں کے ساتھ جنگ کے دوران مارا گیا تو اس کا بیٹا شاہ بیگ ارغون قندھار کا فرمانروا بن گیا۔اس دوران ظہیر الدین بابر جو کابل اور

غزنی پر مشتمل اپنی چھوٹی سی ریاست میں اس قدر مستحکم اور طاقتور ہو گیا تھا کہ اب اس نے گردونواح میں فتوحات کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور قندھار اس کی زد میں تھا۔ ادھر ایران میں شاہ اسمٰعیل صفوی ایرانی سلطنت کی ازسرِ نو بنیاد رکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اسے وسعت دے رہا تھا۔ قندھار پر اس کی نظریں بھی لگی ہوئی تھیں۔ میر محمد معصوم بکھری لکھتا ہے کہ دونوں اطراف سے خطرات کے پیش نظر شاہ بیگ ارغون کے مقربین نے رائے دی کہ ''ہمیں اپنی عاقبت کی فکر کرنی چاہیے اور اگر کسی دن قندھار سے جدا ہوں تو ٹھہرنے کے لئے کوئی جگہ ہونی چاہیے۔''[8] چنانچہ ارغونوں نے شال (کوئٹہ) اور سبی کو فتح کیا اور بالائی سندھ کے علاقے تک پہنچنا شروع کر دیا۔ بنی نوع انسان کی تاریخ میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ کسی گروہ یا قبیلے کے لئے کسی خطے میں عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تو اس نے اپنے لئے نئی دنیا تلاش کی اور اس مہم میں کسی زرخیز اور محفوظ خطے پر غلبہ واقتدار حاصل کر لیا۔ تاریخ عالم میں نقل مکانی کا مسلسل عمل اسی مادی اصول کے تحت ظہور پذیر ہوتا آیا ہے۔ چنانچہ کابل کے بادشاہ بابر کے بار بار حملوں سے تنگ آ کر بالآخر 1517ء میں شاہ بیگ ارغون نے قندھار بابر کے حوالے کر دیا اور خود سندھ کی تسخیر کی مہم پر روانہ ہو گیا۔ اس نے چند برس کوئٹہ (شال) اور سبی (سوی) کے علاقے میں بسر کئے یہاں تک کہ وہ 1521ء میں ٹھٹھہ کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ معصوم بکھری کے مطابق ''دس روز تک مغل لشکری ٹھٹھہ شہر میں خوب لوٹ مار کرتے رہے اور وہاں کے باشندوں کو ذلیل وخوار کرتے رہے۔'' بالآخر اس شہر کے ایک جید عالم وفاضل قاضی قاضن کی درخواست پر شاہ بیگ نے یہ قتل وغارت گری بند کرائی اور شہر میں امن وسکون قائم ہوا۔[9]

1526ء میں شاہ بیگ بکھر اور سیہون پر اپنا قبضہ مستحکم کرنے کے بعد گجرات کو فتح کرنے کے ارادہ سے مہم تیار کر رہا تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کا بیٹا مرزا شاہ حسن اس کا جانشین ہوا۔ معصوم بکھری لکھتا ہے کہ ''شاہ بیگ کی وفات کی خبر سن کر جام فیروز اور ٹھٹھہ کے لوگوں نے خوشی منائی اور نقارے بجائے۔'' گویا اہل سندھ نے بیرونی حکمرانوں کی بالادستی کو قبول نہیں کیا اور مزاحمت کی۔ یہ خبر سن کر شاہ حسن بیگ گجرات کی مہم کا ارادہ ترک کر کے بکھر سے ٹھٹھہ کی طرف روانہ ہوا۔ جام فیروز اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ٹھٹھہ سے فرار ہو کر کچھ کی جانب چلا گیا اور وہاں کچھ مدت ٹھہر کر کچھیوں کی مدد سے ایک لشکر ترتیب دیا۔ شاہ حسن بھی اپنی فوج کے ہمراہ اس کے تعاقب

میں آن پہنچا۔ چاچکوں اور راہموں کے مواضعات کے نواح میں دونوں لشکروں کے مابین بڑی خونریز جنگ ہوئی۔ اس لڑائی میں سندھیوں اور کچھیوں نے گھوڑوں سے اتر کر اور پگڑیاں سر سے اتار کر فیصلہ کن جنگ لڑی۔ سندھ اور ہند میں یہ دستور تھا کہ جب خود قتل ہونے تک لڑائی لڑنے کا فیصلہ کرلیا جاتا تھا تو پھر ننگے سر پاپیادہ ہوکر لڑائی لڑی جاتی تھی۔ میر معصوم کے مطابق صبح سے شام تک اس لڑائی میں بیس (20) ہزار آدمی مارے گئے۔ جام فیروز شکست خوردہ ہوکر گجرات کی جانب فرار ہوگیا اور پھر کبھی لوٹ کر سندھ کی جانب نہ آیا۔ وہ وہاں سلطان بہادر گجراتی کے امیروں میں داخل ہوگیا اور سندھ پر ارغون مغلوں کی حکمرانی مستحکم ہوگئی۔[10]

شاہ حسن بیگ نے اسی سال ملتان پر حملہ کر کے وہاں کے فرمانروا سلطان محمود لنگاہ کو شکست دے دی۔ اس طرح ملتان پر لنگاہ خاندان کی کم وبیش ایک سوسال تک قائم رہنے والی حکمرانی کا خاتمہ ہوا اور ملتان سے ٹھٹھہ و کچھ تک ارغون مغلوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ شاہ حسن بیگ نے تیس (30) سال حکومت کی۔ اس دوران بابر نے 1526ء میں دہلی پر قبضہ کر کے ہندوستان میں آل تیمور کی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس کے جانشین ہمایوں نے 1542ء میں شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست کھا کر راہِ فرار اختیار کر کے سندھ کا رخ کیا اور شاہ حسن بیگ سے مدد طلب کی۔ شاہ حسن نے جواب بھیجا کہ اگر گجرات فتح کرنے کا ارادہ ہے تو پھر میں بھرپور مدد دینے کے لئے تیار ہوں۔ تاہم ہمایوں نے راجپوتانہ کا رخ کیا مگر کچھ عرصہ خاک چھاننے کے بعد عازم سندھ ہوا۔ اسی دوران امرکوٹ کے مقام پر اکبر پیدا ہوا۔ ہمایوں ٹھٹھہ کے نواح میں خیمہ زن ہوا۔ یہاں شاہ حسن بیگ کی فوج کے ساتھ جھڑپ کے بعد وہ قندھار کے راستے ایران چلا گیا۔

شاہ حسن بیگ کا 1556ء میں انتقال ہوا۔ وہ بے اولاد تھا چنانچہ اس کے بعد اسکی سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک کا مرکز ٹھٹھہ تھا جس پر حسن بیگ کے وزیر عیسیٰ ترخان نے حکومت قائم کرلی تھی اور دوسرے کا مرکز بکھر تھا جس پر یہاں کے گورنر سلطان محمود نے خودمختاری حاصل کر لی تھی۔ ترخان بھی ارغونوں کی طرح مغل قبیلہ تھا۔ ترخانوں اور ارغونوں کے مابین لڑائیاں بھی ہوئیں جن میں ارغونوں کو سلطان محمود بکھری کی حمایت حاصل رہی۔ عیسیٰ ترخان کے انتقال (1570ء) کے بعد اس کی اولاد نے جنگ وجدال کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کا جانشین مرزا محمد باقی، بکھر کے سلطان محمود کے ساتھ کبھی جنگ اور کبھی امن کی حالت میں رہا۔ مرزا محمد باقی

اپنے ظلم و جور کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس نے 1584ء میں خودکشی کر لی جس کے بعد اس کا بیٹا مرزا جانی بیگ تخت نشین ہوا۔

1556ء میں ہمایوں کی موت کے بعد اکبر تخت نشین ہوا اور برصغیر میں اس سلطنت کا فروغ اور پھیلاؤ ہوا جو سلطنت مغلیہ کہلاتی ہے۔☆ کشمیر سے بنگال تک اور سندھ سے اڑیسہ تک چھوٹی بڑی مسلمان سلطنتیں اور ہندو ریاستیں اس سلطنت میں ضم ہو گئیں۔ اکبر کے ایک سپہ سالار محب علی نے بالائی سندھ کو فتح کیا۔ سلطان محمود قلعہ بکھر میں محصور ہو گیا اور اکبر سے پناہ مانگی۔ اکبر نے اسے امان دی اور گیسو خان کو اس کے ساتھ عہد و پیمان کرنے کے لئے بھیجا لیکن ابھی گیسو خان بکھر کے نواح تک پہنچا تھا کہ سلطان محمود کا انتقال (1574ء میں) ہو گیا۔ اکبر نے گیسو خان کو بکھر کا گورنر مقرر کر دیا۔ تاہم ٹھٹھہ کی ترخانی حکومت برقرار رہی۔ 1592ء میں اکبر کے سپہ سالار عبدالرحیم خان خانان نے جنوبی سندھ کی مہم سر کی اور سیہون وٹھٹھہ پر قبضہ کر لیا۔ آخری ترخان فرمانروا مرزا جانی بیگ نے اپنی طرف سے بھرپور مزاحمت کی اور خشکی اور دریا دونوں جگہ مغل لشکر کا مقابلہ کیا لیکن بالآخر اطاعت پر مجبور ہوا۔ اکبر نے سندھ کو باقاعدہ صوبہ بنا کر اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ مرزا جانی بیگ کو اپنے امراء میں شامل کر کے اسے سندھ کا پہلا صوبیدار مقرر کر دیا۔☆☆

سندھ پر مغلوں کا اقتدار اعلیٰ 1707ء تک قائم رہا جبکہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت بڑی تیزی کے ساتھ زوال پزیر ہونے لگی۔ مغل دربار کی جانب سے سندھ پر باہر سے بھی صوبیدار بنا کر بھیجے گئے اور مقامی اثر و رسوخ کے حامل سرداروں کو بھی یہ منصب سونپا گیا۔ شروع میں یہ منصب ترخانوں کے پاس رہا۔ آزاد سندھ کے آخری ترخان حکمران مرزا جانی بیگ کو پہلا صوبیدار مقرر کیا گیا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے مرزا غازی بیگ کو اس کی جگہ تعینات کر دیا گیا۔ 1612ء میں غازی بیگ کے قتل کے بعد یہاں کی صوبیداری ترخانوں کے ہاتھ سے نکل گئی۔ مغلوں کے دور میں پورا سندھ ایک انتظامی اکائی نہیں تھا بلکہ یہاں دو انتظامی اکائیاں تھیں۔ ایک بالائی سندھ جس کا مرکز بکھر اور دوسرا زیریں سندھ جس کا مرکز ٹھٹھہ تھا۔

☆ حقیقتاً یہ مغل نہ تھے بلکہ برلاس ترک تھے اور قرون وسطیٰ کے مؤرخین انہیں آل تیمور لکھتے رہے لیکن یورپی مؤرخین نے غلطی کھائی اور انہیں منگولوں سے منسوب کر کے مغل قرار دے دیا۔

☆☆ آئین اکبری کے مطابق مغلیہ سلطنت میں صوبے کے سربراہ یعنی گورنر کو صوبیدار کہا جاتا تھا۔

مغل دربار کی جانب سے دونوں جگہ جداجدا صوبیدار متعین ہوتے تھے۔ 1739ء میں ایران کے بادشاہ نادر شاہ کے حملے تک ان دونوں جگہوں کو ملا کر کل چالیس صوبیدار مقرر ہوئے۔ مغل انتظامیہ میں صوبیدار صوبے میں امن وامان کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ اس کی اعانت کے لئے فوجدار مقرر کئے جاتے تھے جبکہ ریونیو اور ٹیکس جمع کرنے کے لئے دیوان مقرر کئے جاتے تھے۔ اس طرح فوجداری اور دیوانی امور پر مشتمل صوبائی انتظامیہ وضع کی جاتی تھی جو کہ مرکزی مغل دربار کے سامنے جوابدہ ہوتی تھی۔

یورپ کے مختلف ممالک اس زمانے میں استبدادی جاگیری نظام سے نکل کر رفتہ رفتہ تجارتی وصنعتی سرمایہ داری نظام میں داخل ہو رہے تھے۔ ان ممالک کے معاشروں میں وہ ذہنی اور روحانی ولولہ پیدا ہو چکا تھا جس کے باعث ان کی تجارتی وصنعتی ترقی یقینی ہوگئی تھی۔ چنانچہ انگلستان، فرانس، ہالینڈ اور دوسرے یورپی ممالک کی کمپنیوں نے اپنے تجارتی مراکز ایشیائی ممالک میں قائم کرنے شروع کردیئے تھے۔ 1635ء میں برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک ایسا ہی تجارتی مرکز سندھ میں قائم کیا جو 1662ء میں بند کر دیا گیا کیونکہ اورنگ زیب کی اپنے بھائیوں کے ساتھ خانہ جنگی کے باعث اس مرکز سے مطلوبہ نفع نہیں ہوتا تھا۔ 1659ء میں اورنگزیب کے ہاتھوں اس کے بھائی داراشکوہ کو قطعی شکست سندھ میں ہی ہوئی تھی۔ اورنگ زیب کی حکومت تقریباً 50 سال تک قائم رہی جس کے دوران یہ مغل شہنشاہ مسلسل خانہ جنگیوں میں مصروف رہا۔ جب 1707ء میں وہ نوے سال کی عمر میں جاں بحق ہوا تو سندھ میں مغلیہ خاندان کے اقتدار کا سورج بھی تقریباً غروب ہو چکا تھا۔ نہ صرف سندھ بلکہ بنگال، اودھ اور دوسرے صوبوں پر بھی مرکز کی گرفت کمزور ہو چکی تھی اور یہاں کے صوبیدار اپنی اپنی جگہ خودمختاری کی راہ پر چل نکلے تھے۔

اورنگزیب 1701ء میں سندھ میں عربوں کے عباسی خاندان کی نسل سے تعلق کے دعویدار ایک جاگیردار خاندان کلہوڑو کی بالادستی تسلیم کر چکا تھا۔ اس سال اس خاندان کے ایک شخص خدایار خان نے جو کہ سبی کا حاکم تھا شکارپور کے حاکم داؤد پوتہ خاندان کو شکست دے کر اس شہر پر قبضہ کر لیا جسے داؤد پوتوں نے 1616ء میں آباد کیا تھا۔ داؤد پوتے بھی اپنا سلسلۂ نسب عباسی خاندان سے ملاتے تھے۔ نواب بہاولپور کا خاندان بھی ان کا رشتہ دار تھا۔ خدایار خان کی

درخواست پر اورنگ زیب نے 1701ء میں دریائے سندھ اور نارا کے درمیانی علاقے کی عملداری اسے سونپ دی۔ 1711ء میں خدا یار کلہوڑو نے کنڈیارو، لاڑکانہ اور سکھر کے نواحی علاقے تک قبضہ کرکے بالائی سندھ میں اپنا لوہا منوالیا۔ 1719ء میں خدا یار کلہوڑو کا انتقال ہوگیا اور اس کے بیٹے نور محمد کلہوڑو نے اس کی جگہ لے لی۔ اس نے اس سال سیوستان (سیہون) پر قبضہ کرلیا۔ اس دوران ٹھٹھہ میں صوبیدار کا عہدہ خالی ہوا تو مغل شہنشاہ نے سندھ کی سب سے بالادست قوت کی حیثیت سے نور محمد کلہوڑو کو اس منصب پر فائز کردیا۔ اس طرح بالائی سے زیریں حصے تک پورے سندھ پر کلہوڑو خاندان کی حکمرانی قائم ہوگئی۔ 1736ء میں دہلی دربار نے اسے نیم آزاد حکمران تسلیم کرلیا۔ 1739ء میں ایران کے بادشاہ نادر شاہ نے دہلی میں مغلیہ سلطنت کے پرخچے اڑا دیئے تو سندھ کے حاکم نور محمد کلہوڑو نے بھی اپنی وفاداری ایرانی بادشاہ کی طرف منتقل کردی اور وہ اب مغل بادشاہ کے بجائے ایرانی بادشاہ کو خراج ادا کرنے لگا۔ 1747ء میں ایران میں نادر شاہ قتل ہوگیا اور اس کے ایک سپہ سالار احمد شاہ ابدالی نے کابل کو اپنا پایۂ تخت بنا کر ایرانی سلطنت کے بیشتر مقبوضات پر مشتمل اپنی سلطنت وضع کرلی۔ نور محمد کلہوڑو نے بھی اس کی اطاعت قبول کرلی اور کابل دربار کو خراج بھیجنا شروع کردیا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے یہ سلسلہ منقطع کردیا تو 1754ء میں احمد شاہ ابدالی نے اسے خراج ادا کرنے پر مجبور کرنے کے لئے اپنی فوج اس کے خلاف روانہ کردی جس نے سیوستان کے نواح میں آکر پڑاؤ ڈال دیا۔ نور محمد نے مشرق کی جانب ریگستانی علاقے میں فرار کی راہ اختیار کی ۔اس اثناء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ ادھر اس دوران احمد شاہ ابدالی شمالی ہند میں مرہٹوں کے خلاف صف آرا ہوگیا اور سندھ کی طرف سے اس کی توجہ ختم ہوگئی ۔نور محمد کے انتقال کے بعد اس کے تین بیٹوں مراد یار، اتر خان اور غلام شاہ کے درمیان تخت نشینی کی جنگ چار سال تک جاری رہی یہاں تک کہ 1758ء میں غلام شاہ کلہوڑو اپنا غلبہ مستحکم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے 1768ء میں دارالحکومت تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا اور دریائے سندھ کے کنارے قدیم قصبہ نیرون کوٹ میں ایک بلند مقام پر مضبوط قلعہ تعمیر کیا اور اسے حیدر آباد کے نام سے موسوم کرکے اپنا پایۂ تخت قرار دیا۔ 1771ء میں اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا سرفراز خان کلہوڑو اس کا جانشین ہوا۔

سندھ میں بلوچوں کی نقل مکانی کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا لیکن انہیں باقاعدہ سیاسی قوت

پہلی مرتبہ کلہوڑ و دربار میں حاصل ہوئی۔ سرفراز خاں کلہوڑو کے دور میں بلوچوں کے تالپور خاندان نے بہت زیادہ طاقت حاصل کر لی یہاں تک کہ سرفراز خان نے ایک تالپور سردار میر بہرام خان کو قتل کروادیا۔ اس پر تالپوروں نے دوسرے بلوچ سرداروں کی مدد سے سرفراز خان کا تختہ الٹ کر اسے اقتدار سے سبکدوش کر دیا اور اس کی جگہ غلام شاہ کلہوڑو کے بھائی غلام نبی کو تخت نشین کر دیا۔ تاہم غلام نبی کلہوڑو اور تالپور سرداروں کی بھی آپس میں نہ بن سکی اور وہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ غلام نبی ان کے ساتھ لڑائی میں مارا گیا اور تالپوروں نے اس کے بھائی عبدالنبی کلہوڑو کو تخت نشین کر دیا۔ وہ برائے نام حکمران تھا اصل اقتدار اس کے تالپور وزیر میر بجار خان کو حاصل تھا۔ اس دوران 1781ء میں قندھار کے لشکر نے سندھ پر چڑھائی کر دی۔ شکار پور کے قریب میر بجار خان نے اسے شکست دے کر مار بھگایا۔ کچھ عرصے بعد عبدالنبی کلہوڑو نے میر بجار خان کو قتل کروادیا مگر خود اسے بھی تالپور سرداروں کے خوف سے قلات کی جانب راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔ ادھر مقتول وزیر کا بیٹا عبداللہ خان تالپور سندھ کے تخت پر قابض ہو گیا۔ تاہم تھوڑے عرصے کے بعد عبدالنبی نے قندھار کے فرمانروا کی مدد سے دوبارہ سندھ پر اپنا قبضہ بحال کر لیا اور عبداللہ خان تالپور کو مروادیا۔ مگر تالپور سرداروں نے ایک بار پھر اسے فرار ہونے پر مجبور کر دیا اور بہرام خان کے پوتے میر فتح علی کو سندھ کے تخت پر بٹھا دیا۔ بالائی سندھ میں ہلنی کے مقام پر عبدالنبی کلہوڑو اور میر فتح علی کے مابین فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں عبدالنبی شکست کھا کر پہلے سیوستان اور پھر جودھپور کی جانب فرار ہو گیا اور وہیں جاں بحق ہوا۔ اس دوران اس نے قندھار کے دربار میں اپنی بحالی کے لئے درخواست بھیجی لیکن ادھر سے میر فتح علی کے نمائندے بھی وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ افغان فرمانروا تیمور شاہ نے عبدالنبی کی درخواست کو کوئی اہمیت نہ دی اور میر فتح علی کے لئے خلعت فاخرہ، عربی گھوڑے اور سندِ حکومت ارسال کر کے سندھ پر تالپور خاندان کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ یہ واقعہ 1783ء میں پیش آیا۔

کلہوڑوں کی طرح تالپوروں نے بھی افغان بادشاہ کو خراج باقاعدگی سے ادا نہیں کیا۔ اس پر قندھار کی جانب سے کئی مرتبہ لشکروں نے آ کر چڑھائی کی۔ یہاں تک کہ 1792ء میں شکار پور کے مقام پر افغانوں کے ساتھ ایک معاہدہ طے پایا اور میر فتح علی خان نے پچیس (25) لاکھ روپے خراج کے بقایاجات کے طور پر ادا کر کے نئے سرے سے سند حکومت حاصل کی۔ تاہم

1793ء میں تیمور شاہ کے انتقال کے بعد افغان سلطنت ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کا شکار ہو گئی اور سندھ پر سے ان کا کنٹرول ختم ہو گیا۔

تالپور خاندان کی حکومت دراصل اس خاندان کے متعدد جاگیرداروں کی کنفیڈریشن تھی۔ اس کے تین یونٹ تھے۔ حیدرآباد، میرپورخاص اور خیرپور۔ حیدرآباد پر میر فتح علی خان نے اپنے تین بھائیوں غلام علی، کرم علی اور مراد کی شراکت کے ساتھ حکومت قائم کی، میرپورخاص پر میر سہراب نے اور خیرپور پر تھورا خان نے حکومت قائم کی۔ میروں کی یہ حکومتیں بالآخر 1843ء میں انگریزوں کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچیں۔ [11]

کلہوڑوں اور تالپوروں نے زوال پذیر مغل سلطنت، ایرانی سلطنت اور پھر افغان سلطنت کے باجگزاروں کی حیثیت میں حکومت قائم کی اور اپنے علاقے اور عوام کی فلاح و ترقی پر کوئی توجہ نہ دی۔ اگرچہ ان خاندانوں کے اربابِ حل وعقد ذاتی طور پر شریف الطبع اور منکسر المزاج تھے لیکن انہوں نے سندھ کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام کی بہتری کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور سندھی عوام بدستور جاگیردارانہ استبداد کی چکی میں پستے رہے۔ تالپور میروں کی کاروبار حکومت میں عدم دلچسپی کی یہ حالت تھی کہ انہوں نے کوئی باقاعدہ فوج تک منظم نہیں کی تھی اور وہ کسی نہ کسی بیرونی حکمران کی بالادستی قبول کر کے مقامی لوگوں پر اپنا غلبہ قائم رکھتے تھے۔

سندھ پر محمد بن قاسم کے حملے 712ء اور انگریزوں کے قبضے 1843ء تک 1130ء برس کے عرصے پر محیط مسلم عہد کے سرسری مطالعہ سے جو اہم پہلو سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:

1۔ عربوں کا سندھ پر بہت ڈھیلا ڈھالا کنٹرول تھا۔ چنانچہ اموی اور عباسی دور میں یہاں سے غیر منظم اور غیر مسلسل طریقے سے خراج کی وصولیابی تو ہوئی لیکن اسلام کی تبلیغ یا ترویج نہ ہونے کے برابر رہی۔ جن مقامی سرداروں نے اسلام قبول بھی کیا وہ بعد میں عرب حاکموں کی بدعہدی اور دھوکہ دہی کی وجہ سے اپنے پرانے مذہب پر لوٹ گئے۔

2۔ اسماعیلیوں یا قرمطیوں نے نویں اور دسویں صدی عیسوی میں مقامی آبادی کے ساتھ ثقافتی ہم آہنگی استوار کر کے تبلیغ کی اور یہاں اسلام کو فروغ حاصل ہوا۔

3۔ سندھ کے علاقے پر مشتمل پہلی آزاد و خودمختار مسلم ریاست مقامی نومسلموں نے قائم کی۔ اس میں سومرو خاندان نے نویں صدی سے لے کر 1351ء تک کم وبیش پانچ سو

سال تک اور سمو خاندان نے 170 سال (1351-1521ء) تک حکومت کی جبکہ برصغیر کے دوسرے علاقوں میں قائم ہونے والی مسلم ریاستوں اور سلطنتوں پر ترک یا افغان خاندانوں نے حکومت کی۔

4۔ سلطنت دہلی کا سندھ پر کنٹرول قائم نہ ہوا۔ (بہت محدود عرصے کے لئے فقط بالائی سندھ یعنی بکھر پر کنٹرول رہا) سومرو اور سمو خاندان کے فرمانرواؤں نے کبھی کسی کو خراج ادانہیں کیا۔

5۔ سولہویں صدی میں قندھار سے آنے والے ارغونوں اور ترخانوں کے سندھ پر قبضہ سے غیر سندھی مسلم فرمانرواؤں کا سلسلہ شروع ہوا جو خودمختار حیثیت میں 66 سال یعنی 1526-1592ء تک جاری رہنے کے بعد مغلیہ سلطنت کے باقاعدہ صوبہ بن جانے پر منتج ہوا۔ اگرچہ سندھ کو مغلیہ سلطنت کے صوبے کے طور پر 1592-1736ء یعنی 166 سال تک سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقتاً 1707ء میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد دہلی دربار کا کنٹرول بالکل معدوم ہو کر رہ گیا تھا۔

6 سندھ میں ایرانی اور افغان سلطنتوں کا کنٹرول برائے نام رہا۔ اصل اقتدار کے مالک کلہوڑ و اور تالپور خاندان بنے رہے۔

7۔ مسلم عہد کا بیشتر حصہ سندھ کے خودمختار مسلم حکمرانوں کی حکومتوں پر مشتمل ہے۔

8۔ اس دوران حکومتوں کی تبدیلی کے باوجود سندھ میں قبائلی جاگیردارانہ سیاست، معیشت و معاشرت کا دور دورہ رہا۔ انیسویں صدی کے وسط میں انگریزوں کی ترقی یافتہ استعماری فوج کا اس پر قبضہ کر لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔

سندھ پر برطانوی قبضے کا بین الاقوامی پس منظر

انیسویں صدی کا اوائل وہ زمانہ تھا جبکہ برطانوی سامراج کلکتہ، مدراس اور بمبئی کے گردونواح کے وسیع علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد شمالی ہندوستان کی طرف قدم بڑھا رہا تھا اور اس مقصد کے لئے مرہٹوں کے ساتھ اس کی آخری لڑائی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ شمال کی جانب برطانیہ کی پیش قدمی محض برطانوی سلطنت میں توسیع کی خاطر نہیں تھی بلکہ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ

شمال کی جانب سے اپنے عالمی حریف فرانسیسی سامراج کے خطرے کا سد باب کرنا چاہتا تھا۔ اس زمانے میں پیرس میں نپولین بونا پارٹ (Napoleon Bona Parte) برسر اقتدار تھا اور اس کے عالمی عزائم کی کوئی حد نہیں تھی۔ چنانچہ 1808ء میں جبکہ نپولین نے اٹلی، سپین اور یورپ کے کئی دوسرے علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد ''مشرقی مسئلہ'' کے بارے میں بھی زار روس سے ایک معاہدہ کر لیا تھا، برطانیہ نے سندھ کے میروں سے عدم جارحیت کا ایک معاہدہ کیا جس کی ایک شرط یہ تھی کہ ''سندھ سے فرانسیسیوں کو نکال دیا جائے گا اور بمبئی اور حیدرآباد کے درمیان ''وکیلوں'' کا تبادلہ ہوگا۔ سندھ کے میروں کی طرف سے میر غلام علی اور میر مراد علی خان نے اس معاہدے پر دستخط کئے تھے۔''[12]

1811ء میں میر غلام علی خان کے انتقال کے بعد 1820ء میں انگریزوں نے اس کے جانشینوں کے ساتھ ایک اور معاہدہ کیا جس کی ایک شرط یہ تھی کہ سندھ سے سارے یورپینوں اور امریکنوں کو نکال دیا جائے گا اور بمبئی اور حیدرآباد کی حکومتوں کی رعایا ایک دوسرے کے علاقوں میں رہائش اختیار کر سکے گی اور میران سندھ اپنے اپنے علاقے سے کچھ اور دوسری ہمسایہ ریاستوں پر حملوں کا سد باب کریں گے۔[13] اس معاہدے سے قبل 19-1817ء میں انگریزوں کے ہاتھوں مرہٹوں کی قطعی شکست ہو چکی تھی۔ 1832ء میں ایک اور معاہدہ ہوا جس کے تحت سندھ اور ہندوستان کے درمیان تجارت کے لئے دریائی اور زمینی راستے کھول دیئے گئے۔ 1834ء میں خیر پور کے میر کے ساتھ ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت دریائی راستوں سے تجارت پر محصولات میں تخفیف کی گئی۔ اس زمانے میں پنجاب میں رنجیت سنگھ کی حکومت بڑی طاقتور ہو چکی تھی۔ رنجیت سنگھ نے افغانستان میں احمد شاہ ابدالی کے وارثوں میں مسلسل خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر وادیٔ کشمیر کے علاوہ صوبہ ملتان کے ایک بڑے علاقہ پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ جب 1836ء میں وہ سندھ پر حملہ آور ہو کر شکار پور کے لئے خطرے کا باعث بنا اور اس نے 12 لاکھ روپے کا خراج طلب کیا تو میروں نے انگریزوں کی ثالثی اس شرط پر قبول کر لی کہ حیدرآباد میں ایک برطانوی ایجنٹ متعین ہوگا اور میرانِ سندھ پنجاب کے حکمران رنجیت سنگھ کے ساتھ ساری گفت و شنید انگریزوں کی وساطت سے کریں گے۔

اسی سال یعنی 1836ء میں لارڈ آک لینڈ (Auck land) نے کلکتہ میں ایسٹ انڈیا

کمپنی کی حکومت کے سربراہ کا عہدہ سنبھالا تھا۔ وہ برطانیہ کے اس مکتب فکر سے تعلق رکھتا تھا جس کا خیال تھا کہ 1812ء میں نپولین کی قطعی شکست کے بعد اب روسی سامراج ہندوستان کے لئے خطرہ بن گیا تھا کیونکہ وہ وسطی ایشیا کے مختلف علاقوں پر یکے بعد دیگرے قبضہ کر کے کشمیر کی طرف آ رہا تھا۔ اس مکتب فکر کا مزید خیال تھا کہ ہندوستان کو روسی سامراج کی دستبرد سے بچانے کے لئے افغانستان اور ایران پر برطانیہ کی بالادستی قائم کرنا ضروری ہے۔ لندن میں مسلسل یہ اطلاعات مل رہی تھیں کہ افغانستان کا حکمران دوست محمد خان روس کے ساتھ اپنے روابط بڑھا رہا ہے۔ چنانچہ آک لینڈ نے 1836ء میں سندھ کے میروں اور رنجیت سنگھ کے درمیان ثالثی کروانے کے بعد پنجاب کے حکمران کے ساتھ افغانستان کے خلاف گٹھ جوڑ کیا اور دونوں نے مل کر 1838ء میں براستہ سکھر اور بولان حملہ کر دیا۔ اس سے قبل 1837ء میں کابل کے حکمران دوست محمد خان نے نہ صرف روسیوں کی ہدایت کے مطابق ایران سے معاہدہ کر لیا تھا بلکہ اس نے یہ اعلان بھی کر دیا تھا کہ ''وہ انگریزوں کے خلاف روس کا حلیف ہوگا۔ اس کے اس اعلان کی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے اسے یہ یقین دہانی کرانے سے انکار کر دیا تھا کہ وہ اسے پشاور کی وادی رنجیت سنگھ سے واپس لے دیں گے جبکہ روس نے اس سے یہ وعدہ کیا تھا کہ رنجیت سنگھ کے خلاف افغانستان کی امداد کرے گا تاکہ پشاور کی وادی دوبارہ کابل کی تحویل میں آ جائے۔'' انگریزوں اور سکھوں کی جانب سے افغانستان پر یہ مشترکہ حملہ لاہور کے سہ فریقی معاہدے کے مطابق ہوا تھا جس میں آک لینڈ، رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع نے دستخط کئے تھے۔ شاہ شجاع نے اس معاہدے میں یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر اسے دوست محمد خان کی جگہ کابل کے تخت پر بحال کر دیا جائے تو وہ کسی بیرونی طاقت کو براستہ افغانستان سکھوں اور انگریزوں کے کسی علاقے پر حملہ آور نہیں ہونے دے گا۔ اس معاہدے سے سندھ کے میروں کو بھی یہ یقین دلایا گیا تھا کہ اگر وہ کابل کے نئے حکمران شاہ شجاع کو خراج ادا کرتے رہیں گے تو ان کا یہ علاقہ ان کے زیر تسلط رہے گا لیکن اس معاہدے کے تحت مشترکہ فوجی مہم کو ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ 1839ء میں پنجاب کی سلطنت کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کا انتقال ہو گیا۔ تاہم انگریزوں نے اپنی فوجی کارروائی جاری رکھی اور وہ 41-1840ء میں دوست محمد خان کو شکست دے کر شاہ شجاع کو کابل کے تخت پر بٹھانے میں کامیاب ہو گئے اور دوست محمد خان کو گرفتار کر کے ہندوستان لایا گیا لیکن ان کی یہ کامیابی عارضی ثابت ہوئی۔ دسمبر 1841ء میں

کابل میں مقیم انگریزوں کی 15000 فوج کے خلاف عام بغاوت ہوگئی۔ جب انگریزوں کی فوج کا راشن پانی بند کر دیا گیا تو انہوں نے باغیوں کے ساتھ ایک توہین آمیز معاہدہ کر کے وہاں سے پسپائی شروع کر دی مگر کابل سے جلال آباد تک راستے میں سخت سردی، بھوک پیاس اور افغان قبائلیوں کے گوریلا حملوں کے باعث یہ ساری فوج نیست و نابود ہوگئی۔ صرف ایک ڈاکٹر برائیڈن (Brydon) جلال آباد تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا۔ انگریزوں کی اس عبرت ناک شکست اور رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع کی موت کی وجہ سے 1838ء کا لاہور کا معاہدہ کالعدم ہوگیا۔

سندھ پر برطانوی قبضہ

متذکرہ پہلی افغان جنگ سے پہلے لارڈ آک لینڈ نے سندھ کے میروں سے زبردستی یہ منوالیا تھا کہ بمبئی سے اس کی جو فوج افغانستان کے لئے روانہ ہوگی اسے سندھ میں پڑاؤ کی اجازت ہوگی۔ میران سندھ انگریزوں کو یہ سہولت دینے پر آمادہ نہیں تھے۔ لیکن انہیں مجبوراً اس مطالبے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا اور انگریزوں نے اس مطالبہ کی تکمیل کو یقینی بنانے کے لئے 1839ء میں کراچی کی بندرگاہ پر قبضہ کر لیا تھا کیونکہ سندھ کے حکمران انگریزوں کی فوج کے لئے سپلائی کے راستے میں رکاوٹیں حائل کرتے تھے۔ کراچی پر قبضہ کے بعد حیدرآباد کے میروں اور انگریزوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت یہ قرار پایا کہ حیدرآباد کی حکومت کابل کے نئے حکمران شاہ شجاع کو خراج کی 23 لاکھ روپے کی بقایا رقم ادا کرے گی، سندھ میں انگریزوں کی پانچ ہزار فوج مستقل طور پر مقیم رہے گی جس کے جزوی اخراجات حیدرآباد کی حکومت برداشت کرے گی اور وہ دریائے سندھ میں تجارتی کشتیوں سے بھی کوئی ٹیکس نہیں وصول کرے گی۔ اسی قسم کا ایک معاہدہ خیرپور کے میروں سے ہوا تھا جس کے مطابق بکھر کا قلعہ انگریزوں کی تحویل میں دیا گیا۔ میرپور خاص کے حکمران شیر محمد نے بھی ایک معاہدے پر دستخط کئے۔ جس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ وہ سالانہ 50 ہزار روپے خراج ادا کرے گا۔

دسمبر 1841ء میں افغانستان میں انگریزوں کی فوج کی مکمل تباہی کے بعد لارڈ آکلینڈ کو برطرف کر دیا گیا اور اس کی جگہ لارڈ ایلن برو (Ellenborough) کا تقرر ہوا تو اس نئے گورنر جنرل نے یہ فیصلہ کیا کہ افغانستان پر دوسرے حملے سے پہلے سندھ پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا

تسلط ضروری ہے، تا کہ آئندہ جنگی اہمیت کے اس علاقے میں انگریزوں کی فوجوں کے قیام اور انکی آمد و رفت میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہونے پائے۔ ایلن برو نے اپنے اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کا کام ایک جرنیل سر چارلس نیپیئر (Charles Napier) کے سپرد کیا۔ اس نے پہلے تو 1842ء کے اواخر میں حیدر آباد، خیر پور اور میر پور خاص کے حکمرانوں سے گفت وشنید کے ذریعے ایک معاہدے کے تحت پورے سندھ پر پرامن طریقے سے قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر جب اسے اپنے اس مقصد کی تکمیل میں کچھ مشکل پیش آئی تو اس نے جنوری 1843ء میں خیر پور پر حملہ کر دیا۔ اس نے چند دن میں اس علاقے کو اپنے قبضہ میں لینے کے بعد فروری 1843ء میں حیدر آباد کی طرف رخ کیا جہاں میروں کے بلوچ لشکر نے انگریزوں کی ریذیڈنسی کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ 17 رفروری کو حیدر آباد سے تقریباً پانچ میل کے فاصلہ پر میانی کے مقام پر غیر منظم بلوچ لشکریوں اور نیپیئر کی فوج کا تصادم ہوا جس میں بلوچ لشکر کو ایک ہی دن میں شکست ہوگئی اور سر چارلس نیپیئر فتح یاب ہوا۔ پھر 22 رمارچ کو حیدر آباد کے نزدیک ہی دوبو کے مقام پر میر پور خاص کے حکمران شیر محمد کے لشکر کا نیپیئر کی فوج سے مقابلہ ہوا جس میں نیپیئر کی فتح ہوئی اور پورا سندھ انگریزوں کے تسلط میں چلا گیا۔

نیپیئر نے ان دو لڑائیوں کے بعد اپنی حکومت کو جو رپورٹ بھیجی تھی اس میں اپنے اس فوجی کارنامے کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا تھا اور بیشتر انگریز مؤرخین بھی نیپیئر کی اس رپورٹ کی بنیاد پر اس عظیم فوجی کامیابی کے گیت لکھتے ہیں لیکن نیپیئر کی رپورٹ اور انگریز مؤرخین کی قصیدہ نویسی میں افسانہ طرازی زیادہ ہے اور حقیقت بیانی بہت کم ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں برطانیہ کے سامراج نواز لوگوں کو یقین دلانا ضروری تھا کہ افغانستان میں شکست کے باعث ہندوستان پر انگریزوں کی گرفت ڈھیلی نہیں ہوئی۔ دوسری وجہ تھی کہ برطانیہ کے نئے عالمی حریف روس کے حکمرانوں کو یہ تاثر دینا ضروری تھا کہ دسمبر 1841ء میں افغانستان میں ہزیمت اٹھانے کے باوجود ہندوستان میں انگریزوں کی فوجی قوت میں کمی نہیں ہوئی اور وہ برصغیر کا دفاع کرنے کی اہلیت رکھتا ہے اور تیسری وجہ اس ضرورت میں مضمر تھی کہ پنجاب میں رنجیت سنگھ کے وارثوں اور برصغیر کے دوسرے علاقوں کے سامراج دشمن عناصر پر برطانیہ کا فوجی دبدبہ بحال کیا جائے حالانکہ حیدر آباد کی ان دونوں لڑائیوں میں نیپیئر کی فتح کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔

میروں کا نظام حکومت جا گیردارانہ استبدادی نظام تھا۔ ان کے 40 سالہ عہد اقتدار میں ان کے پاس اپنی کوئی باقاعدہ فوج نہیں تھی۔ انہوں نے بلوچ سرداروں کو جاگیریں دے رکھی تھیں تاکہ جب ضرورت پڑے تو وہ اپنے قبائلیوں کو جمع کر کے فوج مہیا کریں۔ انہوں نے نیپیئر کا مقابلہ کرنے کے لئے بعجلت بلوچ قبائلیوں کا ایک لشکر تیار کیا تھا۔ چونکہ ان بلوچیوں میں تنظیم اور ڈسپلن کا نام ونشان نہیں تھا، ان کے پاس جدید قسم کے ہتھیار نہیں تھے اور نہ ہی وہ جدید فن حرب سے آشنا تھے اس لئے نیپیئر کو ان پر غلبہ حاصل کرنے میں کوئی خاص مشکل پیش نہ آئی تھی۔ قبائلیوں نے نیپیئر کی منظم، تربیت یافتہ اور جدید ہتھیاروں سے مسلح فوج کا مقابلہ تقریباً ایسے ہی کیا تھا جیسے کہ آج کل نہتے مظاہرین اینٹوں اور پتھروں سے مسلح پولیس یا فوج کا مقابلہ کرتے ہیں۔ لہٰذا اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کہ میانی کی لڑائی میں پانچ ہزار بلوچی مارے گئے اور نیپیئر کی فوج میں سے ہلاک شدگان کی تعداد صرف 257 تھی۔ نیپیئر نے اپنی رپورٹ میں محض اپنی اور برطانوی سامراج کی مشہوری کے لئے رائی کا پہاڑ بنایا تھا اور اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجی حکمت عملی کا تقاضا بھی یہی تھا۔ سندھ کے گورنر نیپیئر کا اپنا بیان یہ تھا کہ ''ہمیں سندھ پر قبضہ کرنے کا کوئی حق نہیں لیکن ہم قبضہ کرلیں گے اور یہ ایک بہت سودمند کمینگی ہوگی۔''

سندھ......نیپیئر کے تحت علیحدہ صوبہ

سندھ پر سر چارلس نیپیئر کی فوجی حکومت تقریباً ساڑھے چار سال تک قائم رہی جس کے دوران اس علاقہ کو ایک علیحدہ صوبہ کا درجہ حاصل تھا۔ یہ صوبہ کراچی، حیدرآباد اور شکارپور کے تین اضلاع پر مشتمل تھا۔ ٹیکسوں کی وصولی اور داخلی انتظامیہ کا کام میروں کے ہی مقرر کردہ ہندو کارپردازوں اور اہل کاروں کے سپرد تھا اور نظام اراضی میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی تھی۔ میروں کو نقد پنشنیں دی گئی تھیں جن کی سالانہ رقم تین چار لاکھ روپے تھی۔ انہیں اپنے پاس اپنی جاگیریں رکھنے کی اجازت دی گئی تھی جس کی مالیت تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے بنتی تھی۔ میروں کے علاوہ تقریباً دو ہزار دوسرے جاگیرداروں کی بھی جاگیریں برقرار رکھی گئی تھیں کیونکہ انہوں نے تحریری طور پر نیپیئر کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ انگریز سرکار کے وفادار رہیں گے۔ بطور گورنر نیپیئر کی زیادہ تر توجہ صوبے کے مختلف علاقوں میں قلعے، چھاؤنیاں اور دوسرے فوجی مراکز تعمیر کرنے کی طرف

مبذول رہی کیونکہ افغانستان پر دوسرے حملے کے لئے سندھ میں اس قسم کے انتظامات ضروری تھے۔ اکتوبر 1847ء نیپیئر 65 سال کی عمر میں سندھ کی گورنری کے عہدہ سے مستعفی ہوگیا، اس وقت تک صوبہ میں برطانوی سامراج کا اقتدار مستحکم ہوچکا تھا اور پنجاب کے الحاق کی کاروائی کا آغاز بھی ہوگیا تھا۔

باب: 2

بمبئی پریذیڈنسی کی ماتحتی اور ہندو۔ مسلم تضاد

ابتدائی نوآبادکاری...... ہندوؤں کی ترقی اور مسلمانوں کی پسماندگی

1847ء میں سر چارلس نیپیئر کی روانگی کے بعد سندھ کا صوبائی درجہ ختم کر دیا گیا اور اس علاقے کو بمبئی پریذیڈنسی کے ساتھ مدغم کر کے اسکے نظم ونسق کے لئے ایک کمشنر کا تقرر کیا گیا۔ بمبئی پریذیڈنسی کے کمشنری کے علاقے کے طور پر سندھ میں آئندہ دس سال تک بالعموم امن وامان رہا۔ اس عرصے میں انگریزوں نے دریائے سندھ کی سیلابی نہروں کی مرمت وترقی کے لئے کچھ سکیموں پر عمل کیا جس سے زیر کاشت رقبہ میں خاصا اضافہ ہوا اور سرکاری آمدنی بڑھی۔ 1856ء میں حیدرآباد کے نزدیک صرف نہر پھلیلی سے 3 لاکھ ایکڑ رقبہ پر کاشت ہوتی تھی۔ تاہم سندھی عوام سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی لحاظ سے بہت پسماندہ رہے۔

1853ء میں کراچی میں ایک انگریزی اسکول کھلا لیکن سندھی مسلمانوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ سندھی زبان کا کوئی رسم الخط نہیں تھا۔ مسلمان بچوں کی تھوڑی سی تعداد دینی مدرسوں اور مساجد میں قرآن وحدیث کی تعلیم حاصل کرتی تھی لیکن جدید علوم سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہندو ساہوکار، دکاندار اور آڑھتی اپنے کاروبار کا حساب رکھنے کے لئے دیوناگری رسم الخط استعمال کرتے تھے اور انہیں اپنے کاروبار کی ترقی کے لئے جدید علوم میں دلچسپی تھی۔

1853ء میں فوجی مقاصد کے لئے کراچی سے کوٹری تک ریلوے لائن کی تعمیر کا منصوبہ بنایا گیا اور 1855ء میں لندن میں ایک سندھ ریلوے کمپنی بھی قائم ہوئی۔ 1856ء میں یہ تجویز زیر غور آئی کہ سندھ کو پنجاب کے ساتھ ملا کر خیبر سے لے کر کراچی تک علاقے کے لئے لیفٹیننٹ گورنر کا تقرر کیا جائے مگر مالی اور دوسری وجوہ کی بنا پر اس منصوبہ پر عمل نہ ہوا۔ 1857ء

میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس ریلوے کی گزرگاہ کی منظوری بھی دے دی مگر اسی سال میرٹھ میں جنگ آزادی کی ابتدا ہونے کے باعث ریلوے کی تعمیر کا کام معرض التوا میں رہا۔ اس جنگ آزادی کے دوران کراچی، حیدرآباد اور شکارپور میں بھی کچھ بغاوت ہوئی مگر اسے جلدی ہی کچل دیا گیا۔ متعدد باغیوں کو پھانسی دی گئی، کئی ایک کو توپ سے اڑادیا گیا اور تقریباً دو درجن کو عمر قید کی سزا دی گئی۔ نومبر 1858ء میں جب سندھ میں جنگ آزادی یا غدر کے کوئی آثار نہ رہے اور ایسٹ انڈیا کمپنی ختم ہوگئی تو وزیر ہند نے حکم دیا کہ پنجاب میں لیفٹینٹ گورنر کا تقرر کیا جائے لیکن اس حکم میں اس نئے صوبے کی حد بندی کا کوئی ذکر نہیں تھا اور یہ کہا گیا تھا کہ یہ کام حکومت ہند خود ہی سرانجام دے گی۔ لیکن جب حکومت ہند نے وزیر ہند کے اس حکم کی تعمیل کی تو یہ فیصلہ ہوا کہ سندھ کو پنجاب کے ساتھ نہیں ملایا جائے گا بلکہ یہ بمبئی کا ہی حصہ رہے گا کیونکہ کمشنر فریئر (Frere) اس علاقے کا انتظام خوش اسلوبی سے چلا رہا تھا اور شمالی علاقے کے ساتھ مواصلات میں بھی مشکلات حائل تھیں۔[1] 1859ء میں فریئر کی جگہ نئے کمشنر کا تقرر ہوا تو 1861ء میں کراچی اور کوٹری کے درمیان 105 میل لمبی ریلوے کی تعمیر مکمل ہوگئی اور اس طرح افغانستان پر دوسرے حملہ کے لئے تیاری کا ایک اہم مرحلہ طے ہوگیا۔

1866ء میں بمبئی کے ضابطہ دیوانی کا سندھ پر اطلاق ہوا تو ہندو بنیوں کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی قوت میں یکا یک بے پناہ اضافہ ہوگیا۔ اس قانون کے اطلاق سے قبل سندھ میں ہندو زمینداروں کا کوئی وجود نہیں تھا۔ ''ہندو ساہوکار مسلمان مالکان اراضی کو جو قرضہ دیتے تھے اس کی وصولی وہ صرف جنس کی صورت میں کرتے تھے۔ انہیں اپنے قرضے کی وصولی کے لئے زمین حاصل کرنے کا کوئی قانونی حق حاصل نہیں تھا۔ مگر 1866ء کے قانون کے تحت انہیں یہ حق مل گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان زمینداروں کی زمینیں رفتہ رفتہ ہندو ساہوکاروں کے نام منتقل ہونا شروع ہوگئیں۔''[2] لہٰذا سندھ کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی میں 1866ء کا سال ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سال کے بعد مسلمان زمینداروں کے زوال اور ہندو ساہوکاروں اور سوداکاروں کے عروج کی رفتار تیز ہوگئی اور اس بنا پر ہندو مسلم تضاد نے جنم لیا۔

1870ء میں ملتان اور کوٹری ریلوے لائن کی تعمیر کا کام شروع ہوا تو اس سال ہندوستان کے وائسرائے لارڈ میو (Mayo) نے جب مقامی حکومتوں کے اختیارات کی حدود کی

ازسرنوتشکیل کے مسئلہ پرغورکیاتو سندھ کے پنجاب کے ساتھ الحاق کی تجویز ایک مرتبہ پھرزیر بحث آئی کیونکہ فوجی ماہرین کی رائے یہ تھی کہ نارتھ ویسٹرن ریلوے کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد سارا شمال مغربی سرحدی علاقہ ایک ہی انتظامیہ کے ماتحت ہونا چاہیے مگراس سلسلے میں فوری طور پرکوئی اقدام نہ کیا گیا۔ 1876ء میں وزیر ہند نے سندھ کے علاقے کو بمبئی سے علیحدہ کر کے صوبہ پنجاب میں منتقل کرنے کی منظوری دے دی۔ اس فیصلہ کے مطابق حکومت ہند نے 15 راگست 1879ء کو وزیر ہند سے یہ اجازت طلب کی کہ سندھ کو یکم جنوری 1880ء سے پنجاب کے ساتھ ملا دیا جائے۔ مگراس دوران افغانستان کے ساتھ دوسری جنگ شروع ہو چکی تھی اس لئے اس فیصلہ پرعمل درآمد غیر معین عرصے کے لئے ملتوی کر دیا گیا[3] اور سندھ سوئے اتفاق سے بمبئی پریذیڈنسی کا ہی حصہ رہا حالانکہ سندھ کے معاشی، معاشرتی اور ثقافتی روابط بمبئی کے مقابلے میں پنجاب سے زیادہ گہرے تھے۔ سندھ اور پنجاب کے مذہب اور دریاؤں کے پانی کے رشتے خاصے مضبوط تھے اور ویسے ہی سندھ کے مسلمانوں کے بمبئی کے ہندو ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کے ساتھ تضاد کی شدت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔

1879-80ء میں نارتھ ویسٹرن ریلوے کی محض فوجی مقاصد کے لئے تعمیر مکمل ہوئی تھی۔ اس وقت اس کے کوئی تجارتی مقاصد نہیں تھے۔ اس ریلوے کی تعمیر کا پس منظر یہ تھا کہ 1840ء میں پہلی افغان جنگ اور پھر 1849ء میں پنجاب کے الحاق کے بعد ہندوستان میں برطانوی اقتدار کا براہ راست سرحدی قبائل اور افغانستان سے رابطہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد شمال مغربی سرحد کا مسئلہ برطانیہ کے سول اور فوجی حکام اور وائسراؤں کے لئے بڑی دلچسپی کا باعث بن گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ روس وسطی ایشیا میں اپنے علاقے میں توسیع کر رہا تھا اور برطانیہ کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ روس افغانستان اور ہندوستان تک پہنچنے کے عزائم رکھتا ہے۔ اس ریلوے کی اس زمانے میں اہمیت اور کارکردگی کا اعتراف ایک روسی میجر جنرل ایل۔ این۔ سوبولیفٹ نے بھی کیا ہے۔ 1879-80ء میں اس نے ''اینگلو۔افغان کشمکش'' کے زیرعنوان لکھا ہے کہ ''برطانیہ نے اپنے فوجی اڈوں اور مواصلاتی راستوں پر جو جنگی سامان جمع کیا تھا اس کا ریلوے کے نظام سے گہرا تعلق تھا۔ بلاشبہ اس مشکل کام میں ہندوستان کے ریلوے کے نظام نے عظیم ترین خدمات انجام دی تھیں۔ ریلوے کے اس نظام میں اوقات کی پابندی ہے اور اس کے پاس اچھی گاڑیاں ہیں۔''[4]

1881ء میں سندھ کی آبادی میں 79 فیصد مسلمان تھے تقریباً 12 فیصد ہندو، تقریباً 5 فیصد سکھ اور تقریباً 4 فیصد دوسرے غیر مسلم تھے۔ 1882ء میں ایجوکیشن کمشنر کی ایک رپورٹ کے مطابق بمبئی یونیورسٹی کے گریجوایٹوں کی فہرست میں صرف ایک مسلمان ایم۔اے اور دو بی۔اے تھے، حالانکہ یہ یونیورسٹی 1857ء سے قائم تھی۔ ایجوکیشن کمشنر کی رپورٹ میں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ ان تین ''اعلیٰ تعلیم یافتہ'' مسلمانوں میں سے کوئی سندھی بھی تھا یا نہیں؟ البتہ انڈین ایجوکیشن کمیشن کی رپورٹ میں یہ بتایا گیا تھا کہ سندھ کے مسلمان پسماندہ نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر ان کی تعلیمی پسماندگی کی حالت یہی رہی تو مسلم اکثریت کا یہ علاقہ عملی طور پر مرہٹہ برہمنوں کی رعایا بن جائے گا۔[5] بظاہر انڈین ایجوکیشن کمیشن کی اس رپورٹ کی بنیاد حکومت برطانیہ کی اس نئی پالیسی پر تھی جو اس نے 1870ء میں ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں اختیار کی تھی۔

محمڈن نیشنل ایسوسی ایشن کا قیام اور حسن علی آفندی

یہ کوئی محض اتفاق نہیں تھا کہ جس سال انڈین ایجوکیشن کمیشن کی رپورٹ شائع کی گئی تھی اسی سال کلکتہ کی محمڈن ایسوسی ایشن کا صدر سید امیر علی کراچی پہنچا اور اس کی تحریک پر یہاں بھی محمڈن نیشنل ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا جس کا پہلا صدر ایک وکیل حسن علی آفندی تھا۔ اس ایسوسی ایشن کے اغراض و مقاصد یہ تھے کہ (1) سندھی مسلمانوں کے تعلیمی، معاشرتی اور دوسرے مفادات کو فروغ دیا جائے گا۔ (2) حکومت کے سامنے سندھی مسلمانوں کی وکالت کی جائے گی (3) سندھی مسلمانوں اور حکومت کے درمیان اتحاد اور وفاداری کے رشتوں کو مستحکم کیا جائے گا۔ (4) ہندوستان میں مسلمانوں کے اس قسم کے دوسرے اداروں سے دوستانہ روابط قائم کئے جائیں گے۔ اس انجمن کے قیام اور اس کے اغراض و مقاصد سے ظاہر تھا کہ سرسید احمد خان اور سید امیر علی کی کوششیں انگریزوں کے تعاون سے بار آور ہو رہی تھیں یعنی پنجابی مسلمانوں کی طرح سندھی مسلمانوں میں بھی جدید تعلیم کے حصول میں کچھ دلچسپی پیدا ہو رہی تھی۔ اس ایسوسی ایشن کا سیکرٹری مولانا اللہ بخش تھا اور اس کے ممتاز ارکان میں خان بہادر نجم الدین، سردار یعقوب، شیخ محمد اسماعیل، خان بہادر خداداد خان، خان بہادر دل محمد خان، خان بہادر علی محمد حسن علی، شیخ صادق علی، سیٹھ علی بھائی کریم جی، سیٹھ غلام حسن چھاگلہ، سیٹھ نور محمد لانس، سیٹھ صالح محمد عمر، سیٹھ غلام حسین خالق دینا،

سیٹھ فیض محمد فتح علی، شہزادہ محمد یعقوب اور شمس الدین طیب جی شامل تھے۔ ان ناموں سے ظاہر ہے کہ یہ ایسوسی ایشن انگریزوں کی منظوری اور حوصلہ افزائی کی بنا پر قائم ہوئی تھی۔ انگریزوں نے اس مقصد کے لئے سندھ کے مسلمان جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی حوصلہ افزائی اس لئے نہیں کی تھی کہ انہیں یکا یک سندھی مسلمانوں کے ساتھ عشق ہو گیا تھا بلکہ اس لئے کی تھی کہ وہ سندھی مسلمانوں کو کسی حد تک تعلیمی ترقی کی راہ پر چلا کر بمبئی کے ہندو درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کی روبہ اضافہ سیاسی اور معاشی قوت کے مقابلے میں ایک جوابی قوت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت تک بمبئی اور گجرات کے مرہٹہ برہمنوں نے سیاسی اقتدار کے حصول کے لئے زبردست تحریک شروع کر دی تھی۔ بال گنگا دھر تلک اسی تحریک کی پیداوار تھا۔

خان بہادر حسن علی آفندی نے اس ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام 1885ء میں سندھ مدرسہ قائم کیا اور اس کے فوراً بعد وہ اندرون سندھ کے مختلف علاقوں کا دورہ کر کے ایک سال کے اندر سکھر، جیکب آباد اور شکار پور میں اپنی انجمن کی تین شاخیں قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا اور پھر اس کی کوشش سے 1888ء تک شہداد پور، سیہون اور لاڑکانہ میں مزید تین شاخیں قائم ہو گئی تھیں۔ اس سے قبل 1887ء میں کراچی میں سندھ آرٹس کالج کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ قبل ازیں 1885ء میں وائسرائے لارڈ ڈفرن (Dufferin) کراچی میں سندھ مدرسے کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھ چکا تھا اور کراچی میونسپلٹی اس کے لئے گرانٹ منظور کر چکی تھی۔ میونسپلٹی کے ہندو ارکان نے اس گرانٹ کی تجویز کی مخالفت کی تھی مگر انہیں اپنی اس مخالفت میں کامیابی اس لئے نہیں ہوئی تھی کہ مسلمان اور یورپی میونسپل کمشنروں کی اکثریت اس تجویز کے حق میں تھی۔ نجندر ناتھ گپتا کے بیان کے مطابق کراچی میونسپلٹی میں اس رائے شماری کے بعد سندھ میں مسلمان اور ہندو ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔[6]

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان معاشی تضاد کی بنیاد 1866ء میں رکھی گئی تھی جبکہ ہندو ساہوکاروں کو اپنے قرضوں کی وصولی کے لئے مسلمان زمینداروں کی زمینیں ہتھیانے کی قانونی طور پر اجازت دی گئی تھی۔ ہندو بنیوں کے سود کی شرح 18 سے لے کر 36 فیصد تک ہوتی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1892 میں 200 ایکڑ یا اس سے زیادہ رقبہ کے مالک ہندو زمینداروں کی تعداد 1771 تھی جبکہ 1864ء میں پورے سندھ میں ایک بھی ہندو زمیندار نہیں تھا۔

1890ء اور 1896ء کے درمیان صرف چھ سال کی مدت میں مسلمان زمینداروں نے اپنا 22 فیصد رقبہ ہندوؤں کے پاس یا تو فروخت کر دیا تھا یا گروی رکھ دیا تھا۔ 1896ء میں 59 فیصد مسلم زمیندار ہندوؤں کے مقروض تھے اور 42 فیصد قابل کاشت رقبہ ہندوؤں کی ملکیت تھا۔ [7]

حسن علی آفندی نے سندھ کے مسلمان زمینداروں کے مفادات کو ہندوؤں کی دستبرد سے بچانے کی بہت کوشش کی۔ اس کی ایسوسی ایشن کی معاشی بنیاد یہی تھی اور اسی لئے سندھ کے مسلم جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے اس ایسوسی ایشن کی ہر طرح سے امداد و اعانت کی تھی۔ یہ حسن علی آفندی کی ہی کوشش کا نتیجہ تھا کہ 1891ء میں سندھ انکمبر ڈسٹیٹس ایکٹ نافذ ہوا تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ جو زمیندار سالانہ 300 روپے تک مالیہ ادا کرتے ہیں اور بری طرح مقروض ہیں انہیں ساہوکاروں کے چنگل سے نجات دلائی جائے۔ مگر ہندو بنیوں کی عیاری اور مسلم زمینداروں کی سادگی کے باعث یہ قانون خاطر خواہ طور پر نتیجہ خیز ثابت نہ ہوا اور بیشتر مسلمان زمیندار بنیوں کے قرضوں کے تلے دبے رہے۔ اس کی ایک وجہ اس حقیقت میں مضمر تھی کہ مسلمان زمینداروں کی اکثریت آرام کوش اور عشرت پسند تھی۔ ہنٹر (Hunter) لکھتا ہے کہ 1888ء میں سندھ کی آبادی میں تھوڑے سے ہندو کشید کردہ شراب پیتے تھے۔ بقیہ آبادی کی اکثریت، اچھے مسلمان ہونے کی وجہ سے، بھنگ کو ترجیح دیتی تھی۔ [8]

سندھ کا الحاق پنجاب کے بجائے بمبئی کے ساتھ کیوں کیا گیا؟

ہنٹر نے یہ نہیں لکھا کہ بالخصوص سندھ کے مسلمان زمیندار لکھنؤ کے نوابوں کی طرح بھنگ کے بہت شوقین تھے، وہ ہمہ وقت بھنگ کے نشے میں رہتے تھے جبکہ بمبئی اور گجرات کے ہندو بنیے ان کی معاشی بنیادیں اکھاڑنے میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ حکومت ہند نے 1888ء میں ایک مرتبہ پھر حکومت برطانیہ کو سفارش کرنے کا فیصلہ کیا تھا کہ سندھ کو صوبہ پنجاب کے ساتھ ملحق کر دیا جائے مگر اس تجویز کے سارے پہلوؤں پر غور و خوض کے بعد اس سفارش پر عمل نہیں کیا گیا تھا۔ [9]

کراچی کی سندھ سبھا بھی سندھ کو بمبئی کے ساتھ ملحق رکھنے کے حق میں تھی اور اس نے 18 رمئی 1888ء کو وائسرائے کے حضور میں ایک یادداشت پیش کی تھی جس میں یہ دلیل دی گئی تھی

کہ اگر سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے پنجاب کے ماتحت کر دیا گیا تو یہ ایک غیر دانشمندانہ اقدام ہو گا۔ 1876ء میں وائسرائے لارڈ لٹن (Lytton) سندھ کو پنجاب کے ساتھ ملانے کے حق میں تھا مگر بعض انتظامی اور مواصلاتی مشکلات کے پیش نظر اس منصوبہ پر عمل نہیں ہوا تھا۔ چونکہ 1888ء میں نارتھ ویسٹرن ریلوے مکمل ہو چکی تھی اس لئے وائسرائے ڈفرن (Dufferin) نے اس منصوبے کو اپنالیا تھا مگر اس پر عمل پھر بھی نہ ہو سکا۔[10]

حسن علی آفندی کراچی کی سندھ سبھا کا نائب صدر تھا۔ اس سبھا نے سندھ کے پنجاب کے ساتھ ادغام کی مخالفت شاید اس وجہ سے کی تھی کہ سر سید احمد خان کے بقول پنجاب کی انتظامیہ فوجی افسروں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے استبدادی تھی۔ پنجاب نان ریگولیٹڈ علاقہ تھا اس لئے اس صوبہ کے ضلعی، ڈویژنل اور صوبائی حکام کسی قاعدہ وقانون کے پابند نہیں تھے۔ بالفاظ دیگر پنجاب میں ایک طرح کی فوجی آمریت قائم تھی اور کراچی کے ہندو اور مسلمان سرمایہ دار اپنے مفادات اس آمریت کی تحویل میں دینا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے لئے بمبئی کا ریگولیٹڈ علاقہ اچھا تھا جہاں کے حکام کے اختیارات محدود تھے اور جہاں کے کاروباری سرمایہ داروں کے ساتھ ان کے ہر طرح کے روابط تھے۔

مسلمان جاگیرداروں کی بے حسی ......صرف حروں نے بغاوت کی

1843ء میں سر چارلس نیپیئر کے قبضہ کے بعد سندھ میں کبھی کوئی بڑے پیمانے کی بدامنی نہیں ہوئی تھی۔ ابتداً سندھ اور بلوچستان کی سرحد کے نزدیک کچھ بلوچ قبائل نے سرکشی کی تھی مگر دو ایک سال میں انہیں امن پسندی پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ پھر 1857ء میں کراچی، حیدرآباد اور شکار پور کی چھاؤنیوں میں ہندوستانی فوج کے تھوڑے سے حصہ نے بغاوت کی تھی مگر اسے بھی بآسانی کچل دیا گیا تھا۔ اس کے بعد تیس پینتیس سال تک علاقے کی انتظامیہ کو امن وامان میں خلل کا کوئی بڑا مسئلہ درپیش نہ ہوا۔ اس دوران 200 ایکڑ سے زیادہ رقبہ کے مالک 7620 مسلمان بھنگ پیتے رہے، تقریباً 20 لاکھ بے زمین مسلم ہاری انتہائی مفلوک الحالی کی چکی میں پستے رہے اور تقریباً پانچ ہزار ہندو ساہوکار چھوٹے بڑے مسلمان مالکان اراضی کی مکمل معاشی بربادی کا بندوبست کرتے رہے۔

ایٹکن (Aitken) کے بیان کے مطابق انیسویں صدی کے اواخر تک سندھ میں پیشہ ور مجرموں کا کوئی وجود نہیں تھا۔ صرف حروں کا ایک قبیلہ تھا جو وقتاً فوقتاً تشدد کی کاروائیاں کرتا رہتا تھا۔ اس قبیلہ کے ارکان روہڑی کے نزدیک ایک گاؤں کے ایک پیر حزب اللہ کے مرید تھے۔ پیر حزب اللہ اپنا شجرۂ نسب ایک مذہبی بزرگ سید شاہ علی کے ساتھ ملاتا تھا جو 711ء میں محمد بن قاسم کے ساتھ آیا تھا۔ اس پیر کے خلاف دو مرتبہ قتل کا مقدمہ چلا تھا مگر دونوں ہی مرتبہ بری ہو گیا تھا۔ ایک مقدمہ میں اس پر الزام یہ تھا کہ اس نے اپنے بھتیجے فضل اللہ شاہ کو قتل کروایا تھا، کیونکہ عوام الناس اس کی بزرگی کے زیادہ قائل تھے اور وہ اس کے دربار میں زیادہ نذرانے پیش کرتے تھے۔ اس مقدمہ کی بنا پر حزب اللہ کے ایک عقیدت مند کو پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔ ایک شخص بنام وریام پیر حزب اللہ کا خلیفہ تھا۔ اس میں بہت تنظیمی صلاحیت تھی اس لئے اس نے ہزاروں حروں کے دل و دماغ میں پیر کے لئے بے پناہ عقیدت کا جذبہ پیدا کر رکھا تھا۔

1870ء میں حروں کے اس گروہ کا انگریزوں کی انتظامیہ کے ساتھ اس بنا پر تصادم ہوا تھا کہ وریام کا ایک دوست دریا خان پیر کے ایک خلیفہ کو قتل کرنے کے بعد گرفتار ہوا اور پھر پولیس کی تحویل سے فرار ہو کر پیشہ ور ڈاکو بن گیا تھا اور وریام اسے پناہ دیتا تھا۔ 1888ء میں پیر کے ایک اور خلیفہ کا قتل ہوا تو پولیس نے اس سلسلے میں وریام، اس کے بیٹے اور اس کے ایک ساتھی کی تلاش شروع کردی۔ اس پر وریام اور اس کے عقیدت مندوں نے ڈاکہ زنی، قتل و غارت اور لوٹ مار کی وارداتوں کا سلسلہ وسیع پیمانے پر شروع کر دیا۔

حروں کی بغاوت 1896ء تک جاری رہی جس کے دوران محکمہ پولیس اور دوسرے سرکاری محکموں کے متعدد اہل کار قتل ہوئے۔ کچھ عرصے کے لئے اس گروہ کا اس قدر دبدبہ طاری ہو گیا تھا کہ متعدد زمیندار اور ہندو بنیے اپنے جان و مال کی حفاظت کے لئے اسے ٹیکس دیتے تھے۔ جب فوج اور پولیس کی کاروائیوں کے باوجود حروں کی گوریلا سرگرمیوں کا سد باب نہ ہو سکا تو انتظامیہ نے پیر حزب اللہ جس کا 1890ء میں انتقال ہو گیا تھا، کے بیٹے پیر علی گوہر کو یہ ترغیب دی کہ وہ اپنے عقیدت مندوں کو جرائم کے ارتکاب سے منع کرے۔ چنانچہ پیر نے ایک جلسہ میں مریدوں کو یہ تلقین کی تو حروں میں پھوٹ پڑ گئی۔ انتظامیہ نے اس پھوٹ سے فائدہ اٹھایا اور اپریل میں باغی حروں کے سرغنہ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا اور وریام کے بیٹے باچو نے نومبر

1896ءکواپنے ساتھیوں سمیت ہتھیارڈال دیئے۔اسی سال دسمبر میں کراچی میں طاعون کی بیماری شروع ہوئی جس نے بہت جلد پورے سندھ میں ایک وبا کی صورت اختیار کرلی۔سرکاری اعدادوشمار کے مطابق اس وبا سے کل 6420افرادمتاثر ہوئے جن میں سے 4829لقمۂ اجل ہو گئے۔

سندھی مسلمانوں کی سیاسی، معاشی اور تعلیمی پسماندگی

بیسویں صدی کا آغاز ہواتو برصغیر کے، بیشتر حصوں میں کچھ سیاسی ہلچل پیدا ہوگئی تھی۔ انڈین نیشنل کانگرس میں، جو 1885ء میں وائسرائے ڈفرن کی تحریک پر وفادار ہندوستانی سرمایہ داروں کی جماعت کی حیثیت سے قائم ہوئی تھی، اب ہندوقوم پرستی کا عنصر غالب آرہا تھا۔بمبئی پریذیڈنسی کے ایک مرہٹہ لیڈر بال گنگادھرتلک نے 1889ء میں ایک ہفت روزہ ''مرہٹہ'' جاری کیا تھا جس کے ذریعے اس نے ہندوؤں کی بالادستی کے لئے احیائی تحریک چلائی تھی اور پھر اس تحریک ہی کی مدد سے جلد ہی انڈین نیشنل کانگرس پر غلبہ حاصل کرلیا تھا۔سیواجی اس کا پیرومرشد تھا اور وہ مہاراشٹر کی مقبول عام گناپتی دیوی کے نام پر انگریزوں کے خلاف پرتشدد تحریک کا علمبردار تھا۔ جبکہ سر سید احمد خان مسلمانان ہند کو اعتدال پسندی اور انگریزوں کا وفادار رہنے کی تلقین کرتا تھا۔ 1892ء میں انڈین کونسلز ایکٹ کے تحت 1861ء کے ایکٹ میں اس طرح ترمیم کی گئی تھی کہ مرکزی اور صوبائی لیجسلیٹو کونسلوں میں ہندوستانی نمائندوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ 1897ء میں بال گنگادھرتلک کو اشتعال انگیز تقریروں اور تحریروں کی بنا پر 18 ماہ کی سزائے قید ہوئی تو اس کی شہرت پورے برصغیر میں پھیل گئی۔ دوسری طرف سر سید احمد خان نے اپنی یہ کوشش تیز تر کردی کہ مسلمان، ہندو سرمایہ داروں کی انڈین نیشنل کانگرس سے علیحدہ رہیں۔ اسے خطرہ تھا کہ اگر مسلمانوں نے سامراج دشمنی کے جذبہ کے تحت انگریزوں کے خلاف کسی ایجی ٹیشن میں حصہ لیا تو ان کا حال پھر ویسا ہی ہوگا جیسا کہ 1857ء میں ہوا تھا۔ وہ شب و روز مسلمانوں کو جدید تعلیم حاصل کرنے کی تلقین کرتا تھا تا کہ ان کی معاشی، معاشرتی اور ثقافتی پسماندگی دور ہو سکے۔

مگر سندھ کے تقریباً سات ہزار مسلم جاگیردار اور زمیندار ان دونوں تحریکوں سے بےتعلق تھے۔ بھنگ، افیون اور بدکرداری نے انہیں کسی کام کا نہیں چھوڑا تھا اور ان کی اس بےحسی و جہالت کے باعث تقریباً 20لاکھ ہاریوں کو تو دین و دنیا میں سے کسی ایک کے بارے

میں بھی کچھ پتہ نہیں تھا۔ان ہاریوں کی زندگی غلامی کی زندگی تھی۔وہ خانہ بدوش تھےاورتہذیب وتمدن کے ابتدائی مراحل سے بھی نا آشنا تھے۔انہیں معلوم نہیں تھا کہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی حقوق کا کیا مطلب ہوتا ہے۔

1901ء میں انگریز انتظامیہ نے وادیٔ نارا کے ہر تعلقہ کے چار منتخب دیہات میں ہاریوں کے حالات کے بارے میں انکوائری کروائی تھی جس سے یہ پتہ چلا کہ 1774 ہاریوں میں سے 366 اپنے زمینداروں کے مقروض تھے اور 1157 نے ہندو بنیوں سے قرض لیا ہوا تھا۔ انتظامیہ کا خیال یہ تھا کہ سندھ کے دوسرے علاقوں میں مقروض ہاریوں کا تناسب اس سے بھی زیادہ تھا۔[11] بنیوں کے سود کی شرح 18 فیصد اور 36 فیصد تھی۔بعض ضرورت مندوں کو اس سے بھی زیادہ شرح پر سود دینا پڑتا تھا اور دیوانی عدالتیں اس شرح سود کی اجازت دیتی تھیں۔[12] چونکہ یہ ہاری ایسی خانہ بدوشی اور غلامی کی زندگی بسر کرتے تھے جیسی کہ ان کے آباؤ اجداد قرون وسطیٰ میں بسر کیا کرتے تھے اور چونکہ زمینداروں اور بنیوں کے نہایت ظالمانہ استحصال کے باعث ان کی معاشی حالت انتہائی خراب تھی اس لئے ان میں جدید تعلیم کے فروغ اور سیاسی شعور کے ارتقا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

1901ء کی مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق سندھ میں 751252 ہندوؤں میں خواندہ افراد کا تناسب 9.3 فیصد تھا۔جبکہ 2446489 مسلمانوں میں خواندگی کا تناسب اعشاریہ ایک فیصد تھا۔[13] غالباً سندھی مسلمانوں میں خواندگی کا یہ تناسب بھی پنجاب، افغانستان اور سرحد کے تقریباً 50 ہزار مسلم آبادکاروں کی وجہ سے تھا۔گویا سندھی مسلمان تقریباً سو فیصد ان پڑھ تھے۔مسلم زمینداروں کو کوئی تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی اور ہاریوں کو تو یہ پتہ ہی نہیں تھا کہ ''تعلیم'' کس جانور کا نام ہے۔

جب 1905ء میں بنگال کی تقسیم کے خلاف ہندوؤں نے بال گنگا دھر تلک کی زیر قیادت پر تشدد تحریک شروع کی تو دسمبر 1906ء میں وائسرائے لارڈ منٹو (Minto) کی تحریک پر مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔1907ء میں سر سید احمد خان کی قائم کردہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس کراچی میں منعقد ہوا۔

1909ء میں تیسرا انڈین کونسل ایکٹ منظور ہوا تو اس کے دو سال بعد یعنی 1911ء

میں انگریزوں نے سندھی مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کی طرف بھی توجہ کی اور ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ سندھ میں مسلمانوں کے تعلیمی مسئلہ کا جائزہ لے مگر اس کمیشن کے جائزہ کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا کیونکہ سندھ کے کمشنر کو مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ کچھ ایسے آمرانہ طریقے سے حکومت کرتا تھا کہ ہندوؤں کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقے بھی اس سے نالاں تھے۔

نومبر 1911ء میں طرابلس پر اٹلی کے حملے سے خلافت عثمانیہ کا زوال شروع ہونے اور دسمبر 1911ء میں بنگال کی تقسیم کے فیصلے کے منسوخ کئے جانے کے بعد برطانوی سامراج کے بارے میں برصغیر کے مسلم عوام کے سیاسی رویے میں نمایاں تبدیلی آئی۔ انہیں محسوس ہوا کہ اب برطانوی راج کے ساتھ وفاداری ان کے کام نہیں آسکے گی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر ہندو مرہٹہ لیڈر بال گنگا دھر تلک کی زیر قیادت پرتشدد سودیشی تحریک کے ذریعے بنگال کی تقسیم کا فیصلہ منسوخ کروا سکتے ہیں تو مسلمان بھی انگریزوں کی انتظامیہ کے ساتھ محاذ آرائی کر کے ہندوستان کی سیاست میں اپنا جائز مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ مسلم عوام میں یہ احساس اس قدر شدید تھا کہ مسلم جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی، جماعت مسلم لیگ کو بھی جنوری 1913ء کے سالانہ اجلاس میں ہندوستان کے لئے سیلف گورنمنٹ کا مطالبہ کرنا پڑا۔ مگر سندھ کے میروں، پیروں، جاگیرداروں اور دوسرے وڈیروں پر برصغیر کے مسلمانوں میں پیدا شدہ اس سیاسی ہیجان کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ انکی بھاری اکثریت بدستور بھنگ پیتی رہی۔

1913ء میں کراچی میں آل انڈیا کانگرس کا سالانہ اجلاس ہوا تو استقبالیہ کمیٹی کے صدر سردار ہرچند رائے بشن داس نے اپنی تقریر میں پہلی مرتبہ یہ مطالبہ کیا تھا کہ سندھ کو بمبئی سے الگ کر دیا جائے۔ اس کا یہ مطالبہ کراچی کی سندھ سبھا کے 1888ء کے اس مؤقف کے برعکس تھا کہ اگر سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کیا گیا تو یہ ایک غیر دانش مندانہ کاروائی ہوگی۔ اس 25 سال کے عرصے میں کراچی کے ہندو سرمایہ داروں کا اس سلسلے میں رویہ بنیادی طور پر تبدیل ہونے کی وجہ شاید اُن کی اس رائے میں پنہاں تھی کہ اگر متحدہ بنگال کے ہندو اقلیت میں ہونے کے باوجود وہاں کے ہر شعبۂ زندگی میں اپنی بالادستی رکھ سکتے ہیں اور اگر پنجاب کے ہندو اقلیت میں ہونے کے باوجود وہاں کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی میدانوں میں اپنا غلبہ قائم کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ

سندھ کے ہندو ایسا نہیں کر سکیں گے۔

سندھ کے مسلمان ہر لحاظ سے برصغیر کے پسماندہ ترین لوگوں میں سے تھے۔ ایسی پسماندہ اکثریت پر ہر لحاظ سے ترقی یافتہ اقلیت کا غلبہ قائم ہونا کوئی مشکل نہیں تھا۔ گزشتہ پچیس تیس سالوں میں 200 ایکڑ سے زیادہ رقبہ کے مالک ہندو زمینداروں کی تعداد دو ہزار کے لگ بھگ ہوگئی تھی اور مسلم میروں، پیروں، جاگیرداروں، وڈیروں اور ہاریوں کی بہت بڑی تعداد ہندو ساہوکاروں کی مقروض تھی اور تجارت و سرکاری انتظامیہ پر بھی ہندوؤں کی اجارہ داری تھی جبکہ سندھ کی سرکاری آمدنی دس سال میں 111 لاکھ روپے سے بڑھ کر 210 لاکھ روپے ہوگئی تھی۔ گویا سیاسی، معاشی اور انتظامی لحاظ سے سندھ ہندو ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کی زیر قیادت ایک الگ صوبہ بن سکتا تھا اور ولیم ہنٹر کے بقول یہاں کی مسلم اکثریت کی حیثیت مرہٹہ برہمنوں کی رعایا کی سی ہو سکتی تھی۔

بمبئی سے علیحدگی کے مسئلے پر مسلمان وڈیروں کی بے حسی

اگست 1914ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہونے کے بعد جب برطانیہ، روس اور فرانس کے ہاتھوں سلطنت عثمانیہ کے پرخچے اڑنے لگے تو ہندوستان کے مسلمانوں میں برطانوی سامراج کے خلاف جذبات اس قدر برانگیختہ ہوئے کہ سندھ کے میروں، پیروں، جاگیرداروں اور زمینداروں کے طبقہ کا ایک حصہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک سندھ کے متعدد مسلم نوجوان، سندھ مدرسہ اور علی گڑھ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد سیاست میں کچھ دلچسپی لینے لگے تھے لیکن انہوں نے اس زمانے میں بھی سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کا کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا جبکہ کراچی کے ہندو سرمایہ دار وقتاً فوقتاً اس نوعیت کا مطالبہ کرتے رہے تھے۔

جب اگست 1915ء میں اٹلی کی جانب سے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کے بعد عثمانیہ سلطنت کے زوال کی رفتار اور بھی تیز ہوگئی تو مسلمانان ہند کے غم وغصہ کی کوئی حد نہ رہی۔ چنانچہ انڈین نیشنل کانگرس کی قیادت نے ہندی مسلمانوں کے اس جذبۂ پان اسلام ازم سے فائدہ اٹھا کر برطانیہ کے خلاف ہندوؤں اور مسلمانوں کا متحدہ محاذ بنانے کا فیصلہ کیا اور اس فیصلے کے تحت دسمبر 1915ء میں بمبئی میں مسلم لیگ اور کانگرس کا مشترکہ سالانہ اجلاس ہوا۔ جس میں اعتدال

پسند سناتنی ہندو لیڈر موہن داس کرم چند گاندھی نے بھی شرکت کی۔ اس نے ایک سال قبل دسمبر 1914ء میں جنوبی افریقہ سے واپس ہندوستان آ کر یہاں کی کانگرس کی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اگر چہ اس زمانے میں اس تنظیم پر انتہا پسند احیائی مرہٹہ لیڈر بال گنگا دھر تلک کا غلبہ تھا۔ پھر دسمبر 1916ء میں ہندو مسلم اتحاد کے اسی جذبے کے تحت لکھنؤ میں آل انڈیا کانگرس اور آل انڈیا مسلم لیگ کا مشترکہ سالانہ اجلاس ہوا جس کے دوران محمد علی جناح کی تحریک پر ان دونوں جماعتوں کے درمیان ہندوستان کے آئینی اور سیاسی مستقبل کے بارے میں ایک معاہدہ ہوا مگر اس معاہدہ کی شرائط میں سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کی تجویز شامل نہیں تھی۔ تاہم 1917ء کے اواخر میں سلطنت عثمانیہ کا شیرازہ بکھرنے کے بعد جب وزیر ہند مانٹیگو اور وائسرائے چیمسفورڈ ہندوستان کے آئینی مستقبل کے بارے میں سندھی عمائدین کی رائے معلوم کرنے کے لئے کراچی آئے تو سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی سندھ برانچ نے یہ مطالبہ کیا کہ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک الگ صوبہ بنا دینا چاہیے مگر جب 1918ء میں ان دونوں نے اپنی رپورٹ لکھی تو اس میں اس مطالبہ کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ وہ سندھ کو بمبئی کے ساتھ ملحق رکھنے کے ہی حق میں تھے اور بظاہر سندھ کے میروں، پیروں اور جاگیرداروں کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ ان میں سے کسی ایک نے بھی اس کے خلاف احتجاج نہیں کیا تھا۔ بعض سندھی وڈیرے بمبئی کی بورژوا زندگی کی چمک دمک سے بہت متاثر تھے اور انہوں نے روشنیوں کے اس شہر میں اپنی پرلطف رہائش کے لئے عالیشان بنگلے بھی خرید لئے ہوئے تھے۔

تحریکِ خلافت اور سندھی مسلمانوں میں پہلی سیاسی لہر

11 نومبر 1918ء کو اتحادیوں کی فتح کے رسمی اعلان کے تقریباً ایک ماہ بعد دسمبر 1918ء میں دہلی میں مولوی فضل الحق کی زیر صدارت آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا تو اس میں کثیر تعداد میں علماء نے بھی شرکت کی اور وہیں مولانا محمود الحسن کی زیر قیادت جمعیت العلمائے ہند کے قیام کا فیصلہ ہوا۔ مولوی فضل الحق نے اپنی صدارتی تقریر میں ہندوستان کے سارے فرقوں سے اپیل کی تھی کہ وہ خلافت عثمانیہ کے تحفظ کے لئے مسلمانان ہند کی حمایت کریں۔ ان دنوں، بال گنگا دھر تلک برطانیہ کے ارباب اقتدار اور عوام کو انڈین ہوم رول لیگ کے

سوراجی مؤقف سے آگاہ کرنے کے لئے لندن گیا ہوا تھا اور اس کی عدم موجودگی میں موہن داس کرم چند گاندھی ''تحفظ خلافت'' کے پلیٹ فارم پر ''ہندو مسلم اتحاد'' کا نعرہ بلند کر کے اپنی لیڈری چمکانے کے منصوبے بنا رہا تھا۔

1919ء میں پان اسلام ازم کے علمبردار علماء نے علی برادران کی زیر قیادت برصغیر کے مختلف علاقوں میں خلافت کانفرنسیں منعقد کیں۔ ان کی ایک کانفرنس فروری 1919ء میں لاڑکانہ میں بھی ہوئی جس سے جی۔ ایم۔ سید سمیت بہت سے سندھی مسلم نوجوان متاثر ہوئے اور اس طرح سندھی مسلمانوں میں پہلی مرتبہ سیاست کی ایک لہر پیدا ہوئی۔ مارچ میں جی۔ ایم۔ سید کی تحریک پر سن میں ایک خلافت کانفرنس ہوئی جس کی صدارت مولوی فتح محمد سہوانی نے کی۔ اپریل 1919ء میں جنرل ڈائر (Dyer) کے ہاتھوں امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں سینکڑوں نہتے عوام کا قتل عظیم ہوا اور پھر جون میں افغانستان کے ساتھ انگریزوں کی تیسری لڑائی شروع ہوئی تو سندھ کی سیاست میں مزید ہلچل پیدا ہوئی۔ ستمبر 1919ء میں آل انڈیا خلافت کمیٹی کا قیام عمل میں آیا تو سندھی مسلمانوں کو سیاست میں کچھ اور بھی دلچسپی پیدا ہوئی اور عبداللہ ہارون خلافت کمیٹی کی سندھ برانچ کا صدر منتخب ہوا۔

اسی مہینے میں برطانیہ کے وزیر خارجہ ارل گرے (Grey) نے اعلان کیا تھا کہ ''جرمنی کے ساتھ انصاف ہو گیا ہے۔ اب ترکی کے ساتھ اس سے بھی زیادہ سخت انصاف ہوگا۔'' اس کے بیان کا مطلب یہ تھا کہ جرمنی کو تو شکست ہو گئی اور سلطنت عثمانیہ کا بھی شیرازہ بکھر گیا ہے۔ اب ترکی کے بھی حصے بخرے کئے جائیں گے اور اس ملک کا وجود ہی دنیا کے نقشے سے مٹ جائے گا۔ برطانوی وزیر خارجہ کے اس اعلان کے پیش نظر 23 رنومبر کو دہلی میں مولوی فضل الحق کی زیر صدارت دوسری آل انڈیا خلافت کانفرنس ہوئی جس میں گاندھی کے علاوہ موتی لال نہرو، مدن موہن مالویہ اور کئی دوسرے ہندو لیڈروں نے بھی شرکت کی۔ اس کانفرنس میں ایک قرارداد کے ذریعے مسلمانان ہند سے اپیل کی گئی تھی کہ جنگ عظیم میں انگریزوں کی فتح کے جشن میں شریک نہ ہوں، برطانوی مال کا بائیکاٹ کریں اور حکومت سے کسی معاملے میں بھی تعاون نہ کریں۔ سندھ سے سیٹھ عبداللہ ہارون نے اس کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ اس کانفرنس کے دو دن بعد جمعیت العلمائے ہند کے رسمی طور پر قیام کا اعلان کیا گیا۔ مفتی کفایت اللہ اور مولوی احمد سعید

علی الترتیب صدر اور سیکرٹری منتخب ہوئے۔ دسمبر 1919ء کے آخری ہفتے میں امرتسر میں آل انڈیا کانگرس، آل انڈیا مسلم لیگ، آل انڈیا خلافت کمیٹی اور جمعیت العلمائے ہند کے اجلاس ہوئے۔ ان جلسوں سے چند دن پہلے مانٹیگو۔چیمسفورڈ (Montagu-Chelmesford) کی سفارشات کے مطابق نئی آئینی اصلاحات کا اعلان ہو چکا تھا مگر مسلمانوں کے اسلام پسند قائدین کے لئے ان اصلاحات میں کوئی دلکشی نہیں تھی۔ ان کا اولین مسئلہ یہ تھا کہ خلافت عثمانیہ کا تحفظ کس طرح کیا جائے۔ مولانا محمد علی جوہر کی تقریر یہ تھی کہ ''خدا کے برگزیدہ نبی ﷺ نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کو جزیرۂ عرب سے نکال باہر کر دو۔ اس حکم کی تعمیل ہم پر فرض ہے۔ بیت المقدس جسے مسلمانوں نے اپنا خون بہا کر فتح کیا تھا اور جس پر اب تک خلیفۃ المسلمین کا اقتدار تھا ہم اس پر اغیار کا قبضہ ہرگز نہیں رہنے دیں گے۔'' تاہم کانگرس کی قرارداد یہ تھی کہ ''عوام ان اصلاحات پر اس طرح عمل کریں گے کہ ملک میں مکمل طور پر ذمہ دار حکومت قائم ہو جائے۔'' اس قرارداد پر بحث کے دوران کسی مسلمان لیڈر نے اس امر پر احتجاج نہیں کیا تھا کہ ان اصلاحات کے تحت سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے اسے الگ صوبہ کا درجہ نہیں دیا گیا۔

20رجنوری 1920ء کو دہلی میں خلافت کمیٹی کی میٹنگ ہوئی جس میں گاندھی، تلک اور بعض دوسرے ہندو لیڈروں نے مسئلۂ خلافت کے بارے میں مسلمانوں کے مؤقف کی تائید کی۔ اس میٹنگ کے بعد مختلف شہروں میں خلافت کانفرنسیں ہوئیں اور 10رمارچ کو موہن داس کرم چند گاندھی نے عالم اسلام کی خلافت کے تحفظ کے لئے اپنے عدم تعاون کے پروگرام کا اعلان کیا۔ 14رمئی کو اتحادی طاقتوں اور سلطان ترکی کے درمیان معاہدہ سیورے (Sevre) پر دستخط ہوئے تو معلوم ہوا کہ برطانیہ کے وزیر خارجہ نے ستمبر 1919ء میں ترکی سے ''سخت انصاف'' کرنے کا جو اعلان کیا تھا یہ معاہدہ اس کے مطابق تھا۔ یعنی ترکی کے حصے بخرے کر کے اسے مختلف ممالک میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ یہ معاہدہ خلافت کمیٹی کے لیڈروں پر بجلی کی طرح گرا۔ چنانچہ انہوں نے گاندھی کی تجویز کے مطابق 28مئی سے عدم تعاون کی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔

ستمبر 1920ء میں ناگپور میں کانگرس کا خصوصی اجلاس ہوا جس میں خلافت کمیٹی کے فیصلے کی تائید ہو گئی۔ اس اجلاس کے بعد جمعیت العلمائے ہند نے ایک فتویٰ جاری کیا جس میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ مسلمانوں کو انتخابات، سکولوں، کالجوں اور عدالتوں کا بائیکاٹ کرنا

چاہیے اور خطابات ترک کر دینے چاہئیں۔ اس فتوے پر تقریباً ایک ہزار علماء نے دستخط کئے تھے۔ نومبر میں الہ آباد میں خلافت کمیٹی کا اجلاس ہوا تو اس میں بھی ایک فتویٰ کے ذریعے مسلمانوں کے لئے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا گیا اور انہیں ہدایت کی گئی کہ وہ یہاں سے ہجرت کر جائیں۔ کانگرسی لیڈروں اور کوتاہ اندیش مولویوں کی تحفظ خلافت کے نام پر اس سیاست کا سب سے زیادہ حیرت انگیز پہلو یہ تھا کہ اس کا سب سے زیادہ اثر سندھ کے مسلمانوں پر ہوا۔ چنانچہ اس علاقے کے ادنیٰ اور درمیانہ طبقہ کے ہزاروں مسلمان اپنا سب کچھ اونے پونے بیچ باچ کر افغانستان کی طرف روانہ ہو گئے لیکن جب حکومت افغانستان نے شمع خلافت کے ان پروانوں کو اپنے ملک کی حدود میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی تو ان کی بہت بری حالت ہوئی۔ کئی ہزار فاقہ کشی اور مختلف امراض میں مبتلا ہو کر راستے ہی میں جاں بحق ہو گئے لیکن اس کے باوجود بہت سے سندھی مسلمانوں نے 21-1920ء میں تحریک عدم تعاون میں حصہ لیا اور جیلوں میں گئے۔

جولائی 1921ء میں کراچی میں مولانا محمد علی جوہر کی زیر صدارت خلافت کانفرنس ہوئی جس میں چھ قراردادیں منظور کی گئیں۔ ایک قرارداد یہ تھی کہ ''مسلمانوں کے لئے برطانوی فوج میں نوکری کرنا مذہباً حرام ہے۔ تمام مسلمانوں اور خصوصاً علماء کا فرض ہے کہ یہ بات فوج میں ہر مسلمان تک پہنچا دی جائے۔'' اس کانفرنس کا سندھ کے مسلمانوں پر بہت اثر ہوا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش سے تحریک خلافت میں حصہ لینے لگے۔ مگر جب اگست 1921ء میں جنوبی ہندوستان میں مسلمان موپلوں نے اس تحریک کے زیر اثر برطانوی سامراج اور ہندو زمینداروں و ساہوکاروں کے خلاف بغاوت کر دی تو برصغیر کی سیاست کا رخ ہی بدل گیا۔ ہندو مسلم اتحاد نے یکا یک معاندانہ فرقہ وارانہ تضاد کی صورت اختیار کر لی اور ہندو مسلم فسادات کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ سندھ کے سیاسی لحاظ سے نہایت پسماندہ مسلمان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

1925ء میں پہلی بار مسلم لیگ نے سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرنے کا مطالبہ کیا

تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد دسمبر 1925ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا علی گڑھ میں سالانہ اجلاس ہوا تو اس میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں کہا گیا تھا کہ ''چونکہ نسلی ''جغرافیائی یا کسی اور لحاظ سے سندھ کے بمبئی پریذیڈنسی میں شامل رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے اور

چونکہ ماضی کے تجربہ سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ سندھ کی بمبئی پریذیڈنسی میں شمولیت سندھی عوام کے مفادات اور ہندوستان کے اس علاقے کی ترقی کے لئے انتہائی نقصان دہ ہے اس لئے آل انڈیا مسلم لیگ کی رائے میں سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے ایک الگ صوبہ بنا دینا چاہیے۔'' یہ قرارداد پونا کے مولوی رفیع الدین احمد نے پیش کی تھی اور فیروز پور کے گل محمد خان نے اس کی تائید کی تھی۔ یہ قرارداد اس لحاظ سے بہت اہمیت کی حامل تھی کہ اس کی منظوری کے بعد سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کا مطالبہ مسلمانوں کی کل ہند سیاست کا جزو بن گیا۔ 1925ء سے قبل مسلمانوں کی کسی بڑی سیاسی جماعت نے کبھی سندھ کو صوبائی درجہ دینے کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ مئی 1924ء میں لاہور میں محمد علی جناح کی زیر صدارت مسلم لیگ کا جو خصوصی اجلاس ہوا تھا اس میں صوبہ سرحد کے لئے تو صوبائی درجہ کا مطالبہ کیا گیا تھا لیکن سندھ کے لئے اس قسم کا مطالبہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی اور پھر دسمبر 1924ء میں مسلم لیگ کا بمبئی میں جو سالانہ اجلاس ہوا تھا اس میں بھی سندھی مسلمانوں کے لئے علیحدہ سیاسی حقوق کا کوئی ذکر نہیں ہوا تھا۔ پھر جنوری 1925ء میں گاندھی کی تحریک پر دہلی میں جو آل پارٹیز کانفرنس ہوئی تھی اس میں بھی سندھ کا مسئلہ زیر بحث نہیں آیا تھا۔

اگرچہ دسمبر 1926ء میں دہلی میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں سال گزشتہ کی متذکرہ قرارداد کا اعادہ نہیں کیا گیا تھا لیکن مارچ 1927ء میں محمد علی جناح نے مرکزی اسمبلی کے بجٹ سیشن کے دوران ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے تقریباً 30 مسلمان لیڈروں کی جو ''آل پارٹیز مسلم کانفرنس'' بلائی تھی اس کے پانچ نکاتی فارمولے میں پہلا نکتہ یہ تھا کہ سندھ کو صوبہ بمبئی سے علیحدہ کر کے ایک الگ صوبہ بنا دیا جائے۔ اس کانفرنس نے جناح کی تجویز کے مطابق یہ اعلان کیا تھا کہ اگر مسلمانان ہند کے حقوق و مفادات کے بارے میں اس کی تین چار شرائط منظور کر لی جائیں تو مسلمان مخلوط طریقۂ انتخاب قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔

15 رمئی 1927ء کو آل انڈیا کانگرس کی مجلس عاملہ نے بمبئی میں ان شرائط پر غور کر کے یہ فیصلہ کیا کہ موتی لال نہرو کی سربراہی میں ایک کمیٹی ''تجاویز دہلی'' کی روشنی میں آئندہ کے لئے ہندوستان کے آئین کا مسودہ تیار کرے گی۔ اس کمیٹی کی رپورٹ اگست 1928ء میں شائع کر دی گئی اور پھر 22 دسمبر 1928ء کو آل پارٹیز کنونشن میں غور کیا گیا۔ اس رپورٹ میں جناح کی مارچ 1927ء کی آل پارٹیز کانفرنس کی شرائط کو نظر انداز کر کے پورے ہندوستان کے لئے وحدانی طرز

حکومت کی سفارش کی گئی تھی اور سندھ کے مستقبل کے بارے میں یہ کہا گیا تھا کہ ''اس علاقے کو علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے بشرطیکہ تحقیق سے یہ ثابت ہو جائے کہ (1) مالی لحاظ سے سندھ اپنے اخراجات میں خود کفیل ہو جائے گا۔ (2) اگر صوبہ مالی لحاظ سے خود کفیل نہ ہو تو یہ تجویز بمع مالی مشکلات عوام کے سامنے پیش کی جائے۔ اگر سندھ کی اکثریت علیحدہ صوبہ بنانے اور اس کا خرچ برداشت کرنے کے لئے تیار ہو تو سندھ کو علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے۔ (3) اگر سندھ کو علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے تو سندھ کی حکومت کا ڈھانچہ دوسرے صوبوں کی حکومتوں جیسا ہوگا۔ سندھ کی غیر مسلم اقلیتوں کو مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں نمائندگی کے لئے وہی مراعات حاصل ہونگی جو ہندو اکثریتی صوبوں میں مسلمان اقلیت کو دی جائیں گی......سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کی بنا پر وہاں کے ہندو بیوپاریوں کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ سندھ کے ہندو تجارت میں اپنی جرأت مندی اور خطر پسندی کے لئے مشہور ہیں۔ جب تک ان میں یہ جذبہ رہے گا اس وقت تک ان کے مستقبل کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ انہیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ مجوزہ آئینی ڈھانچے کے تحت صوبوں کے اختیارات محدود ہوں گے اور سارے اہم محکمے مرکزی حکومت کے پاس ہوں گے۔'' نہرو کمیٹی کی رپورٹ میں سندھ کے بارے میں اس اگر مگر کا مطلب یہ تھا کہ مہاراشٹر اور گجرات کے ہندو سرمایہ دار اس علاقے سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں تھے۔ ان دنوں سکھر کے نزدیک دریائے سندھ پر بیراج کی تعمیر ہو رہی تھی اور ہر ایک کو معلوم تھا کہ آبپاشی کے اس منصوبے کی تکمیل کے بعد سندھ کی معیشت میں بہت ترقی ہوگی۔ احمد آباد اور بمبئی میں ہندو اور پارسی کارخانہ داروں کو اس علاقے سے کپاس کی سخت ضرورت تھی لہٰذا وہ اس پر اپنی سیاسی بالادستی برقرار رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔

مزید برآں خود سندھ میں بھی سر شاہنواز بھٹو جیسے جاگیرداروں کا ایک ایسا عنصر موجود تھا جو سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کے خلاف تھا۔ انہیں بمبئی کے اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں اور بالا خانوں کی رنگین، چمکدار اور چھنکتی ہوئی زندگی بہت پسند تھی چنانچہ 1928ء کے اوائل میں سائمن کمیشن کے ساتھ کام کرنے کے لئے بمبئی کی صوبائی اسمبلی نے سر شاہنواز بھٹو کی سربراہی میں جو کمیٹی مقرر کی تھی اس نے سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کی سفارش نہیں کی تھی۔ اس کمیٹی کے صرف دو مسلم ارکان سید میران محمد شاہ اور غلام حسین ہدایت اللہ نے اپنے اختلافی نوٹ میں سندھ کو الگ صوبہ بنانے کا

مطالبہ کیا تھا جبکہ پنجاب اسمبلی کی کمیٹی کی اکثریتی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے۔ بھٹو کمیٹی کے روبرو سندھ محمڈن ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک وفد نے سندھ کی علیحدگی کے حق میں مدلل کیس پیش کیا تھا۔ اس وفد کے ممتاز ارکان میں خان بہادر ایوب کھوڑو اور حسن آفندی مرحوم کا بیٹا خان بہادر ولی محمد علی شامل تھے۔ خان بہادر کھوڑو نے اس زمانے میں علیحدگی کے مطالبہ کی تکمیل کے لئے بڑی سرگرمی سے کام کیا تھا۔ اس نے اس مقصد کے لئے ایک پمفلٹ بھی لکھا تھا جس میں ساہوکاروں کے ہاتھوں سندھی مسلمانوں کے مصائب کی تفصیل بیان کی گئی تھی۔ اس نے ان دنوں اس سلسلے میں سیٹھ عبداللہ ہارون اور جی۔ایم سید کے ہمراہ صدر مسلم لیگ محمد علی جناح سے بھی ملاقات کی تھی۔

جب کلکتہ میں آل پارٹیز کنونشن میں جناح کی پرزور مخالفت کے باوجود نہرو کمیٹی کی رپورٹ منظور کر لی گئی تو اس کے دو ایک دن بعد دہلی میں سر آغا خان کی زیر صدارت آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ یہ اجلاس پنجاب کے سر فضل حسین کی تحریک پر منعقد کیا گیا تھا اور اس میں برصغیر کے مسلم جاگیرداروں، تعلقہ داروں اور سرمایہ داروں کے علاوہ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا حسرت موہانی نے بھی شرکت کی تھی۔ اس اجلاس میں مسلمانوں کے چودہ مطالبات پر مشتمل ایک طویل قرارداد منظور کی گئی تھی جس کا پہلا مطالبہ یہ تھا کہ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک علیحدہ صوبہ بنایا جائے۔ پھر مارچ 1929ء میں دہلی میں محمد علی جناح کی زیر صدارت متحدہ مسلم لیگ کا اجلاس ہوا۔ اس میں جناح نے آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے متذکرہ ان چودہ مطالبات کو ایک قرارداد کی صورت میں اپنا لیا جس میں سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کا مطالبہ سرفہرست تھا۔ یہ قرارداد بعد میں ''جناح کے چودہ نکات'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

گول میز کانفرنس اور سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کی منظوری

نومبر 1930ء میں سائمن کمیشن کی رپورٹ کی بنا پر لندن میں گول میز کانفرنس شروع ہوئی تو سندھ کے مسئلہ پر غور کرنے والی سب کمیٹی کے روبرو سر غلام حسین ہدایت اللہ اور محمد علی جناح نے سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کے حق میں پرزور دلائل دیئے۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ نے کہا کہ ''یہ حقیقت سب تسلیم کرتے ہیں کہ سندھ نسلی، جغرافیائی اور لسانی لحاظ سے الگ صوبہ ہے اور

اس علاقے کے لوگوں کی ثقافت اور معاشرت بمبئی کے لوگوں سے بالکل مختلف ہے۔اس کے مالیہ اور آبپاشی کے نظام بھی بمبئی سے مختلف ہیں۔ یہ محض تاریخ کا ایک اتفاق تھا کہ 1843ء میں جس فوج نے سندھ پر قبضہ کیا تھا وہ بمبئی سے آئی تھی اس لئے اس علاقے کو بمبئی سے ملحق کر دیا گیا۔اس زمانے میں پنجاب کا برطانوی ہندوستان کے ساتھ الحاق نہیں ہوا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو شاید سندھ پنجاب کے ساتھ ملحق کر دیا جاتا جس کے عوام کے رسم ورواج ،انداز زندگی اور مالیہ وآبپاشی کے نظام تقریباً ویسے ہی ہیں جیسے کہ سندھ کے ہیں۔ انہی وجوہ کی بنا پر میں بمبئی کمیٹی کے ان دو ارکان میں سے تھا جنہوں نے سندھ کے علیحدگی کے مسئلہ پر اکثریت سے اختلاف کیا تھا۔اس نے کہا کہ ہندو سندھ کی علیحدگی کی محض اس لئے مخالفت کرتے ہیں کہ انہیں اپنے مفادات کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔آج کل سندھ کی انتظامیہ پر ہندوؤں کی اجارہ داری ہے۔ان کی تعداد تقریباً 25 ہزار ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر سندھ بمبئی سے علیحدہ ہو گیا تو انکی ملازمتیں خطرے میں پڑ جائیں گی۔ان کے اس خدشہ کی بنیاد غلط فہمی پر ہے۔ جب سندھ کو صوبہ کا درجہ ملے گا اور اس کی صوبائی حکومت میں سرکاری ملازمین کی بھرتی پبلک سروس کمیشن کے ذریعے ہوگی اور کمیشن سے مذہب کی وجہ سے خویش پروری کی توقع نہیں کی جاسکتی۔آج سندھ میں چھوٹے بڑے ہندو ملازمین بہت رشوت خور ہیں۔ وہ زمینداروں کو خوب لوٹتے ہیں۔حتیٰ کہ میری زمینوں کا منشی بھی ہندو سرکاری ملازمین کو رشوت دیتا ہے۔ان میں سے ایسے بھی ہیں جن کی تنخواہیں پچیس تیس روپے سے زیادہ نہیں لیکن ان کے بچے انگلستان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔'' سر غلام حسین ہدایت اللہ نے کہا'' سندھ میں ہندوؤں کی تعداد بہت تھوڑی نہیں ہے۔سندھی آبادی میں ان کا تناسب تقریباً 25 فیصد ہے۔ان کی معاشی قوت بہت زیادہ ہے۔ ہر مسلمان ان کا مقروض ہے۔ یہ 25 فیصد ہندو سندھ کی 40 فیصد اراضی کے مالک ہیں اور مزید 30 فیصد اراضی ان کے پاس رہن ہے۔اس طرح صرف 30 فیصد اراضی مسلم اکثریت کے پاس رہ جاتی ہے۔''

محمد علی جناح نے سر غلام حسین ہدایت اللہ کے اس مؤقف کی پر زور تائید کی۔ انہوں نے کہا کہ ''جہاں تک مجھے یاد ہے سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کا مطالبہ سب سے پہلے ہندوؤں نے ہی کیا تھا۔ان کا خیال یہ تھا کہ سندھ کی حیثیت بمبئی پریذیڈنسی کی راکھ کی سی ہے اور وہ اپنے علاقے کی اس حیثیت کے خلاف احتجاج کرتے تھے۔ سندھ کے کانگرسی ہندو لیڈر ہر چند رائے نے

انڈین نیشنل کانگرس کی قرارداد میں یہ بات بار بار کہی تھی۔''

''چنتا منی (رکن سب کمیٹی): کہاں؟

''جناح: نیشنل کانگرس میں۔

''چنتا منی: سندھ پر قرارداد منظور ہوئی تھی؟

''سر شاہنواز بھٹو: ہاں۔ کراچی میں 1913ء میں۔

''جناح: میں اس زمانے کی بات کر رہا ہوں جب کہ ہر چند رائے نے کراچی میں قرارداد پیش کی تھی لیکن اب میں اس سے آگے بڑھ کر اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہوں کہ جب انڈین نیشنل کانگرس کا آئین مرتب ہو رہا تھا اور سندھ کے نمائندوں کا اصرار تھا کہ کانگرس کے آئین میں سندھ کو ایک آزاد اور الگ صوبہ قرار دیا جائے اور اسے بمبئ پریذیڈنسی کا ایک جزو تصور نہ کیا جائے اور اگر آپ اب بھی کانگرس کے آئین پر نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس میں سندھ کو ایک الگ صوبہ تسلیم کیا گیا ہے۔''

سر شاہنواز بھٹو نے کہا کہ ''سندھ میں زراعت پیشہ آبادی کی حالت بہت ہی خراب ہے۔ وہ دن میں ایک مرتبہ سوکھی ہوئی جوار کی روٹی کھاتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کا علاج معالجہ بھی نہیں کرا سکتے۔ حتیٰ کہ اگر ان کا کوئی عزیز مر جائے تو اس کے لئے کفن بھی مہیا نہیں کر سکتے۔ زمیندار بالکل بھکاری بن گئے ہیں۔ ان کی زمینیں ان کے ہاتھ سے نکلی جا رہی ہیں۔ وہ سرکاری مالیہ ادا نہیں کر سکتے۔ انکی جائیداد کی کوئی قیمت نہیں رہی۔ وہ اتنے تعلیم یافتہ نہیں ہیں کہ سرکاری ملازمتیں اختیار کر لیں۔ ان کے پاس پیسہ نہیں ہے کہ جس سے تجارت کر سکیں۔ لہٰذا انہیں متوقع آفت سے بچانے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ انہیں ان کی اپنی حکومت دے دی جائے۔''

سر شاہنواز بھٹو نے اس کے بعد جیکب آباد سندھ مسلم کانفرنس کی ایک قرارداد سب کمیٹی کے روبرو پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ سندھ کو غیر مشروط طور پر بمبئ سے علیحدہ کر دیا جائے۔ سندھی عوام کے لئے کوئی اور آئینی انتظام قابل قبول نہیں ہوگا۔''

سب کمیٹی کے ہندو ارکان ڈاکٹر مونجے اور راجہ نریندر ناتھ نے مسلمان زعما کے اس موقف کی پر زور مخالفت کی اور اس امر کی نشاندہی کی کہ سندھ مالی لحاظ سے خود کفیل نہیں ہوگا۔ وہاں کی ہندو آبادی اب بھی زیادہ ٹیکس ادا کرتی ہے اور سندھ کی علیحدگی کی صورت میں اس پر

ٹیکسوں کا بوجھ اور بھی بڑھ جائے گا۔

تاہم سب کمیٹی نے 16 رجنوری 1931ء کو اپنی رپورٹ میں کثرت رائے سے یہ تجویز منظور کی کہ "چونکہ سندھ کے عوام نسلی اور لسانی لحاظ سے بمبئی کے لوگوں سے مختلف ہیں اور یہ علاقہ جغرافیائی لحاظ سے بھی بمبئی سے الگ ہے اس لئے اسے الگ صوبے کا درجہ دے دینا چاہیے۔ سندھ صوبہ بمبئی سے الگ ہونے کے بعد مالی لحاظ سے خود کفیل ہوگا یا نہیں؟ اس بارے میں ابھی تک تفصیلی جائزہ نہیں لیا گیا۔ اگر تحقیقات سے یہ ظاہر ہو کہ نیا صوبہ مالی لحاظ سے خسارے کا صوبہ ہوگا تو سندھ کے الگ ہونے سے پہلے وہاں کے نمائندوں سے پوچھنا چاہیے کہ وہ اطمینان بخش طریقے سے ظاہر کریں کہ وہ خسارے کو کس طرح پورا کریں گے۔"[14]

دوسری گول میز کانفرنس 7 رستمبر 1931ء سے یکم دسمبر 1931ء تک ہوئی جس میں کانگرس کی طرف سے گاندھی نے بھی شرکت کی۔ اس کانفرنس کے خاتمہ پر برطانیہ کے وزیراعظم ریمزے میکڈانلڈ نے اپنی تقریر میں برصغیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیڈروں سے اپیل کی کہ وہ فرقہ وارانہ تنازعات کا کوئی تصفیہ کر لیں۔ اس نے کہا کہ اگر مناسب مدت کے اندر ہندوستانی لیڈروں نے باہمی بات چیت کے ذریعے فرقہ وارانہ تنازعہ کا تصفیہ نہ کیا تو حکومت برطانیہ اس سلسلے میں ازخود کوئی فیصلہ صادر کر دے گی۔ گاندھی نے اس کانفرنس سے واپسی پر اپنی سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی اور اسے اس بنا پر پھر گرفتار کر لیا گیا۔ چنانچہ تقریباً آٹھ ماہ بعد اگست 1932ء میں حکومت برطانیہ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے سیاسی تنازعہ کے بارے میں اپنا ایوارڈ صادر کر دیا۔ جس کے تحت سندھ کو بمبئی سے الگ صوبہ قرار دیا گیا لیکن شرط یہ تھی کہ اس علاقے کی 71 فیصد مسلم آبادی کو صوبائی اسمبلی میں ساٹھ فیصد نشستیں ملیں گی اور ہندوؤں کی 27 فیصد آبادی کو 40 فیصد نشستیں حاصل ہوں گی۔

تیسری گول میز کانفرنس 17 رنومبر 1932ء کو شروع ہوئی اور 24 ردسمبر 1932ء کو ختم ہو گئی۔ اس آخری کانفرنس کے بعد ہندوستان کے آئندہ کے آئینی ڈھانچے کے بارے میں حکومت برطانیہ کے قرطاس ابیض پر غور کرنے کے لئے برطانیہ کی ساری پارلیمانی پارٹیوں کی ایک مشترکہ کمیٹی مقرر کی گئی جس کے روبرو سندھی مسلمانوں کا مؤقف صرف خان بہادر محمد ایوب کھوڑو نے پیش کیا۔

سندھ کے مسلمان لیڈروں کی جانب سے اس زمانے میں اپنے علاقے کی بمبئی سے علیحدگی کے مطالبہ کی معاشی وجوہ میں سے ایک اہم وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک سکھر بیراج کی تعمیر مکمل ہو چکی تھی۔ اس پر 20 کروڑ روپے خرچ ہوئے تھے۔ بمبئی کے گورنر لائیڈ جارج (Lloyed George) نے 13 رجنوری 1932ء کو اس کا افتتاح کیا تھا اور اس سے جون 1932ء میں آبپاشی شروع ہو گئی تھی۔ اس بیراج کا نہری نظام دریائے سندھ کے دائیں کنارے کی چار نہروں اور بائیں کنارے کی تین نہروں پر مشتمل تھا اور اس طرح سکھر، لاڑکانہ، دادو، نصیر آباد (بلوچستان) تھرپارکر، حیدرآباد اور خیرپور میں دریائے سندھ سے سیراب ہونے والا رقبہ 3286000 ایکڑ سے بڑھ کر 4142000 ایکڑ ہو گیا تھا۔ لہٰذا سر غلام حسین ہدایت اللہ، خان بہادر محمد ایوب کھوڑو، جی۔ ایم۔ سید، شیخ عبدالمجید سندھی اور سندھ کے دوسرے مسلمان لیڈروں کو بجا طور پر یہ خدشہ تھا کہ اگر آئندہ انہیں اپنے علاقے پر سیاسی بالادستی حاصل نہ ہوئی تو سکھر بیراج کے بیشتر معاشی فوائد ہندو ساہوکار، ہندو زمیندار اور ہندو کاروباری سرمایہ دار حاصل کر لیں گے۔ ان کے لئے حکومت برطانیہ کا اگست 1932ء کا کمیونل ایوارڈ بھی غیر تسلی بخش تھا کیونکہ انہیں احساس تھا کہ 60 ارکان کی صوبائی اسمبلی میں 24 غیر مسلم ارکان کو سیاسی قوت کا توازن حاصل ہو گا اور ان کے تعاون کے بغیر کوئی وزارت مستحکم نہیں ہو گی۔ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ چونکہ سندھی ہندوؤں کی معاشی قوت بہت زیادہ ہے، سرکاری انتظامیہ پر ان کی اجارہ داری ہے اور تعلیمی شعبے میں بھی وہ بہت ترقی یافتہ ہیں اس لئے وہ بآسانی چند مسلم ارکان کو خرید کر صوبہ میں اپنی کٹھ پتلی حکومت بنا لیں گے۔ گویا مسلمان لیڈروں کو سندھ میں مسلم اکثریت کا سیاسی مستقبل پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریت سے بہتر نظر نہیں آتا تھا۔ ان دونوں بڑے صوبوں کی اسمبلیوں میں بھی قوت کا توازن غیر مسلموں کے ہاتھوں میں ہی تھا اور ان میں بھی ہندوؤں کی حمایت کے بغیر کوئی وزارت مستحکم نہیں ہو سکتی تھی۔

باب: 3

نئے صوبہ سندھ میں مسلم جاگیردارانہ سیاست اور ہندو۔مسلم تضاد

37ء کے انتخابات اور غلام حسین ہدایت اللہ وزارت

1930-32ء کی گول میز کانفرنس کی سفارشات کے مطابق ہندوستان کے لئے مرتب کردہ آئینی بل نے برطانوی پارلیمنٹ کے دونوں ایونوں میں ضروری مراحل طے کر کے اگست 1935ء میں قانون کی صورت اختیار کی جس کے تحت سندھ کو علیحدہ صوبہ قرار دیا جا چکا تھا تو ہندوستان میں عام انتخابات کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ان دنوں فرقہ وارانہ کشیدگی بھی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور برصغیر کے دوسرے شہروں میں آئے دن ہندو مسلم فسادات ہوتے تھے۔ لاہور میں مسجد شہید گنج کی تحریک کی وجہ سے فرقہ وارانہ فضا بہت ہی دھماکہ خیز تھی۔ ہر روز شہر کے کسی نہ کسی علاقے میں چھرا گھونپنے کی وارداتیں ہوتی تھیں۔

اس بل کی منظوری سے قبل محمد علی جناح، جنہوں نے 1930ء کے بعد لندن میں رہائش اختیار کر لی تھی، 1934ء کے اوائل میں واپس آ کر مسلم لیگ کے مستقل صدر منتخب ہو چکے تھے اور پھر وہ اکتوبر 1934ء میں 1919ء کے ایکٹ کے تحت بمبئی کے مسلم علاقے سے مرکزی اسمبلی کے بلا مقابلہ رکن بھی منتخب ہو چکے تھے۔ اس انتخاب کے موقع پر وہ لندن میں تھے جہاں سے انہوں نے جنوری 1935ء میں واپس آ کر برصغیر کی سیاست میں پھر سرگرمی سے حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اپریل 1935ء میں وہ پھر لندن گئے جہاں سے وہ اکتوبر 1935ء میں مستقل طور پر ہندوستان واپس آ گئے۔ ان کا پروگرام یہ تھا کہ وہ 1935ء کے ایکٹ کے تحت ہونے والے عام

انتخابات میں آل انڈیا مسلم لیگ کی قیادت کریں گے اور پھر صوبوں میں کانگرس اور مسلم لیگ کی مخلوط وزارتیں بنوا کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پائیدار اتحاد قائم کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے اسی پروگرام کے تحت پہلے تو مسلم لیگ کا ایک انتخابی منشور شائع کروایا جس کا معاشی پروگرام کانگرس کے معاشی پروگرام سے مختلف نہیں تھا اور اس کے سیاسی پروگرام میں یہ عندیہ دیا گیا تھا کہ مسلم لیگ عام انتخابات کے بعد کانگرس کے ساتھ 1916ء کے معاہدۂ لکھنؤ کی قسم کا سمجھوتہ کرنے پر آمادہ ہوگی اور پھر انہوں نے برصغیر کی ساری مسلمان جماعتوں کا متحدہ محاذ بنانے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لئے جناح نے مختلف صوبوں کے دورے بھی کئے مگر پنجاب، سندھ، سرحد اور یو۔ پی کے تعلقہ داروں، جاگیرداروں، زمینداروں اور وڈیروں نے اس سلسلے میں ان سے تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔

سندھ میں سر غلام حسین ہدایت اللہ، سر شاہنواز بھٹو اور سیٹھ عبد اللہ ہارون نے 23/جولائی 1936ء کو پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کی طرز پر غیر فرقہ وارانہ سندھ یونائیٹڈ پارٹی بنالی اور جناح سے کہہ دیا کہ وہ سندھ کے معاملات میں مداخلت نہ کریں۔ اکتوبر 1936ء میں سندھ یونائیٹڈ پارٹی کا کنونشن ہوا تو سر غلام حسین ہدایت اللہ کا عہدوں کی تقسیم کے مسئلہ پر سیٹھ عبد اللہ ہارون سے اختلاف ہو گیا اور اس نے خان بہادر محمد ایوب کھوڑو اور میر بندے علی تالپور کے ساتھ مل کر سندھ مسلم پارٹی بنالی۔ جب 1937ء کے اوائل میں عام انتخابات ہوئے تو مسلم اکثریت کے اس حصے میں مسلم لیگ کا کوئی ایک امیدوار بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ سندھ یونائیٹڈ پارٹی کا سر شاہنواز بھٹو بھی لاڑکانہ کے حلقہ سے شکست کھا گیا۔ صوبائی اسمبلی میں پارٹی پوزیشن اس طرح تھی:

سندھ یونائیٹڈ پارٹی (مسلم)	=	18
سندھ ہندو سبھا	=	11
انڈی پینڈنٹ مسلم	=	9
کانگرس	=	8
سندھ مسلم پارٹی	=	4
سندھ آزاد پارٹی (کانگرس نواز)	=	3
انڈی پینڈنٹ ہندو	=	2
لیبر انڈی پینڈنٹ	=	1

آزاد	=	4
کل	=	60

اگر چہ اسمبلی کی اس پارٹی پوزیشن میں سر غلام حسین ہدایت اللہ کی پارٹی کے ارکان کی تعداد صرف چار تھی تاہم اس نے ہندو ارکان اسمبلی کی حمایت حاصل کر کے اپریل 1937ء میں اپنی تین رکنی وزارت بنالی۔ اس نے اپنی اس وزارت سازی کے لئے ہندوؤں کو ایک وزارت اور سپیکری دی تھی۔ سندھ یونائیٹڈ پارٹی اپنی غیر فرقہ واریت کے باوجود خالصتاً مسلم پارٹی تھی کیونکہ اس کے ٹکٹ پر کوئی ایک بھی غیر مسلم امیدوار کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اس پارٹی کو اسمبلی میں خان بہادر اللہ بخش کی زیر قیادت اپوزیشن کی بنچوں پر بیٹھنا پڑا حالانکہ یہ ارکان کی تعداد کے لحاظ سے باقی سب پارٹیوں اور گروہوں سے بڑی پارٹی تھی۔ سندھ کے پہلے گورنر سر لینس لوٹ گراہم (Lancelot Graham) نے اس پارٹی کو وزارت سازی کی دعوت محض اس لئے نہیں دی تھی کہ اس میں نہ صرف جی۔ ایم۔ سید اور ہاشم گزدر جیسے درمیانہ طبقے کے ارکان شامل تھے بلکہ اس میں ایسا عنصر بھی موجود تھا جس کا رجحان کانگرس کے ''ترقی پسند حلقوں'' کی جانب تھا۔ ان کے مقابلے میں سر غلام حسین ہدایت اللہ اور اس کے ساتھی پنجاب کے سر سکندر حیات اور اس کے ساتھیوں کی طرح زیادہ قابل اعتماد تھے اور سندھ یونائیٹڈ پارٹی کا میروں کا گروپ بھی سر غلام حسین سے مل گیا تھا۔

27 اپریل کو صوبائی اسمبلی کا پہلا سیشن شروع ہوا تو ہزاروں بے زمین ہاریوں نے اسمبلی کے سامنے مظاہرہ کر کے حقوق کا مطالبہ کیا۔ یہ مظاہرہ ہاری کمیٹی نے کروایا تھا جو 1930ء میں عالمی معاشی بحران کے دوران قائم ہوئی تھی اور جس نے گزشتہ سات سال میں ہاریوں کی فلاح و بہبود اور تنظیم کے لئے خاصا کام کیا تھا۔ برطانوی سامراج کی طرف سے 1935ء میں سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے اسے صوبائی درجہ دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ 30-1929ء کے عالمی معاشی بحران کے وقت برصغیر کے دوسرے علاقوں کی طرح سندھ میں بھی بائیں بازو کی طبقاتی سیاست نے جنم لے لیا تھا اور برطانیہ چاہتا تھا کہ اس خطرناک سیاست کے سدباب کے لئے سندھ کے مسلمان اور ہندو زمینداروں کو بورژوا پارلیمانی جمہوریت کے پرچم تلے مجتمع اور منظم کیا جائے۔

چونکہ سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت کا انحصار سراسر انڈیپینڈنٹ ہندو پارٹی پر تھا

اور اپوزیشن میں سندھ یونائیٹڈ پارٹی اور کانگرس کا زبردست بلاک تھا۔ اس لئے اس نے تقریباً دو ماہ بعد اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لئے سندھ یونائیٹڈ پارٹی کے ساتھ ایک پروگرام کی بنیاد پر اتحاد کر لیا۔ اس پروگرام کے مطابق (1) زرعی اراضی کو چراگاہی فیس سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ (2) جنگلات میں چراگاہوں کی فیس میں کمی کی گئی۔ (3) یہ فیصلہ کیا گیا کہ تقاوی قرضوں کی وصولی آسان اقساط میں ہوگی۔ بعض قرضوں پر سود میں کمی کی جائے گی اور بعض دوسرے قرضوں کو سود سے مستثنیٰ کر دیا جائے گا۔ (4) کمشنروں اور کلکٹروں کے کرسی پروانے منسوخ کر دیئے جائیں گے۔ اور (5) لوکل باڈیز میں نامزدگی کا طریقہ ختم کر دیا جائے گا لیکن چند ماہ بعد جب اس کی کابینہ کے ایک رکن مکھی گوبند رام نے استعفےٰ دے دیا تو سر غلام حسین نے ہندو پارٹی کی مرضی کے خلاف ڈاکٹر ہیمند اس ایڈوانی کو اپنی کابینہ میں شامل کر لیا اور پھر تھوڑی دیر بعد جب اسمبلی کے سپیکر بھوج سنگھ کی وفات ہوئی تو اس نے اس کی جگہ ایک مسلمان رکن اسمبلی سید میران محمد شاہ کو منتخب کرا لیا۔ اس پر اس کے حامی ہندو ارکان اسمبلی بہت برہم ہوئے اور وہ اپوزیشن میں کانگرس کے ساتھ جا ملے۔

جی۔ ایم۔ سید کے بیان کے مطابق اس زمانے میں ہندوؤں کے سر غلام حسین کی حکومت کے خلاف ہونے کی ایک وجہ ان کے ان خدشات میں بھی پنہاں تھی کہ (1) اسمبلی کی مسلم اکثریت قرضہ مصالحتی بل پاس کر کے ہندوؤں کو تقریباً دو کروڑ روپے کا نقصان پہنچائے گی۔ (2) ہاشم گز در کا انتقال اراضی کا بل منظور کر لیا جائے گا اور اس طرح ہندو سندھ میں زمین خریدنے کے حق سے محروم ہو جائیں گے۔ [1]

ہندو ارکان اسمبلی نے اپنے مفاد کے تحفظ کی خاطر وزارت تبدیل کرادی۔۔۔۔۔۔ اللہ بخش وزارت

اس صورتحال میں جب سندھ یونائیٹڈ پارٹی نے یہ دیکھا کہ سر غلام حسین کی حکومت کا انحصار اب سراسر اس پر رہ گیا ہے تو اس نے اپنی حمایت کی قیمت تین وزارتوں کی صورت میں طلب کی۔ اس کا مطالبہ یہ تھا کہ خان بہادر اللہ بخش، خان بہادر محمد ایوب کھوڑو اور نچل داس وزیرانی کو کابینہ میں شامل کیا جائے مگر وہ صرف دو نئے وزیروں کو لینے کے لئے تیار تھا۔ خان بہادر کھوڑو اس

کے لئے قابل قبول نہیں تھا۔ چنانچہ اس بنا پر سندھ یونائیٹڈ پارٹی اور سر غلام حسین کی سندھ مسلم پارٹی کا اتحاد ٹوٹ گیا اور نتیجتاً مارچ 1938ء میں جب اسمبلی کا بجٹ سیشن شروع ہوا تو اس پارٹی نے جی۔ایم۔سید کی وساطت سے کانگرس پارٹی اور انڈی پینڈنٹ ہندو پارٹی کے ساتھ خفیہ گٹھ جوڑ کر کے سر غلام حسین کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا اور اس کی جگہ خان بہادر اللہ بخش نے کانگرس پارٹی اور انڈی پینڈنٹ ہندو پارٹی کی حمایت سے وزارت بنالی۔اس وزارت کو 36 مسلم ارکان اسمبلی میں سے صرف سات کی حمایت حاصل تھی جن میں جی۔ایم۔سید کے علاوہ پیر الٰہی بخش اور علی محمد راشدی بھی شامل تھے۔

گویا نئے صوبہ سندھ کی ایک سالہ پارلیمانی سیاست کا تجربہ یہ تھا کہ ہندو ارکان اسمبلی اپنی پارٹی وابستگیوں کا لحاظ کئے بغیر ایسا مسلمان وزیر اعلیٰ چاہتے تھے جس کی حکومت کا انحصار سراسر ان کی حمایت پر ہو یعنی جسے مسلم ارکان کی اکثریت کی حمایت حاصل نہ ہو اور وہ اپنے ہندو حامیوں کی مرضی کے مطابق حکومت چلائے۔سندھ میں اس ایک سال کے تجربے سے یہ بھی ظاہر ہوا تھا کہ انڈین نیشنل کانگرس کا غیر فرقہ واریت کا نعرہ محض ایک فریب تھا۔سندھ اسمبلی کے کانگرسی ہندو ارکان فرقہ پرست انڈی پینڈنٹ ہندو پارٹی کے ساتھ مل کر خان بہادر اللہ بخش کی وزارت کے محض اس لئے حامی بن گئے تھے کہ سر غلام حسین کی وزارت دو ایک ایسے قوانین منظور کرنے کا ارادہ رکھتی تھی جو ہندو ساہوکاروں کے مفادات کے منافی تھے۔جی۔ایم۔سید ان دنوں کانگرس پارٹی کا ممبر تھا۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ ''سندھ میں کانگرس اسمبلی پارٹی کے ہندو سچی قوم پرستی کے جذبے کے تحت کام نہیں کرتے تھے بلکہ وہ ہندو ساہوکاروں اور سیٹھوں کے مفادات کے تحفظ کے کام میں انڈی پینڈنٹ ہندو پارٹی کے ارکان پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔''[2]

کانگرسی ہندوؤں کا یہ رویہ صرف سندھ تک ہی محدود نہیں تھا۔ بلکہ پورے برصغیر میں کانگرسی ہندو لیڈروں کی بھاری اکثریت کے اسی قسم کے فرقہ پرستانہ رویے نے 38-1937ء میں ہندو مسلم تضاد میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ بورژوا ہندو لیڈر نظریاتی طور پر تو فرقہ وارانہ قوم پرستی کے علمبردار بنتے تھے لیکن عملی طور پر نہایت تنگ نظر فرقہ پرستی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ 1937ء کے عام انتخابات کے بعد صدر مسلم لیگ محمد علی جناح نے بہت کوشش کی کہ صوبوں میں مخلوط وزارتوں کی تشکیل کے اصول کی بنیاد پر کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان کوئی سمجھوتہ ہو جائے

مگر کانگرسی ہندولیڈروں کی فرقہ پرستی ان کی اس کوشش کی کامیابی کے راستے میں حائل رہی اور کانگرسی قیادت نے ہر جگہ دو چار مسلمان پٹھوؤں کو ساتھ ملا کر عملاً ہندو راج قائم کر لیا۔ جیسا کہ عاشق حسین بٹالوی نے بتایا ہے کہ کانگرس نے 1937ء کے انتخابات کے بعد ''یو۔ پی میں حافظ ابراہیم اور رفیع احمد قدوائی، بمبئی میں یٰسین نوری، مدراس میں سیٹھ یعقوب حسن، بہار میں سید محمود اور سی۔ پی میں یوسف شریف کو محض اس لئے وزارت میں جگہ دی تھی کہ وہ مسلمان تھے لیکن یہ مسلمان قوم کی نمائندگی نہیں کرتے تھے۔ یو۔ پی کی مجلس قانون ساز کے مسلمان ممبروں کی تعداد 66 تھی جن میں سے 64 حافظ ابراہیم اور رفیع احمد قدوائی کو اپنا نمائندہ تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے۔ بمبئی اسمبلی میں مسلمان کل 30 تھے جن میں سے 29 کو یٰسین نوری پر قطعاً کوئی اعتماد نہیں تھا۔ اسی طرح بہار اور صوبجات متوسط کی مجالس قانون ساز میں علی الترتیب مسلمان 40 اور 14 تھے لیکن بہار کے 36 اور صوبجات متوسط کے 13 ممبر سید محمود اور یوسف شریف کو اپنا اپنا نمائندہ تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے پھر بھی کانگرس نے ان نام نہاد مسلمانوں کو اس قوم کا نمائندہ سمجھ کر اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔''[3] سندھ میں خان بہادر اللہ بخش کو 36 مسلم ارکان اسمبلی میں سے صرف سات کی حمایت حاصل تھی مگر کانگرس پارٹی محض فرقہ پرستی کے جذبہ کے تحت اس کی حمایت کرتی تھی۔

لیکن 1938ء کے وسط تک برصغیر کے ہندو اکثریتی صوبوں میں کانگرس حکومتوں کی فرقہ پرستی اور سندھ کے مسلم اکثریتی صوبہ میں کانگرس کی موقع پرستی اور مفاہمت کے باعث پورے برصغیر کے مسلم عوام ہندو راج کے تصور سے اس قدر خوفزدہ اور مشتعل ہو چکے ہوئے تھے کہ سندھ کے ہر طبقہ کے مسلمان اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ خان بہادر اللہ بخش کی وزارت کو ہندوؤں کی کٹھ پتلی وزارت تصور کرتے تھے اور جو سات مسلم ارکان اسمبلی اس وزارت کی حمایت کرتے تھے ان کو وہ قومی غدار قرار دیتے تھے۔ جی۔ ایم۔ سید ان دنوں سندھی مسلمانوں میں پیدا شدہ جذبات کا اعتراف کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ جب خان بہادر اللہ بخش کی وزارت کی تشکیل کے بعد اس نے پیر الٰہی بخش اور پیر علی محمد راشدی کے ہمراہ رابطہ عوام کی مہم شروع کی تھی تو کراچی کے خالق دینا ہال میں مسلم حاضرین نے ان کی تقریریں سننے سے انکار کر دیا تھا۔[4]

سندھ کی مسلم رائے عامہ کا دباؤ اتنا زیادہ تھا کہ خان بہادر اللہ بخش کی وزارت کے حامی چھ سات مسلم ارکان کے گروہ میں بھی پھوٹ پڑ گئی۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ خان بہادر اللہ بخش

نے سندھ یونائیٹڈ پارٹی کے فیصلے کے خلاف مالیہ اراضی کی شرح میں اضافہ کر دیا تھا اور وہ اپنی کابینہ میں اس گروہ کے مزید مسلم ارکان کو شامل کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ جی۔ایم۔سید نے اس تنازعہ کے تصفیہ کے لئے اگست 1938ء میں پہلے سردار پٹیل اور پھر ابوالکلام آزاد کو کراچی بلایا مگر وہ اس تنازعہ کا تصفیہ نہ کرا سکے۔ البتہ انہوں نے اسمبلی میں کانگرس کے ہندو ارکان کو یہ ہدایت کی کہ وہ خان بہادر کی وزارت کی حمایت کرتے رہیں۔ یہ زمانہ وہ تھا جبکہ ہندوستان کے طول وعرض میں مسلمانان ہند کے سارے طبقے کانگرسی قیادت کی تنگ نظری، تنگ دلی اور فرقہ پرستی کے مظاہرے دیکھ کر بلبلا اٹھے تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح نے ہندو اکثریتی صوبوں میں کانگرسی حکومتوں کی فرقہ پرستی، گاندھی کی آمریت اور جواہر لال نہرو کی مسلم رابطۂ عوام کی مہم کے خلاف سخت ردعمل کا اظہار کیا تھا اور مارچ 1938ء میں مسلم لیگ کونسل نے کانگرسی صوبوں میں مسلم اقلیت کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کی تحقیقات کے لئے راجہ سید محمد مہدی آف پیرپور کی زیرصدارت ایک خصوصی کمیٹی بھی مقرر کر دی ہوئی تھی۔ اس صورتحال کے پیش نظر جی۔ایم۔سید اور اس کے ساتھی یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو گئے کہ ''آل انڈیا کانگرس اپنی کل ہند حکمت عملی کی خاطر سندھ کے عوام کے مفادات کو قربان کر رہی ہے اور سندھ کی کانگرس پارٹی عوام الناس کی فلاح کے لئے کوئی قانون سازی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے کیونکہ اس کی سیاسی قوت کا سرچشمہ ہندو رائے دہندگان کے مفاد پرست عناصر ہیں''[5] اور پھر انہوں نے طویل غور وفکر کے بعد یہ بھی محسوس کیا کہ ''مسلم دشمن اور عوام دشمن قوتوں کے سدباب کے لئے سندھ کے مسلمانوں کی فرقہ وارانہ بنیاد پر تنظیم ضروری ہے۔''[6]

سندھ صوبائی مسلم لیگ نے 1938ء میں مسلمانوں کے علیحدہ وطن کا مطالبہ کر دیا تھا

اسی زمانے میں جی۔ایم۔سید کے بعض دوستوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ سندھ میں مسلم لیگ کو منظم کیا جائے۔ چنانچہ 9/اکتوبر 1938ء کو کراچی میں مسلم لیگ کی پہلی صوبائی کانفرنس منعقد کی گئی اور سندھی مسلمانوں نے اس کانفرنس میں بے پناہ جوش وخروش کا مظاہرہ کیا۔ اس کا احوال بیان کرتے ہوئے جی۔ایم۔سید لکھتا ہے کہ ''صدر آل انڈیا مسلم لیگ محمد علی جناح کا

ایسا پرتپاک استقبال کیا گیا کہ سندھ آبزرور جیسے لیگ مخالف اخبار کو بھی لکھنا پڑا کہ اس پر شہزادے بھی رشک کریں گے۔"[7] علاوہ ازیں سر سکندر حیات، مولوی فضل الحق اور ہندوستان کے بہت سے دوسرے ممتاز مسلمان لیڈروں نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔

اس کانفرنس میں استقبالیہ کمیٹی کے صدر سر عبداللہ ہارون نے اپنی تقریر میں ہندو مسلم تنازعہ کے تصفیہ کے بارے میں مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "ہم علیحدگی کے بہت نزدیک پہنچ گئے ہیں۔ اگر اقلیتوں کے مسئلہ کو اطمینان بخش طریقے سے حل نہ کیا گیا تو کسی کے لئے بھی یہ ممکن نہیں رہے گا کہ وہ ہندوستان کو ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا کی الگ الگ فیڈریشنوں میں تقسیم ہونے سے بچا سکے۔" ہارون نے متنبہ کیا کہ "جب تک اکثریتی فرقہ اقلیتوں کی انفرادیت کو نیست و نابود کرنے کا عزم ترک نہیں کرے گا اس وقت تک ہندوستان میں کبھی متحدہ محاذ قائم نہیں ہو سکے گا۔ اگر اکثریتی فرقہ نے ہمارے مطالبات تسلیم نہ کئے تو ہندوستان میں بھی چیکوسلواکیہ جیسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں۔" سر عبداللہ ہارون کی اس تقریر کے بعد شیخ عبدالمجید سندھی نے یہ قرارداد پیش کی کہ "سندھ پراونشل مسلم لیگ کے خیال میں یہ قطعی طور پر ضروری ہے کہ وسیع و عریض ہندوستانی برعظیم میں پائیدار امن کے مفادات کی خاطر اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی دونوں قوموں کی بلا رکاوٹ ثقافتی ترقی، معاشی و معاشرتی فلاح و بہبود اور سیاسی خود اختیاری کے مفادات کی خاطر ہندوستان کو دو فیڈریشنوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک مسلم ریاستوں کی فیڈریشن ہو اور دوسری غیر مسلم ریاستوں کی فیڈریشن ہو۔ لہٰذا یہ کانفرنس آل انڈیا مسلم لیگ سے سفارش کرتی ہے کہ وہ ایک ایسی آئینی سکیم تیار کرے جس کے تحت مسلم اکثریتی صوبے، مسلم ریاستیں اور دوسرے علاقے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اپنی فیڈریشن کی صورت میں مکمل آزادی حاصل کر سکیں اور ہندوستان سے باہر کی کسی بھی دوسری مسلم ریاست کو اپنی فیڈریشن میں شامل کر سکیں۔ اس مسلم فیڈریشن میں غیر مسلم اقلیتوں کو ویسے ہی تحفظات دیئے جائیں گے جیسے کہ انڈیا کی غیر مسلم فیڈریشن میں مسلم اقلیت کو دیئے جائیں گے۔" لیکن کانفرنس میں یہ قرارداد منظور نہ کی گئی بلکہ اس کی بجائے جو قرارداد منظور کی گئی اس میں مسلم لیگ کونسل سے کہا گیا کہ "وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی دونوں قوموں کی سیاسی خود اختیاری کی خاطر ہندوستان کے آئندہ کے آئین کے مسئلہ پر اس مقصد کے تحت غور کرے کہ دونوں قوموں کو باعزت اور جائز حیثیت مل سکے اور ایک ایسی آئینی

سکیم تیار کرے جس کے تحت مسلمانوں کومکمل آزادی حاصل ہو سکے۔'' اس کانفرنس میں مسلم لیگ نے پہلی مرتبہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو الگ الگ قومیں قرار دے کر ان دونوں کے لئے حق خود اختیاری کا مطالبہ کیا تھا۔ بعد کے سالوں میں مسلم لیگی زعما برصغیر کی جغرافیائی تقسیم کی باتیں کرتے رہے لیکن وہ اس سوال کے بارے میں واضح نہیں تھے کہ آیا یہ تقسیم ایک ایسی مکمل علیحدگی کی صورت میں ہوگی کہ دونوں فیڈریشنوں میں کوئی چیز بھی مشترک نہیں ہوگی۔ ایسی شہادتیں موجود ہیں کہ ان کے سامنے کسی نہ کسی طرح کے مشترکہ مرکز کا امکان موجود تھا۔''[8]

شیخ عبدالمجید سندھی، جس نے دو فیڈریشنوں کے قیام کے بارے میں ابتدائی قرارداد پیش کی تھی، نے 1964ء میں روزنامہ جنگ کو بتایا تھا کہ اس کے ذہن میں ایک محدود مرکز کا امکان موجود تھا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ مرکز کے پاس امور خارجہ، دفاع، اقلیتوں کے تحفظات اور دونوں فیڈریشنوں کے درمیان تنازعات کے تصفیہ کے امور ہونے چاہئیں۔ نوابزادہ لیاقت علی خان نے بھی 25/مارچ 1939ء کو میرٹھ ڈویژنل مسلم لیگ کانفرنس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''جو سکیم بھی بالآخر منظور کی جائے اس کے تحت یہ قرار دینا ضروری ہوگا کہ اگر ہندو اور مسلمان پرامن طریقے سے اکٹھے نہیں رہ سکتے تو اس مقصد کے لئے انہیں اجازت دینی چاہیے کہ وہ ملک کو مناسب طریقے سے تقسیم کر لیں...... اگر ایسا ہو جائے تو ایک محدود اور خصوصی فیڈریشن کا قیام نہ صرف آسان ہوگا بلکہ موزوں ہوگا۔''[9]

کانفرنس میں حاضرین کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ جس دن یہ تاریخی قرارداد منظور ہوئی اسی دن یہ فیصلہ کیا گیا کہ سندھ اسمبلی کے سارے مسلم ارکان متحد ہو جائیں گے اور وہ متفقہ طور پر اپنا قائد منتخب کر کے صوبہ میں خالصتاً لیگ کی وزارت بنائیں گے۔ خان بہادر اللہ بخش تحریری طور پر اس فیصلہ سے اتفاق کر کے اس بات پر آمادہ ہو گیا تھا کہ وہ مسٹر جناح، سر سکندر حیات اور مولوی فضل الحق کی موجودگی میں اسمبلی کے سارے مسلم ارکان سے اتحاد کر لے گا مگر کانگرس اور ہندو گروپ نے سر توڑ کوشش کی کہ مسلم ارکان اسمبلی متحد نہ ہونے پائیں۔ چنانچہ خان بہادر اللہ بخش آخری وقت پر اپنے وعدے سے یہ کہہ کر پھر گیا کہ اس کے حامی اسمبلی کی بقیہ میعاد کے دوران وزارت اعلیٰ کی تبدیلی پر آمادہ نہیں ہیں۔[10]

صدر مسلم لیگ محمد علی جناح نے خان بہادر اللہ بخش کی اس قلابازی کے بارے

میں 13 / اکتوبر کو ایک بیان جاری کیا جس میں انہوں نے بتایا کہ ''سندھ اسمبلی میں لیگ پارٹی کے سارے مسلم ارکان کے اتحاد کے لئے 9 / اکتوبر کو جو تحریری معاہدہ ہوا تھا اس پر خان بہادر اللہ بخش، پیر الٰہی بخش، سر غلام حسین ہدایت اللہ، میر بندے علی تالپور، جی۔ایم۔سید اور عبد المجید سندھی نے دستخط کئے تھے۔'' 9 / اکتوبر کے اس معاہدے کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ ''خان بہادر اللہ بخش کی وزارت مستعفی ہو جائے گی۔ 12 / اکتوبر کو لیگ اسمبلی پارٹی متفقہ طور پر نئے قائد کا انتخاب کرے گی اور اس مسئلہ پر پارٹی میں اتفاق نہ ہوا تو مسٹر جناح نئے قائد کی نامزدگی کریں گے جو سب کو منظور ہوگی۔'' جب سندھ کانگرس پارٹی کو اس معاہدے کا علم ہوا تو اس کے اسمبلی بورڈ کے لیڈر نے بذریعہ تار سردار پٹیل سے یہ اجازت حاصل کر لی کہ دس کانگرسی ارکان اسمبلی صوبہ میں لیگ کی وزارت قائم ہونے کے خطرے کے پیش نظر اللہ بخش وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کے حق میں ووٹ نہیں دیں گے۔ کانگرس کی یہ تدبیر مؤثر ثابت ہوئی اور خان بہادر اللہ بخش جب 12 / اکتوبر کو مسلم ارکان اسمبلی کی میٹنگ میں آیا تو وہ اس تحریری معاہدے سے یہ کہہ کر منحرف ہو گیا کہ وہ لیگ اسمبلی پارٹی میں صرف اسی صورت میں شامل ہوگا کہ اسے پارٹی کا قائد منتخب ہونے کا پہلے سے یقین دلا دیا جائے گا۔ چونکہ یہ شرط مسلم لیگ ارکان کی اکثریت کے لئے قابل قبول نہیں تھی اس لئے اللہ بخش اپنے چھ سات حامیوں کے ہمراہ میٹنگ سے چلا گیا اور بعد میں 27 مسلم ارکان نے جناح کی موجودگی میں لیگ پارٹی کی تشکیل کی۔ اس کارروائی کے بعد لیگ پارٹی کے ارکان مسلم اتحاد کی خاطر خان بہادر اللہ بخش کی اس نامعقول شرط کو ماننے پر آمادہ ہو گئے اور انہوں نے سر عبداللہ ہارون کی وساطت سے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ اس پر خان بہادر نے کہا کہ وہ 13 / اکتوبر کو اس سلسلے میں اپنے فیصلے سے آگاہ کرے گا مگر اس نے اپنا یہ وعدہ بھی پورا نہ کیا حالانکہ جناح سارا دن اس کا انتظار کرتے رہے [11] اور اس طرح کانگرس کی قیادت سندھ میں بھی مسلم رائے عامہ کے خلاف اپنے ہتھکنڈوں میں کامیاب ہو گئی۔ جی۔ایم۔سید اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''اس طرح کانگرس کی پالیسی اور ہندو انڈی پینڈنٹ پارٹی کی تنگ نظری نے سندھ میں فرقہ وارانہ تلخی کے بیج بو دیئے۔ اس کے بعد ہندوؤں کے سارے اخبارات اور رائے عامہ کی توجہ مسلم لیگ کو کچلنے کی طرف مبذول رہی جس کے ذریعے سندھی مسلمان اپنے آپ کو منظم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔'' [12]

اللہ بخش وزارت......کانگرس کی کٹھ پتلی اور لیگ کی مخالف

خان بہادر اللہ بخش نے سندھ پراونشل لیگ کانفرنس کے فوراً بعد مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے 26 ارکان میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش شروع کر دی اور جلد ہی اس میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے انفرادی طور پر بعض مسلم لیگی ارکان کو وزارتوں کی پیش کش کی جبکہ صوبائی گورنر گراہم (Graham) نے اس سے اس سلسلے میں تعاون کرتے ہوئے اسمبلی کا سیشن غیر معین عرصہ کے لئے ملتوی کر دیا حالانکہ لیگی اپوزیشن کے قائد سر غلام حسین ہدایت اللہ نے اسمبلی کا اجلاس منعقد کرنے کے لئے تحریری مطالبہ کر رکھا تھا۔ وزیر اعلیٰ اللہ بخش گورنر گراہم اور کانگرس کی اس ملی بھگت کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب مارچ 1939ء میں اسمبلی کا بجٹ سیشن شروع ہوا تو لیگ پارٹی میں پھوٹ پڑ چکی تھی۔ اس پھوٹ کا مظاہرہ اس وقت ہوا جبکہ جی۔ ایم۔ سید نے وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی۔ اس تحریک کی صرف سات لیگی ارکان نے حمایت کی اور جی۔ ایم۔ سید کے بقول سر غلام حسین ہدایت اللہ ان سات ارکان میں شامل نہیں تھا کیونکہ اس وقت تک وہ بھی وزارت کا تحفہ وصول کر چکا تھا اور کابینہ کے ارکان کی تعداد تین سے بڑھ کر چھ ہو چکی تھی۔ خان بہادر اللہ بخش اکتوبر 1938ء میں اپنی کابینہ میں توسیع کرنے پر تیار نہیں تھا حالانکہ اس وقت اسے مسلم بلاک کی ٹھوس حمایت حاصل ہو سکتی تھی لیکن اب اس نے اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کے لئے کابینہ میں توسیع کرنے میں تامل نہ کیا کیونکہ اس طرح صرف چند افراد کی ذاتی تمناؤں کی تسکین ہوتی تھی۔ اس نے اکتوبر 1938ء میں ایسا اس لئے نہیں کیا تھا اور اب اس لئے کیا تھا کہ اس وقت ہندو ممبروں کے لئے مسلمانوں کی یکجہتی قابل قبول نہیں تھی اور اب کانگرس پارٹی اور ہندو گروپوں کا مفاد اس میں تھا کہ چند مسلم لیگی افراد کی امنگوں کی تسکین کر کے لیگ پارٹی میں پھوٹ ڈالی جائے۔[13]

اس کا مطلب یہ تھا کہ کانگرس ہندوستان کے کسی بھی صوبہ میں مسلم لیگ کے ساتھ کسی سیاسی مفاہمت اور اشتراک عمل پر آمادہ نہیں تھی۔ وہ اپنی اس پالیسی پر مصر تھی کہ چند مسلمانوں کو انفرادی حیثیت میں اپنے ساتھ ملا کر پورے ہندوستان میں حکومت کی جائے۔ یو۔ پی اور برصغیر کے دوسرے ہندو اکثریتی صوبوں میں جواہر لال نہرو اور دوسرے کانگرسی لیڈر مسلم لیگ کے ساتھ اشتراک عمل نہ کرنے کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ مسلم لیگ جاگیرداروں اور تعلقہ داروں کی جماعت

ہےاس لئے اس کے ساتھ مل کر ترقی پسندانہ سوشلسٹ پروگرام پر عمل نہیں ہوسکتا تھا۔لیکن وہ سندھ میں اپنے اس ''اعلیٰ اصول'' پر عمل پیرا نہیں تھی۔ یہاں وہ مسلم جاگیرداروں اورزمینداروں کے ساتھ بخوشی اشتراک عمل کرتی تھی حالانکہ صوبائی لیگ کی قیادت درمیانہ طبقہ کے سید گروپ کے ہاتھ میں تھی۔اس صوبہ میں کانگرس زرعی اصلاحات کا نام بھی نہیں لیتی تھی اور ایسے ترقی پسندانہ قوانین کی منظوری کے خلاف تھی جس کی زد ہندو ساہوکاروں اورسرمایہ داروں پر پڑتی تھی۔

جی۔ایم۔سید کے بقول خان بہادر اللہ بخش کی وزارت سازی سے قبل اس سے کانگرس کا کوئی تعلق نہیں تھالیکن اب وہ خان بہادر کو محبت پیار کے ساتھ سینے سے لگاتی تھی۔محض اس لئے کہ وہ ایک ایسا وزیر اعلیٰ تھا جو ہندو مفاد پرستوں کے لئے خطرہ کا باعث نہیں بن سکتا تھا۔کانگرس کی ایسی ہی دوغلی،منافقانہ اورفرقہ پرستانہ پالیسی نے مسلمانان ہند کو مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر مجتمع ومنظم ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔سندھ اسمبلی کے 1939ء کے بجٹ سیشن کے دوران کانگرس پارٹی کی منافقانہ دغا بازی کی پالیسی ''اوم منڈی'' کے مسئلہ پر کچھ اس طرح بےنقاب ہوئی تھی کہ اس کے بعد سندھی مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کو اس ''غیر فرقہ وارانہ جماعت'' پر ذرا بھی اعتماد باقی نہیں رہا تھا۔اس مسئلہ کی نوعیت یہ تھی کہ حیدرآباد کے ایک دولت مند بیوپاری لیکھ راج نے شہر میں ''اوم منڈی'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کر رکھا تھا۔جس میں وہ سبھائی ہندوفرقہ کی بیوہ،شادی شدہ اور کنواری عورتوں کو رکھا کرتا تھا اور عام ہندوؤں کو یہ شکایت تھی کہ اس ''آشرم'' میں عورتوں سے بدکاری کی جاتی ہے اور ان کا مطالبہ تھا کہ نام نہاد فلاحی ادارے پر پابندی عائد کر کے اسے بند کر دیا جائے لیکن صوبائی حکومت اس مطالبہ کو پورا نہیں کرتی تھی کیونکہ قانونی طور پر اسے ایسا کرنے کا اختیار حاصل نہیں تھا۔اس پر کانگرس اور ہندو انڈی پینڈنٹ پارٹی نے ایک ممتاز ہندو لیڈر جیٹھ مل پرس رام کی وساطت سے مسلم لیگ کے گروپ کے قائد جی۔ایم۔سید سے درخواست کی کہ وہ اسمبلی میں وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کی حمایت کریں۔جب مسلم لیگ پارٹی نے ان کی یہ بات مان لی تو خان بہادر اللہ بخش کی طرف سے جی۔ایم۔سید کو بتایا گیا کہ مسلم لیگیوں کو اس کے خلاف تحریک عدم اعتماد کی حمایت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ ہندو ارکان اسمبلی اس تحریک کی آڑ لے کر اپنے بعض ایسے مطالبات منوانا چاہتے ہیں جو سندھی مسلمانوں کے مفادات کے منافی ہونگے مگر جی۔ایم۔سید نے کابینہ کے اس

موٴقف کوتسلیم نہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ بخش کے چاروں مسلم ارکان متفقہ طور پر ہندوؤں کے مزید 18 مطالبات منظور کرنے پر مجبور ہو گئے اوراس سے اگلے دن جب اسمبلی میں تحریک عدم اعتماد پیش ہوئی تو کانگرس اور ہندو انڈی پینڈنٹ پارٹی کے سارے ارکان یکا یک وزارتی بنچوں پر جا بیٹھے اور جی۔ایم۔سید اور اس کے مسلم لیگی ساتھی حیرت زدہ ہو کر ایک دوسرے کے منہ دیکھنے لگے۔ انہیں اس وقت پتہ چلا کہ کانگرس اور ہندو انڈی پینڈنٹ پارٹی نے عیاری اور مکاری کے ساتھ مسلمانوں میں پھوٹ سے فائدہ اٹھا کر اللہ بخش کا بینہ کو بلیک میل کیا ہے اور کچھ عرصہ بعد ہندوؤں نے جلسے جلوسوں کے ذریعے اللہ بخش کو کراچی میں ہنومان مندر کی ناجائز تعمیر کی منظوری دینے پر بھی مجبور کر دیا۔ یہ مندر کسی نقشہ کی منظوری کے بغیر تعمیر کیا گیا تھا اور اس میں کچھ سرکاری زمین بھی شامل کر لی گئی تھی۔

ہنومان مندر کے اس واقعہ سے سندھی مسلمانوں کا یہ یقین پختہ تر ہو گیا کہ اللہ بخش کی کابینہ سو فیصد ہندو مفاد پرستوں اور فرقہ پرستوں کی کٹھ پتلی ہے اور اسے مسلمانوں کے مفادات و جذبات کا ذرا بھی خیال نہیں۔ چنانچہ صوبائی مسلم لیگ کی قیادت نے ایوب کھوڑو کی تحریک پر اس صورتحال سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور اس فیصلہ کے تحت اکتوبر، نومبر 1939ء میں سکھر میں مسجد منزل گاہ کی واگزاری کے لئے تحریک چلائی گئی۔ اس تاریخی مسجد پر انگریزوں نے 1843ء میں قبضہ کر کے اس کی عمارت کو ہندوؤں کی تحویل میں دے دیا تھا۔ سکھر کے مسلمانوں کی مختلف غیر سیاسی انجمنیں بڑی دیر سے اس مسجد کی واگزاری کا مطالبہ کرتی رہی تھیں مگر کبھی ان کی شنوائی نہیں ہوئی تھی۔ جب صوبائی مسلم لیگ نے یکم اکتوبر 1939ء کو اس مسجد کی واگزاری کے لئے ستیہ گرہ شروع کی تو اس غیر سیاسی مذہبی مسئلہ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سیاسی تنازعہ کی صورت اختیار کر لی۔ ہندو مہا سبھا اور کانگرس دونوں ہی اس مسجد کی واگزاری کی مخالفت کرتی تھیں اور مسلم لیگ اسکی بہر قیمت واگزاری کا اعلان کرتی تھی۔ مسلم لیگ کی ستیہ گرہ کا طریقہ یہ تھا کہ بہت سے مسلمانوں نے اس عمارت میں گھس کر دھرنا مار لیا تھا۔ یہ ستیہ گرہ 48 دن تک جاری رہی مگر اس دوران تشدد کا کوئی واقعہ نہ ہوا۔

اس عرصے میں سکھر میں ڈاکٹر مونجے کی زیر صدارت آل انڈیا ہندو مہا سبھا کی کانفرنس بھی ہوئی جس میں اشتعال انگیز تقریریں ہوئیں۔ جی۔ایم۔سید کے بیان کے مطابق اس

کانفرنس کے انعقاد میں کانگرس نے بھی سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ ہندوؤں کے اس دباؤ کے تحت صوبائی حکومت نے 19 نومبر کو صوبائی مسلم لیگ کے سرکردہ لیڈروں کو گرفتار کر کے ستیہ گرہ کرنے والے مسلمانوں کو اس عمارت سے بزورقوت باہر نکال دیا۔ اس سرکاری کارروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ 20 نومبر کو سکھر شہر میں اتنا سخت فرقہ وارانہ فساد ہوا کہ پولیس کو گولی چلانا پڑی۔ اس فساد میں 20 افراد ہلاک اور 23 زخمی ہوئے اور اس طرح سندھ کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خون کی خلیج حائل ہوگئی۔ اس وقت تک دوسری عالمی جنگ شروع ہو چکی تھی اور آل انڈیا کانگرس کی مجلس عاملہ اور اس کے باپو ''مہاتما'' گاندھی کا اعلان یہ تھا کہ وہ اس جنگ میں انگریزوں کے ساتھ صرف اسی صورت تعاون کریں گے کہ ہندوستان کو غیر مشروط طور پر مکمل آزادی دے دی جائے اور ایک آزاد و خودمختار دستور ساز اسمبلی کی تشکیل کی جائے جو آزاد ہندوستان کا آئین مرتب کرے گی۔ ان کا مزید اعلان یہ تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے لئے ہندو مسلم تنازعہ کے پیشگی تصفیہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ تنازعہ محض انگریزوں کا پیدا کردہ ہے اور اس کا تصفیہ دستور ساز اسمبلی میں ہو جائے گا۔

جی۔ ایم۔ سید...... کبھی مسلم لیگی کبھی لیگ مخالف

سکھر کے فرقہ وارانہ فسادات کے بعد خان بہادر اللہ بخش کی کابینہ کے ہندو ارکان مستعفی ہو گئے اور جب جنوری 1940ء میں صوبائی اسمبلی کا سیشن شروع ہوا وہ اپوزیشن کی بنچوں پر بیٹھے۔ انہیں شکایت یہ تھی کہ خان بہادر کی حکومت سکھر میں ہندوؤں کے جان و مال کی حفاظت کرنے میں ناکام رہی ہے اور ان کا مطالبہ یہ تھا کہ آئندہ وہ اسمبلی میں مسلم ارکان کے اس گروہ کا ساتھ دیں گے جو سندھ میں ہندو فرقے کے تحفظات کا اطمینان بخش طریقے سے یقین دلائے گا۔ اس مقصد کے لئے ہندوؤں کی سندھ پنچایتوں کی فیڈریشن کے نمائندوں نے خان بہادر اللہ بخش کے گروپ اور مسلم لیگ گروپ دونوں ہی سے گفت وشنید کا سلسلہ شروع کیا۔ ابھی یہ گفت وشنید جاری ہی تھی کہ اسمبلی میں مارکیٹنگ بل میں ہندوؤں کی ایک ترمیم پر رائے شماری ہوئی جس میں اللہ بخش وزارت ہار گئی۔ گویا حکومت کے خلاف مسلم لیگ اور ہندوؤں کا عملی طور پر اتحاد ہو گیا۔ اس پر وزیر اعلیٰ نے اعلان کیا کہ چونکہ ایوان میں اسے اکثریت کی حمایت حاصل نہیں ہے اس لئے وہ مستعفی ہو رہا ہے اور نئی حکومت کی تشکیل تک اسمبلی کا اجلاس معرض التوا میں رہے گا۔ چنانچہ

اسی دن اسمبلی کا اجلاس غیر معین عرصے کے لئے ملتوی کر دیا گیا لیکن خان بہادر کی وزارت تقریباً ایک ماہ تک مستعفی نہ ہوئی کیونکہ اس عرصے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے دونوں گروہوں سے سودا بازی ہوتی رہی۔

ہندوؤں کے 21 مطالبات تھے جو بہادر خان نے منظور کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن جی۔ایم۔سید کی تحریک پر مسلم لیگ گروپ نے یہ مطالبات مان لئے اور اس گروپ نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر حکومت بنانے کے لئے مسلم لیگ کو توڑ دیا اور اس کی جگہ اپنی ایک نئی غیر فرقہ وارانہ پارٹی سندھ نیشنلسٹ پارٹی بنالی۔ جی۔ایم۔سید لکھتا ہے کہ ''مسلم لیگ گروپ کی جانب سے اپنے اعلانیہ مؤقف سے انحراف کی زیادہ تر ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی تھی۔ ہم نے یہ رویہ اس لئے اختیار کیا تھا کہ ہمارے گروپ کے ارکان کی اکثریت عقیدتاً مسلم لیگی نہیں تھی اور وہ اتفاقاً مسلم لیگی بنے تھے۔ چونکہ ہم عقیدہ کے لحاظ سے مسلم لیگی نہیں تھے اس لئے ہمیشہ اس امر کا امکان تھا کہ کسی بھی مشکل کے وقت ہماری یہ کمزوری بے نقاب ہو جائے گی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ سکھر کے فسادات کے بعد ہم فرقہ وارانہ خیر سگالی کے بارے میں اپنی نیک نیتی کا ثبوت مہیا کرنا چاہتے تھے۔ ہم یہ محسوس کرتے تھے کہ ہمیں اکثریتی فرقہ کے نمائندوں کی حیثیت سے ہندوؤں کی جانب تعاون اور دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہیے اور تیسری وجہ یہ تھی کہ سکھر کے فسادات کے بعد بہت سے مسلمانوں کو جیلوں میں جو اذیتیں پہنچی تھیں، ہم برسر اقتدار آ کر ان کا ازالہ کرنا چاہتے تھے''[14]

جی۔ایم۔سید یہ بھی دعویٰ کرتا ہے کہ ''اس کے گروپ نے یہ گٹھ جوڑ اصلی سندھی ہندوؤں کے ساتھ کیا تھا جو معقولیت پسند تھے اور فرقہ وارانہ امن کے دل سے خواہاں تھے۔ ان کے برعکس وہ ہندو جو باہر سے آ کر سندھ میں آباد ہو گئے تھے ان کا مفاد اس میں تھا کہ فرقہ وارانہ کشیدگی برقرار رہے اور وہ ہمیشہ کل ہند تنازعات کو صوبائی مسائل کے ساتھ الجھا کر مسلم لیگ کے خلاف نفرت پیدا کرتے رہتے تھے۔ ان غیر مستند سندھی ہندوؤں کو کانگرس اور ہندو انڈیپینڈنٹ پارٹی کے بعض عناصر کی حمایت حاصل تھی۔''[15]

جی۔ایم۔سید کا یہ عذر دراصل عذر لنگ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ شخص اپنی اصول پرستی کے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود اندرون خانہ غیر اصولی سیاسی جوڑ توڑ میں کبھی بھی کوئی تامل نہیں کرتا تھا۔ یہ انتہا درجہ کا انانیت پسند تھا۔ اس لئے اسے وزارتوں کی تعمیر و تخریب کے کام میں بڑا

مزہ آتا تھا۔ یہ اپنی کتاب میں کھلم کھلا اعتراف کرتا ہے کہ سر غلام حسین ہدایت اللہ اور خان بہادر اللہ بخش کی وزارتیں اس نے بنوائی تھیں اور اُسی نے تڑوائی تھیں۔ اس نے اکتوبر 1938ء میں مسلم لیگ میں شمولیت واقعی کسی عقیدے یا اصول کی بنیاد پر نہیں کی تھی بلکہ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس طرح خان بہادر اللہ بخش کی وزارت مسلم اتحاد کے نام پر توڑی جاسکتی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں سندھ کی مسلم رائے عامہ بڑے جوش وخروش کے ساتھ مسلم لیگ کے حق میں ہو چکی تھی۔ گویا اس کی سیاست میں موقع پرستی کا عنصر ہمیشہ غالب رہا تھا۔ اس کے سندھی نیشنلزم کی بنیاد بھی موقع پرستی پر تھی کیونکہ اس طرح اسے ''اصلی'' سندھی ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایسی حکومت بنوانے کا موقع مل رہا تھا جس کے ارکان کے لئے یہ لازمی ہوتا کہ وہ اسکے ''آستانہ عالیہ'' پر حاضری دیتے رہتے۔ سندھ میروں اور پیروں کا صوبہ تھا اور جی۔ ایم۔ سید ایک سیاسی پیر بننا چاہتا تھا تا کہ سندھ کا ہر بادشاہ اس کے ''حضور'' میں ''دعائے خیر'' کے لئے خاضر ہو اور وہ اس مقصد کے لئے کسی بھی حربے کو ناجائز نہیں سمجھتا تھا۔ وہ ایک انتہائی خود پسند، خودنگر آدمی تھا اور اسکی انانیت پسندی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ اگر اس کے سندھی نیشنلزم میں موقع پرستی کی آلودگی نہ ہوتی تو یہ جاگیرداروں، وڈیروں، زمینداروں، پیروں، ساہوکاروں، سیٹھوں اور سرمایہ داروں سے اندرون خانہ سیاسی جوڑتوڑ کرنے کی بجائے اپنے صوبہ کے مفلوک الحال ہاریوں اور دوسرے مظلوم عوام کی تنظیم وترقی کے لئے کوئی ٹھوس کام کرتا اور اسے کوئی سیاسی شعور ہوتا تو اسے معلوم ہوتا کہ 40-1939ء میں ہندوستان کے کسی بھی صوبہ کی سیاست کو کل ہند سیاست سے الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کی اسی سیاسی بے شعوری کا نتیجہ تھا کہ اس نے یکم فروری 1940ء کو صدر مسلم لیگ قائد اعظم محمد علی جناح کے نام ایک خط لکھا تھا کہ ''اب وقت آ گیا ہے کہ ہم محض مسلمانوں کی یکجہتی پر ہی اپنی توجہ نہ رکھیں بلکہ اپنی توانائی اپنے حقیقی مقصد یعنی ملک کی خدمت کے لئے وقف کریں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی تدابیر کو تبدیل کریں اور اپنی قوت کو اپنے آخری مقصد کی تکمیل کے لئے صرف کریں۔ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ ہمیں انڈین نیشنل کانگرس میں شامل ہو جانا چاہیے...... سندھ دونوں جماعتوں کے مل کر کام کرنے کے لئے بہترین جگہ ہے۔ دونوں کے پروگرام یکساں ہونے چاہئیں اور اس طرح ہمیں کانگرس کے عوامی فلاح کے دعوے کی آزمائش کرنی چاہیے۔ ہمیں معلوم ہے کہ سندھ کے عوام الناس مسلمان ہیں۔'' جناح

نے 8 رفروری کواس خط کا یہ جواب دیا تھا کہ" کاش تم کانگرس کے دعوؤں سے گمراہ نہ ہوتے اور اس امر کا ذرا زیادہ گہرائی سے مطالعہ کرتے کہ کانگرس اوراس کی ہائی کمان کا مقصد کیا ہے۔ ہندو مسلم تصفیہ کا سوال کل ہند سوال ہے اور میرا خیال ہے کہ جو مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہر صوبہ میں الگ الگ کوئی تصفیہ کر سکتے ہیں وہ غلطی پر ہیں کیونکہ اس طرح مسلمانوں کی یکجہتی لازمی طور پر ٹوٹ جائے گی۔"[16] جی۔ایم۔سید نے اس خط میں اپنی نئی سندھ نیشنلسٹ پارٹی کے وجود کو صدر مسلم لیگ سے تسلیم کرانے کی کوشش کی تھی اس کا خیال تھا کہ اس کی یہ پارٹی صوبائی سطح پر ہندو مسلم اتحاد قائم کر کے مستحکم حکومت بنا سکے گی لیکن اسے یہ شعور نہیں تھا کہ دراصل وہ پورے ہندوستان میں مسلم اتحاد کو نقصان پہنچا کر پرامن ہندو۔مسلم تصفیہ کے راستے میں حائل ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں کانگرس حکومت برطانیہ پر دباؤ ڈال رہی تھی کہ وہ ہندو مسلم تصفیہ کا انتظار کئے بغیر ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر دے اور مسلمانان ہند کے تعلیم یافتہ طبقوں کی نظر میں کانگرس کے اس مطالبہ کا مطلب یہ تھا کہ وہ پورے برصغیر میں ہندوراج نافذ کرنا چاہتی ہے۔خود جی۔ایم۔سید کا بھی گزشتہ تین سال کا تجربہ یہ تھا کہ صوبائی کانگرس عملاً ایک موقع پرست ہندو جماعت تھی اور وہ ہندو ساہوکاروں اور سیٹھوں کے تحفظ کے لئے ہر غیر اصولی گٹھ جوڑ کو جائز سمجھتی تھی۔

بندے علی تالپور وزارت......جی۔ایم۔سید کے جوڑ توڑ اور دوبارہ اللہ بخش وزارت

جی۔ایم سید نے فروری 1940ء میں سندھی نیشنلزم کے نام پر اسی فرقہ پرست کانگرس،"اصلی سندھی ہندوؤں کے ساتھ 21 مطالبات کی بنیاد پر جو سمجھوتہ کیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 18 رمارچ 1940ء کو سندھ کا نہایت رجعت پسند، موقع پرست اور عوام دشمن جاگیردار میر بندے علی تالپور صوبہ کی وزارت اعلیٰ کی گدی پر براجمان ہو گیا اور جی۔ایم۔سید بھی مئی میں اس کی کابینہ میں شامل ہو گیا۔صوبہ سندھ کے قیام کے بعد تین سال میں یہ تیسری وزارت تھی اور خود جی۔ایم۔سید کے بقول اس سیاسی عدم استحکام کی بیشتر ذمہ داری اس پر عائد ہوتی تھی۔ میر بندے علی تالپور کو وزیر اعلیٰ اس لئے نہیں بنایا گیا تھا کہ اس میں کوئی قابلیت یا صلاحیت تھی بلکہ اس لئے بنایا گیا تھا کہ اس عہدہ کے بغیر وہ سندھ نیشنلسٹ پارٹی میں شامل نہیں ہوتا تھا اور اس کی

شمولیت کے بغیر اس پارٹی کی حکومت نہیں بن سکتی تھی۔

لیکن جی۔ایم۔سید نے میر بندے علی تالپور کی سربراہی میں بھان متی کے جس کنبے کی تشکیل کی تھی اس میں سندھی نیشنلزم کی بنیاد پر غیر فرقہ وارانہ اتحاد و اخوت کا جذبہ زیادہ دیر تک کارفرما نہ رہ سکا اور تھوڑے ہی دنوں میں یہ پتا چل گیا کہ کانگرسی ہندوؤں نے خان بہادر اللہ بخش کے ساتھ مل کر اس وزارت کا تختہ الٹنے کا منصوبہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ جی۔ایم۔سید نے کانگرسیوں کی ان سازشوں کا سدباب کرنے کے لئے ایک غیر فرقہ وارانہ سندھ پیپلز ایسوسی ایشن بنائی اور یہ کوشش کی کہ عوامی سطح پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کا جذبہ پیدا کر کے وزارت کو مستحکم کیا جائے لیکن اس کی یہ کوشش ناکام ہوئی اور چند ہی ماہ میں میر بندے علی تالپور کی وزارت ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں ہی غیر مقبول ہوگئی۔ایک طرف کانگرسی ہندو اس کے خلاف تھے تو دوسری طرف مسلم لیگی مسلمان اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ کابینہ کے ہندو اور مسلمان وزراء بھی ایک دوسرے سے تعاون نہیں کرتے تھے۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ہندو مسلم تضاد کا تصفیہ صرف کل ہند سطح پر ہی ہوسکتا تھا۔محض صوبائی سطح پر ایسی کسی کوشش کے کامیاب ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ 16؍مارچ 1940ء کو آل انڈیا کانگرس کے رام گڑھ سیشن میں ہندوستان کی فوری آزادی کے لئے سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کے فیصلے اور پھر 23؍مارچ 1940ء کو لاہور میں قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد ہندو مسلم تضاد میں پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہوگیا تھا اور اس کا سندھ کی سیاست پر بھی اثر انداز ہونا لازمی تھا۔ کانگرسی ارکان اسمبلی کی فرقہ پرستی کا یہ عالم تھا کہ وہ صوبائی ملازمتوں میں مختلف فرقوں کے لئے تناسب مقرر کرنے کی کسی نہ کسی بہانے سے مخالفت کرتے تھے حالانکہ حکومت ہندوؤں کو ''اسپیشل ویٹیج دینے پر آمادہ تھی۔

جب جی۔ایم۔سید نے یہ دیکھا کہ سندھ کے عوام وخواص میں وزارت کی ساکھ روز بروز گر رہی ہے تو اس نے اگست 1940ء میں پہلے تو کابینہ میں اپنے رفقا کے نام ایک خط کے ذریعے وزارت سے مستعفی ہونے کا ارادہ ظاہر کیا اور پھر وہ جواہر لال نہرو کی زیر صدارت نیشنل پلاننگ کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کرنے بمبئی گیا جہاں اس نے جواہر لال نہرو کے علاوہ پہلی مرتبہ صدر آل انڈیا مسلم لیگ محمد علی جناح سے 5؍ستمبر کو طویل ملاقات کی جس کے دوران جناح

نے اسے مشورہ دیا کہ وہ سندھ کے مسلم عوام سے براہ راست رابطہ قائم کر کے انہیں منظم و بیدار کرے۔ وہ بمبئی سے واپس آیا تو اس نے ایک کانگرسی لیڈر آصف علی کی موجودگی میں خان بہادر اللہ بخش کو یہ ترغیب دی کہ وہ کابینہ میں شامل ہو کر اسمبلی میں مسلم بلاک کو تقویت دے۔ اس پر خان بہادر خود تو رضامند نہ ہوا البتہ اس نے پیش کش کی کہ اس کے گروپ کی طرف سے سر غلام حسین ہدایت اللہ کو کابینہ میں شامل کیا جائے۔ جی۔ایم۔سید کے بقول خان بہادر کے اس انکار کی اصل وجہ یہ تھی کہ آل انڈیا کانگرس کی مجلس عاملہ نے اسے یقین دلایا تھا کہ جونہی بندے علی کی وزارت کا تختہ الٹا جائے گا تو کانگرس اس کی حمایت کر کے اسے وزیراعلیٰ بنوا دے گی۔ تاہم سید نے اللہ بخش کے ساتھ اندرون خانہ گٹھ جوڑ کی کوشش جاری رکھی اور اس مقصد کے لئے اس نے اسے دو وزارتوں کی پیش کش کی اور اسے امید دلائی کہ اس طرح اس کے وزیراعلیٰ بننے کا امکان زیادہ روشن ہوگا۔ جب اس کی اللہ بخش کے ساتھ خفیہ بات چیت جاری تھی تو صدر کانگرس ابوالکلام آزاد کراچی پہنچا جہاں اس نے میر بندے علی تالپور، خان بہادر محمد ایوب کھوڑو، شیخ عبدالمجید اور جی۔ایم۔سید کے ساتھ ملاقاتیں کیں جن کے دوران یہ طے ہوا کہ اللہ بخش گروپ کو کابینہ میں دو نشستیں دی جائیں گی۔ صوبائی اسمبلی کے کانگرسی ارکان کو یہ معاہدہ قبول نہیں تھا لیکن کیونکہ وہ خان بہادر اللہ بخش کو بہر قیمت وزیراعلیٰ بنانے کا تہیہ کئے ہوئے تھے۔ بالآخر ایک ہندو رکن اسمبلی نچل داس کی کوشش سے دونوں گروپوں کے درمیان ایک تحریری معاہدہ ہو گیا۔ جس کے تحت یہ قرار پایا کہ پہلے خان بہادر اللہ بخش اور پھر اس کا ساتھی سر غلام حسین ہدایت اللہ کابینہ میں شامل ہونگے۔ اس معاہدہ پر جی۔ایم۔سید کے علاوہ خان بہادر کھوڑو نے بھی دستخط کئے تھے۔ جب صوبہ لیگ کے صدر سر عبداللہ ہارون کو پتہ چلا تو اس نے سید اور کھوڑو کو ہدایت کی کہ وہ مستعفی ہو کر اللہ بخش کے لئے کابینہ میں گنجائش پیدا نہ کریں مگر جی۔ایم۔سید نے اسے نظر انداز کر دیا۔ وہ 22رنومبر 1940ء کو کابینہ کی رکنیت سے مستعفی ہو گیا اور اسکی جگہ اسی وقت خان بہادر اللہ بخش نے حلف اٹھالیا۔ اسی دن اسمبلی کے مختلف گروپوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک جائنٹ پارلیمنٹری ایڈوائزری کمیٹی مقرر کی گئی جس کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ صوبائی حکومت کو قانون سازی کے کام میں مشورہ دے گی۔

16ردسمبر 1940ء کو صدر مسلم لیگ محمد علی جناح کراچی آئے تو انہوں نے صدر کانگرس ابوالکلام آزاد کی نگرانی میں طے شدہ متذکرہ معاہدہ پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور یہ رائے ظاہر کی کہ

اس طرح سندھ میں مسلم لیگ کو نقصان پہنچا ہے۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ کابینہ کے سارے مسلم ارکان کو مسلم لیگ کے سامنے جواب دہ ہونا چاہیے مگر اس پر وزیر اعلیٰ میر بندے علی تالپور تو مسلم لیگ میں شامل ہو گیا مگر خان بہادر اللہ بخش نے انکار کر دیا۔ جناح کی کراچی سے روانگی کے بعد جی۔ ایم۔ سید نے خان بہادر اللہ بخش سے خفیہ بات چیت کا سلسلہ جاری رکھا جس کے دوران اس نے اسے وزارت اعلیٰ کی بھی پیش کش کی مگر صدر صوبہ لیگ کی مخالفت کے باعث اس تجویز پر عمل نہ ہوا۔ چنانچہ جنوری 1941ء میں خان بہادر اللہ بخش اور جی۔ ایم۔ سید کی اندرون خانہ بات چیت ٹوٹ گئی اور اس کے تقریباً ایک ماہ بعد جب اسمبلی کا سیشن شروع ہوا تو خان بہادر اور کابینہ کا ایک ہندو رکن کٹوتی کی تحریک پر بحث کے دوران یکا یک اٹھ کر اپوزیشن میں جا بیٹھے۔ اس پر وزیر اعلیٰ بندے علی تالپور نے اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا اور یہ اعلان کیا کہ وہ اپنی وزارت کا استعفیٰ پیش کر دے گا۔ بندے علی تالپور کی وزارت کے اس طرح خاتمہ کے بعد خان بہادر اللہ بخش نے کانگرس اور ہندو انڈی پینڈنٹ پارٹی کی حمایت سے پھر اپنی وزارت بنالی جبکہ صوبہ لیگ کی جی۔ ایم۔ سید کی زیر صدارت قائم شدہ تنظیمی کمیٹی نے وسیع پیمانے پر مسلم رابطہ کی مہم شروع کر دی۔ صوبہ سندھ کی گزشتہ چار سال کی تاریخ میں یہ چوتھی وزارت تھی۔

حروں کی برطانوی سامراج کے خلاف بغاوت

خان بہادر اللہ بخش کی اس حکومت کے عہد کا اہم ترین واقعہ یہ تھا کہ صوبہ کے حروں نے 1941ء کے اواخر میں برطانوی سامراج کے خلاف بغاوت کر دی تھی جس کے دوران صوبہ سندھ کے بیشتر علاقوں میں کافی عرصہ تک خون خرابہ ہوا اور لاقانونیت کا دور دورہ رہا۔ اس بغاوت کا پس منظر یہ تھا کہ اگرچہ حروں کی 1892ء کی بغاوت دو تین سال میں ختم ہو گئی تھی مگر صوبائی انتظامیہ اور بالخصوص محکمہ پولیس اور محکمہ مال کے اہلکاروں کی طرف سے ان پر ظلم وتشدد کا سلسلہ کبھی بھی بند نہیں ہوا تھا اور حر بھی اس سرکاری جبر وتشدد کے خلاف احتجاج کے طور پر گروہوں کی صورت میں وقتاً فوقتاً ڈاکہ زنی اور دوسرے جرائم کا ارتکاب کرتے رہتے تھے۔ یہ سلسلہ چالیس سال تک جاری رہا۔ چونکہ سرکاری انتظامیہ انہیں پرامن طریقے سے بذریعہ کاشت کاری روزی پیدا کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی اس لئے وہ اس مقصد کے لئے غیر قانونی اور پرتشدد ذرائع اختیار کرنے

پر مجبور ہوتے تھے۔ محکمہ پولیس اور محکمہ مال کی طرف سے ان پر جتنا ظلم ہوتا تھا اتنی ہی شدت سے وہ مختلف طریقوں سے مزاحمت کرتے تھے۔

تیسرے عشرے کے اواخر میں اس ''جرائم پیشہ قبیلہ'' کے مذہبی راہنما پیر پگاڑو کو 8 سال قید کی سزا ہوئی تھی لیکن جب وہ ہندوستان کی مختلف جیلوں میں تین سال کی قید کی سزا کاٹنے کے بعد واپس اپنے علاقہ میں آیا تو اس کے اندازِ فکر میں بنیادی تبدیلی آ چکی تھی۔ جیلوں میں اس کا مختلف قسم کے سیاسی نظربندوں اور بالخصوص بنگال اور پنجاب کے دہشت پسندوں سے رابطہ ہوا تھا اور اس بنا پر وہ سیاسی طور پر برطانوی سامراج کا بدترین دشمن بن چکا تھا۔ اگست 1941ء میں اس نے اپنے مریدوں کے نام ایک ہدایت نامہ جاری کیا جس میں اس نے انہیں ہدایت کی تھی کہ وہ آئندہ صرف ہاتھ کے بنے ہوئے کھدر کے کپڑے پہنیں اور ذبیحہ گاؤ سے پرہیز کریں۔ اس نے اپنے گاؤں میں اس مقصد کے لئے چار سو کھڈیاں لگوائی تھیں اور آل انڈیا سپنرز ایسوسی ایشن کے نمائندہ پروفیسر این۔ آر۔ ملکانی کا تعاون حاصل کر کے پورے سندھ میں کھڈی کے کپڑے پہننے کی مہم چلائی تھی [17] اور اس کے ساتھ ہی ساتھ انگریزوں کے خلاف بغاوت کا منصوبہ بھی بنا تا رہا تھا۔ بعض اطلاعات کے مطابق اس نے اس مقصد کے لئے عراق کے رشید علی اور بیت المقدس کے مفتیٔ آعظم سے بھی رابطہ پیدا کیا تھا جبکہ یہ دونوں ہی نازی جرمنی کے ایجنٹ تصور کئے جاتے تھے۔ اس نے بنگال کے بعض دہشت پسند انقلابیوں کی بھی خدمات حاصل کی تھیں تاکہ وہ اس کے مریدوں کو تخریب کاری کی تربیت دیں۔ [18]

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ سندھ کا وزیر اعلیٰ خان بہادر اللہ بخش وائسرائے کی دعوت پر نیشنل ڈیفنس کونسل کا رکن بن گیا تھا اور کانگرس کے صدر ابوالکلام آزاد نے سندھ پراونشل کانگرس کمیٹی کو بذریعہ تار ہدایت کی تھی کہ وہ سندھ کے غیر معمولی حالات کے پیش نظر خان بہادر کی ڈیفنس کونسل کی رکنیت پر اعتراض نہ کرے۔ بلکہ میری جانب سے طے کردہ اصولوں کے مطابق اسکی وزارت کی حمایت جاری رکھے۔ [19] ابوالکلام آزاد نے سندھ کانگرس کمیٹی کو یہ ہدایت اس حقیقت کے باوجود دی تھی کہ ہندو اکثریتی صوبوں کی کانگرسی حکومتیں اس وجہ سے بطور احتجاج مستعفی ہو گئی تھیں کہ وائسرائے ہند نے کانگرس سے مشورہ کئے بغیر نازی جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا۔ چونکہ سندھ مسلم اکثریتی صوبہ تھا اس لئے کانگرس کی مرکزی قیادت کو خدشہ تھا کہ اگر صوبائی کانگرس نے

خان بہادر اللہ بخش کی وزارت کی حمایت جاری نہ رکھی تو یہاں مسلم لیگ کی وزارت قائم ہو جائے گی اور یہ بات ابوالکلام آزاد کے طے کردہ اصول کے منافی تھی۔ اس اصول کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ مسلم لیگ کو ہر صوبہ میں اقتدار سے محروم رکھنے کے لئے ہر قسم کی بے اصولی جائز ہے۔

سندھ میں حروں کی بغاوت کی ابتدا نومبر 1941ء میں ہوئی تھی جبکہ جاپان تین ماہ قبل ہندچینی پر قبضہ کر کے جنوب مشرقی ایشیا میں عالمی جنگ کی ابتدا کر چکا تھا اور اس امر کی واضح علامتیں موجود تھیں کہ اب وہ ملایا، سنگاپور اور برما پر حملہ کرنے ہی والا ہے۔ اس بغاوت کی بنا پر پیر پگاڑو کو گرفتار کر لیا گیا تو 16 رمئی 1942ء کو حروں نے ٹنڈو آدم کے نزدیک ''پنجاب میل'' کو پٹڑی سے اتار دیا۔ اس حادثہ میں 22 مسافر ہلاک اور 26 زخمی ہوئے۔ انہوں نے یہ واردات فش پلیٹیں نکال کر کی تھی اور اس سے قبل انہوں نے ٹیلی فون اور ریلوے کنٹرول کی تاریں کاٹ دی تھیں۔ حکومت سندھ نے اس حادثہ کے بعد اپنے علاقے میں رات کے وقت ریل گاڑیوں کی آمد و رفت بند کر دی اور پھر یکم جون کو سندھ کے وسیع علاقے میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا جبکہ جاپان ملایا، برما، فلپائن، سنگاپور اور انڈونیشیا پر قبضہ کر چکا تھا۔ حکومت سندھ کے سرکاری اعلان میں مارشل لاء کے نفاذ کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ حروں نے 1942ء کے پہلے ساڑھے تین ماہ میں 33 وارداتیں کی تھیں۔ 25 مقامات پر ریلوے اور تار کی لائنوں کو نقصان پہنچایا تھا اور 45 افراد کو قتل کیا تھا جن میں محکمہ پولیس کے ارکان کی خاصی تعداد تھی۔ سرکاری اعلان میں مزید بتایا گیا تھا کہ حر ضلع سانگھڑ کے جس 125 مربع میل علاقے میں وارداتیں کرتے ہیں وہ گھنے جنگلات اور جھاڑیوں کی وجہ سے بہت دشوار گزار ہے۔ حروں کی اپنی انٹیلی جنس سروس ہے اور وہ ایک دوسرے کو اطلاع دینے کے لئے خاص زبان استعمال کرتے ہیں۔ اگر کوئی اجنبی آدمی ان کے علاقے میں چلا جائے تو وہ بچ کر واپس نہیں آسکتا۔[20] مارشل لاء کے نفاذ کے بعد دس دن میں 400 حروں کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور ان پر مقدمہ چلانے کے لئے تین ٹربیونل مقرر کئے گئے تھے۔ 15 رجون 1942ء کو صوبہ لیگ کے ایک وفد نے صوبائی گورنر سے ملاقات کر کے ان مشکلات سے آگاہ کیا جو بالائی سندھ میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد عام لوگوں کے لئے پیدا ہو گئی تھیں۔ اس وفد میں خان بہادر محمد ایوب کھوڑو، ہاشم گزدر، جی۔ ایم۔ سید اور شیخ عبدالمجید شامل تھے۔ تاہم 18 رجون کو فوجی عدالتیں قائم کر دی گئی تھیں اور انہیں ہدایت کی گئی تھی کہ وہ حروں کے خلاف مقدمات کی سرسری سماعت کر کے انہیں سزائیں دیں۔

جی۔ایم۔سید کے بیان کے مطابق مرکزی حکومت نے سندھ کے جس علاقے میں مارشل لاء نافذ کیا تھا اس کا رقبہ تقریباً 20 ہزار مربع میل تھا۔ یہ فوجی راج تقریباً ایک سال تک جاری رہا اور اس علاقے کے کچھ حصے میں کرفیو بھی نافذ رہا۔حروں کی بغاوت کو کچلنے کے لئے آرمڈ کاریں اور ہوائی جہاز بھی استعمال کئے گئے تھے اور کئی مرتبہ صورتحال پر قابو پانے کے لئے بمباری بھی کی گئی تھی۔اس دوران ایک وقت ایسا بھی آیا جبکہ اس تحریک کو کچلنے کے لئے تقریباً 30 ہزار فوج استعمال کی گئی تھی۔ پیر صبغت اللہ شاہ المعروف پیر پگاڑو کے گاؤں پر بمباری کی گئی تھی اور اسکی جائیداد بھی ضبط کر لی گئی تھی۔ایک رپورٹ کے مطابق ''بعض علاقوں میں چھاتہ بردار فوج بھی استعمال کی گئی تھی کیونکہ کسی اور ذریعے سے ان علاقوں میں پہنچنا ممکن نہیں تھا۔''[21]

14رجولائی کو لندن میں وزیر ہند نے بتایا کہ سندھ کی نہایت مشکل اور خطرناک صورتحال پر قابو پانے میں خاصی کامیابی ہوئی ہے لیکن ابھی متاثرہ علاقے کے نظم ونسق کا کام سول انتظامیہ کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔ 19رجولائی کو سول اینڈ ملٹری گزٹ کی رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ اس وقت تک 3000 حروں کو گرفتار کیا جا چکا تھا۔ 8راگست 1942ء کو کانگرس کی سول نافرمانی کی پرتشدد تحریک شروع ہوئی تو اس کے تقریباً ایک ماہ بعد نئی دہلی میں ایک سرکاری اعلان میں بتایا گیا کہ ''پیر پگاڑو کے گاؤں میں قلعہ نما عمارتوں کو منہدم کیا جا رہا ہے کیونکہ یہ حکومت کے اقتدار کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان عمارتوں کے انہدام کا کام فوج کے مسلمان سپاہی مسلمان افسروں کی نگرانی میں کر رہے ہیں اور گاؤں کی درگاہ، مسجد اور دوسری مذہبی عمارتوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جا رہا ہے۔حکومت درگاہ کی مذہبی اہمیت کو نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی صرف پیر پگاڑو کے لادینی اقتدار کی علامتوں کو تباہ کیا جا رہا ہے۔''[22] جب نئی دہلی سے یہ اعلان ہوا تھا اس وقت تک مارشل لاء کے تحت 69 حروں کو تختۂ دار پر چڑھایا جا چکا تھا۔ 15رستمبر کو حروں کے ایک گروہ نے ''بمبئی میل'' کو بھی پٹڑی سے اتارنے کی کوشش کی تھی۔انہوں نے گاڑی پر گولیاں چلائی تھیں مگر انہیں اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی اور فوج نے ان کا تعاقب کر کے کئی ایک کو ہلاک کر دیا تھا اور دس کو گرفتار کر لیا تھا۔

اللہ بخش وزارت کی برطرفی

حروں کی بغاوت اور انکے خلاف فوجی کاروائی ابھی جاری تھی کہ 19 ستمبر 1942ء کو سندھ کی سیاست میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا جبکہ وزیر اعلیٰ خان بہادر اللہ بخش نے وائسرائے کے نام ایک خط میں اپنی خان بہادری کا خطاب ترک کر دینے کا اعلان کیا۔ اللہ بخش نے جب یہ فیصلہ کیا تھا اس وقت مشرقی یو۔پی میں کانگرس کی پر تشدد ایجی ٹیشن جاری تھی اور جاپانی سامراج کلکتہ اور مدراس کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا۔ سنگا پور میں آزاد ہند فوج قائم ہو چکی تھی اور سبھاش چندر بوس کا اعلان یہ تھا کہ اس کی یہ فوج عنقریب جاپانیوں کے ساتھ اشتراک عمل کر کے برصغیر کو برطانیہ کے چنگل سے نجات دلائے گی۔ یورپ اور شمالی افریقہ میں اتحادیوں کی فوجیں ہزیمت اٹھا رہی تھیں اور نازی جرمنی کی فوجیں سوویت یونین میں برق رفتاری سے پیش قدمی کر کے سٹالن گراڈ میں داخل ہو چکی تھیں۔ گویا عالمی جنگ کے نقشہ پر ایک سطحی نظر ڈالنے سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ اب برطانیہ، امریکہ اور سوویت یونین کے عالمی اقتدار کا جنازہ نکلنے ہی والا ہے اور آئندہ ساری دنیا میں جرمنی، اٹلی اور جاپان کی بالا دستی ہوگی۔ آل انڈیا کانگرس کی قیادت نے اس تاثر کے تحت 8 اگست 1942ء کو ایجی ٹیشن شروع کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور وزیر اعلیٰ اللہ بخش نے بھی اسی تاثر کے تحت خان بہادری ترک کرنے کا فیصلہ کیا تھا حالانکہ تقریباً ایک سال قبل 21 اگست 1941ء کو وہ عالمی جنگ میں برطانیہ کی امداد کرنے کے لئے وائسرائے کی نیشنل ڈیفنس کونسل میں شامل ہوا تھا۔

جب 26 ستمبر 1942ء کو وزیر اعلیٰ اللہ بخش نے وائسرائے کے نام ارسال کردہ اپنا خط شائع کر دیا تو صوبائی گورنر سر ہیو ڈو (Hugh Dow) نے اس سے استعفیٰ طلب کر لیا لیکن اس نے استعفیٰ دینے سے انکار کر کے اسی دن ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ برطانوی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ وہ ہندوستان کو اپنے چنگل میں جکڑے رکھے۔ سیاسی اور فرقہ وارانہ اختلافات کو اپنے پروپیگنڈا مقاصد کے لئے استعمال کرے اور اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے قومی قوتوں کو کچل دے۔ اس نے کہا کہ ''میں برطانوی سامراج کی شکست کا متمنی ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی نازی ازم اور فاشزم کی مزاحمت بھی کرنا چاہتا ہوں۔'' تاہم اس نے کانگرس کی پر تشدد تحریک کی مذمت

کی اور یہ رائے ظاہر کی کہ ''اس سے ملک کو بہت نقصان پہنچا ہے'' وزیر اعلیٰ اللہ بخش کے اس بیان کے تقریباً دو ہفتے بعد 10 راکتوبر کو صوبائی گورنر نے اسے برطرف کر دیا اور اسی دن اس کی کابینہ کے ایک وزیر سر غلام حسین ہدایت اللہ کو وزارت سازی کی دعوت دے دی حالانکہ اس وقت اسے اسمبلی میں کسی ایک رکن کی بھی حمایت حاصل نہیں تھی۔ اسمبلی میں لیگ پارٹی کے ارکان کی تعداد سب سے زیادہ تھی اور اس کا قائد خان بہادر محمد ایوب کھوڑو تھا مگر کھوڑو کو وزارت سازی کی دعوت بظاہر اس لئے نہیں دی گئی تھی کہ گورنر کی رائے میں سر غلام حسین کی وفاداری زیادہ قابل اعتماد تھی۔ کھوڑو نے تو اپنی وفاداری کے ثبوت کے طور پر محض خان بہادری کا ہی مرحلہ طے کیا ہوا تھا لیکن غلام حسین ہدایت اللہ نے اس سے آگے بڑھ کر سر کا خطاب حاصل کیا ہوا تھا۔

سندھ صوبہ لیگ کے رہنماؤں کی جناح سے بغاوت اور غلام حسین وزارت کی تشکیل

سر غلام حسین ہدایت اللہ نے وزارت سازی کی دعوت موصول ہونے کے فوراً بعد ہی لیگ اسمبلی کے قائدین ایوب کھوڑو اور جی۔ ایم۔ سید وغیرہ سے بات چیت کی۔ اس واقعہ سے تقریباً چھ ماہ پہلے 26 رمئی 1942ء کو صوبہ لیگ کے صدر سر عبداللہ ہارون کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی جگہ ایوب کھوڑو صوبائی لیگ کے قائم مقام صدر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ جب اس نے اور جی۔ ایم۔ سید وغیرہ نے مرکزی لیگ ہائی کمان کی منظوری کے بغیر سر غلام حسین سے وزارت سازی کے سلسلہ میں بات چیت شروع کی تو سر عبداللہ ہارون کے بیٹے یوسف ہارون نے صدر مسلم لیگ قائد اعظم محمد علی جناح کو بذریعہ تار مطلع کر دیا۔ اس پر جناح نے 13 اور 14 راکتوبر کو اپنے دو تاروں میں لکھا کہ ''مسلم لیگ کسی ایک فرد یا گروہ کے ساتھ مل کر مخلوط وزارت نہیں بنا سکتی کیونکہ یہ بات ہمارے بنیادی اصولوں کے خلاف ہو گی۔'' جناح کا مطلب یہ تھا کہ چونکہ مسلم لیگ مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اس لئے وہ کسی علاقے کے کسی غیر مسلم لیگی فرد یا گروہ کو مسلمانوں کا نمائندہ تسلیم نہیں کر سکتی۔ لیکن جناح کے اس واضح مؤقف کے باوجود ایوب کھوڑو اور جی۔ ایم۔ سید نے سر غلام حسین کی مخلوط وزارت میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ طے شدہ پروگرام یہ تھا کہ ''(1) کابینہ لیگ اسمبلی پارٹی اور صوبہ لیگ کی مجلس عاملہ کی

عمومی نگرانی میں کام کرے گی۔ (2) مزارعت، ساہوکارہ اور انتقال اراضی کے بل اسمبلی میں پیش کئے جائیں گے اور انہیں منظور کروایا جائے گا۔ (3) حروں کی سرکوبی کے لئے ارباب اختیار کو جو غیر معمولی اختیار دیئے گئے ہیں انہیں محدود کیا جائے گا تا کہ بے گناہ لوگ اذیت کا شکار نہ ہوں اور مارشل لاء کے تحت علاقے کو کم کر کے اسی حد تک رکھا جائے جس کے اندر حروں کی سرگرمیاں رہتی ہیں۔''[23] اس فیصلہ پر عمل درآمد کے لئے لیگ اسمبلی پارٹی سے ایک قرارداد منظور کروائی گئی جس کی تائید صوبہ لیگ کی مجلس عاملہ اور کونسل نے بھی کی مگر شیخ عبدالمجید سندھی نے اس قرارداد سے اتفاق نہ کیا اور وہ اس بنا پر لیگ کے جنرل سیکرٹری کے عہدہ سے مستعفی ہو گیا۔ 18ر اکتوبر کو کھوڑو اور سید نے جب بذریعہ تار جناح کو اپنے اس فیصلہ سے آگاہ کیا تو صدر مسلم لیگ بہت برہم ہوئے اور انہوں نے 19ر اکتوبر کو انہیں مطلع کیا کہ ''لیگ اسمبلی پارٹی، صوبہ لیگ کی مجلس عاملہ اور کونسل کو میری منظوری کے بغیر اس قسم کا فیصلہ کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔'' تاہم جناح کی اس برہمی کے باوجود ایوب کھوڑو اور ہاشم گزدر نے اسی دن سر غلام حسین کی کابینہ کے ارکان کی حیثیت سے حلف اُٹھا لیا۔ 21ر اکتوبر کو ہندو انڈی پینڈنٹ پارٹی نے اس کابینہ کی شرائط کے طور پر 12 مطالبات پیش کئے۔ جن میں بڑے مطالبات یہ تھے کہ ''اس پارٹی کی منظوری کے بغیر ہندوؤں پر اثر انداز ہونے والی کوئی قانون سازی نہیں کی جائے گی۔ محکمہ مال ہندوؤں کو دیا جائے گا اور حروں کے خلاف نافذ شدہ قانون میں ترمیم کر کے اسے مزید سخت بنایا جائے گا۔''[24]

22ر اکتوبر کو سر غلام حسین ہدایت اللہ کا ہندو پارٹی سے سمجھوتہ ہو گیا اور اس سے اگلے دن 23ر اکتوبر کو اس نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ اسی دن خان بہادر اللہ بخش کا ایک رفیق خاص پیر الٰہی بخش بھی اس شرط پر مسلم لیگ میں شامل ہو گیا کہ اسے بھی کابینہ میں جگہ دی جائے گی۔ چنانچہ اس کی یہ شرط بھی پوری ہو گئی اور شام کو جس چھ رکنی کابینہ کی تشکیل ہوئی اس میں محکموں کی تقسیم اس طرح تھی:

1۔	وزیر اعلیٰ سر غلام حسین ہدایت اللہ	محکمہ خزانہ
2۔	خان بہادر محمد ایوب کھوڑو	محکمہ مال
3۔	محمد ہاشم گزدر	نظم ونسق
4۔	پیر الٰہی بخش	تعلیم

5۔ ڈاکٹر ہمن داس صحت وزراعت

6۔ رائے صاحب گوکل داس تعمیرات عامہ وبلدیات

صوبہ سندھ کی تقریباً ساڑھے پانچ سال کی تاریخ میں یہ پانچویں وزارت تھی۔ اس وقت تک سندھ اپنے سیاسی عدم استحکام کی بنا پر پورے برصغیر میں بہت بدنام ہو چکا تھا۔

8 نومبر 1942ء کو دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا تو ایوب کھوڑو، ہاشم گزدر اور جی۔ ایم۔ سید بھی وہاں پہنچے۔ انہوں نے سر غلام حسین کی کابینہ میں مسلم لیگ کی شمولیت کے جواز میں اپنا یہ موقف پیش کیا کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو صوبہ میں گورنر راج نافذ ہو جاتا لیکن شیخ عبدالمجید سندھی نے انکے اس موقف کی مخالفت کی اور کہا کہ سر غلام حسین ہدایت اللہ ایک موقع پرست اور نا قابل اعتبار شخص ہے۔ مسلم لیگ کو اس کی کابینہ میں شامل ہو کر خود اپنی رسوائی کا باعث نہیں بننا چاہیے تھا۔ مجلس عاملہ نے ان دونوں موقفوں پر طویل بحث کے بعد ایک قرارداد منظور کی ''جس میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا گیا تھا کہ سندھ مسلم لیگ نے وزارت سازی کے سلسلے میں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کی ہدایت پر عمل نہیں کیا۔'' تاہم مجلس عاملہ نے اکتوبر کے بعد کے واقعات کے پیش نظر نواب محمد اسماعیل خان، سر ناظم الدین، چودھری خلیق الزماں اور قاضی محمد عیسیٰ پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی۔ جس کے ذمہ یہ کام کیا گیا کہ وہ موقع پر حالات کا جائزہ لے کر مناسب اقدام کرے گی۔ اس کمیٹی کی تشکیل کا مطلب یہ تھا کہ چونکہ سر غلام حسین مسلم لیگ میں شامل ہو گیا ہے اس لئے اسکی کابینہ سے صوبہ لیگ کی وابستگی کو تسلیم کیا جا سکتا ہے اور یہ بات مسلم لیگ کے بنیادی اصولوں کے منافی نہیں ہو گی۔ چنانچہ دسمبر میں نواب اسماعیل خان اور چودھری خلیق الزماں کراچی پہنچے اور انہوں نے یہی فیصلہ صادر کیا۔ اس وقت تک میر غلام علی تالپور بھی مسلم لیگ میں شامل ہو چکا تھا اور پھر اس کے بعد جنوری اور فروری 1943ء میں مزید کئی مسلم ارکان لیگ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ حتیٰ کہ جب یکم مارچ 1943ء کو بجٹ سیشن شروع ہوا تو 36 مسلم ارکان میں سے لیگ اسمبلی پارٹی کی تعداد 29 تھی۔ چونکہ کانگرس کی ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک کی وجہ سے متعدد کانگرسی ارکان جیلوں میں چلے گئے تھے اس لئے ایوان میں لیگ پارٹی کو واضح اکثریت حاصل تھی۔

جی۔ایم سید نے سندھ اسمبلی سے برصغیر میں مسلمانوں کی آزادقومی ریاستوں کے قیام کیلئے قرارداد منظور کرائی

جی۔ایم۔سید نے اس صورتحال کے پیش نظر 3/مارچ 1943ء کوایک قرارداد پیش کی جو برصغیر کے کسی قانون سازادارے کی اپنی نوعیت کی پہلی قرارداد تھی۔اس قرارداد میں صوبائی حکومت سے سفارش کی گئی تھی کہ''وہ وائسرائے کی وساطت سے حکومت برطانیہ کواس صوبہ کے ان جذبات وخواہشات سے آگاہ کرے کہ چونکہ ہندوستان کے مسلمان ایک الگ قوم ہیں اوران کے خود اپنے الگ مذہب، فلسفہ، معاشرتی رسوم، ادب، روایات اور سیاسی و معاشی نظریات ہیں جو ہندوؤں سے بالکل مختلف ہیں لہٰذا وہ ایک واحد الگ قوم کی حیثیت سے ہندوستان کے ان علاقوں میں اپنی ریاستیں قائم کرنے کے مستحق ہیں جن میں ان کی اکثریت ہے۔ وہ زوردار الفاظ میں اعلان کرتے ہیں کہ ان کے لئے کوئی ایسا آئین قابل قبول نہیں ہوگا جو مسلمانوں کو ایک ایسی مرکزی حکومت کے ماتحت کردے جس پر کسی دوسری قوم کا غلبہ ہو۔چونکہ مسلمان مستقبل میں اپنے الگ واضح خطوط پر آزادانہ حیثیت سے اپنا کردار ادا کرنا چاہتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی الگ قومی ریاستیں قائم کریں۔اگر ہندوستان کے مسلمانوں کوایک مرکزی حکومت کے ماتحت کردیا گیا تو اس کی وجہ سے لازمی طور پر خانہ جنگی ہوگی جس کے سنگین اور ناخوشگوار نتائج برآمد ہونگے۔''اس قرارداد کی ایوان کے سارے مسلم ارکان نے تائید کی تھی البتہ سابق وزیراعلیٰ اللہ بخش غیر حاضر تھا۔دو ہندو وزیروں اور ایک پارلیمانی سیکرٹری نے قرارداد کے خلاف ووٹ دیئے تھے اور ہندوانڈی پینڈنٹ پارٹی کے ارکان واک آؤٹ کر گئے تھے۔[25]

سندھ اسمبلی کی یہ قرارداد آل انڈیا مسلم لیگ کے لئے بہت اہمیت کی حامل تھی کیونکہ دو سال پہلے 11/مارچ 1941ء کو پنجاب کا وزیراعلیٰ سرسکندر حیات خان لیگ کی 23/مارچ 1940ء کی قرارداد سے منحرف ہو گیا تھا اوراس نے اپنی جولائی 1939ء کی سکیم کے مطابق ہندوستان میں پانچ زونل فیڈریشنوں پر مشتمل کنفیڈریشن کے قیام کے مطالبہ کا اعادہ کیا تھا۔ پھر 12/اپریل 1942ء کو کرپس پلان کے تحت ہندوستان کو ڈومینین سٹیٹس (Dominion Status) کی پیش کش کی گئی تھی اور یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ جو صوبے اس ڈومینین میں شامل ہونا نہیں چاہیں گے انہیں اپنی

الگ ڈومینین قائم کرنے کا حق حاصل ہوگا اور پھر 25 راگست 1942ء کو سر فیروز خان نون نے علی گڑھ سٹوڈنٹس یونین کے ایک اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے تجویز پیش کی تھی کہ ہندوستان میں پانچ ڈومینینوں پر مشتمل ایک کنفیڈرل ڈھانچے کی تعمیر کی جائے۔

قائداعظم کی حمایت سے جی۔ایم۔سید کو سندھ صوبائی مسلم لیگ کا صدر بنایا گیا

متذکرہ تاریخی قرارداد کی منظوری کے فوراً بعد لیگ اسمبلی پارٹی کے مختلف دھڑوں کے درمیان اقتدار اور بالادستی کے لئے رسہ کشی شروع ہوگئی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ مئی 1942ء میں سر عبداللہ ہارون کے انتقال کے بعد خان بہادر محمد ایوب کھوڑو صوبہ لیگ کا قائم مقام صدر بنا تھا اور اکتوبر 1942ء میں سر غلام حسین ہدایت اللہ کی کابینہ میں شامل ہونے کے بعد بھی وہ اس عہدہ پر قائم رہنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جون 1943ء میں صوبہ لیگ کے عہدیداروں کا جو انتخاب ہونے والا ہے اس میں اس کے قدامت پسند جاگیردار دھڑے کا غلبہ ہو۔اس کے مقابلے میں جی۔ایم۔سید کے ''ترقی پسند'' درمیانہ طبقہ کے گروپ کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ صوبہ لیگ کی قیادت پر اس کا غلبہ ہوتا کہ صوبائی حکومت پر اس کی بالادستی قائم ہو۔

23 راپریل 1943ء کو دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا تو سندھ لیگ کا یہ مسئلہ برائے فیصلہ صدر مسلم لیگ محمد علی جناح کے روبرو پیش کیا گیا۔اس پر جناح نے سید گروپ کو ہدایت کی کہ وہ سر غلام حسین کی کابینہ کو فی الحال ہدف تنقید نہ بنائے اور اسے کچھ عرصہ اور کام کرنے کا موقع دے اور انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ مستقبل قریب میں خود کراچی آ کر یہ فیصلہ کریں گے کہ آئندہ صوبہ لیگ کا صدر کون ہوگا۔ 14 رمئی 1943ء کو صوبہ کے سابق وزیراعلیٰ اللہ بخش کو قتل کر دیا گیا اور اس کے بعد بعض حلقوں میں یہ تاثر پیدا ہوگیا کہ اس واردات میں خان بہادر کھوڑو کسی نہ کسی طرح ملوث تھا۔ چنانچہ جون کے اوائل میں جب جناح کراچی پہنچے تو ان کا فیصلہ یہ تھا کہ صوبہ لیگ کا صدر جی۔ایم۔سید کو ہونا چاہیے اور ان کے اس فیصلے کے مطابق 13 رجون کو سید کا اس عہدے کے لئے انتخاب ہوگیا۔

جی۔ایم۔سید کے اس انتخاب سے سندھ کے درمیانہ طبقہ کے تعلیم یافتہ عناصر کو قدرے خوشی ہوئی اور ان میں یہ امید پیدا ہوئی کہ شاید اب ان کے بدنصیب صوبے میں نہ صرف مسلمان

جاگیرداروں اور وڈیروں کی دھڑے بندی، ابن الوقتی اور مفاد پرستی کا کچھ سد باب ہو گا بلکہ یہاں ہندو ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کے استحصال میں بھی کچھ کمی ہو گی۔ ان عناصر نے صوبہ سندھ کی چھ سالہ تاریخ کے تجربے سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ مسلمان جاگیرداروں اور وڈیروں سے مفلوک الحال ہاریوں اور دوسرے غریب پسماندہ عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کسی مؤثر کاروائی کی توقع نہیں کی جا سکتی اور ہندو ساہوکاروں اور سیٹھوں سے بھی یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ صوبہ میں کوئی ایسی حکومت قائم رہنے دیں گے جو ان کے مفادات کے لئے خطرہ کا باعث بن سکتی ہو۔ ان عناصر کو امید تھی کہ جی۔ ایم۔ سید اپنی ماضی کی متلون مزاجی اور اندرون خانہ سیاسی جوڑ توڑ کی روایت کو ترک کر کے آئندہ بطور صدر صوبہ مسلم لیگ غریب سندھی عوام کی بھلائی کے لئے کوئی ٹھوس کام کر سکے گا۔

سندھ میں ہندو اقلیت کی ترقی اور مسلم اکثریت کی پس ماندگی کی صورتحال

سندھی مسلمانوں کے ان عناصر میں ایک نوجوان سید غلام مصطفیٰ بھی تھا۔ یہ نوجوان بہت رقیق القلب اور بالغ نظر تھا۔ اس کے لئے سندھی مسلمانوں کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی زبوں حالی ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ اس نے 1943ء کے اواخر میں 142 صفحات کی ایک مختصر سی کتاب لکھی جس میں اس نے سندھ کے میروں، پیروں، جاگیرداروں، وڈیروں، ہاریوں، ساہوکاروں اور سیٹھوں کی زندگی کا ایسا نقشہ کھینچا کہ آج بھی اس پر ایک نظر ڈالنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ''سندھی مسلمانوں میں کانگرس کی عدم مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ یہ جماعت یہاں کے ہندو بنیوں کے مفادات کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان ہندو بنیوں کی جو غریب مسلمان کسانوں کا خون چوستے ہیں۔ مسلمان کسانوں کے مقابلے میں ہندو کسانوں کی آبادی بہت ہی معمولی ہے اور ان کی یہ معمولی آبادی بھی اچھوتوں پر مشتمل ہے جبکہ ہندو کل آبادی کا 23 فیصد ہیں۔ سندھی مسلمانوں کی آبادی میں سے 92 فیصد بالکل ان پڑھ ہیں جبکہ ہندو سب کے سب خواندہ ہیں۔ سندھ کے سارے اناج پر ہندوؤں کا کنٹرول ہے اور اگر کوئی مسلمان اس کاروبار میں داخل ہونے کی کوشش کرے تو اسے آناً فاناً ختم کر دیا جاتا ہے۔ سارے سرکاری اعلیٰ عہدوں پر ہندوؤں کی اجارہ داری ہے اور کسی مسلمان کو ترقی کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ جب کبھی یہاں کے مسلمان اپنی زبوں حالی کو دور کرنے کی کوئی کوشش کرتے ہیں تو ہندوؤں کی طرف

سے یہ شور برپا ہوجاتا ہے کہ یہ مسلمان فرقہ پرست ہیں اور ہندوؤں کے دشمن ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس صوبہ کا گورنر ہمیشہ مسلم اکثریت کے حقوق کے تحفظ کے لئے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتا ہے حالانکہ دوسرے صوبوں میں اس قسم کے اختیارات کا استعمال اقلیت کے حقوق کے تحفظ کے لئے ہوتا ہے۔ خان بہادر اللہ بخش نے ہندوؤں کی حمایت کے سہارے حکومت کی تھی لہٰذا وہ مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکال سکتا تھا۔ وہ ہندوؤں کو مطمئن رکھنے پر مجبور تھا کیونکہ ان کی حمایت کے بغیر وہ وزیر اعلیٰ نہیں رہ سکتا تھا۔ اب سر غلام حسین ہدایت اللہ کی سربراہی میں مسلم لیگ کی وزارت کی حالت بھی اللہ بخش وزارت سے مختلف نہیں ہے۔ اسمبلی کے بیشتر مسلم ارکان قرضے کے بھاری بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں لہٰذا ان کے لئے سر غلام حسین کے زیر حفاظت رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ بہت سے مسلم ارکان اسمبلی نے مالیہ اراضی کی بھاری بقایا رقم ادا نہیں کی۔ لہٰذا وہ حکومت کے زیر سایہ ہی پر امن زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ وہ ہر اس حکومت کی حمایت کریں گے جو انہیں پریشان نہ کرنے کا وعدہ کرے گی۔ اللہ بخش کی وزارت کے سوا دوسری تمام وزارتوں کا تختہ کانگرس کی وجہ سے الٹا گیا تھا اور اللہ بخش کانگرس کی حمایت پر حکومت کرتا رہا۔ اب جبکہ کانگرسی جیلوں میں چلے گئے ہیں تو یہاں بظاہر مسلم لیگ کی مستحکم وزارت قائم ہے...... اس صوبہ میں 16 آئی۔سی۔ایس ہندو ہیں اور صرف ایک آئی۔سی۔ایس مسلمان ہے جو ابھی تک ڈیرہ دون میں زیر تربیت ہے...... یہاں جو وزارت بنتی ہے اس کے ارکان کو یقین ہوتا ہے کہ ان کی یہ وزارت زیادہ دیر قائم نہیں رہے گی۔ اس لئے وہ اپنے مختصر عہد وزارت میں خوب لوٹ مچاتے ہیں...... یہاں کے مسلمان وڈیرے معاشرتی لحاظ سے درندے ہیں۔ ان میں عدل و انصاف کا کوئی شعور نہیں ہے ان کے پاس پیسہ ہے لیکن تعلیم نہیں ہے۔ اُن کے پاس اقتدار ہے لیکن کوئی شعور نہیں ہے۔ وہ اعلیٰ حیثیت کے حامل ہیں لیکن آداب زندگی سے ناواقف ہیں۔ ان کے طور طریقے جنگلی ہیں۔ اگر ان میں سے کسی کو کسی باشعور محفل میں بٹھا دیا جائے تو اس کی حالت ایسی ہی ہوگی جیسی کہ مچھلی کی پانی سے باہر ہوتی ہے۔ وہ بھونڈے پن اور بدسلیقگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ گندی زبان میں باتیں کرتے ہیں اور ان کی گفتگو میں کوئی شائستگی نہیں ہوتی۔ وہ ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ ہر شائستہ آدمی ششدر رہ جاتا ہے۔ وہ صرف پیسہ بنانے، اقتدار کو غلط استعمال کرنے اور معاشرے میں خرابی پیدا کرنے

میں دلچسپی لیتے ہیں۔ انہیں غریبوں اور حاجت مندوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ وہ انتخابات پر، چائے پارٹیوں، ڈنر پارٹیوں اور جھوٹی مقدمہ بازی پر ہزاروں روپے خرچ کر دیتے ہیں لیکن غریبوں کی بھلائی کے لئے کبھی اپنی جیب سے ایک پائی بھی نہیں نکالتے۔ انہیں عوامی فلاح و بہبود کے کسی کام میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ البتہ اگر کوئی بڑا سرکاری افسر کسی کام کے لئے چندے کا مطالبہ کرے تو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر چندہ دیتے ہیں...... سندھ کے سیدوں کی بھی یہی حالت ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی بات پر مقدمہ بازی کرتے ہیں اور جب کوئی مقدمہ جیت جاتے ہیں تو پھر خوب بھنگ پیتے ہیں...... بڑے زمینداروں کو کتوں کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ وہ غریب کسانوں کو اذیت پہنچا کر بہت خوش ہوتے ہیں جبکہ خود سرکاری حکام اور ہندو ساہوکاروں کے چنگل میں پھنسے ہوتے ہیں۔ ان میں بے پناہ احساس کمتری ہوتا ہے۔ میں نے خود دیکھا کہ ایک خان بہادر نے پہلے ایک پولیس سب انسپکٹر کے پاؤں چھوئے اور پھر وہ اس کے سامنے چٹائی پر بیٹھ گیا۔ ان کے نزدیک انسان کی عظمت صرف پیسے سے ہوتی ہے اور ہمہ وقت صرف پیسے کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ انگریز حکام کی خوشنودگی کے لئے کوئی بھی مضحکہ خیز حرکت کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ اُن کے لئے انگریز کی خفگی نا قابلِ برداشت ہوتی ہے۔ وہ خودکشی کو انگریز کی حکم عدولی یا خفگی پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ انگریز سے اس قدر مرعوب ہیں کہ وہ اسے سپرمین تصور کرتے ہیں...... غریب عوام ان زمینداروں سے اتنی نفرت کرتے ہیں کہ جب کبھی ان میں سے کوئی مر جاتا ہے تو کسی کو بھی افسوس نہیں ہوتا...... بہت سے زمیندار غریب ہاریوں کی خوبصورت بیویوں کو اپنی نجی جائیداد تصور کرتے ہیں۔ یہ ہاریوں سے بطور حق بیگار لیتے ہیں...... ان بڑے زمینداروں کے علاوہ سندھ میں جاگیرداروں کا بھی ایک طبقہ ہے۔ ان جاگیرداروں کو تین چار وجوہ کی بنا پر زمین ملی ہوئی ہے۔ اول اس لئے کہ وہ کسی سابق حکمران خاندان کا رکن ہے۔ دوئم اس لئے کہ وہ کسی قبیلے کا سردار ہے۔ سوئم اس لئے کہ اس نے حکومت کی نہایت وفاداری سے کوئی خدمت سرانجام دی ہوئی ہے اور چہارم اس لئے کہ وہ کسی درگاہ کا سجادہ نشین ہے۔ ان جاگیرداروں کے قبضہ میں تقریباً 19 لاکھ ایکڑ رقبہ ہے جس کا یہ کوئی مالیہ ادا نہیں کرتے اور آبیانہ بھی بہت کم ادا کرتے ہیں...... یہ وڈیرے اور جاگیردار بہت بدکردار اور اخلاق باختہ ہیں اور منشیات کے بہت عادی ہیں۔ جتنی منشیات سندھ میں استعمال ہوتی ہیں اتنی برصغیر کے کسی دوسرے علاقہ میں نہیں ہوتیں۔ ہندوستان

میں تمباکو کی کل کھپت کا 12 فیصد حصہ صرف سندھ میں استعمال ہوتا ہے اور ہندوستان کی تقریباً 20 فیصد بھنگ، چرس اور افیون صرف سندھ میں استعمال ہوتی ہیں اور اس میں سے 50 فیصد سے زائد امراء کے استعمال میں آتی ہیں...... سندھ میں بااثر، آزاد اور خودمختار درمیانہ طبقہ کا وجود نہیں ہے اور جو چھوٹا سا درمیانہ طبقہ ہے اس کا معاشرے میں کوئی مقام نہیں ہے اس میں قومی زندگی پر اثرانداز ہونے کی کوئی قوت نہیں ہے اور یہ قیادت کی قوت سے بھی محروم ہے۔ یہ امراء کے جال میں سے نکلنے کی جرأت نہیں کرتا۔ درمیانہ طبقہ کی وساطت سے سندھ کے عوام کو ارتقاء کے عبوری دور میں سے نکالا جا سکتا تھا لیکن بدقسمتی سے اس طبقہ میں اس کام کی صلاحیت موجود نہیں ہے۔ یہ طبقہ اپنی معاشی جدوجہد میں بہت زیادہ الجھا ہوا ہے اور اسے عوام کی روزمرہ کی زندگی کو بہتر بنانے کے بارے میں سوچنے کی فرصت نہیں ہے۔ اس طبقہ کو ہمہ وقت فاقہ کشی کا خطرہ لاحق رہتا ہے اور اسی خطرے کی وجہ سے وہ ساری ذلتیں برداشت کرتا ہے۔ اس طبقہ کے لوگ غریبوں کی اس لئے رہنمائی نہیں کرتے کہ انہیں امراء کے خفا ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے...... یہ امراء کو اپنے سے برتر سمجھتے ہیں اور ان کی رفاقت اور نظرِ عنایت کے لئے ترستے رہتے ہیں۔ ان میں عزتِ نفس کا نام ونشان نہیں ہوتا اور امراء کے سامنے ان کی حیثیت جوتے چاٹنے والے کتوں کی سی ہوتی ہے۔ ان کے اس رویے نے ان کی ذہنی اور جسمانی نشوونما کو روک رکھا ہے...... جس معاشرے میں بااثر، بااختیار اور باشعور درمیانہ طبقہ نہ ہو اس کی معاشرتی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی زندگی کی بدحالی کا سدباب نہیں ہوسکتا۔ ساری دنیا میں سارے انقلابی آزاد، ذہین اور دیانت دار درمیانہ طبقہ نے پیدا کئے ہیں۔ روس کا انقلاب بھی درمیانہ طبقہ نے برپا کیا تھا۔ لینن بھی درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ فوج اور غریب عوام نے انقلاب کے بعد اُس کا ساتھ دیا تھا۔ درمیانہ طبقہ کاروباری اور تعلیم یافتہ عناصر سے بنتا ہے لیکن بدقسمتی سے سندھ کے مسلمان نہ تو کاروبار کرتے ہیں اور نہ تعلیم حاصل کرتے ہیں...... سندھ کے غریب عوام کے معاشرتی تنزل کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ ان میں سیاسی شعور نہیں ہے۔ وہ معاشی لحاظ سے کچلے ہوئے ہیں اور تعلیم سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ وہ مذہبی عصبیت کے حامل ہیں لیکن اخلاقی لحاظ سے بہت گرے ہوئے ہیں کیونکہ ہر بھوکا شخص پیٹ کے تنور میں کوئی نہ کوئی ایندھن ڈالنے کے لئے سب کچھ کر گزرتا ہے۔ انہیں اس گڑھے سے نکالنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں ہوئی...... سندھ کی آبادی تقریباً 45 لاکھ ہے۔ جس میں مسلمانوں کی آبادی

تقریباً 23 لاکھ ہے۔ تقریباً سارے مسلمان دیہات میں رہتے ہیں۔ جنگلات اور دور افتادہ علاقوں میں جگہ جگہ جھونپڑیاں نظر آتی ہیں۔ ان غریبوں کے پاس چند پھٹے پرانے کپڑوں، دو ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائیوں اور تین چار مٹی کے برتنوں کے علاوہ کوئی اثاثہ نہیں ہوتا۔ انہوں نے معاشرتی اور سیاسی تبدیلی کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔ انہیں اپنا پیٹ پالنے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ بھوک کا اژدھا ہمیشہ ان کے سروں پر لہراتا رہتا ہے۔ کوئی ہندو ساہوکار اور سیٹھ انہیں ذریعۂ روزگار مہیا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا اور کوئی مسلمان جاگیردار یا وزیران کے لئے دو وقت کی روٹی کا بندوبست نہیں کرتا۔ جب انگریز سندھ میں آئے تھے تو یہاں غیر مسلموں کی آبادی 15 فیصد تھی بلکہ اب یہ 27 فیصد ہیں کیونکہ نزدیکی ریاستوں اور ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں سے بہت سے غیر مسلموں کو یہاں لاکر آباد کر دیا گیا ہے۔ یو۔ پی سے زیادہ تر بنیے آئے ہیں اور پنجاب سے یہاں آنے والوں میں زیادہ تعداد سکھوں کی ہے...... سندھ کی 40 فیصد زمین 0.55 فیصد لوگوں کی ملکیت ہے بقیہ 60 فیصد زمین خود کاشت کرنے والے کسانوں کی ملکیت ہے۔ جب انگریز یہاں آئے تھے تو غیر مسلموں کے پاس کوئی زمین نہیں تھی لیکن اب وہ 30 لاکھ ایکڑ زمین کے مالک ہیں...... 32 لاکھ مسلمانوں میں سے تقریباً 3 لاکھ شہروں میں رہتے ہیں۔ ایک لاکھ مسلمان ایسے ہیں جو سالانہ پانچ سو روپیہ مالیہ ادا کرتے ہیں۔ بقیہ 28 لاکھ مسلمان غریب ہیں اور کسانوں کی آبادی انہی پر مشتمل ہے۔ ان 28 لاکھ مسلمانوں میں سے 27 لاکھ بے زمین ہاری ہیں اور ان 27 لاکھ ہاریوں میں سے 14 لاکھ خانہ بدوش ہیں۔ انکی کسی ایک جگہ مستقل رہائش نہیں ہوتی۔ یہ اپنے زمیندار تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ شہروں میں جو 3 لاکھ مسلمان رہتے ہیں ان میں سے چند ہزار کے سوا باقی سب مزدور ہیں۔ کراچی، حیدرآباد، سکھر اور دوسرے شہروں میں کوئی غیر مسلم مزدور نہیں ملتا۔ غیر مسلموں کی کل آبادی میں سے صرف 8 فیصد کاشت کاری کرتے ہیں اور وہ بھی اچھوت ہیں۔ کچھ اچھوت تھرپارکر، نواب شاہ اور حیدر آباد کے اضلاع میں مزدوری بھی کرتے ہیں...... بڑے زمینداروں کی زیر ملکیت رقبہ اتنا زیادہ ہے کہ وہ اپنی نااہلیت کے باعث اس کی دیکھ بھال نہیں کر سکتے۔ ایسے بیسیوں زمیندار ہیں جو کبھی اپنی زمینوں پر گئے ہی نہیں۔ وہ اپنے کارندوں سے اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کرواتے ہیں...... سندھ کے مولویوں اور پیروں کو سمجھے بغیر یہاں کے مسلم عوام کے حالات کو سمجھنا ممکن نہیں۔ یہاں کا پیر امراء کے طبقہ سے تعلق رکھتا ہے اور

مولوی کا تعلق درمیانہ طبقہ سے ہوتا ہے اس لئے یہ دونوں ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔ سندھ کے پیر میں کوئی روحانی برتری یا صوفیانہ صفت نہیں ہوتی۔ اس کی روحانیت جعلی ہوتی ہے اور وہ اس جعلی روحانیت کے زور پر ان پڑھ اور جاہل عوام کی زندگی وموت سے کھیلتا ہے۔ سندھ کے پیر کوئی کام نہیں کرتے۔ وہ سارا سال اپنے غریب مریدوں سے نذرانے وصول کرتے ہیں اور پھر اس کثیر رقم سے عیش کرتے ہیں۔ کسی زمانے میں جس شخص کو پیر کہتے تھے وہ اعلیٰ اوصاف واخلاق کا حامل ہوتا تھا لیکن آج کل پیر اس شخص کو کہتے ہیں جس کا کردار ابلیسی ہوتا ہے۔ بے داغ کردار والے پیروں کی تعداد بہت تھوڑی ہے جبکہ 90 فیصد پیر انتہائی اخلاق باختہ ہیں۔ یہ پیر عوام الناس کی ترقی کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔ یہ عوام میں سیاسی شعور پیدا نہیں ہونے دیتے۔ ان پیروں کے پاس بہت دولت ہے اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہیں اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں روحانی قوت ملی ہے اور ان پیروں کے مرید سارے سندھ میں پائے جاتے ہیں۔ بڑے جاگیرداروں یا زمینداروں یا اعلیٰ حکام کا کوئی نہ کوئی مرشد یا پیر ہوتا ہے۔ سندھ میں ایسا کوئی فرد یا خاندان نہیں جس کا کوئی نہ کوئی پیر نہیں ہے۔ جس شخص کا کوئی پیر نہ ہو اس کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی زندگی پر دونوں جہانوں میں عذاب نازل ہوتا ہے۔ کوئی شخص اپنا پیر بدل نہیں سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی عقیدت کا محور تبدیل کرے تو اس پر پہلے پیر کی پھٹکار پڑتی ہے اور عوام اس کی مذمت کرتے ہیں۔ یہ پیر اپنے مریدوں کی عقیدت مندی کو پائیدار رکھنے کے لئے انہیں اپنے آباؤ اجداد کے ایسے معجزے بتاتے رہتے ہیں جن کی کوئی تصدیق نہیں ہوسکتی۔ اگر کوئی شخص کسی قبر پر گنبد بنا لے اور پھر اس مقبرے کا مجاور اور گدی نشین بن کر اپنے عظیم آباؤ اجداد کے معجزے سنانے شروع کردے تو وہ خود بھی پیر بن جاتا ہے۔ پھر ماہانہ یا سالانہ میلہ ہوتا ہے جس میں رنڈی بازی اور قمار بازی ہوتی ہے اور بھنگ اور دوسری منشیات کا خوب استعمال ہوتا ہے۔ پیر منشیات کے استعمال کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس طرح انسان کو روحانی طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ وہ قبروں کی پرستش کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ بلکہ خود اپنی پوجا کرواتا ہے۔ وہ لوگوں کو ان قبروں کی مٹی دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا نذرانہ دو اور پھر اسے کھالو۔ اس سے نہ صرف روحانی فائدہ ہوگا بلکہ جسمانی بیماری کا بھی علاج ہوگا۔ ان پیروں کے بہت سے حرامی بچے ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے مریدوں پر بے پناہ قابو ہوتا ہے اور وہ ان سے جو چاہتے ہیں کرواتے ہیں۔ کوئی مرید اپنے پیر کی سیاسی زندگی

میں اس کی مخالفت نہیں کرسکتا۔ اگر وہ ایسا کرے تو اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ حروں کے پیر پگاڑو اور لواری کے پیر کی بے پناہ سیاسی قوت کا راز یہی ہے...... مختصر یہ کہ آج کل سندھ کے مسلمانوں کی زبوں حالی کی وجہ یہ ہے کہ امراء کے طبقہ کو عوام کی فلاح و بہبود میں کوئی دلچسپی نہیں، درمیانہ طبقہ بزدل اور موقع پرست ہیں۔ نوجوان روایت پسند اور ماضی پرست ہے۔ سرکاری حکام بدکردار ہیں اور پیر اور مولوی منافق ہیں۔ ہم ایسے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں جس کے کنارے پر مولوی کھڑا ہے اور جس کے مرکز میں سیاسی قوت ہے۔ مولوی کے پاس ہنٹر ہے اور وہ کنارے پر کھڑا ہو کر سرکس انسٹرکٹر کا کردار ادا کر رہا ہے...... ہماری تہذیب مُلّا اور مولوی کے پاؤں تلے کچلی جا رہی ہے۔ پیری مریدی ایک ایسا خطرناک کیڑا ہے جس نے ہماری تہذیب کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ ان ملاؤں نے ہمارے سادہ مذہب اسلام کو رسوم و روایات کا مذہب بنا دیا ہے۔ مولوی کے نزدیک ذہن کی آزادی ایک جرم ہے۔ آپ کے ذہن کے سارے دروازے بند ہونے چاہئیں۔ اگر آپ نے اپنے ذہن میں کسی نئے تصور کو گھسنے کی اجازت دی تو آپ پر کفر اور غداری کا ٹھپہ لگ جائے گا اور آپ کو معاشرتی طور پر دھتکار دیا جائے گا...... ہمارے لئے لازمی ہے کہ ہم ان پیروں اور مولویوں سے اپنا تحفظ کریں۔ بصورت دیگر ہمیں آئندہ بہت بڑے خطرات درپیش ہونگے۔ ہم نے ہمیشہ بیرونی مشکلات کا کامیابی سے مقابلہ کیا ہے لیکن اپنے داخلی تباہ کن دھماکے کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ مولوی تپ دق کا کیڑا ہے۔ اسے تباہ کرنا بہت ضروری ہے۔''[26]

سید غلام مصطفیٰ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا اور سیاسی نظریے کے لحاظ سے پکا مسلم لیگی تھا۔ اس کے نوجوان سینے میں سندھی مسلمانوں کی بدحالی کو دیکھ کر بہت درد ہوتا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس نے کتاب اپنے خون کے آنسوؤں سے لکھی تھی۔ تاہم اس نے اس میں 1943ء کے سندھی مسلم معاشرے کا جو ہولناک نقشہ کھینچا تھا اس کے پیش نظر اس معاشرے کی اصلاح و ترقی کا کام کوئی آسان نہیں تھا۔ اسے خوش فہمی تھی کہ شاید جی۔ایم سید جیسے عناصر اس سلسلے میں کچھ کر سکیں گے مگر بہت جلد پتہ چل گیا کہ ان میں یہ عظیم کام سرانجام دینے کے لئے مطلوبہ صلاحیت نہیں تھی۔ جی۔ایم۔سید اپنی سیاسی سیماب پائی اور اندرون خانہ جوڑ توڑ کی روایت کو ترک نہ کر سکا اور سندھ کی سیاست پر میروں، پیروں، جاگیرداروں اور وڈیروں کا غلبہ بدستور قائم رہا۔ نتیجتاً ہاریوں اور دوسرے مظلوم عوام کے لئے کوئی صحت مند تبدیلی واقع نہ ہوئی۔

باب: 4

جی۔ایم۔سید اور قائداعظم کے مابین اختلافات کی بنا

جی۔ایم۔سید درمیانہ طبقہ کا نمائندہ، غلام حسین ہدایت اللہ جاگیرداروں کا نمائندہ

جولائی 1943ء میں سندھ اسمبلی کا سیشن ہوا تو لیگ اسمبلی نے جاگیرداروں کے دباؤ کے تحت ایک کمیٹی مقرر کر کے اسے ہدایت کی کہ وہ جاگیرداری ایکٹ پر نظرثانی کرے یہ قانون اللہ بخش وزارت کے عہد میں منظور ہوا تھا اور اس کے تحت مخدوموں کو کچھ ایسی رعائتیں دی گئی تھیں جو جاگیرداروں کو قابل قبول نہیں تھیں اور وہ اس قانون کو منسوخ کروانے کے درپے تھے۔ انہوں نے اس سیشن میں آنریری مجسٹریٹوں کے نظام کو بحال کرنے کے حق میں ایک قرارداد بھی منظور کرائی تھی تا کہ انہیں دیہی عوام کی زندگی پر ظالمانہ اختیارات حاصل رہیں۔ شیخ عبدالمجید سندھی نے لیگ وزارت کے یہ طور طریقے دیکھے تو وہ بہت مایوس ہوا۔ چنانچہ وہ اس مایوسی کی بنا پر مسلم لیگ کی رکنیت سے مستعفی ہو گیا اور پیر علی محمد راشدی نے 15 نومبر 1943ء کو جی۔ایم۔سید کے نام ایک طویل خط میں اسے ترغیب دی کہ وہ بھی لیگ سے علیحدگی اختیار کر لے کیونکہ جس نصب العین کے ساتھ وہ 1938ء میں مسلم لیگ میں شامل ہوا تھا اس کے پورا ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ تاہم جی۔ایم۔سید نے اس وقت راشدی کے مشورے پر عمل نہ کیا اور وہ بطور صدر صوبہ لیگ کراچی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ سیشن کی تیاریوں میں مصروف رہا۔

دسمبر 1943ء میں مسلم لیگ کا یہ سالانہ اجلاس بڑی دھوم دھام سے منعقد ہوا۔ ان دنوں ہندو مسلم تصفیہ کے لئے راج گوپال اچاریہ کا فارمولہ اخباری بحث کا موضوع بنا ہوا تھا۔ جناح نے اس اجلاس میں اپنی صدارتی تقریر میں اس فارمولے پر کوئی تبصرہ نہ کیا البتہ انہوں نے ہندوؤں سے اپیل کی کہ وہ اس اصول کو تسلیم کر لیں جس کی بنیاد پر مسلمانان ہند علیحدگی کا مطالبہ کر

رہے تھے۔اس اجلاس میں ایک چھ رکنی مجلس عمل اور ایک پاکستان پلاننگ بورڈ کی تشکیل کی گئی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں کی سیاست ایک نئے مرحلے میں داخل ہو گئی تھی اور مسلم لیگ کو اپنا نصب العین پورا ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ سندھ کی طرف سے مجلس عمل میں جی۔ایم۔سید کو شامل کیا گیا تھا۔اس مجلس عمل کے ذمے یہ کام کیا گیا تھا کہ وہ (1) سارے صوبوں میں مسلم لیگ کے آئین میں یکسانیت پیدا کرے گی۔(2) نیشنل گارڈز تحریک کی نئ آئین کے تحت از سر نو تنظیم کرے گی۔(3) سارے ہندوستان کا دورہ کر کے مقامی حالات کا جائزہ لے گی۔ (4) تعلیمی اصلاحات تجویز کرے گی اور (5) مسلم لیگ کے نصب العین کی تشہیر کا بندوبست کرے گی۔جی۔ایم۔سید کو اس مجلس عمل کی وساطت سے کل ہند سیاست میں حصہ لینے کا موقع ملا جبکہ سندھ میں مسلم لیگ کی مقبولیت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔14 ر مارچ 1944ء کو جب پراونشل لیگ کونسل کا اجلاس ہوا تھا تو سندھ میں لیگ کے ممبروں کی تعداد 3 لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔

جی۔ایم۔سید کی کل ہند سطح پر سیاسی ترقی اور صوبہ میں مسلم لیگ کی بے پناہ مقبولیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ گزشتہ کئی ماہ سے سید کی صوبائی مسلم لیگ اور سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت کے درمیان جس تضاد کی پس پردہ نمود ہو رہی تھی وہ یکا یک منظر عام پر آ گیا۔اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ جی۔ایم۔سید بطور صدر صوبہ مسلم لیگ شہری اور دیہاتی مسلم عوام کے درمیانہ طبقہ کے مفادات کی ترجمانی کرتا تھا جبکہ سر غلام حسین ہدایت اللہ بطور وزیر اعلیٰ صوبہ کے میروں، پیروں، جاگیرداروں اور وڈیروں کے مفادات کی نگرانی کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ جی۔ایم۔سید کو شکایت تھی کہ اکتوبر 1942ء میں اس کی اپنی پرزور حمایت سے سر غلام حسین کی جو وزارت بنی تھی اس نے لیگ اسمبلی پارٹی کی جانب سے عوامی فلاح و بہبود کے لئے منظور کردہ قراردادوں میں سے کسی ایک قرارداد پر بھی عمل نہیں کیا اور وزیر اعلیٰ صوبہ لیگ کی پالیسی کے برعکس جاگیرداروں کے مفادات کا تحفظ کرتا ہے۔دوسری طرف سر غلام حسین ہدایت اللہ کو یہ شکایت تھی کہ جی۔ایم۔سید نے اپنی مجلس عاملہ کو ایک سپر گورنمنٹ کی حیثیت دے رکھی ہے اور وہ حکومت کے کام میں بے جا مداخلت کرتا رہتا ہے۔ بظاہر دونوں کے الزامات صداقت سے خالی نہیں تھے۔جی۔ایم۔سید واقعی بہت خود پسند اور برخود غلط شخص تھا اور وہ اس وجہ سے حکومت سے باہر رہ کر سیاسی جوڑ توڑ کرنے اور وزراء پر حکم چلانے کا عادی تھا۔ دوسری طرف سر غلام حسین ہدایت اللہ واقعی بہت

رجعت پسند جاگیردار تھا، اسے غریب مسلم عوام کی فلاح وترقی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ صوبائی لیگ کی کسی پالیسی پر عمل نہیں کرتا تھا اور ہمہ وقت اپنے جاگیردار طبقے کے مفادات کی نگرانی میں مصروف رہتا تھا۔ مزید برآں وہ ہندو ساہوکاروں اور سیٹھوں کے مفادات کا بھی تحفظ کرتا تھا اور انگریزوں کی کاسہ لیسی میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتا تھا۔

جون 1944ء میں جی۔ایم۔سید مرکزی مجلس عمل کے رکن کی حیثیت سے پشاور گیا تو اسے معلوم ہوا کہ وہاں ڈاکٹر خان صاحب کی کانگرسی وزارت کی جگہ مئی 1943ء میں سردار محمد اورنگزیب خان کی سربراہی میں جو مسلم لیگی وزارت بنی ہوئی تھی وہ عوام الناس میں بہت غیر مقبول تھی کیونکہ وہ بھی غریب عوام کے لئے کوئی فلاحی کام کرنے کی بجائے سامراج نواز جاگیرداروں کے مفادات کو ترجیح دیتی تھی۔ جی۔ایم۔سید اس دورے سے واپس آیا تو اس نے 7رجولائی 1944ء کو اپنی مجلس عاملہ سے ایک طویل قرارداد منظور کرائی جس میں یہ کہا گیا کہ ''چونکہ سر غلام حسین کی وزارت نے اپنے دو سال کے عہد اقتدار کے دوران مسلم لیگ کے پروگرام پر عمل نہیں کیا۔ اس نے مالیہ کی شرح میں 200 سے 300 فیصد تک اضافہ کر دیا ہے۔ اس نے اناج کی سرکاری خریداری کے لئے ایسے سنڈیکیٹس قائم کئے ہیں جو کاشت کاروں کو لوٹ رہے ہیں۔ اس کی اس پالیسی کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ گندم کا بھاؤ نو روپے آٹھ آنے فی من سے کم ہو کر سات روپے فی من ہو گیا۔ ہاری ہمارے صوبہ کی ریڑھ کی ہڈی ہیں اور انکی فلاح وبہبود مسلم لیگ کا اولین نصب العین ہے۔ اگر مسلم لیگ ان کے مفاد کو فروغ نہیں دے سکتی تو اس کے قائم رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ سر غلام حسین کی وزارت نے نہ صرف تاخیری حربے استعمال کر کے ابھی تک قانون مزارعت بھی منظور نہیں کیا بلکہ وہ جاگیرداری ایکٹ میں بھی ایسی ترمیم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے جو غریب کاشتکاروں کے مفاد کے منافی ہو گی۔ اسکی مجوزہ ترمیم کا مقصد یہ ہے کہ اسے جاگیردار ارکان اسمبلی کی حمایت حاصل رہے۔ لہٰذا مجلس عاملہ کا فیصلہ یہ ہے کہ موجودہ وزراء کی کونسل صوبہ سندھ اور مسلمانوں کے مفاد کی خاطر مستعفی ہو جائے۔''[1] اسے یہ قرارداد اصولی طور پر مسلم لیگ اسمبلی پارٹی سے منظور کروانی چاہیے تھی مگر اس نے ایسا محض اس لئے نہیں کیا کہ اسے اسمبلی پارٹی میں اس کے منظور ہونے کی توقع نہیں تھی کیونکہ اسمبلی میں سر غلام حسین کی اکثریت تھی۔ تاہم مجلس عاملہ کی اس قرارداد سے صاف ظاہر تھا کہ صدر صوبہ لیگ جی۔ایم۔سید

اوروزیراعلیٰ سرغلام حسین ہدایت اللہ کے درمیان کھلم کھلا محاذ آرائی شروع ہوگئی تھی۔ اب صوبہ میں بیک وقت دونوں کی بالادستی قائم نہیں رہ سکتی تھی۔

جناح نے جی۔ایم۔سید کے مقابلے میں غلام حسین کی حمایت کی جو جناح اورسید کے مابین وجہ نزاع بنی

جی۔ایم۔سید نے متذکرہ قرارداد غالباً اس تاثر کے تحت منظور کروائی تھی کہ قائداعظم محمد علی جناح نے جس طرح اپریل 1944ء میں پنجاب کے وزیراعلیٰ سرخضر حیات خان ٹوانہ اور صدر صوبہ لیگ خان افتخار حسین خان آف ممدوٹ کے گروپ کے درمیان تنازعہ کا فیصلہ صوبہ لیگ کے حق میں اس طرح صادر کیا تھا کہ سرخضر کو مسلم لیگ سے خارج کردیا تھا اسی طرح وہ سندھ میں بھی وزیراعلیٰ سرغلام حسین کے خلاف اور صوبہ لیگ کے حق میں فیصلہ دیں گے مگر اس کا یہ تاثر غلط ثابت ہوا۔ جب یہ قرارداد بذریعہ تار صدر مسلم لیگ قائداعظم جناح کو بھیجی گئی تو وہاں سے جو جوابی تار آیا اس میں درج شدہ فیصلہ سرغلام حسین کے حق میں تھا۔ جناح کے تار میں لکھا تھا کہ ''ایسے معاملات کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار مرکزی پارلیمانی بورڈ کو حاصل ہے۔ صوبہ لیگ کو اس سلسلے میں مزید کوئی کاروائی نہیں کرنی چاہیے بلکہ اسے یہ معاملہ لاہور میں 29/جولائی کو ورکنگ کمیٹی کونسل اور یکم/اگست کو پارلیمنٹری بورڈ کے اجلاس میں پیش کرنا چاہیے۔''[2]

چنانچہ جب 31/جولائی 1944ء کو لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا تو جو سب سے اہم مسئلہ زیرغور آیا وہ سندھ کا مسئلہ تھا۔ ''قائداعظم نے مسٹر جی۔ایم۔سید اور وزیراعلیٰ سرغلام حسین ہدایت اللہ اور ان کے ساتھی مسٹر ایم۔اے۔کھوڑو کے خیالات سنے اور آخر میں دونوں فریقوں میں سمجھوتہ ہوگیا اور طے پایا کہ پراونشل لیگ سرغلام حسین کی وزارت کی امداد جاری رکھے گی اور وزارت پراونشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے احکام کے ماتحت کام کرے گی۔''[3] مگر جی۔ایم۔سید کے بیان کے مطابق دونوں فریقوں میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہوا تھا بلکہ ہوا یہ تھا کہ جناح سرغلام حسین کی وزارت کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں تھے اور مجلس عاملہ کے کسی رکن میں جناح کی خواہش کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہیں تھی۔ بالآخر تکنیکی وجہ کی بنا پر یہ فیصلہ ہوا تھا کہ ''متذکرہ قرارداد کو لیگ اسمبلی پارٹی کے روبرو پیش کیا جائے

گا۔لیکن اس کے بعد ہمارے ذہن میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ ہائی کمان کے روبرو سندھ وزارت کے خلاف کسی کیس کی شنوائی نہیں ہوگی...... جناح مجلس عاملہ کے اجلاس میں مجھ پر بہت برہم ہوا تھا اور اس نے میری توہین کی تھی۔''[4] چونکہ جی۔ایم۔سید خود بہت انانیت پسند تھا اس لئے اس نے جناح کی برہمی کے باوجود آل انڈیا مسلم لیگ کے اس فیصلے کو قبول نہ کیا اور اس نے 5 راگست کو واپس کراچی پہنچ کر اورینٹ پریس کے نمائندہ کو بتایا کہ ''میں نے وزارت کے خلاف الزامات واپس نہیں لئے۔وہ قرارداد ابھی تک قائم ہے۔'' اس کے اس انٹرویو کا مطلب یہ تھا کہ وہ صوبہ سندھ میں اپنی بالادستی قائم کرنے کے لئے قائداعظم جناح سے بھی محاذ آرائی پر آمادہ تھا۔ اس کے اس باغیانہ رجحان کی وجہ یہ تھی کہ وہ صوبائی سیاست کو کل ہند سیاست پر ترجیح دیتا تھا۔اس کا خیال تھا کہ اگر مسلم لیگ کی سیاست صوبوں میں ترقی پسند اور صحت مند ہوتو اس کی کل ہند سیاست میں ترقی پسندی کا عنصر غالب رہے گا۔ بالفاظ دیگر وہ چاہتا تھا کہ مسلم لیگ کی صوبائی اور مرکزی دونوں ہی سطح پر درمیانہ طبقہ کا غلبہ ہومگر قائداعظم جناح ان دنوں مسلمانوں کے سارے طبقوں کے وسیع ترین متحدہ محاذ کے حق میں تھے۔ان کی رائے یہ تھی کہ اگر مسلم لیگ کی کسی سطح پر بھی تفرقہ پیدا ہوا تو اس کا اثر اس کی کل ہند سیاست پر پڑے گا۔

اگست 1944 میں جرمنی ،اٹلی اور جاپان کی شکست یقینی نظر آرہی تھی۔جنوب مشرقی ایشیا میں ہزیمت اٹھانے کے بعد جاپان میں جنرل ٹوجو کی حکومت مستعفی ہوچکی تھی۔ یورپ میں سوویت یونین نے زبردست جوابی حملہ شروع کر دیا ہوا تھا اور ہٹلر کی فوجیں بری طرح پسپا ہورہی تھیں اور اتحادی فوجیں جرمنی کے خلاف دوسرا محاذ کھولنے کے لئے شمالی فرانس میں اتر گئی ہوئی تھیں۔ان حالات میں ہر ایک کو پتا تھا کہ حکومت برطانیہ جنگ کے خاتمہ کے بعد ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں قطعی فیصلہ کرنے پر مجبور ہوگی اور وائسرائے ویول اس مقصد کے لئے کانگرس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کے ساتھ سلسلہ جنبانی شروع کر چکا تھا اور راج گوپال اچاریہ کی جانب سے یہ کوشش بھی جاری تھی کہ کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان ہندو مسلم تنازعہ کا کوئی تصفیہ ہوجائے۔ایسے حالات میں جناح نہ صرف اپنی جماعت کی صفوں میں مکمل اتحاد واتفاق کے متمنی تھے بلکہ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ بعض علاقوں کے مسلمانوں نے مسلم لیگ سے الگ جو چھوٹی موٹی جماعتیں بنا رکھی ہیں وہ بھی کسی نہ کسی طرح مسلم لیگ میں شامل ہوجائیں تا کہ ان کے اس دعویٰ کو

کوئی چیلنج نہ کر سکے کہ مسلم لیگ مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔

جی۔ایم۔سید صدر مسلم لیگ قائداعظم محمد علی جناح کی اس سیاسی حکمت عملی کو سمجھتا تھا لیکن وہ اس سے اتفاق نہیں کرتا تھا۔ وہ بہر قیمت سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت کا تختہ الٹنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس کی لاہور سے واپسی کے دو تین ہفتے بعد جب سابق وزیر اعلیٰ اللہ بخش کے قتل کے مقدمہ کی سماعت کے دوران ایک ملزم نے اقبال جرم کرتے ہوئے یہ الزام لگایا کہ ''اللہ بخش کے قتل کی سازش خان بہادر ایوب کھوڑو کے ایما پر ہوئی تھی اور اس نے قاتلوں کو انعام دینے کا وعدہ کیا تھا۔'' تو صوبہ مسلم لیگ کے دو دھڑوں میں اقتدار کی رسہ کشی میں شدت پیدا ہوگئی اور 26 ستمبر کو اس رسہ کشی میں مزید اضافہ ہوگیا جب کہ خان بہادر کھوڑو کو اللہ بخش کے قتل کے مقدمہ میں ملوث ہونے کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔ اپنی اس گرفتاری سے قبل کھوڑو وزارت کے عہدہ سے مستعفی ہوگیا تھا اور گورنر نے فوراً ہی اس کا استعفیٰ منظور کرلیا تھا۔ اس واقعہ سے سر غلام حسین کی سیاسی پوزیشن خاصی کمزور ہوگئی کیونکہ خان بہادر کھوڑو اس کا طاقتور سیاسی حلیف تھا اور اس کے وزیر مال ہونے کی وجہ سے اسمبلی کے جاگیردار ارکان اس کی گرفت میں تھے۔ کھوڑو کے استعفیٰ کے فوراً بعد پہلے تو مسلم لیگ کے مختلف دھڑوں کے درمیان اس کے خالی عہدہ کے لئے کھینچا تانی شروع ہوئی۔ سید گروپ کی خواہش یہ تھی کہ اس کے امیدوار سید محمد علی شاہ کو کھوڑو کی جگہ وزیر مال بنایا جائے مگر میر گروپ یہ عہدہ میر علی احمد تالپور کو دلوانا چاہتا تھا اور ایک تیسرے گروپ کی کوشش یہ تھی کہ میر بندے علی تالپور کو کھوڑو کی خالی کردہ وزارت مل جائے۔ وزارت کے لئے یہ بھاگ دوڑ تقریباً ڈیڑھ ماہ تک جاری رہی۔

سر غلام حسین کی کابینہ کا ایک رکن ہاشم گزدر۔ جی۔ایم۔سید گروپ سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ اب تک اندر خانے یہ کوشش کرتا رہا تھا کہ وہ خود سر غلام حسین کی جگہ مسلم لیگی وزیر اعلیٰ بن جائے۔ اس نے نومبر کے اوائل میں اس مقصد کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری نواب زادہ لیاقت علی خان کی حمایت حاصل کرنے کی بھی کوشش کی تھی جبکہ اس نے ایک خط میں نواب زادہ کو بتایا تھا کہ ''کانگرسی ارکان اسمبلی عنقریب اپنی رہائی کے بعد اس کی حمایت کریں گے کیونکہ مرکزی اسمبلی میں کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان تعاون کی فضا پیدا ہوگئی ہے۔''[5]

نوابزادہ لیاقت علی خان کے نام ہاشم گزدر کے اس خط کا پس منظر یہ تھا کہ ان دنوں اخبارات ایسی

خبروں سے بھر پور تھے کہ مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے ڈپٹی لیڈر نواب زادہ لیاقت علی خان نے مرکز میں عبوری حکومت کے قیام کے لئے قائداعظم محمد علی جناح سے بالا بالا کانگرس اسمبلی پارٹی کے لیڈر بھولا بھائی ڈیسائی سے کوئی سمجھوتہ کرلیا ہوا ہے۔نواب سر محمد یامین لکھتا ہے کہ یہ ''خفیہ معاہدہ یکم اپریل 1944ء کو اس کے گھر میں ہوا تھا جبکہ قائداعظم محمد علی جناح بہت بیمار ہونے کے بعد دہلی سے بمبئی اور وہاں سے ملیر چلے گئے تھے......اس وقت یہ بات زیر بحث نہیں آئی تھی کہ لیاقت علی خان اس سلسلے میں قائداعظم کی منظوری حاصل کرے گا۔لیاقت علی خان کا خیال ڈاکٹروں کی رائے کی وجہ سے یہ تھا کہ قائداعظم صرف چند دن کے مہمان ہیں اور اب ان کو اس کی تکلیف دینے کی ضرورت نہیں۔''[6] بظاہر جی۔ایم۔سید اور ہاشم گزدر کو اخباری رپورٹوں کے پیش نظر یہ غلط فہمی ہوچکی تھی کہ چونکہ آل انڈیا مسلم لیگ کی قیادت اب عملی طور پر نواب زادہ لیاقت علی خان کے پاس چلی گئی تھی اور وہ کانگرس کے ساتھ تعاون کا حامی ہے اس لئے اگر انہیں نواب زادہ کی حمایت حاصل ہو جائے گی تو وہ سر غلام حسین کی وزارت کا تختہ الٹ کر خود کانگرس کے تعاون کے ساتھ اپنی وزارت بنالیں گے مگر ان کی یہ خواہش و کوشش کامیاب نہ ہوئی اور سر غلام حسین ہدایت اللہ نے لیگ اسمبلی پارٹی سے مشورہ کئے بغیر 13 رنومبر کو میر غلام علی تالپور کو اپنی کابینہ میں شامل کر لیا اور اس کے ساتھ اس نے ایک انگریز زمیندار سر راجر ٹامس کو بھی ایک ایڈیشنل وزارت کے عہدہ پر فائز کر دیا حالانکہ وہ صوبائی اسمبلی کا رکن بھی نہیں تھا۔

جی۔ایم۔سید لکھتا ہے کہ اس موقع پر سر غلام حسین نے صوبائی پارلیمانی پارٹی کے ایک رکن سید محمد علی شاہ کو بھی اس شرط پر وزارت کی پیش کش کی تھی کہ وہ پارلیمانی بورڈ کے رکن کی حیثیت سے اس کے بیٹے انور حسین ہدایت اللہ کے حق میں ووٹ دے کر شکار پور کے ضمنی انتخاب کے لئے اسے لیگ کا ٹکٹ دلوا دے گا۔مگر سید محمد علی شاہ نے اس سودا بازی سے انکار کر دیا تھا۔ شکار پور کے حلقہ کی نشست پہلے مئی 1943ء میں خان بہادر اللہ بخش کے قتل کے باعث خالی ہوئی تھی اور اسکی جگہ خان بہادر احمد خان منتخب ہوا تھا مگر اس خان بہادر کی جلد ہی وفات کے باعث یہ نشست دوبارہ خالی ہوگئی تھی اور سر غلام حسین کی خواہش تھی کہ یہاں سے اس کے بیٹے کا انتخاب ہو......سر غلام حسین نے مکھی گوبند رام اور مجھے بھی وزارت کی پیش کش کی تھی مگر میں نے بھی سید محمد علی شاہ کی طرح انکار کر دیا تھا کیونکہ میری رائے یہ تھی کہ (1) خان بہادر کھوڑو لیگ کا

وزیر تھا اس کی خالی اسامی پارٹی کے فیصلے کے بغیر پر نہیں کرنی چاہیے تھی۔(2) مرکزی پارلیمانی بورڈ کی منظوری کے بغیر صوبائی کابینہ میں توسیع نہیں ہوسکتی تھی۔(3) مرکزی پارلیمانی بورڈ کی منظوری کے بغیر کسی ایسے شخص کو کابینہ میں شامل کرنا نہیں چاہیے تھا جو اسمبلی کا رکن ہی نہیں تھا۔(4) میرا ضمیر اس امر کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ میں وزارت کے عوض پارلیمانی بورڈ کے اجلاس میں انور حسین ہدایت اللہ کے حق میں ووٹ دوں۔"[7] لیکن جی۔ایم۔سید یہ نہیں لکھتا کہ اس کا گروپ محض سر غلام حسین کی وزارت کا تختہ الٹنے کے لئے ان کانگرسی ہندوؤں سے گٹھ جوڑ کرنے پر آمادہ تھا جو اس کے بیان کے مطابق "اصلی" سندھی نہیں تھے بلکہ استحصالی مقاصد کے تحت باہر سے آکر یہاں آباد ہوئے تھے اور جو محض زبانی طور پر غیر فرقہ وارانہ قوم پرستی کے علمبردار تھے لیکن عملی طور پر بدترین قسم کے فرقہ پرست ہندو تھے۔

19 ر نومبر کو جی۔ایم۔سید کی زیر صدارت صوبائی لیگ کے پارلیمانی بورڈ کا اجلاس ہوا جس میں شکار پور کے حلقہ سے ضمنی انتخابات کے لئے مسلم لیگ کے ٹکٹ کے امیدواروں کی درخواستوں پر غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ صوبہ لیگ کا نائب صدر آغا غلام نبی پٹھان اس حلقہ سے مسلم لیگ کا امیدوار ہوگا۔ بورڈ نے وزیر اعلیٰ سر غلام حسین ہدایت اللہ کے بیٹے انور حسین ہدایت اللہ اور خان بہادر نظام الدین کی درخواستیں مسترد کر دیں۔ جب 20 ر نومبر کو صوبائی بورڈ کے اس فیصلے کی خبر شائع ہوئی تو سندھ کا سیاسی بحران مزید شدید اور پیچیدہ ہوگیا۔

نوائے وقت نے جی۔ایم۔سید کی حمایت اور قائداعظم پر تنقید کی

لاہور کا اخبار نوائے وقت "سندھ کے جھگڑے" میں سید گروپ کا حامی تھا۔ اسے ایسی خبروں پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ یہ گروپ کانگرسی ارکان اسمبلی کی حمایت سے سر غلام حسین کی وزارت کا تختہ الٹ کر اپنی نئی وزارت بنانے کا متمنی ہے۔ اس کا 18 ر نومبر کا اداریہ یہ تھا کہ "سندھ کا وزارتی جھگڑا ملک کے سیاسی حلقوں میں دلچسپی کا موضوع بنا ہوا ہے اور قیاس ظاہر کیا جا رہا ہے کہ کہیں سر غلام حسین ہدایت اللہ مسلم لیگ کو ہی نہ چھوڑ دیں......سر غلام حسین کے ماضی کو دیکھا جائے تو یہ قیاس آرائی کچھ غلط بھی معلوم نہ ہوگی۔ اگر لیگ نے انہیں چھوڑنے میں پہل نہ کی تو کچھ عجب نہیں کہ وہ پہل کریں اور لیگ کو چھوڑ دیں......پچھلے دنوں کراچی میں یہ افواہ عام تھی کہ

مسٹر گزدر کانگرسی ارکان اسمبلی کو رہا کر کے نئی وزارت مرتب کرنا چاہتے ہیں......سندھ کے موجودہ ہندو وزراء کی پوزیشن بھی سخت خراب ہے۔ اسمبلی کے اندر اور باہر انہیں ہندوؤں کا اعتماد حاصل نہیں تھا اور مسٹر جی۔ ایم۔ سید کی تجویز یہ تھی کہ ان ہندو وزراء کو علیحدہ کر کے انکی جگہ ایسے ہندو وزیر مقرر کئے جائیں گے جنہیں ہندوؤں کا اعتماد حاصل ہو......سر غلام حسین ہدایت اللہ پچھلے سات سالوں میں جماعتی اخلاق کی کمزوری کے بہت سے مظاہرے کر چکے ہیں......اپنی وزارت کے استحکام کے لئے ہی انہوں نے مسلم لیگ کی پناہ لی تھی اور اسی مقصد کے لئے وہ اب مسلم لیگ کو چھوڑ بھی سکتے ہیں۔ مسلم لیگ میں ایسے لوگوں کا وجود لیگ کے لئے ہرگز باعث تقویت نہیں اور اگر وہ لیگ سے نکل جائیں تو کسی کو اس پر افسوس نہ ہوگا۔‘‘[8]

اور پھر 22 ر نومبر کو نوائے وقت نے ’’چیستان سندھ‘‘ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ

’’سندھ کی سیاسیات بالکل گورکھ دھندہ ہیں اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وزارت اور لیگ اور پھر وزارت میں وزیروں کے جھگڑے کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ نے اپنے ایک تازہ بیان میں کہا کہ وہ مسلم لیگی ہیں اور ان کی وزارت مسلم لیگی ہے۔ ان میں اور ہاشم گزدر میں کوئی اختلافات نہیں ہیں مگر دوسری طرف یہ خبر عام ہے اور جس کی تردید نہیں ہوسکی کہ مسٹر گزدر خود وزیر اعلیٰ بننا چاہتے ہیں۔ پھر غلام حسین ہدایت اللہ انہیں وزارت سے خارج کرنے پر تلے ہوئے ہیں......ضمنی انتخابات میں لیگ نے اپنا ٹکٹ مسٹر غلام نبی کو دیا ہے۔ سر غلام حسین کے صاحبزادے مسٹر انور حسین بھی امیدوار ہیں اور سر غلام حسین اب مرکزی لیگ سے صوبائی لیگ کے اس فیصلے کے خلاف اپیل کریں گے۔ اس سب پر مستزاد یہ ہے کہ مسٹر جی۔ ایم۔ سید صدر صوبہ مسلم لیگ تو سر غلام حسین ہدایت اللہ کی پالیسی سے بیزار ہیں مگر مرکزی اسمبلی میں سندھ کے لیگی ممبر سیٹھ یوسف ہارون ان کے خلاف اور سر غلام حسین کے زبردست موید ہیں۔‘‘[9]

صوبائی پارلیمانی بورڈ کے اس فیصلے سے قبل صدر آل انڈیا مسلم لیگ قائداعظم جناح نے سندھ کے وزیر اعلیٰ سر غلام حسین ہدایت اللہ سے بذریعہ تار استفسار کیا تھا کہ صوبائی وزارت میں مزید غیر مسلموں کو کس وجہ سے شامل کیا گیا ہے۔ اس پر سر غلام حسین نے یوسف ہارون کے ہاتھ ایک مکتوب جناح کو بھیجا جس میں استفسار کا مفصل جواب درج تھا۔ نوائے وقت کی 25 ر نومبر کی اطلاع کے مطابق ’’اس مکتوب کے جواب میں مسٹر جناح نے کہا کہ آپ مجھ سے 29 ر نومبر کو

دہلی میں ملاقات کریں...... مسٹر جی۔ ایم۔ سید صدر پراونشل مسلم لیگ کو بھی مسٹر جناح کی طرف سے اس قسم کا مکتوب موصول ہوا تھا جس میں درج تھا کہ 29 نومبر کو مجھ سے دہلی میں ملیں۔ چنانچہ مسٹر سید بھی سر غلام حسین کے ساتھ دہلی جائیں گے۔'' جب دونوں فریق حسب ہدایت 29 نومبر کو دہلی پہنچے تو جناح نے ان دونوں سے تین چار دن تک طویل ملاقاتیں کرنے کے بعد یہ فیصلہ صادر کیا کہ صوبائی کابینہ میں سر راجر ٹامس کا تقرر مناسب نہیں۔ چنانچہ 7 دسمبر کو سر راجر ٹامس نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور وزیراعلیٰ سر غلام حسین نے اسے زراعت اور تعمیر بعد از جنگ کے سلسلے میں حکومت سندھ کا ایڈوائزر مقرر کر دیا۔ جناح کو سر راجر کے اس تقرر پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔''

تاہم 9 دسمبر کو جب آل انڈیا پارلیمانی بورڈ کا اجلاس ہوا تو ''غلام حسین کے فرزند انور حسین ہدایت اللہ اور خان بہادر نظام الدین کی اپیلوں کو نامنظور کر دیا گیا۔ مرکزی بورڈ کی رائے یہ تھی کہ صوبائی بورڈ کے آغا غلام نبی پٹھان کے حق میں دیئے گئے فیصلے میں مداخلت کرنے کی کوئی خاص وجہ موجود نہیں ہے'' مگر 16 دسمبر کو صوبائی پارلیمانی بورڈ نے اپنے فیصلے کو خود ہی بدل دیا۔ اس نے سکھر میں اپنی ایک میٹنگ کے بعد یہ اعلان کیا کہ شکارپور کے ضمنی انتخابات کے لئے مسلم لیگ کا امیدوار آغا غلام نبی پٹھان نہیں ہوگا بلکہ اس کی جگہ خان بہادر نظام الدین مسلم لیگی امیدوار کی حیثیت سے آزاد امیدوار خان بہادر مولا بخش کے خلاف انتخاب لڑے گا لیکن 20 دسمبر کو جب کاغذات نامزدگی کی پڑتال ہوئی تو خان بہادر نظام الدین انتخاب سے دستبردار ہو گیا اور خان بہادر مولا بخش کے بلا مقابلہ منتخب ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس ڈرامائی کامیابی کے موقع پر خان بہادر نظام الدین کا یہ بیان تھا کہ ''مسٹر سید، خان بہادر مولا بخش کے حامی ہیں اس لئے میری کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ لہٰذا میں دستبردار ہوتا ہوں۔''[10]

مگر جی۔ ایم۔ سید نے اپنی کتاب میں اس واقعہ کی جو تفصیل بیان کی ہے وہ اس بیان سے بالکل مختلف ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ''مرکزی پارلیمانی بورڈ کی جانب سے صوبائی پارلیمانی بورڈ کے فیصلے کی توثیق کے بعد جب میں مسلم لیگی امیدوار آغا غلام نبی پٹھان کے حق میں انتخابی مہم پر شکارپور گیا تو وہاں معلوم ہوا کہ سر غلام حسین کی ہدایت کے مطابق ساری مشینری لیگی امیدوار کے خلاف صف آرا ہے اور چھوٹے بڑے حکام کھلم کھلا یہ کہہ رہے تھے کہ لیگی امیدوار کو کامیاب نہیں

ہونے دیا جائے گا۔ اس صورتحال کے پیش نظر ہم نے پارلیمانی بورڈ کی ہنگامی میٹنگ کے بعد سرغلام حسین کے بیٹے کی وساطت سے اسے پیغام پہنچایا کہ پارلیمانی بورڈ آغا غلام نبی کی جگہ اس کے رشتے دار خان بہادر نظام الدین کو لیگ ٹکٹ دینے پر آمادہ ہے بشرطیکہ وہ یقین دلائے کہ وہ لیگ کے ڈسپلن کا پابند ہوگا اور انتخاب سے دستبردار نہیں ہوگا۔ یہ دونوں شرائط منظور کر لی گئیں اور ہم سے اس سلسلے میں تحریری طور پر وعدہ کرلیا گیا۔ چنانچہ ہم نے خان بہادر نظام الدین کو لیگ کا ٹکٹ دے دیا اور اس کے حق میں انتخابی مہم شروع کر دی مگر جلدی ہی ہمیں پتہ چل گیا کہ ہم سے دھوکہ ہوا ہے۔ سرغلام حسین نے دونوں امیدواروں کو اپنے پاس بلایا اور اس کے بعد خان بہادر نظام الدین نے ضمنی انتخابات سے اپنی دستبرداری کا اعلان کر کے خان بہادر مولا بخش کے ''بلا مقابلہ'' انتخاب کا راستہ صاف کر دیا۔''[11] اس کے اس انتخاب کا سرکاری اعلان 9 رجنوری 1945ء کو کیا گیا تھا۔

نوائے وقت کے 21 ردسمبر 1944ء کے اداریے سے جی۔ایم۔سید کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس کا اداریہ یہ تھا کہ ''یہ سب کچھ سرغلام حسین کی کوششوں سے ہوا ہے اور مسٹر جی۔ایم۔سید کو اس معاملہ میں پوچھا تک نہیں گیا۔ اگر یہ درست ہے تو اس واقعہ کو سندھ میں ایک طوفان کا پیش خیمہ سمجھنا چاہیے۔ یہ افواہ عام ہے کہ عنقریب سرغلام حسین وزارت سے مستعفی ہو کر نئی وزارت مرتب کریں گے اور ان کی نئی کابینہ میں مسٹر نبی بخش اور مسٹر ہاشم گزدر دونوں میں سے کوئی بھی شامل نہ ہوگا۔'' نوائے وقت کی اسی دن کی اشاعت میں سرراہے کے کالم میں اطلاع دی گئی تھی کہ ''بلوچستان جدید'' اور ''نظام'' کراچی سے اردو کے دو روزنامہ اخبار شائع ہوتے ہیں۔ دونوں مسلم لیگی ہیں۔ ایک مسٹر گزدر کو ڈاکو کہتا ہے اور سرغلام حسین کو محسن قوم۔ دوسرے کے کالموں میں مسٹر گزدر مسلمانوں کے سب سے محبوب رہنما ہیں اور سرغلام حسین غدار قوم۔''[11]

شکارپور کے حلقہ کے ضمنی انتخاب سے خان بہادر نظام الدین کی دستبرداری کے اعلان کے فوراً بعد ٹنڈو محمد خان کے حلقہ سے ضمنی انتخاب کے لئے زور شور سے انتخابی مہم شروع ہوگئی۔ اس حلقہ کی نشست میر غلام علی تالپور کے ایک رشتہ دار میر غلام اللہ کی وفات کی وجہ سے خالی ہوئی تھی۔ اس کے لئے دو امیدوار تھے اور دونوں ہی مسلم لیگی تھے۔ سرغلام حسین کے گروپ کا امیدوار ایک ان پڑھ جاگیردار حاجی حسین بخش تھا اور سید گروپ کا امیدوار درمیانہ طبقہ کا ایک تعلیم یافتہ نوجوان

سید قبول محمد شاہ تھا۔ جب دسمبر 1944ء کے اواخر میں اس حلقہ میں دونوں گروپوں کی انتخابی مہم جاری تھی اور صوبہ لیگ میں دھڑے بندی کسی سے بھی پوشیدہ نہیں رہی تھی تو یوسف ہارون نے جناح کے نام ایک خط میں جی۔ایم۔سید اور اس کی مسلم لیگ پر سخت نکتہ چینی کی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ سر غلام حسین ہدایت اللہ کے سوا کوئی شخص مسلم لیگ کا خیر خواہ اور ہمدرد نہیں۔ جب یوسف ہارون نے اپنا خط اخبارات میں شائع کروا دیا تو نوائے وقت نے یوسف ہارون اور اس کے رشتہ دار سر غلام حسین کو ہدف تنقید بنایا اور جی۔ایم۔سید کی تعریف کی۔نوائے وقت کی رائے یہ تھی کہ ''سندھ میں مسلم لیگ کئی سال تک محض ایک کاغذی جماعت رہی مگر آج وہ ایک زندہ، باعمل اور عوامی جماعت ہے۔اس انقلاب کے لئے سندھ صوبہ مسلم لیگ کے صدر مسٹر جی۔ایم۔سید ذمہ دار ہیں...... سندھ کے مسلمانوں کا اعتماد اگر کسی شخص کو حاصل ہے تو وہ مسٹر جی۔ایم۔سید ہیں......سر غلام حسین ہدایت اللہ کو یہ انقلاب کسی بھی طرح گوارا نہیں تھا کہ وزارت کو عوام کی حاکم نہیں بلکہ ایجنٹ بنائے۔ چنانچہ صوبہ مسلم لیگ اور وزارت میں جھگڑے شروع ہوئے......سندھ میں مسلم لیگ کے دو گروپوں میں کشمکش ہے۔ایک گروہ لیگ کو صحیح معنوں میں ایک ترقی پسند اور عوامی جماعت بنانا چاہتا ہے مگر دوسرا گروہ چاہتا ہے کہ لیگ بدستور ارباب اقتدار کے ہاتھ میں حصول و استحکام اقتدار کے لئے آلۂ کار بنی رہے۔سر غلام حسین اور انکے عزیز خاص سیٹھ یوسف ہارون اس مؤخرالذکر گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اب وہ قائداعظم سے فریاد کر رہے ہیں کہ اول الذکر گروہ ہمیں ختم کرنا چاہتا ہے خدارا ہماری دستگیری فرمایئے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ سندھ کے مسلم عوام کیا چاہتے ہیں؟۔''[12]

جس دن نوائے وقت کا یہ اداریہ شائع ہوا اسی دن بمبئی میں یوسف ہارون اور اس کے ساتھیوں نے قائداعظم محمد علی جناح سے ملاقات کی جس کا نتیجہ 8 رفروری 1945ء کو برآمد ہوا جبکہ مسٹر محمد ہاشم گزدر نے سر غلام حسین کی کابینہ کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔اس نے یہ استعفیٰ وزیراعلیٰ کی ہدایت پر دیا تھا اور گورنر نے اسی دن اسے منظور کر لیا تھا۔نوائے وقت کی اطلاع کے مطابق ''استعفیٰ دینے سے پہلے مسٹر گزدر نے حیدرآباد جا کر سندھ پراونشل مسلم لیگ کے صدر مسٹر جی۔ایم۔سید سے ملاقات کی۔انہوں نے مسٹر گزدر کو مشورہ دیا کہ وہ لیگ اسمبلی پارٹی کے فیصلے تک استعفیٰ نہ دیں لیکن مسٹر جناح اور نواب زادہ لیاقت علی خان نے ان کو بذریعہ تار مشورہ دیا کہ

مستعفی ہو جائیں کیونکہ جب تک وزیراعلیٰ کو لیگ اسمبلی پارٹی کا تعاون حاصل ہے اس وقت تک اپنے ساتھی وزراء کا انتخاب انہی کا کام ہے۔'' مسٹر گزدر نے وزیراعلیٰ کو اپنے خط میں لکھا کہ وہ نواب زادہ لیاقت علی خان کے حسب ہدایت مستعفی ہو رہے ہیں۔ قائداعظم کو مسٹر گزدر نے مندرجہ ذیل تار دیا تھا ''وزیراعلیٰ نے لیگ اسمبلی پارٹی اور کابینہ سے مشورہ کئے بغیر میرا استعفیٰ مانگ لیا ہے۔ میں بصد احترام آپ کا مشورہ طلب کرتا ہوں۔'' اس کے جواب میں قائداعظم نے مندرجہ ذیل تار دیا تھا ''میں نے اس مسئلہ پر اخباری بیان جاری کر دیا ہے۔ میں وزیراعلیٰ کے اس حق میں مداخلت نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے مسلمان ساتھیوں کا خود انتخاب کریں۔''[13] اس واقعہ پر نوائے وقت کی رائے یہ تھی کہ ''سر غلام حسین مسلم لیگ کے دامن سے چمٹے رہنے کی کوشش کریں گے کیونکہ اس سے ان کے اقتدار کو تقویت پہنچتی ہے اور وہ قوم کے نام پر آسانی سے قوم کا گلہ گھونٹ سکتے ہیں۔ ممکن ہے بعض لیگی حلقے بھی نمائشی اقتدار کی خاطر انہیں لیگ کے حصار میں پناہ دینے کی تائید کریں لیکن زود یا بدیر مسلم لیگ کو اس اہم سوال پر غور کرنا ہوگا کہ ایسی وزارتیں جو عوام کی نمائندہ نہیں اور لیگ کی وفادار بھی نہیں کب تک اس طرح لیگ کے نام کو بدنام کرتی رہیں گی۔''[14]

12 رجنوری 1945ء کو یہ خبر شائع ہوئی کہ ''وزیراعلیٰ سر غلام حسین ہدایت اللہ حیدرآباد روانہ ہو گئے ہیں جہاں آپ سندھ پراونشل مسلم لیگ کے صدر مسٹر جی۔ ایم۔ سید سے ملاقات کریں گے۔ اس ملاقات کا انتظام خان بہادر میر غلام علی ہوم منسٹر نے کیا ہے۔ کوشش کی جارہی ہے کہ دونوں لیڈروں کے درمیان سمجھوتہ کرا دیا جائے'' مگر اس سے اگلے دن جی۔ ایم۔ سید نے سر غلام حسین کے خلاف طویل بیان جاری کر کے اس خبر کی تردید کر دی۔ سید کا بیان تھا کہ ''سر غلام حسین 1938ء میں اس وقت مسلم لیگی بنا تھا جب اسے وزارت سے جواب مل گیا تھا۔ اس نے 1939ء میں یہ اعلان کیا تھا کہ وہ اللہ بخش وزارت میں شمولیت پر موت کو ترجیح دے گا لیکن اس اعلان کے تین دن بعد وہ وزارت میں شامل ہو گیا اور پھر اس نے کھلم کھلا مسلم لیگ کے خلاف زہر افشانی شروع کر دی۔ جس پر اسے دو سال کے لئے مسلم لیگ سے خارج کر دیا گیا تھا۔ وہ اللہ بخش کی وزارت میں بھی اپنے وزیراعلیٰ اللہ بخش کا وفادار نہیں تھا اور اندرون خانہ اس کا تختہ الٹنے کی سازش کرتا رہتا تھا اور پھر جب اللہ بخش کو برطرف کر دیا گیا تو وہ بغیر کسی جماعت کے وزیراعلیٰ کی گدی پر براجمان ہو گیا۔ اس کے بعد ہمیں جلدی ہی محسوس ہو گیا کہ سر غلام حسین کسی فرد یا تنظیم کا وفادار

نہیں بلکہ اسے صرف اپنا ہی مفاد عزیز ہے۔اب ڈیلی گزٹ کی رپورٹ یہ ہے کہ سر غلام حسین مسلم لیگ کو چھوڑ رہا ہے۔نیشنلسٹ مسلمانوں اور یورپین ارکان اسمبلی کی تائید وحمایت حاصل کر رہا ہے اور اس غرض سے اس نے شیخ عبدالمجید سے بھی گفت وشنید کی ہے......وہ مسلم لیگ کو نقصان پہنچانا اور غیر مسلم لیگی اشخاص سے تعاون کرنا چاہتا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ وہ کامیاب نہیں ہوگا۔"[15]

16 رجنوری کو جی۔ایم۔سید نے خان بہادر کھوڑو کے خلاف مقدمہ قتل میں شہادت دیتے ہوئے اعتراف کیا کہ وہ اور ہاشم گزدر سر غلام حسین کے خلاف ہیں۔اس نے عدالت کو بتایا کہ "جب اکتوبر 1942ء میں اللہ بخش کی وزارت کو برطرف کیا گیا تو آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح کا پرزور مطالبہ تھا کہ لیگ اسمبلی پارٹی کے قائد خان بہادر کھوڑو کو وزیر اعلیٰ بنایا جائے۔ہم سب بھی یہی چاہتے تھے لیکن صوبائی گورنر نے سر غلام حسین کو وزارت سازی کی دعوت دے دی اور وہ وزیر اعلیٰ بن گیا۔"[16]

جی۔ایم۔سید کی اس شہادت کے تین دن بعد اسے آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری نواب زادہ لیاقت علی خان کی جانب سے بذریعہ تار یہ ہدایت موصول ہوئی کہ "کراچی سٹی مسلم لیگ کے سالانہ انتخابات کے لئے ہاشم گزدر کی بجائے کسی اور شخص کو الیکشن آفیسر مقرر کیا جائے۔" نواب زادہ نے یہ تار دہلی میں کراچی مسلم لیگ کے بعض لیڈروں کے ایک وفد سے ملاقات کے بعد ارسال کیا تھا اور اس سے صاف ظاہر تھا کہ مسلم لیگ کی مرکزی قیادت سر غلام حسین ہدایت اللہ اور سیٹھ یوسف ہارون کی حمایت کر رہی ہے اور وہ آئندہ سندھ مسلم لیگ کی دھڑے بندی میں سید گروپ کا ساتھ نہیں دے گی۔ مسلم لیگ میں سر غلام حسین ہدایت اللہ کا ستارہ عروج پر تھا اور جی۔ایم۔سید کا مستقبل تاریک نظر آنے لگا تھا۔ باالفاظ دیگر جاگیردار طبقہ کا دھڑا تقویت حاصل کر رہا تھا اور درمیانہ طبقہ کا گروپ کمزور ہو رہا تھا۔ تاہم 20 رجنوری کو آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عمل کا ایک رکن قاضی عیسیٰ کراچی آیا اور اس نے جی۔ایم۔سید کو ٹنڈو محمد خان سے بلا کر یہ کوشش کی کہ اس کی سر غلام حسین سے صلح ہو جائے مگر اس وقت تک ان دونوں کے درمیان طبقاتی تضاد اتنا شدید ہو چکا تھا کہ ان میں مصالحت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔جس دن قاضی عیسیٰ نے ان دونوں کی رات کے کھانے کی ایک پرائیویٹ دعوت میں ملاقات کرائی تھی،اسی دن سر غلام حسین کی حکومت کی طرف سے مسٹر سید کی اس کے گاؤں میں تین ماہ کے لئے

نظر بندی کا حکم جاری ہو چکا تھا۔ مگر جب دو چار دن بعد اخبارات میں مسلم لیگ کی صوبائی حکومت کے صدر صوبہ لیگ کے خلاف اس حکم پر شور وغوغا ہوا تو وزیر اعلیٰ سر غلام حسین نے اس سلسلے میں اخبارات میں شائع شدہ خبروں کی تردید کر دی۔

جی۔ ایم۔ سید کی نظر بندی کی خبر پر زور دار احتجاج کرنے والوں میں لاہور کا اخبار نوائے وقت بھی تھا۔ اس اخبار کا تبصرہ یہ تھا کہ ''سندھ کی نام نہاد لیگی وزارت مسلم لیگ کے دامن پر ایک نہایت شرم ناک دھبہ ہے اور اس وزارت کا کوئی ''کارنامہ'' بھی ہمارے لئے تعجب افزا نہیں۔ البتہ ہمیں لیگ کے ان اکابر اور لیڈروں کے طرز پر ضرور حیرت ہے جو شتر مرغ کی طرح دشمن کو دیکھ بھی رہے ہیں لیکن ریت میں سر چھپا کر حقیقت کا سامنا کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ سر غلام حسین وزارت کبھی بھی لیگی وزارت نہیں تھی۔ سر غلام حسین نے ذاتی سر بلندی کی خاطر لیگ میں پناہ لی تھی اور مسلم لیگ نے انہیں اپنا لیبل استعمال کرنے کی اجازت دے کر اس صوبہ کے مسلمانوں سے شدید بے انصافی کی۔ مسٹر سید کی نظر بندی نے یہ حقیقت واضح کر دی ہے (اگر چہ اس سے قبل بھی یہ حقیقت محتاج وضاحت نہ تھی) کہ سر غلام حسین ہدایت اللہ وزارت کو کس حد تک مسلم لیگ کی عزت، آبرو، اصولوں اور ڈسپلن کا پاس ہے۔ مسٹر راجر ٹامس کا بطور وزیر تقرر اور مسٹر گزدر کی وزارت سے علیحدگی ان کے دو معمولی کارنامے تھے...... ان دونوں کارناموں کے باوجود سر غلام حسین کی لیگ سے وفاداری پر حرف نہ آیا۔ اب شاید مسٹر سید کی نظر بندی کے سلسلے میں بھی یہی کہا جائے کہ قانوناً وزیر اعلیٰ کو حق حاصل ہے کہ وہ صوبہ کے حاکم کی حیثیت سے جسے چاہے جہاں چاہے نظر بند کر دے اور کون ہے جو وزیر اعلیٰ کے اس قانونی حق سے انکار کر سکے؟...... سندھ کی مسلم لیگی سیاسیات اب ایک نہایت شرمناک ''سکینڈل'' کی صورت اختیار کر گئی ہیں۔ قائد اعظم اور لیگ ہائی کمان کو اپنی اولین فرصت میں سندھ کے معاملے کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے۔ اس باب میں تعویق سخت نقصان دہ ثابت ہوگی۔ قاضی محمد عیسیٰ کو سندھ میں تحقیقات کے لئے بھیجنا سندھ مسلم لیگ سے مذاق کرنا ہے۔ جو لوگ بلوچستان مسلم لیگ کی ''تنظیم'' سے واقف ہیں اور جنہیں یہ بھی پتہ ہے کہ سندھ میں لیگ مٹھی بھر وکیلوں اور زمینداروں کی جماعت نہیں وہ جانتے ہیں کہ قاضی صاحب ہر گز اس ذمہ داری کے اہل نہیں جو ان کے سپرد کی گئی ہے۔ سندھ کی صورتحال کسی بہتر دماغ کی توجہ کی مستحق ہے...... ایسے موقع پر نیمے دروں نیمے بروں پالیسی

ہمارے نزدیک لیگ سے دشمنی کے مترادف ہے۔''[17] ظاہر ہے کہ اس اداریے میں آل انڈیا مسلم لیگ، قائد اعظم محمد علی جناح اور جنرل سیکرٹری نواب زادہ لیاقت علی خان کو اس بنا پر ہدف تنقید بنایا گیا تھا کہ وہ سندھ مسلم لیگ کی دھڑے بندی میں سر غلام حسین کے دھڑے کا ساتھ دے رہے تھے حالانکہ اس کی وزارت مسلم لیگ کے دامن پر ایک شرمناک دھبہ تھی۔ وہ ''شتر مرغ'' تھے اور سندھ مسلم لیگ کے بارے میں نیمے دروں نیمے بروں پالیسی پر عمل کر کے لیگ دشمنی کا ارتکاب کر رہے تھے۔

8رجنوری 1945ء کو جب وزیر اعلیٰ سر غلام حسین نے اپنی کابینہ کے ایک رکن ہاشم گزدر کو استعفیٰ دینے پر مجبور کیا تھا، اس سے دو ایک دن قبل صدر آل انڈیا مسلم لیگ قائد اعظم محمد علی جناح نے بذریعہ تار ہاشم گزدر کو مطلع کیا تھا کہ ''میں نے اس مسئلہ پر اخباری بیان جاری کر دیا ہے۔ میں وزیر اعلیٰ کے اس حق میں مداخلت نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے مسلمان ساتھیوں کا خود انتخاب کریں۔'' اور نوائے وقت کی رپورٹ کے مطابق ''مسٹر جناح اور نواب زادہ لیاقت علی خان نے اس کو بذریعہ تار مشورہ دیا تھا کہ مستعفی ہو جاؤ کیونکہ جب تک وزیر اعلیٰ کو لیگ اسمبلی پارٹی کا تعاون حاصل ہے اس وقت تک اپنے ساتھی وزراء کا انتخاب انہی کا کام ہے اور گزدر نے وزیر اعلیٰ کو اپنے خط میں لکھا تھا کہ وہ نواب زادہ لیاقت علی خان کے حسب ہدایت مستعفی ہو رہا ہے۔'' چنانچہ سابقہ مثال کے پیش نظر نوائے وقت کو شبہ تھا کہ ''شاید مسٹر سید کی نظر بندی کے سلسلے میں بھی یہی کہا جائے کہ قانوناً وزیر اعلیٰ کو حق حاصل ہے کہ وہ صوبہ کے حاکم کی حیثیت سے جسے چاہے اور جہاں چاہے نظر بند کر دے۔'' نوائے وقت کی جانب سے اس زمانے میں سندھ کے مسٹر جی۔ ایم۔ سید کی اس قدر حمایت اور مسلم لیگ کی مرکزی قیادت کی اس قدر مخالفت کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ یہ اخبار پنجابی مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کا ترجمان تھا اور اس لحاظ سے اس کی ہمدردی قدرتی طور پر سندھ کے مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کے قائد جی۔ ایم۔ سید کے ساتھ تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس اخبار کے ایڈیٹر کو شکوہ تھا کہ مسلم لیگ کی مرکزی قیادت کی سیاست قرآن سے دور اور ان کا عمل اسلام کے عمل کے خلاف ہے۔ اسے یہ بھی شکایت تھی کہ خواجگانِ لیگ روشِ بندہ پروری سے بیگانہ ہیں اور میرانِ کارواں خوئے دلنوازی سے ناآشنا ہیں۔''[18] جناح نے اپریل 1944ء میں اپنے لاہور میں قیام کے دوران ''بندہ پروری'' اور ''دلنوازی'' کی کوشش کی تھی لیکن

بعد میں ''ابلیس سیاست'' ممتاز دولتانہ اس کوشش کے بارآور ہونے کی راستے میں حائل ہوگیا تھا اور ''خواجگان لیگ'' نے پھر اس ''روش بندہ پروری'' میں کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔☆

جہاں تک نوائے وقت کے اس موقف کا تعلق تھا کہ مرکزی مسلم لیگ کے اکابر سر غلام حسین کی وزارت کے بارے میں ''شتر مرغ'' کی طرح رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں اور وہ سندھ مسلم لیگ کے بارے میں ''نیمے دروں نیمے بروں'' پر عمل پیرا ہیں وہ 30 رجنوری 1945ء کو غلط ثابت ہوگیا جبکہ جناح کے ایک بیان سے واضح ہوگیا کہ سندھ کے بارے میں ان کا رویہ نہ تو ''شتر مرغ'' کا سا تھا اور نہ ہی وہ ''نیمے دروں نیمے بروں'' پالیسی پر عمل پیرا تھے۔ وہ غیر مبہم انداز میں اور پورے شعور کے ساتھ سر غلام حسین ہدایت اللہ کے دھڑے کے حق میں تھے۔ جناح نے اپنے بیان میں سیاسیات سندھ کے بارے میں اس رائے کا اعادہ کیا تھا کہ ''آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عمل ہی اس ضمن میں با اختیار ہے۔ مجھے خوشی ہوئی ہے کہ قاضی محمد عیسیٰ کو مجلس عمل نے صوبائی انتخابات کے صحیح انتظامات کے لئے بھیج دیا ہے۔ جہاں تک وزارت کا تعلق ہے معمول کے مطابق غیر مسلم عناصر کے ساتھ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عمل کی رضامندی کے بعد کولیشن قائم کی جاسکتی ہے۔ موجودہ وزارت کی تشکیل وترتیب میں پارٹی لیڈر کو اپنے رفقائے کار کے انتخاب کا کامل حق حاصل ہے...... ہمیں تمام جھگڑوں سے بالاتر ہو کر متحد ومتفق ہوجانا چاہیے۔''[19] جناح کے اس بیان سے چار پانچ دن پہلے ٹنڈو محمد خان کے حلقہ کے ضمنی انتخاب میں صوبہ مسلم لیگ کے دونوں دھڑوں کے درمیان کھلم کھلا معرکہ آرائی ہوئی تھی اور جی۔ایم۔سید کا الزام یہ تھا کہ اس انتخاب میں سر غلام حسین گروپ نے اپنے امیدوار میر حسین بخش خان تالپور کو کامیاب کرانے کے لئے سرکاری مشینری کے ذریعے ناجائز حربے استعمال کئے تھے مگر جناح نے اپنے بیان میں اس الزام کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا اور یہ مشورہ دیا تھا کہ ''ہمیں تمام جھگڑوں سے بالاتر ہو کر متحد ومتفق ہوجانا چاہیے۔''

فروری 1945ء کے دوسرے ہفتے میں جی۔ایم۔سید نے بمبئی میں صدر آل انڈیا مسلم لیگ سے تین دن ملاقاتیں کیں جن کے بعد قائداعظم نے 12 رفروری کو ایک بیان میں سندھ کے مسلم لیگی لیڈروں سے اپیل کی کہ وہ آپس میں مل جل کر کام کریں۔ 13 رفروری کو سندھ کے وزیراعلیٰ سر غلام حسین ہدایت اللہ نے ایک بیان میں کہا ''مجھے اپنے محبوب لیڈر قائداعظم کی

☆ تفصیل کے لیے دیکھیے، پاکستان کی سیاسی تاریخ جلد۔5 مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء۔ص ص 82, 400

اس پر جوش اپیل سے کامل اتفاق ہے جو انہوں نے صدر سندھ پروانشل مسلم لیگ سے کی ہے اور مجھے کامل بھروسہ ہے کہ اس اپیل کی بدولت ہم متحد و متفق ہو جائیں گے'' مگر جی۔ایم۔سید نے اس پر لبیک نہ کہا اور خاموشی اختیار کئے رکھی اور نوائے وقت نے بھی اس ''پر جوش اپیل'' کو کسی ادارتی تبصرے کا مستحق نہ سمجھا۔

16 رفروری کو آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عمل اور مرکزی پارلیمانی بورڈ نے چودھری خلیق الزماں، نواب محمد اسماعیل خان اور قاضی عیسیٰ کو اس امر پر مامور کیا کہ وہ سندھ کا دورہ کریں اور مسلم لیگ کی تنظیم کے لئے جو مناسب اقدام سمجھیں کریں۔19 رفروری کو مسلم لیگ کی مجلس عمل کے دو ارکان...... چودھری خلیق الزماں اور نواب محمد اسماعیل خان نے...... کراچی پہنچ کر صوبائی مسلم لیگ کی از سر نو تنظیم کے لئے سید گروپ اور غلام حسین گروپ سے بات چیت کی جبکہ صوبائی اسمبلی کا بجٹ سیشن جاری تھا اور سر غلام حسین کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ سید گروپ اس سیشن میں اسے شکست دلوا دے گا اور قائد اعظم کی اتحاد و اتفاق کی اپیل رائیگاں جائے گی۔نوائے وقت کی اس بات چیت کے بارے میں خبر یہ تھی کہ ''پراونشل مسلم لیگ نے ہدایت اللہ وزارت پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ مسلم لیگ کے پروگرام کو چلانے میں ناکام رہی ہے...... وزارت نے مسلم لیگ کے لائحہ عمل سے بے رخی کا سلوک روا رکھا اور اس کو عملی جامہ پہنانے میں پہلو تہی سے کام لیتی رہی...... مجلس عمل کے ارکان کی...... ابھی تک کوشش نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی۔مسٹر سید کی پارٹی کو یقین ہے کہ وہ ہدایت اللہ منسٹری کو توڑنے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کا اجلاس منعقد ہوا جس میں تمام صورتحال پر غور کیا گیا اور وزارتی پارٹی کے مخالف گروپ نے وزیر اعلیٰ کو چیلنج کیا کہ وہ پارٹی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔دوسری طرف وزیر اعلیٰ کو...... اگر ضروری ہوا تو وہ اپنی وزارت کو بچانے کے لئے وزارت میں توسیع کر دیں گے۔''20 رفروری کو نوائے وقت کی خبر یہ تھی کہ ''صدر سندھ پروانشل مسلم لیگ مسٹر جی۔ایم۔سید اور مسٹر غلام حسین ہدایت اللہ کے درمیان سمجھوتہ کے مذاکرات بالآخر ٹوٹ گئے ہیں۔آج سندھ پروانشل مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں آل انڈیا مسلم لیگ کے ارکان نے اس خبر کا اعلان کیا۔''

مجلس عمل کے ارکان اس خبر کا اعلان کرنے کے بعد سندھ سے روانہ ہوئے تو اس کے دو ایک دن بعد 23 رفروری کو لیگ اسمبلی پارٹی کے بیشتر ارکان نے تحریری طور پر جی۔ایم۔سید

سے مطالبہ کیا کہ سر غلام حسین کی وزارت کا تختہ الٹنے کے لئے مناسب اقدام کیا جائے کیونکہ اسے پارٹی کا اعتماد حاصل نہیں ہے۔ اگلے دن 24 فروری کو سید نے پہلے تو وزیر اعلیٰ کو پارٹی کے ارکان کی اکثریت کے اس مطالبہ سے مطلع کیا اور پھر اس نے جنرل ایڈمنسٹریشن کے محکمہ کے اخراجات میں تخفیف کی ایک تحریک پر رائے شماری کے ذریعے سر غلام حسین کی وزارت کو شکست دے دی۔ اس رائے شماری میں ہندو انڈی پینڈنٹ پارٹی کے ارکان اور خان بہادر مولا بخش کے گروپ نے سید گروپ کا ساتھ دیا تھا۔ جی۔ ایم۔ سید نے اس واقعہ کے بعد اسی دن قائد اعظم کو ایک تار ارسال کیا کہ لیگ اسمبلی پارٹی کے 28 ارکان میں سے 19 نے تحریری طور پر یہ مطالبہ کیا تھا۔ جناح نے فوری طور پر اس تار کا کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ 26 فروری کو سر غلام حسین نے خان بہادر مولا بخش کے نام ایک خط میں اسے ایک آزاد ممبر کی حیثیت سے اپنی کابینہ میں شامل کرنے کی پیش کش کی اور یہ بھی وعدہ کیا کہ اس کے گروپ کے ایک اور رکن کو بھی وزیر بنا دیا جائے گا۔ اس نے اپنے خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ ''اگر مسٹر جناح یا لیگ ہائی کمان نے اس کولیشن سے اتفاق نہ کیا تو بھی میں آپ کو مستعفی ہونے کو نہیں کہوں گا اور نہ ہی مسلم لیگ کے عہد نامے پر دستخط کرنے پر مجبور کروں گا میں ایسی صورت میں آپ کے ساتھ رہوں گا اور کولیشن برقرار رکھوں گا۔''[20] اس خط کے اگلے دن یہ خبر موصول ہوئی کہ خان بہادر مولا بخش نے ہدایت اللہ کابینہ میں بحیثیت وزیر حلف اٹھا لیا ہے۔ آپ کو ریونیو کا محکمہ سونپا گیا ہے...... خان بہادر مولا بخش کا دعویٰ ہے کہ آٹھ مسلم لیگی میرے حامی ہیں جنہوں نے تحریک تخفیف میں وزارت کے خلاف ووٹ دیئے تھے...... اس طرح اب سر غلام حسین ہدایت اللہ کو خاصی اکثریت حاصل ہو گئی ہے۔ اب حزب اختلاف کی پوزیشن یہ ہے کہ مسٹر جی۔ ایم۔ سید کے ساتھ صرف 6 مسلم لیگی اور 7 ہندو ممبر ہیں۔ خان بہادر مولا بخش کو وزارت دینے کے علاوہ یہ بھی وعدہ کیا گیا ہے کہ ان کے گروپ کے دو آدمیوں کو پارلیمنٹری سیکرٹری بنایا جائے گا۔ سر غلام حسین نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ مسٹر جی۔ ایم۔ سید نے خان بہادر مولا بخش اور مسٹر نچل داس سے مل کر مخلوط وزارت مرتب کرنے کی کوشش کی تھی جو ناکام رہی۔ اس کے بعد ظاہر تھا کہ گورنر دفعہ 92 نافذ کر دیتا...... خان بہادر مولا بخش اس شرط پر وزارت میں شامل ہوئے ہیں کہ انہیں مسلم لیگ میں شرکت کے لئے مجبور نہیں کیا جائے گا...... خان بہادر مولا بخش نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ...... میں وزارت میں

انڈی پینیڈنٹ مسلمان کی حیثیت سے شامل ہوا ہوں......آزاد مسلم حلقوں کا بیان ہے کہ بجٹ سیشن کے بعد وزارت سندھ میں مزید توسیع کی جائے گی اور آزاد مسلم گروپ کو ایک اور وزارت دے دی جائے گی۔''[21]

اسی دن یعنی 27 رفروری کو جی۔ایم۔سید نے صدر مسلم لیگ کے نام ایک اور برقیہ روانہ کیا جس میں کہا گیا تھا کہ ''سر غلام حسین نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ آپ نے مجھے اور ہاشم گزدر کو لیگ سے نکالنے کی سفارش کی ہے۔ اس سے صورتحال عجیب نوعیت اختیار کر گئی ہے۔ ہندو پارٹی ابھی تک میرے اور مسلم لیگ کے ساتھ ہے۔ 24 رفروری کو ووٹ کے بعد خان بہادر مولا بخش نے کولیشن کے لئے زور دیا تھا جسے میں منظور نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اس تجویز کو ٹھکرا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سر غلام حسین نے آزاد مسلم پارٹی کے ساتھ مل کر کولیشن قائم کر لیا اور خان بہادر مولا بخش کو کابینہ میں شامل کر لیا گیا۔ سر غلام حسین اب یہ افواہ پھیلا رہے ہیں کہ وہ اب پارلیمنٹری بورڈ کی منظوری حاصل کر رہے ہیں۔ براہ مہربانی لیگ کے رویے کی فی الفور وضاحت کر دیجئے۔'' قائداعظم نے 28 رفروری کو اس کے دونوں تاروں کے جواب میں یہ تار روانہ کیا کہ ......''افسوس ہے کہ آپ نے غیر آئینی طریق کار اختیار کر کے نامناسب سازشوں میں شرکت کی۔ آپ دشمنوں کے ہاتھ میں کھیلے اور اپنے لیڈر اور پارٹی کو نیچا دکھایا۔ آپ نے ایک نازک صورتحال پیدا کر دی ہے۔ پارٹی ڈسپلن کو توڑ دیا ہے۔ نفاق پیدا کیا ہے اور سندھ کی یکجہتی کو ختم کیا ہے۔ اس طرح آپ نے ان مواعید کو توڑا ہے جو بمبئی میں میرے ساتھ گفت وشنید کے بعد آپ نے میرے ساتھ کئے تھے۔ آپ نے مجلس عمل، مرکزی پارلیمنٹری بورڈ، لیگ وزارت، آئین وقواعد سب کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس طرح غلط رویہ اختیار کر کے آپ نے لیگ کی بنیادی تنظیم کو زک پہنچائی ہے۔ آپ کا یہ فعل انتہائی غیر مناسب ہے اور مسلم مفاد کے قطعاً منافی ہے۔ میں ان حالات میں آپ کو کسی قسم کا مشورہ نہیں دے سکتا۔''[22]

لیکن نوائے وقت کی رائے قائداعظم کی اس رائے سے بالکل برعکس تھی۔ اس اخبار کے خیال میں سندھ کے اس سیاسی ڈرامے میں جی۔ایم۔سید ایک اصول پسند عوامی ہیرو تھا جبکہ سر غلام حسین کا کردار سراسر شیطانی تھا۔ نوائے وقت نے جناح کے اس تار کی اخبارات میں اشاعت کے دوسرے دن پہلے تو یہ خبر شائع کی کہ ''سر غلام حسین وزیر اعلیٰ سندھ، مسٹر محمود ہارون کو

اپنے نمائندۂ خصوصی کے طور پر بھیج رہے ہیں تا کہ وہ قائداعظم کے سامنے سندھ کی وزارت کی پوزیشن واضح کر دیں...... وہ مسٹر جناح کو بتائیں گے کہ کن حالات میں ہدایت اللہ وزارت کے خلاف ووٹ پاس ہوا اور اب خان بہادر مولا بخش کو وزیر بنانے سے نازک صورت حال اختتام پذیر ہوگئی ہے...... امید ہے کہ لیگ ہائی کمان خان بہادر مولا بخش کے لیگی نہ ہونے پر اعتراض نہیں کرے گی...... مسٹر گزدر نے قائداعظم کے تار کو افسوس ناک قرار دیا مگر مسٹر سید ابھی خاموش ہیں۔'' پھر 3/مارچ کو اس نے ایک اور خبر شائع کی کہ ''کراچی سٹی لیگ کی مجلس عاملہ نے ایک قرارداد میں قضیۂ سندھ کے بارے میں قائداعظم کے رویہ کی تائید کی ہے۔ اس نے لیگ ہائی کمان سے سفارش کی ہے کہ مسٹر جی۔ ایم۔ سید اور مسٹر گزدر کو لیگ سے خارج کر دیا جائے...... مسٹر سید نے قائداعظم کو ایک خط لکھا ہے جس میں انہوں نے مسلم لیگ کے ساتھ مکمل طور پر وفاداری کا اظہار کیا ہے اور پھر اُسی دن نوائے وقت نے اس مسئلہ پر ادارتی تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''...... مسٹر جناح نے سید غلام مرتضیٰ صدر صوبہ مسلم لیگ کو جو تار بھیجا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہوا کا رخ کدھر ہے؟ سچ پوچھئے تو اس معاملہ میں مسٹر جناح کی رائے اور فیصلہ ہی قابل توجہ ہے...... صرف مسٹر جناح کی رائے اور فیصلہ پر اس کا انحصار ہے کہ سندھ کی مسلم لیگی سیاسیات کیا رخ اختیار کرتی ہیں۔ سر غلام حسین کے طرز عمل کے لئے کوئی وجہ جواز اب تک ہمیں نہیں سوجھ سکی۔ انہوں نے لیگ کے ضبط اور وقار کو اتنا صدمہ پہنچایا ہے کہ اس کی تلافی ممکن نہیں...... لیکن ان کی ساری لغزشیں مل کر بھی ان کی اس ایک لغزش سے زیادہ نقصان دہ نہیں کہ انہوں نے ایک غیر لیگی مسلمان مسٹر مولا بخش کو کابینہ میں شامل کیا...... ان کا یہ اقدام مسلم لیگ کی پالیسی کے سراسر خلاف ہے۔ لیگ ان مسلمانوں کی سیاسی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتی جو مسلم لیگ کے دائرے سے باہر ہیں۔ وہ ان سے کولیشن تو کیا ایک حریف یا حلیف کی حیثیت سے گفتگوئے مفاہمت پر آمادہ نہیں...... اسی اصولی اعتراض کی بنا پر مسٹر جناح نے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد اور صدر کانگرس سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کون نہیں جانتا کہ خان بہادر مولا بخش کی سندھ وزارت میں شرکت مسلم لیگ کے اس اعتراض کو بالکل بے معنی بنا دیتی ہے۔ سر غلام حسین کی یہ بے اصولی اس پس منظر میں اور زیادہ شرمناک ہے کہ مسٹر جی۔ ایم۔ سید نے خان بہادر مولا بخش کے ساتھ مل کر کولیشن وزارت بنانے سے انکار کر دیا تھا اور اس پر زور دیا تھا

کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائے۔نئی وزارت کی تشکیل کی امید اور سر غلام حسین کی شکست کی توقع بھی مسٹر سید کو اس بے اصولی پر آمادہ نہ کر سکی لیکن سر غلام حسین نے ان کے اگلے ہوئے نوالے کو بڑی رغبت سے چبالیا اور اسی گروپ سے کولیشن منظور کی جس کی پیش کردہ تحریک تخفیف ان کی وزارت کی شکست کا باعث ہوئی۔ اگر مسٹر سید نے لیگ کے وقار کو دانستہ یا نا دانستہ کوئی صدمہ پہنچایا ہے تو ان کے خلاف ضرور تحقیقات ہو لیکن سر غلام حسین کی سر پرستی فرمانے کے لئے مسلم لیگ ہائی کمان کے پاس کوئی وجہ جواز نہیں۔ اگر اس وقت وہ مواخذہ سے بچ گئے تو خود لیگ کے اندر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ مولوی فضل الحق اور ملک خضر حیات سے کس طرح بہتر ہیں؟ اور انہیں اس ترجیحی سلوک کا مستحق کیوں سمجھا جا رہا ہے؟۔''[23]

ظاہر ہے کہ نوائے وقت کے اس اداریے میں قائداعظم پر بے اصولی اور دوغلہ پن اور احباب پروری کے الزامات عائد کئے گئے ہیں۔ یہ اخبار اس مسئلہ پر اس قدر خفا ہوا تھا کہ اس نے صدر مسلم لیگ کے لئے تو صرف ''مسٹر جناح'' کے الفاظ استعمال کئے تھے لیکن صدر کانگرس کے لئے ''حضرت مولانا ابوالکلام آزاد'' کے الفاظ لکھے تھے۔ اس کے اداریے کے آخر میں دونوں سوالات کا مطلب یہ تھا کہ سر غلام حسین ہدایت اللہ سے ترجیحی سلوک کراچی کے ہارون خاندان کی وجہ سے کیا جا رہا ہے۔ یوسف ہارون اور محمود ہارون کراچی کے سرمایہ دار میمن سیٹھ سر عبداللہ ہارون مرحوم کے بیٹے تھے اور ان کے خاندان کے قائداعظم جناح کے اسماعیلی خوجہ خاندان سے تعلقات تھے جبکہ سر غلام حسین کی ہارون سے رشتہ داری تھی۔ نوائے وقت کے نزدیک جب جی۔ ایم۔ سید نے ایک غیر مسلم لیگی مسلمان خان بہادر مولا بخش کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے سر غلام حسین کی مسلم لیگی وزارت کو شکست دلوائی تھی تو اس میں بے اصولی کی کوئی بات نہیں تھی لیکن جب سر غلام حسین نے اسی غیر مسلم لیگی مسلمان کو اپنی وزارت میں شامل کر لیا تھا تو اس نے لیگ کے ضبط و وقار کو اتنا صدمہ پہنچایا تھا کہ اسکی تلافی ممکن نہیں تھی......اور اس کی سر پرستی فرمانے کے لئے مسلم لیگ ہائی کمان کے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔

6/ مارچ کو نوائے وقت نے یہ خبر شائع کی کہ مسٹر محمود ہارون نے، جنہیں سر غلام حسین ہدایت اللہ نے قائداعظم کی خدمت میں اپنا خاص نمائندہ بنا کر بھیجا ہے، ایک انٹرویو میں اس امید کا اظہار کیا ہے کہ'' سندھ میں ایک مرتبہ اور خالص لیگی وزارت بن جائے گی...... میں نے

قائداعظم کووزارت کی مشکلات سے آگاہ کیا ہے۔ان کا رویہ ہمدردانہ تھا اور جہاں تک ان کے لئے ممکن تھا انہوں نے ہماری امداد کی ہے'' اور پھر 7/مارچ کو مدیر نوائے وقت نے جی۔ایم۔سید کی شان میں ادارتی قصیدہ لکھا۔اداریہ یہ تھا کہ ''مسٹر سید اور سر غلام حسین ہدایت اللہ کے اختلاف میں شروع سے ہماری حمایت مسٹر سید کو حاصل رہی ہے۔نہ صرف اس لئے کہ ہماری رائے (جو واقعات اور شواہد پر مبنی ہے) میں صوبہ سندھ میں مسلم لیگ کو صحیح معنوں میں ایک زندہ تنظیم انہوں نے ہی بنایا ہے۔نہ صرف اس لئے کہ سندھ کے مسلمانوں میں واحد ہستی انہی کی ہے جسے مسلمانان سندھ کا اعتماد حاصل ہے۔نہ صرف اس لئے کہ وہ اس شدت کے ساتھ اصول پرور ہیں کہ ان کے ایسے استقلال اور کریکٹر کی پختگی کی مثال مسٹر جناح کے سوا مسلم لیگ کے شاید ہی کسی لیڈر میں مل سکے بلکہ اس لئے بھی کہ ہم اس اختلاف کو مسٹر سید اور سر غلام حسین کا ذاتی جھگڑا نہیں سمجھتے۔ ہمارے نزدیک یہ اختلاف دو سیاست دانوں کی ذاتی آویزش نہیں۔ ہمارے ناقص خیال میں سندھ کا یہ جھگڑا آل انڈیا مسلم لیگ کی کل ہند سیاسیات کی اس لہر سے تعلق رکھتا ہے جو ملک کے ہر گوشے میں ابھر رہی ہے۔ یہ لہر مسلم لیگ کی عوامی تحریک کی لہر ہے۔اس لہر کا مقصد یہ ہے کہ مسلم لیگ کو بڑے بڑے تعلقہ داروں، بیرسٹروں، وکیلوں، جاہ پسند اور منصب پرست سیاست دانوں کی جماعت کی بجائے مسلمان عوام کی جماعت بنایا جائے۔ہمیں اس اعتراف میں کوئی عار نہیں کہ ایک مدت تک لیگ پر انہی عناصر کا قبضہ رہا اور اب بھی یہ عناصر مسلم لیگ میں کافی قوی ہیں لیکن جوں جوں لیگ عوامی جماعت بن رہی ہے، یہ عناصر کمزور ہورہے ہیں۔اپنی بقا کے لئے ان کا ہاتھ پاؤں مارنا ناگزیر ہے لیکن کسی عوامی تحریک میں ایسے عناصر کی کوئی گنجائش نہیں ہوسکتی۔اس لئے لیگ کے عوامی عناصر کا ان رجعت پسند عناصر سے تصادم ضروری ہے، سندھ کا جھگڑا اس بڑی لہر کا ایک حصہ ہے......سرحد، آسام، بنگال، بہار اور بمبئی تک اس کی صدائے بازگشت سنی جاسکتی ہے۔''[24]

نوائے وقت کے 3/مارچ کے اداریے میں قائداعظم جناح پر بے اصولی، دوغلا پن اور احباب پروری کے جو الزامات عائد کئے گئے تھے بعد کے حالات سے ثابت ہوا کہ وہ عامیانہ اور بے بنیاد تھے اور اس کے 7/مارچ کے اداریئے میں جی۔ایم۔سید کی اصول پروری اور استقلال و کریکٹر کی پختگی کے بارے میں جو قصیدہ لکھا گیا تھا وہ واقعات وشواہد پر مبنی نہیں تھا۔ قائداعظم جناح نے جی۔ایم۔سید کو 28/فروری کو ترش الفاظ میں جو تار بھیجا تھا اس کا مطلب یہ

نہیں تھا کہ انہوں نے سر غلام حسین کی کابینہ میں ایک غیر مسلم لیگی مسلمان خان بہادر مولا بخش کی شمولیت کو تسلیم کرلیا تھا۔ وہ اپنے اس موقف پر سختی سے قائم تھے کہ لیگ ان مسلمانوں کی سیاسی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتی جو مسلم لیگ کے دائرے سے باہر ہیں۔ وہ ان سے کولیشن تو کیا حریف یا حلیف کی حیثیت سے گفتگوئے مفاہمت کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کی ہدایت کے مطابق سر غلام حسین کو مستعفی ہو کر اپنی وزارت کی از سر نو تشکیل کرنا پڑی تھی جن میں کوئی غیر مسلم لیگی مسلمان شامل نہیں کیا گیا تھا۔

جہاں تک جی۔ ایم۔ سید کی اصول پروری اور کریکٹر کی پختگی کا تعلق تھا ماضی کے واقعات سے اس کی تائید نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی مستقبل کے واقعات نے اس کی تائید کی۔ ماضی میں 1937ء کے بعد ہر غیر لیگی اور لیگی وزارت کی تعمیر و تخریب میں سید کا ہاتھ ضرور رہا تھا۔ وہ اگر چہ خود درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتا تھا لیکن بدقسمتی سے اس کی معاشرت اور سیاست جاگیردارانہ تھی۔ وہ اندرون خانہ سیاسی جوڑ توڑ کا ماہر تھا اور ایسا کرتے ہوئے اس نے کبھی کسی اصول کی پابندی نہیں کی تھی۔ اس لئے سندھ کے سیاسی عدم استحکام کی خاصی ذمہ داری اس پر بھی عائد ہوتی تھی۔ اس کی شخصیت میں جاگیردارانہ دوست نوازی، دھڑے بندی، کنبہ پروری اور عداوت پسندی کا عنصر بہت غالب تھا۔ اس نے 24 رفروری کو سر غلام حسین کی وزارت کا تختہ الٹنے کے لئے خان بہادر مولا بخش اور ہندو ارکان اسمبلی سے جو گٹھ جوڑ کیا تھا اس کی بنیاد کسی اصول پروری یا کردار کی پختگی پر نہیں تھی بلکہ اس کا موقع پرستانہ مقصد محض یہ تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو سر غلام حسین کا تختہ الٹا جائے۔ اس نے یہ کردار صدر مسلم لیگ قائداعظم جناح اور مجلس عمل کے ارکان کے مشورے کے برعکس ادا کیا تھا۔ اس طرح اس نے مسلم لیگ کے ضبط و وقار کو بہت صدمہ پہنچایا تھا۔ اسی لئے جناح نے اسے ترش الفاظ میں تار بھیجا تھا۔ البتہ اداریے کا یہ ''ناقص خیال'' صحیح تھا کہ سندھ کی سیاست کا یہ جھگڑا آل انڈیا مسلم لیگ کی کل ہند سیاست کی اس لہر سے تعلق رکھتا تھا جو ملک کے ہر گوشے میں ابھر رہی تھی۔ جی۔ ایم۔ سید واقعی سندھ کے وسیع المشرب درمیانہ طبقہ کا نمائندہ تھا اور سر غلام حسین ہدایت اللہ وہاں کے دقیانوسی میروں، پیروں اور جاگیرداروں کے مفادات کا نگران اعلیٰ تھا۔ مزید برآں یہ بھی صحیح تھا کہ خود مدیر نوائے وقت کی صحافت اور سیاست بھی اسی لہر کی پیداوار تھی۔ وہ بھی سر غلام حسین ہدایت اللہ کی طرح معاملہ فہم اور حقائق آشنا تھا۔ اسے بھی اچھی طرح علم تھا

کہ مسلم لیگ کی روز افزوں مقبولیت کے پیش نظر اس سے بگاڑ پیدا کرنا دریا میں رہ کر مگر مچھ سے الجھنے والی بات تھی۔ کوئی سمجھ دار سیاست دان اور مصلحت اندیش صحافی اس غلطی کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا۔

جی۔ایم۔سید اور غلام حسین کی عارضی صلح اور وزارت کی تشکیل نو

13 ر مارچ کو سر غلام حسین ہدایت اللہ خالص لیگی وزارت بنانے کے لئے جی۔ایم۔ سید کا کامل تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور جی۔ایم۔سید نے اسی دن آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری نواب زادہ لیاقت علی خان کو بذریعہ تار یہ یقین دلایا کہ ''میں آپ کی ہدایت پر پوری طرح وفاداری سے کاربند رہوں گا۔ میں نے سر غلام حسین کو بھی اپنی مکمل حمایت کا یقین دلا دیا ہے۔''[25] اس کے بعد جی۔ایم۔سید نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ ''میں نے لیگ ہائی کمان کے سامنے غیر مشروط طور پر سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ میں سندھ میں خالص لیگی وزارت کے قیام کے لئے سر غلام حسین کو ہر قسم کی امداد دینے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کروں گا۔ مسٹر سید نے مزید کہا کہ مسلم عوام مسلم لیگ کے ساتھ ہیں۔''[26] معاملہ فہمی اور حقائق آشنائی صرف سر غلام حسین تک ہی محدود نہیں تھی۔ جی۔ایم۔سید بھی ''اصول پروری اور کریکٹر کی پختگی'' کے باوجود اس حقیقت سے واقف تھا کہ مسلم عوام مسلم لیگ کے ساتھ ہیں اور وہ اس زمانے میں مسلم لیگ کی عوامی لہر کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔

14 ر مارچ 1945ء کو سر غلام حسین ہدایت اللہ نے مسلم لیگ پارٹی اور ہندو انڈیپینڈنٹ پارٹی کے ساتھ کولیشن سے سندھ میں نئی وزارت مرتب کر لی۔ صوبہ سندھ کی آٹھ سالہ تاریخ میں اس ساتویں وزارت میں محکموں کی تقسیم یوں تھی:

1۔	وزیر اعلیٰ سر غلام حسین ہدایت اللہ	فنانس، زراعت، تعمیر بعد از جنگ
2۔	خان بہادر میر غلام علی تالپور	نظم و نسق
3۔	پیر الٰہی بخش	تعلیم، محصولات اور جنگلات
4۔	سید محمد علی شاہ	تعمیرات عامہ اور بلدیات
5۔	نچل داس وزیرانی	مال
6۔	مکھی گوبند رام	صحت عامہ اور صنعتیں

یہ وزارت مسلم لیگ اور ہندوانڈی پینڈنٹ پارٹی کی کولیشن کی شرائط کے بارے میں آل انڈیا مسلم لیگ کی پیشگی منظوری حاصل کرنے کے بعد تشکیل ہوئی تھی۔ طے شدہ شرائط یہ تھیں:

1۔ صوبائی حکومت ترقی پسندانہ اصول سے ہر ایک جماعت اور طبقہ کی فلاح و بہبود کے واسطے چلائی جائے گی۔ اس میں کسی ملت و مذہب اور سیاسی عقیدہ کا امتیاز روا نہیں رکھا جائے گا۔

2۔ اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کی مناسب حفاظت کی جائے گی اور نہ صرف منصفانہ بلکہ فراخدلانہ برتاؤ رکھا جائے گا۔

3۔ ہر فرقے اور جماعت کی معاشرتی رسوم، مذہبی حقوق، جذبات اور دستور کا مناسب احترام کیا جائے گا اور کسی جماعت یا طبقہ کی ثقافت یا تعلیم کے خلاف کوئی بالواسطہ یا بلاواسطہ اقدام نہیں کیا جائے گا۔

4۔ دیہات وقصبات میں بسنے والے ہندوؤں کے جان و مال اور عزت کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔

5۔ یہ وزارت قیمتوں پر کنٹرول، خریداری کے متعلق پالیسی، اجناس کی برآمد، زمینداروں کے مفاد، کسانوں کے حقوق اور تجارتی اداروں کے مفاد کو ملحوظ رکھے گی۔

6۔ کل ہند سیاست سے تعلق رکھنے والے مسائل میں ہر ایک پارٹی کو اپنے عقائد اور خیالات کے مطابق اقدام کرنے کا حق ہوگا۔

لیکن صوبہ مسلم لیگ میں اتحاد و اتفاق کے عہد و پیمان کے ساتھ اس وزارت کی تشکیل کو ابھی تین چار ہفتے ہی گزرے تھے کہ سید گروپ اور ہدایت اللہ گروپ کے درمیان اختلافات پھر نمودار ہو گئے۔ وجہ یہ تھی کہ دونوں دھڑوں کے درمیان متذکرہ اتحاد و اتفاق محض مسلم لیگ کی عوامی لہر کے زور پر ہوا تھا اور اس کی بنیاد محض مصلحت پسندی اور موقع پرستی پر تھی۔ اپریل کے وسط میں جب صوبہ لیگ کے سالانہ انتخابات کی تیاریاں شروع ہوئیں تو ان دونوں دھڑوں کے اختلافات کو اخبارات میں پھر ہوا ملنے لگی۔ نوائے وقت کی رپورٹ یہ تھی کہ ''جوں جوں انتخابات کا وقت قریب آ رہا ہے ان دونوں پارٹیوں کے اختلافات وسیع تر ہوتے جا رہے ہیں۔ کراچی سٹی مسلم لیگ کے انتخابات میں لیگ کے آئین کے بنیادی قواعد کی صریح خلاف ورزی کی گئی ہے۔

اس مطلب کی ایک قرارداد لیگ کی صوبائی کونسل میں پیش کی جارہی ہے تا کہ ان انتخابات کو خلاف آئین قرار دیا جائے۔"[27]

اس خبر کا پس منظر یہ تھا کہ کراچی سٹی مسلم لیگ کے انتخابات فروری 1945ء میں ہوئے تھے اور ان میں سر غلام حسین کے رشتہ دار اور معتمد خاص یوسف ہارون کے گروپ کے امیدوار کامیاب ہوئے تھے۔ ان انتخابات سے قبل آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری نواب زادہ لیاقت علی خان نے دہلی میں ہارون گروپ کے ایک وفد سے ملاقات کے بعد 19 رجنوری کو صدر صوبائی مسلم لیگ جی۔ ایم۔ سید کو ہدایت کی تھی کہ وہ اس شہر کی مسلم لیگ کے انتخابات کے لئے مسٹر ہاشم گزدر کی جگہ کسی اور شخص کو الیکشن آفیسر مقرر کرے۔ 2 رمارچ کو ہارون گروپ کی نئی مسلم لیگ نے لیگ ہائی کمان سے سفارش کی تھی کہ جی۔ ایم۔ سید اور ہاشم گزدر کو لیگ سے خارج کر دیا جائے لیکن اس سفارش پر تو عمل نہ ہوا البتہ 12 رمارچ کو سر غلام حسین کو قائداعظم جناح کی ہدایت کے مطابق اپنی کابینہ سے ایک غیر لیگی مسلمان خان بہادر مولا بخش کو نکالنے کے لئے اپنی وزارت کا استعفیٰ پیش کرنا پڑا۔ 14 رمارچ کو اس نے سید گروپ کے ساتھ "اتحاد و اتفاق" کے بعد نئی وزارت کی تشکیل کی جس میں سید گروپ کے ایک رکن سید محمد علی شاہ کو بھی شامل کیا گیا۔ 28 رمارچ کو اس وزارت نے اسمبلی میں سید گروپ کی حمایت سے اپنا بجٹ منظور کروایا تو اس کے بعد فوراً ہی سید گروپ نے پہلے کانگرس کے رہا شدہ ارکان اسمبلی سے مفاہمت کی بات چیت شروع کی۔ جب 7 راپریل کو یہ بات چیت ناکام ہوگئی [28] تو سید گروپ نے یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ صوبہ کی مسلم لیگی وزارت میں توسیع کی جائے۔ ہاشم گزدر کا 16 راپریل کو انٹرویو یہ تھا کہ زیر غور تجویز کے مطابق کابینہ میں تین اور وزراء شامل کئے جائیں گے جس سے وزراء کی تعداد 9 ہو جائے گی جن میں سے چھ مسلمان اور تین ہندو وزیر ہونگے اور اس وزارت کی پوزیشن بہت مستحکم ہو جائے گی"[29] لیکن اس سے اگلے دن ہدایت اللہ کابینہ کے وزیر صحت مکھی گوبند رام نے بتایا کہ اس کی انڈی پینڈنٹ ہندو پارٹی اس تجویز کے خلاف ہے کہ موجودہ سندھ وزارت میں توسیع کی جائے۔" ...... اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں سے ہی وزارت کے تمنائی میدان میں آجائیں گے ...... یہ تجویز وزارت کو مستحکم بنانے کی بجائے اور پیچیدگیاں پیدا کر دے گی۔"[30]
چونکہ مکھی گوبند رام نے یہ بیان بظاہر وزیر اعلیٰ سر غلام حسین کے کہنے پر دیا تھا اس لئے

19 ر اپریل کو اورینٹ پریس نے یہ خبر دی کہ سید گروپ اور ہدایت اللہ گروپ کے درمیان اختلافات وسیع ہوتے جارہے ہیں۔

عبدالمجید سندھی کی لیگ میں دوبارہ شمولیت اور غلام حسین وزارت کو خطرہ

اپریل میں سر غلام حسین ہدایت اللہ اپنی ایک آنکھ کے آپریشن کے لئے بمبئی گیا تو اس کے دو تین ہفتے بعد 8 رمئی کو شیخ عبدالمجید سندھی مسلم لیگ میں دوبارہ شامل ہو گیا اور اس طرح وزارتی گروپ کی پوزیشن بہت کمزور ہوگئی۔ 18 رمئی کو نوائے وقت کی رپورٹ یہ تھی کہ مسلم لیگ میں شیخ عبدالمجید سندھی کی غیر متوقع شمولیت کو بہت اہمیت دی جارہی ہے۔ سندھ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ بھی وزارتی مسائل پر کانگرس سے تعاون پر آمادہ نظر آتی ہے۔ صدر صوبہ لیگ مسٹر جی۔ ایم۔ سید صوبہ کی بہتری کے لئے کوئی مشترکہ طریق کار اختیار کرنے کی فکر میں ہیں اور اس ضمن میں غیر مسلم لیڈروں سے بھی تبادلۂ خیالات کر رہے ہیں۔ کانگرسی لیڈر مسٹر سید کی تجویز پر غور کر چکے ہیں اور آزاد ہندو پارٹی کے ارکان بھی تمام صورتحال کا جائزہ لے رہے ہیں...... عام طور پر یہ رائے ظاہر کی جارہی ہے کہ وزارت کو اور محفوظ بنانے کے لئے شیخ عبدالمجید سندھی کو کابینہ میں شامل کر لیا جائے گا۔ اگر سر غلام حسین عملی سیاسیات سے کنارہ کش ہونے کا فیصلہ کریں گے تو امید اغلب یہی ہے کہ شیخ صاحب کو وزارت اعلیٰ قبول کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔ یہ خیال بھی ظاہر کیا جا رہا ہے کہ مسٹر گزدر کو بھی کوئی نہ کوئی وزارتی پوزیشن حاصل ہو ہی جائے گی۔''

پھر 19 رمئی کو نوائے وقت نے سید گروپ کے ذریعے سے موصول شدہ اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''سندھ کا دریائے سیاست پھر اپنی گزرگاہ بدلنے والا ہے۔ رپورٹ یہ ہے کہ سر غلام حسین ہدایت اللہ سیاسات سے کنارہ کش ہو رہے ہیں اور ان کی جگہ شیخ عبدالمجید سندھی وزارت اعلیٰ کی مسند پر جا بیٹھیں گے۔ ابھی تک اس خبر کی تصدیق نہیں ہوسکی۔ سر غلام حسین عرصہ سے بیمار ہیں اور ان کی بیماری آنکھوں کی بیماری ہے۔ ہماری اطلاع یہ ہے کہ انہیں ایک آنکھ سے تو اب بالکل ہی دکھائی نہیں دیتا اور دوسری آنکھ کے علاج اور آپریشن کے لئے وہ کئی ماہ سے بمبئی میں مقیم ہیں۔ مگر اس کی زیادہ امید نہیں کہ ان کی بینائی درست ہو سکے۔ ممکن ہے سر غلام حسین سیاسیات سے کنارہ کشی کے لئے اپنی معذوری کو کافی وجہِ جواز سمجھیں اور سندھ کے مسلمانوں کی

حالت پر رحم فرماتے ہوئے سیاسیات سے ریٹائر ہو جائیں لیکن یہ بھی عین ممکن ہے کہ وہ دوسرے صوبوں کے بعض وزراء اور ارباب سیاست کی طرح ''رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے'' کا ورد کرتے ہوئے بدستور اپنی گدی سے چمٹے رہیں۔ شیخ عبدالمجید سندھی کی دوبارہ لیگ میں شمولیت کے بعد سیاسیات سندھ میں کوئی نہ کوئی تغیر ناگزیر ہے۔ اس لئے مذکورہ بالا رپورٹ کو بالکل ناقابل اعتماد بھی نہیں کہا جاسکتا۔ بلوچوں کے متعلق بھی معلوم ہوا ہے کہ وہ بھی مستقل پارٹی بنا رہے ہیں جو مسلم لیگ سے بالکل علیحدہ ہوگی اور پنجاب کی جاٹ سبھا کے نقش قدم پر چلے گی۔'' گویا نوائے وقت کے نزدیک اگر سید گروپ مسلم لیگ کی مرکزی قیادت کی خواہش اور ہدایت کے برعکس حصول اقتدار کے لئے اندرون خانہ جوڑ توڑ کرتا تھا تو اس میں کوئی برائی نہیں تھی لیکن اگر ہدایت اللہ گروپ اپنے اقتدار کے تحفظ کے لئے یہی حربہ استعمال کرتا تو اس میں کوئی اچھائی نہ تھی۔

چونکہ بظاہر سندھ میں بلوچ پارٹی ہدایت اللہ گروپ کی حوصلہ افزائی سے ہی بنائی جارہی تھی اس لئے نوائے وقت کو خدشہ تھا کہ ''شیخ عبدالمجید سندھی کی لیگ میں شمولیت سے صوبہ مسلم لیگ کو جو تقویت پہنچی ہے عین ممکن ہے اس کا ازالہ اس تفریق سے ہو جائے جو سندھ میں بلوچ پارٹی کے نام سے مسلمانوں میں پیدا کی جارہی ہے۔ نئی پارٹی کے لیڈر میر گروپ کے ممبر ہیں اور ان میں قابل ذکر میر غلام علی تالپور ہوم منسٹر اور میر بندے علی خان تالپور سابق وزیر اعلیٰ سندھ ہیں۔ نئی پارٹی کے لیڈروں کا نعرہ یہ ہے کہ سندھ کے سید مسٹر جی۔ ایم۔ سید کی قیادت میں اس صوبہ پر اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں اس لئے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے بلوچوں کی اپنی پارٹی ہونی چاہیے۔ سندھ اسمبلی کے بلوچ ممبر اس پارٹی میں جمع ہو رہے ہیں۔''[31] اس خدشہ کی بنا پر جی۔ ایم۔ سید بھی اپنے دھڑے کو مضبوط کرنے کے لئے ہمہ تن اپنے روایتی جوڑ توڑ میں مصروف تھا۔ اس کی اس کوشش کی وجہ سے انہی دنوں پیر علی محمد راشدی اور غلام مصطفیٰ بھرگری بھی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے اور اس بنا پر سید گروپ اور ہدایت اللہ گروپ کے درمیان اختلافات اور زیادہ وسیع ہو گئے تھے۔ اور دونوں گروپوں کی یہ کوشش تھی کہ صوبہ لیگ کے آئندہ انتخابات میں ایک دوسرے کو پچھاڑا جاسکے۔ ہدایت اللہ گروپ ایک متوازی لیگ قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ صوبہ میں اس لیگ کی کئی شاخیں قائم کی جاچکی تھیں جو سید گروپ کے خلاف پروپیگنڈا کر رہی تھیں۔[32]

باب: 5

سیّد۔ جناح تضاد میں شدّت اور سیّد کا لیگ سے اخراج

سیّد گروپ کی صوبائی سیاست اور جناح کی مرکزی سیاست میں تضاد

سندھ مسلم لیگ کے دونوں دھڑوں کے درمیان رسہ کشی محض صوبہ لیگ کے انتخابات کے لئے نہیں ہو رہی تھی بلکہ اس کی ایک اور بڑی وجہ یہ تھی کہ سندھ کے ہر باشعور شخص کو معلوم تھا کہ عالمی جنگ کے خاتمہ پر عام انتخابات ہونگے اور ان انتخابات میں وہی دھڑا جیتے گا جسے صوبہ لیگ پر غلبہ حاصل ہوگا۔ اپریل میں مسولینی کے قتل اور ہٹلر کی خودکشی کے بعد 8 رمئی کو نازی جرمنی کی سوویت یونین کے ہاتھوں شکست ہو چکی تھی اور جاپان کی قطعی شکست کا دن بھی دور نظر نہیں آتا تھا۔ چنانچہ حکومت ہند نے مئی کے آخری ہفتے میں ساری صوبائی حکومتوں کے نام ایک سرکلر بھیجا تھا جس میں مرکزی اسمبلی کے تازہ انتخابات کرائے جانے کے بارے میں رائے معلوم کی گئی تھی اور اس سرکلر کے پیش نظر عام خیال یہ تھا کہ مرکزی اسمبلی کے عام انتخابات اس سال کے اختتام سے پہلے ہی ہو جائیں گے۔ پیر علی محمد راشدی نے اسی خیال کے تحت 30 رمئی کو سندھ پراونشل لیگ کونسل کے آئندہ اجلاس میں ایک قرارداد پیش کرنے کا نوٹس دیا۔ اس قرارداد میں آل انڈیا مسلم لیگ سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اپنی پالیسی اور طریق کار پر از سر نو غور کرے اور اس میں تبدیلی کرتے ہوئے مسلم لیگ اسمبلی پارٹیوں کے کام پر نگرانی کے اختیارات آئندہ سے صوبائی مسلم لیگوں کے سپرد کر دے۔ اس قرارداد میں مزید کہا گیا تھا کہ ''آل انڈیا مسلم لیگ میں یہ رجحان روز بروز بڑھتا جا رہا ہے کہ مسلم لیگ اسمبلی پارٹیوں اور وزارتوں میں صوبائی مسلم لیگوں کو نگرانی کے جو اختیارات ہیں انہیں آہستہ آہستہ سلب کر لیا جائے۔ مرکزی مسلم لیگ کا یہ رجحان انتہا درجہ کی ''مرکزیت'' کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جو جمہوریت کے منافی ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ رجحان

صوبائی خودمختاری کے اصول سے بھی متصادم ہوتا ہے۔ یہ پالیسی سخت نا قابل عمل اور نقصان دہ ہے۔اس لئے اس میں ترمیم ہونی چاہیے۔"[1]

اس قرارداد کا عملی طور پر مطلب یہ تھا کہ آئندہ مرکزی مسلم لیگ ہائی کمان کو صوبائی امور میں مداخلت کر کے ہدایت اللہ گروپ کی پشت پناہی نہیں کرنی چاہیے۔اگر ایسا ہوگا تو ہدایت اللہ وزارت کا فوراً تختہ الٹ دیا جائے گا۔اس کی جگہ شیخ عبدالمجید سندھی کی وزارت قائم ہو جائے گی اور پھر جب 1945ء کے اواخر میں اس نئی وزارت کی زیر نگرانی عام انتخابات ہونگے تو سید گروپ کو شاندار کامیابی حاصل ہوگی۔نوائے وقت کو پیر علی محمد راشدی کی اس قرارداد سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔اس نے اس قرارداد پر کوئی ادارتی تبصرہ نہ کیا اور اس نے 3 رجون کو یہ خبر شائع کی کہ "سندھ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے اپنے اجلاس میں صوبہ لیگ ورکنگ کمیٹی کی اس قرارداد کی تصدیق کر دی ہے جس میں صوبہ میں مسلم لیگ پارلیمنٹری پروگرام سے تعاون کرنے کے لئے کانگرس سے اپیل کی گئی تھی۔" سندھ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے یہ اپیل اس حقیقت کے باوجود کی تھی کہ راج گوپال اچاریہ کے فارمولا کی بنیاد پر گاندھی اور جناح کے درمیان جو خط و کتابت جاری ہوئی تھی وہ اکتوبر 1944ء میں ناکام ہو چکی تھی۔سر تیج بہادر سپرو کی جانب سے "مصالحتی کمیٹی" کی تشکیل کے لئے پیش کردہ تجویز بھی اپریل 1945ء میں بے نتیجہ ثابت ہو چکی تھی اور مرکز میں عبوری حکومت کے بارے میں لیاقت۔ ڈیسائی پیکٹ بھی قائداعظم جناح اور کانگرسی لیڈروں کی مخالفت کے باعث بارآور نہیں ہوا تھا۔

پھر نوائے وقت نے 7 اور 8 رجون کو سندھ لیگ کونسل کی کاروائی کچھ اس طریقے سے رپورٹ کی جس سے یہ تاثر ہوتا تھا کہ وہ مسلم لیگ میں انتہا درجہ کی "مرکزیت" کے رجحان کے خلاف تھا اور صوبائی خودمختاری کے حق میں تھا۔اسے کونسل کی اس قرارداد پر بھی کوئی اعتراض نہیں تھا جس میں لکھی جنگل کی زمینیں پنجابیوں کو دینے پر حکومت سندھ کی پرزور مخالفت کی گئی تھی اور حکومت سندھ پر زور دیا گیا تھا کہ وہ ان زمینوں پر غیر سندھیوں کو نہ لائے کیونکہ اس طرح سندھ کے لئے تازہ مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔" 8 رجون کو نوائے وقت نے ایک صوبائی وزیر سید محمد علی شاہ کا، جو سید گروپ سے تعلق رکھتا تھا، یہ انٹرویو شائع کیا کہ "میر گروپ اور سید گروپ کے درمیان بھاری اختلافات ہیں...... میر گروپ سندھ کے غرباء پر ناروا تشدد کر رہا ہے اور وہ سخت رجعت

پسند ہے۔ وہ قدیم خطاب سسٹم کا احیا چاہتا ہے۔ جاگیرداری ایکٹ میں ترمیم کا خواہاں ہے تا کہ کسانوں کی قسمت پر مکمل قبضہ کیا جا سکے لیکن اس کے برعکس سید گروپ ترقی کے علاوہ کسانوں کے لگانوں کے سلسلہ میں ان کے حقوق کا تحفظ چاہتا ہے۔'' اور پھر اس اخبار نے 12 رجون کو یو۔ پی کے ایک مسلم لیگی لیڈر زیڈ۔ ایچ۔ لاری کا ایک بیان شائع کیا جس میں سندھ مسلم لیگ کی منظور کردہ متذکرہ قراردادوں کی تائید کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''جہاں تک مجھے علم ہے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ نے صوبائی بورڈوں کی ترتیب آئین کے ضمن میں اپنے فرض کو کما حقہ ادا نہیں کیا لہٰذا سندھ اور دوسرے صوبوں میں مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔ یہ ناکامی سخت حیران کن ہے۔ اب وقت ہے کہ مرکزی پارلیمنٹری بورڈ اپنے ابتدائی فرائض فی الفور ادا کرے۔ صوبائی پارلیمنٹری بورڈوں کے قیام کے بعد مرکزی پارلیمانی بورڈ صرف اپیل سننے کا مجاز ہو گا اور صوبائی معاملات میں اسے براہ راست کوئی اختیارات حاصل نہ ہوں گے۔''

25 رجون کو شملہ میں مسلم لیگ، کانگرس اور برصغیر کی بعض دوسری جماعتوں کے قائدین کی ایک کانفرنس شروع ہوئی۔ یہ کانفرنس وائسرائے ویول نے حکومت برطانیہ کے 14 رجون کے اعلان کے مطابق بلائی تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ مرکز میں کانگرس، مسلم لیگ اور دوسری سیاسی جماعتوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک عبوری حکومت بنائی جائے۔ اس دوران قائداعظم جناح نے دوسرے صوبوں کے مسلم لیگی لیڈروں کے علاوہ سندھ کے مسلم لیگی لیڈروں کو بھی برائے مشورہ شملہ بلایا تھا۔ جی۔ ایم۔ سید لکھتا ہے کہ ''میں ان دنوں مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان تصفیہ کا زبردست خواہاں تھا اور میں لیگی لیڈروں کی مشاورتی میٹنگوں کے دوران اپنے ان جذبات کا اظہار کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتا تھا۔ میں سارے ترقی پسندوں کی طرح مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان اتحاد کا حامی تھا تا کہ سیاسی تعطل دور ہو اور ملک آزادی اور خوشحالی کی راہ پر چل سکے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ میرا یہ رویہ صدر مسلم لیگ کے لئے کھلم کھلا خفگی کا باعث بن رہا تھا۔ ایک مرتبہ جب میں نے اس مصالحتی لائن پر چلنے کی پرزور وکالت کی تو صدر مسلم لیگ اس قدر خفا ہوا کہ اس نے میری توہین کی۔''[2]

جی۔ ایم۔ سید کو صدر مسلم لیگ کے ''توہین آمیز رویے'' کے بارے میں 31 رجولائی 1944ء کو بھی شکایت پیدا ہوئی تھی جبکہ قائداعظم جناح نے لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کی

ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کے دوران اس کی اس بنا پر سرزنش کی تھی کہ اس نے صوبائی لیگ مجلس عاملہ سے ہدایت اللہ وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی ایک قرارداد منظور کروائی تھی اور 28 رفروری 1945ء کو بھی اسے اپنی توہین کا شدت سے احساس ہوا تھا جبکہ صدر مسلم لیگ نے بذریعہ تار اس وجہ سے ہدف ملامت بنایا تھا کہ اس نے لیگ اسمبلی پارٹی کے بیشتر ارکان سے مخالفانہ ووٹ دلوا کر ہدایت اللہ وزارت کو شکست دلوائی تھی۔ سندھ مسلم لیگ کے صدر جی۔ایم۔سید کی انانیت اس کی اس پے درپے توہین سے بڑی مجروح ہوئی تھی۔ اس کے اور آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کے درمیان روز افزوں تضاد کی ایک وجہ یہ تھی کہ قائداعظم جناح واقعی مسلم لیگ میں انتہا درجہ کی مرکزیت کے خواہاں تھے جبکہ جی۔ایم۔سید زیادہ سے زیادہ صوبائی خودمختاری کا متمنی تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ جی۔ایم۔سید کی سیاسی بصیرت صرف اس کے اپنے صوبہ تک ہی محدود تھی جبکہ قائداعظم جناح کی تمام تر توجہ کل ہند سطح پر حکومت برطانیہ اور کانگرس کے ساتھ سیاسی لڑائی کی طرف مبذول رہتی تھی۔ شملہ میں قیام کے دوران جی۔ایم۔سید کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان تصفیہ کا اس لئے زبردست خواہاں تھا کہ اس طرح وہ سندھ میں کانگرس کے ساتھ تعاون کر کے ہدایت اللہ وزارت کا تختہ الٹ سکتا تھا۔ اسے یہ شعور نہیں تھا کہ جناح اس موقع پر کانگرس کے ساتھ تصفیہ کے اس لئے خواہاں نہیں تھے کہ برصغیر میں ان کی مسلم لیگ کی پوزیشن کمزور تھی۔ 1937ء کے بعد عالمی جنگ کے باعث عام انتخابات نہیں ہوئے تھے اور اس وجہ سے وہ عملی طور پر یہ ثابت نہیں کر پائے تھے کہ مسلم لیگ واقعی مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ آئندہ عام انتخابات کے بعد برطانیہ اور کانگرس کے ساتھ ایسا تصفیہ ہو جو مسلمانان ہند کے حقوق و مفادات کا فی الحقیقت ضامن ہو۔ یہی وجہ تھی کہ وہ پنجاب سے کسی غیر لیگی مسلمان کو مرکزی حکومت میں قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ شملہ کانفرنس 14 رجولائی کو ان کے اس غیر متزلزل موقف کی وجہ سے ناکام ہوئی تھی اور پھر اسی موقف کی وجہ سے انہوں نے 46-1945ء کے عام انتخابات میں بے مثال کامیابی حاصل کی تھی۔ جی۔ایم۔سید صدر آل انڈیا مسلم لیگ کی اس سیاسی حکمت عملی کو سمجھنے سے قاصر تھا اس لئے جولائی 1945ء کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ مسلم لیگ میں اس کے گروپ کے اختلافات کے تصفیہ کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی تھی اور یہ کہ وہ خود مسلم لیگ کی ایسی جامد مشینری میں نہیں رہ سکتا تھا جو صرف اپنے صدر کے بنائے ہوئے ایک ہی راستے پر چلتی تھی۔

جناح کی طرف سے صوبائی پارلیمانی بورڈ کی تشکیلِ نو اور سیّد گروپ کی تخفیف

شملہ کانفرنس کے دوران آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے ایک تجویز منظور کی تھی جس کے مطابق مرکزی پارلیمانی بورڈ کے اختیارات میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ گویا مسلم لیگ میں مرکزیت اور بھی بڑھ گئی تھی اور صوبائی مسلم لیگوں کے اختیارات بہت ہی محدود ہو گئے تھے۔ جی۔ایم۔سید نے اس تجویز پر بحث کے دوران اس کی سخت مخالفت کی تھی اور اس نے اپنی مخالفت کے حق میں جو دلائل پیش کئے تھے اُن میں ایک دلیل یہ بھی تھی کہ ماضی میں مسلم لیگ کی مرکزی قیادت صوبوں کی رجعت پسند قوتوں کی پشت پناہی کرتی رہی ہے اور کئی مرتبہ اس نے صوبوں کے ترقی پسند مسلم لیگیوں کو جمہوری راستے پر چلنے سے باز رکھا ہے۔ اگر اب مرکزی پارلیمانی بورڈ کو مزید اختیارات دے دیئے گئے تو وہ ان اختیارات کو مختلف صوبوں کی رجعت پسند قوتوں کے حق میں استعمال کرے گا اور اس طرح یہ قوتیں نہ صرف آج کل اپنے اقتدار کو برقرار رکھ سکیں گی بلکہ وہ مستقبل میں بھی اپنی پوزیشن کو مستحکم کر لیں گی [3] مگر جی۔ایم۔سید کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ متذکرہ تجویز منظور ہو گئی اور جی۔ایم۔سید مسلم لیگ ہائی کمان کے خلاف مزید کبیدہ خاطر ہو کر واپس کراچی پہنچا۔

چند دن بعد 3 راگست کو خان بہادر محمد ایوب کھوڑو اللہ بخش کے قتل کے الزام سے باعزت طور پر بری کر دیا گیا۔ بہت سے مسلمان عدالت میں فیصلہ سننے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ جب خان بہادر کی بریت کا اعلان ہوا تو ہجوم نے اللہ اکبر کے نعرے لگائے اور پھر سارے صوبہ میں افواہ پھیل گئی کہ غلام حسین ہدایت اللہ خرابیٔ صحت کی بنا پر عملی سیاست سے کنارہ کش ہو رہا ہے اور اس کی جگہ خان بہادر کھوڑو وزیر اعلیٰ ہو گا۔

21 راگست کو وائسرائے ویول نے برطانیہ کی نئی لیبر حکومت کی ہدایت پر یہ اعلان کر دیا کہ اس سال موسم سرما میں عام انتخابات ہوں گے۔ یہ اعلان سنتے ہی سر غلام حسین ہدایت اللہ 23 راگست کو بمبئی گیا اور 28 راگست کو صدر مسلم لیگ قائداعظم محمد علی جناح بذریعہ جہاز کراچی پہنچے اور یہاں انہوں نے صدر صوبہ لیگ جی۔ایم۔سید سے ملاقات کر کے اسے ہدایت کی کہ وہ صوبائی پارلیمانی بورڈ کی اس طرح از سر نو تشکیل کرے کہ اس میں ہدایت اللہ کے وزارتی گروپ کو بھی کافی نمائندگی حاصل ہو جائے۔ چونکہ صوبائی پارلیمانی بورڈ کی تشکیل نو کا مطالبہ سر غلام حسین

ہدایت اللہ کے علاوہ ''بلوچ پارٹی'' کے لیڈر میر غلام علی تالپور کی طرف سے بھی کیا جا رہا تھا، اس لئے جناح نے اس سلسلے میں یکم ستمبر کو میر حسین بخش خان صدر آل انڈیا بلوچ پارٹی، میر بندے علی تالپور، سر حاتم علوی اور قاضی فضل اللہ سے بھی ملاقاتیں کیں اور پھر 6 ستمبر کو جناح نے ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ سات رکنی صوبائی پارلیمانی بورڈ سر غلام حسین ہدایت اللہ، جی۔ایم۔سید، محمد ایوب کھوڑو، میر غلام علی تالپور، سید خیر شاہ، غلام نبی پٹھان اور پیر الٰہی بخش پر مشتمل ہوگا۔ جناح نے امید ظاہر کی کہ 15 ستمبر کو مسلم لیگ اسمبلی پارٹی اور صوبائی لیگ کونسل کے اجلاس ہوں گے تو ان میں صوبائی پارلیمانی بورڈ کی تشکیل نو کی منظوری دی جائے گی۔

جی۔ایم۔سید لکھتا ہے کہ ''جناح کے اس فیصلے سے سندھ کے ترقی پسندوں کو بہت نقصان پہنچا۔ ہمارا گروپ اقلیت میں ہو گیا اور رجعت پسندوں کے وزارتی گروپ کو اکثریت حاصل ہو گئی۔ بورڈ کے سات ارکان میں سے تین ہمارے تھے اور چار وزارتی گروپ کے تھے۔ ابھی جناح کراچی میں ہی تھا کہ وزارتی گروپ کے چار ارکان کی ایک خفیہ میٹنگ پیر الٰہی بخش کے گھر میں ہوئی جس میں انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ کن امیدواروں کو لیگ کے ٹکٹ دیئے جائیں گے۔ میں نے جناح کو اس سازش سے آگاہ کیا تو اس نے مجھ پر اعتبار نہ کیا اور ہدایت کی کہ جیسے بھی ہو اس نئے بورڈ کی صوبائی کونسل سے منظوری حاصل کی جائے۔''[4] 15 ستمبر کو سر غلام حسین ہدایت اللہ کے گھر میں لیگ اسمبلی پارٹی کا اجلاس ہوا جس میں خان بہادر کھوڑو کو پارلیمانی بورڈ کا رکن منتخب کیا گیا اور 16 ستمبر کو صوبائی لیگ کونسل کا اجلاس ہوا جس میں جی۔ایم۔سید کی تحریک پر صوبائی پارلیمانی بورڈ کی تشکیل نو کی منظوری دے دی گئی اور 20 ستمبر کو صوبائی اسمبلی کا سپیکر سید میران شاہ مسلم لیگ میں شامل ہو گیا۔ اس سے پہلے نئے صوبائی گورنر سر فرانسس موڈی کی طرف سے یکم ستمبر کو اسمبلی توڑنے کا اعلان کیا جا چکا تھا۔

یکم اکتوبر 1945ء کو صوبائی پارلیمانی بورڈ کا اجلاس ہوا تو اس وقت صوبہ کی 35 مسلم نشستوں کے لئے لیگ ٹکٹ کے امیدواروں کی 70 درخواستیں موصول ہو چکی تھیں جبکہ کراچی سے شائع ہونے والے سیٹھ ڈالمیا کے اخبار ڈیلی گزٹ کا اداریہ یہ تھا کہ ''پاکستان کے ہز میجسٹی سلطان بہادر'' نے موجودہ وزارت کی جو ''غیر معمولی شاہانہ حمایت'' کی ہے اور آمرانہ طریقہ سے صوبائی پارلیمانی بورڈ کی جو تشکیل کی ہے اس کی وجہ سے صوبائی مسلم لیگ کئی دھڑوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔

لہٰذا پارلیمانی بورڈ کے ارکان میں لیگ کے امیدواروں کے بارے میں اتفاق رائے نہیں ہو سکے گا۔''[5] ڈیلی گزٹ کی یہ ادارتی پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ یکم اکتوبر کو صبح 11 بجے جی۔ ایم۔ سید کے گھر میں پارلیمانی بورڈ کا اجلاس شروع ہوا تو دونوں دھڑوں کے درمیان لیگ ٹکٹوں کی شیرینی کی تقسیم پر فوراً زبردست جھگڑا شروع ہو گیا۔ ڈیلی گزٹ کی رپورٹ کے مطابق جھگڑے کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ خان بہادر ایوب کھوڑو، جس نے اپنی بریت کے بعد جی۔ ایم۔ سید سے گٹھ جوڑ کیا تھا، راتوں رات میر غلام علی تالپور کے ساتھ مل گیا تھا اور اس وجہ سے بورڈ میں وزارتی دھڑے کا پلڑا بہت بھاری ہو گیا تھا۔ اس دھڑے نے اپنی اکثریت کے بل بوتے پر اپنے دھڑے کے امیدواروں کو دھڑا دھڑ ٹکٹ دینے شروع کر دیئے تو جی۔ ایم۔ سید بوکھلا گیا اور اس نے وہیں اعلان کر دیا کہ ''مجھے صوبائی کونسل کے 25 ارکان کی طرف سے کونسل کا ایک ہنگامی اجلاس بلانے کی درخواست موصول ہوئی ہے جس میں پارلیمانی بورڈ کے بعض ارکان کے خلاف سنگین الزامات عائد کئے گئے ہیں۔ کونسل کا یہ مطلوبہ ہنگامی اجلاس 12 راکتوبر کو ہو گا جس میں نئے پارلیمانی بورڈ کا انتخاب ہو گا اور یہ نیا بورڈ عام انتخابات کے لئے طے شدہ اصولوں کے مطابق موزوں امیدواروں کو مسلم لیگ کے ٹکٹ دے گا۔'' جی۔ ایم۔ سید نے بطور صدر صوبہ لیگ یہ اعلان کر کے پارلیمانی بورڈ کا اجلاس غیر معین عرصے کے لئے ملتوی کر دیا۔

ادھر اس اعلان کے بعد بورڈ کے چار ارکان نے ایوب کھوڑو کے گھر میں جمع ہو کر اپنی کاروائی جاری رکھی اور انہوں نے اپنے بیشتر امیدواروں کو لیگ ٹکٹ دینے کا فیصلہ کر لیا تو جی۔ ایم۔ سید نے ایک بیان میں بورڈ کے ان چار ارکان کی کاروائی کو غیر آئینی قرار دیا اور انکشاف کیا کہ اس نے اس صورتحال سے قائداعظم اور مرکزی پارلیمانی بورڈ کو مطلع کر دیا ہے۔ اسی دن سر غلام حسین ہدایت اللہ، میر غلام علی تالپور، پیر الٰہی بخش اور خان بہادر محمد ایوب کھوڑو نے ایک مشترکہ بیان میں جی۔ ایم۔ سید کے متذکرہ بیان پر گہرے دکھ کا اظہار کیا اور یہ الزام عائد کیا کہ ''سید نے یہ رویہ محض اس لئے اختیار کیا ہے کہ پارلیمانی بورڈ کے ارکان کی اکثریت تھرپارکر، حیدرآباد اور نواب شاہ کے اضلاع سے اس کے منظور نظر امیدواروں کو لیگ ٹکٹ دینے پر آمادہ نہیں تھی۔ مسٹر سید نے پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت ایک غلط اور غیر قانونی رولنگ دی ہے اور اس کے پس پردہ پیر علی محمد راشدی کے زرخیز ذہن کی کارفرمائی ہے۔ راشدی لیگ کے دشمنوں کے

اکسانے پر مسلم لیگ میں تفرقہ ڈالنے کا کردار ادا کر رہا ہے۔"[6]

3 / اکتوبر کو سیٹھ یوسف ہارون نے اٹلی سے واپس آ کر صوبائی مسلم لیگ کے دونوں دھڑوں میں صلح کرانے کی کوشش کی اور امید ظاہر کی کہ کوئی نہ کوئی پائیدار تصفیہ ہو جائے گا۔ مگر اسی دن پیر علی محمد راشدی نے ڈیلی گزٹ سے ایک انٹرویو میں وزارتی گروپ کے چاروں ارکان کی جانب سے اپنے خلاف عائد کردہ الزام کی تردید کی اور کہا کہ "خان بہادر کھوڑو محض اس لئے میرے خلاف ہے کہ میں نے یہ شکایت کی تھی کہ وہ صوبائی لیگ کے قواعد وضوابط کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ مزید برآں اس کے خلاف سنگین الزامات ہیں۔ سب کو معلوم ہے کہ پارلیمانی بورڈ کے بعض ارکان نے لیگ ٹکٹ دینے کے لئے رشوت لی ہے۔ ایسی صورتحال میں یہی ہو سکتا ہے کہ لیگ کونسل صورتحال کا از سرنو جائزہ لے کر مناسب اقدام کرے۔ ڈیلی گزٹ کے رپورٹر نے اس انٹرویو کے بعد فوراً ہی ایوب کھوڑو سے رابطہ کیا تو اس نے کہا کہ پیر علی محمد راشدی نے کونسل کا اجلاس بلانے کی تحریک اس لئے کروائی ہے کہ اس کے دوست نبی بخش بھٹو کو لیگ ٹکٹ نہیں دیا گیا۔ اس نے مزید کہا کہ جی۔ ایم۔ سید نے بورڈ کی میٹنگ اس وقت ملتوی کی تھی جب اکثریت نے اس کی تحریک التوا کو مسترد کر دیا تھا۔"[7]

4 / اکتوبر کو ڈیلی گزٹ کی ایک رپورٹ میں انکشاف کیا گیا کہ سندھ مسلم لیگ میں موجودہ افتراق ونفاق اس سازش کا نتیجہ ہے جو اگست 1945ء میں کراچی میں تیار کی گئی تھی۔ اس سازش کا مقصد یہ ہے کہ مسلم لیگ سے جی۔ ایم۔ سید کو خارج کر کے لیگ کی تنظیم پر رجعت پسند قوتوں کے غلبہ کے لئے راہ ہموار کی جائے۔ ایک ممتاز لیگی لیڈر کے بیان کے مطابق جناح نے دانستہ یا نادانستہ رجعت پسند عناصر کو اجازت دی ہے کہ وہ اس کے نام کو اپنے حق میں استعمال کریں۔ ڈیلی گزٹ کی اس رپورٹ میں جی۔ ایم۔ سید کے نام میر غلام علی تالپور کے 20 / اگست کے ایک طویل خط کا متن بھی شائع کیا گیا تھا جس میں تالپور نے مطالبہ کیا تھا کہ چونکہ موجودہ پارلیمانی بورڈ میں سید گروپ کی اکثریت ہے اس لئے اس کی اس طرح از سرنو تشکیل کی جائے کہ یہ تین وزراء، خان بہادر کھوڑو اور جی۔ ایم۔ سید پر مشتمل ہو۔" گزٹ کی یہ رپورٹ غلط نہیں تھی۔ ہدایت اللہ گروپ نے واقعی اگست میں جی۔ ایم۔ سید کو مسلم لیگ سے خارج کروانے کی سازش کی تھی۔ میر غلام علی تالپور نے فی الحقیقت جی۔ ایم۔ سید کو متذکرہ خط لکھا تھا اور پھر 22 / اگست کو

سر غلام حسین ہدایت اللہ قائد اعظم سے ملاقات کرنے کے لئے بمبئی گیا تھا اور بظاہر وہیں اس نے صدر مسلم لیگ کو قائل کر لیا تھا کہ چونکہ جون 1945ء میں مقرر کردہ صوبائی پارلیمانی بورڈ میں سید گروپ کی اکثریت ہے اس لئے اس کی از سر نو تشکیل ہونی چاہیے تاکہ وزارتی گروپ کو اس میں مناسب نمائندگی حاصل ہو۔

آمدہ مرکزی و صوبائی انتخابات کے لئے لیگ کی ٹکٹوں کے سوال پر سید۔جناح تضاد اپنی انتہا تک پہنچ گیا

10 ر اکتوبر 1945ء کو نئی دہلی میں اعلان کیا گیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ نے مرکزی اسمبلی کے انتخابات کے لئے 20 امیدواروں کو ٹکٹ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ چونکہ ان امیدواروں کی فہرست میں ہدایت اللہ گروپ کے سیٹھ یوسف ہارون کا نام بھی شامل تھا اس لئے سیاسی مبصرین کے لئے یہ پیش گوئی کرنا مشکل نہیں تھا کہ سندھ مسلم لیگ میں لیگ ٹکٹوں کے سوال پر جو رسہ کشی ہو رہی ہے اس میں مرکزی لیگ کس دھڑے کا ساتھ دے گی۔ بادی النظر میں سید گروپ کا ستارہ رو بہ زوال تھا۔

12 ر اکتوبر 1945ء کو کراچی میں صوبہ لیگ کونسل کا اجلاس شروع ہوا تو صدر صوبہ لیگ جی۔ایم۔سید نے اسے دو دن کے لئے ملتوی کر دیا کیونکہ آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری نواب زادہ لیاقت علی خان نے اس سے ٹیلی فون پر اس اجلاس کے التوا کی درخواست کی تھی۔ مرکزی پارلیمانی بورڈ کے ارکان لاہور سے اس ریل گاڑی میں سوار نہیں ہو سکے تھے جس کے ذریعے انہیں 12 ر اکتوبر کو کراچی پہنچنا تھا۔ تاہم ڈیلی گزٹ کی رپورٹ یہ تھی کہ کونسل کے 14 ر اکتوبر کے اجلاس کے بعد سندھ میں مستقل طور پر پھوٹ پڑ جائے گی کیونکہ جی۔ایم۔سید اور پیر علی محمد راشدی وغیرہ یہ طے کر چکے ہیں کہ اگر مرکزی پارلیمانی بورڈ نے ان کے حق میں رولنگ نہ دی تو وہ لیگ سے مستعفی ہو جائیں گے۔ 13 ر اکتوبر کو مرکزی پارلیمانی بورڈ کے تین ارکان نواب زادہ لیاقت علی خان، نواب محمد اسماعیل خان اور مسٹر حسین امام کراچی پہنچے۔ بورڈ کا چوتھا رکن چودھری خلیق الزماں تھا لیکن ڈیلی گزٹ کی اطلاع کے مطابق ''وہ محض اس لئے کراچی نہیں آیا تھا کہ اسے ماضی میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر یہ یقین تھا کہ جب تک جناح اور لیگ ہائی کمان

رجعت پسند قوتوں کے خلاف جی۔ایم۔سید کے آئیڈیلزم کو موقع نہیں دیں گے اس وقت تک سندھ کے جھگڑے کا کوئی تصفیہ نہیں ہو سکے گا۔"[8]

14 را کتوبر 1945ء کو مرکزی بورڈ کے ارکان نے پہلے جی۔ایم۔سید سے دو گھنٹے تک ملاقات کی اور پھر انہوں نے بیک وقت سر غلام حسین ہدایت اللہ، میر غلام علی تالپور اور پیر الٰہی بخش سے کئی گھنٹے تک گفت وشنید کی۔اسی دن شام کو ڈسٹرکٹ بورڈ ہال میں صوبہ لیگ کونسل کا اجلاس ہوا جس میں غلام حیدر شاہ کی پیش کردہ ایک طویل قرارداد میں موجودہ صوبائی پارلیمانی بورڈ پر عدم اعتماد کا اظہار کیا گیا اور مرکزی بورڈ کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ جی۔ایم۔سید، سید خیر شاہ، غلام نبی پٹھان اور بھرگری پر مشتمل سب کمیٹی سے مشورہ کر کے صوبائی اسمبلی کے سارے حلقوں کے لئے ٹکٹ دے۔اگر مرکزی بورڈ مناسب سمجھے تو اسے اس مقصد کے لئے لیگ کے دوسرے گروپوں سے بھی مشورہ کر لینا چاہیے۔یہ قرارداد بھاری اکثریت سے منظور ہوئی۔35 کونسلروں نے اس کے حق میں اور صرف پانچ نے اس کے خلاف ووٹ ڈالے۔اس قرارداد کی منظوری کے بعد مرکزی بورڈ کے ارکان نے صوبہ لیگ کے مختلف گروپوں سے بات چیت کا سلسلہ جاری رکھا۔19 را کتوبر کو نواب زادہ لیاقت علی خان نے اوریئنٹ پریس سے انٹرویو میں بتایا کہ "21 را کتوبر کو مسٹر جناح کراچی آئیں گے تو اس کے بعد صوبائی اسمبلی کے لئے ٹکٹوں کی تقسیم کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ ہوگا۔اس نے کہا کہ سندھ مسلم لیگ میں نظریاتی اختلافات کی ساری باتیں بے ہودہ ہیں۔مسلمانوں کا ایک ہی نظریہ ہے وہ ہے پاکستان کا نظریہ۔اس نے مزید کہا کہ پاکستان کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ صوبوں کی بنیاد پر خود مختار ریاستیں قائم ہوں گی اس سے زیادہ اس نظریے کی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں۔"

21 را کتوبر کو قائداعظم محمد علی جناح کراچی پہنچے تو انہوں نے تین چار دن کے دوران جی۔ایم۔سید، خان بہادر ایوب کھوڑو، سر غلام حسین ہدایت اللہ اور بعض دوسرے صوبائی لیڈروں سے ملاقاتیں کی۔جی۔ایم۔سید اپنی ملاقات کے بارے میں لکھتا ہے کہ "جناح مجھ سے اس بنا پر بہت برہم تھا کہ میں نے اس کے مقرر کردہ پارلیمانی بورڈ کے اجلاس کو ملتوی کر دیا تھا۔وہ پراونشل لیگ کونسل کے اجلاس کے انعقاد کے لئے کونسلروں کی درخواست کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔اس نے غیر مبہم الفاظ میں یہ کہا تھا کہ کونسل کے ارکان کی حیثیت محض ایک ہجوم کی تھی اور ان کا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔جب وہ مجھ سے باتیں کر رہا تھا تو اس کا چہرہ غصہ سے لال پیلا ہو

گیا تھا اور اس نے کہا کہ ہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے کے مقام پر پہنچ گئے ہیں۔ وہ میری کوئی بات سننے پر تیار نہیں تھا اور ایسا لگتا تھا کہ اسے یہ بھی احساس نہیں ہے کہ وہ پراونشل لیگ کے ایسے صدر سے مخاطب ہے جس نے محض اپنی جماعت کے حکم کی تعمیل کی ہے...... میں ایک سال سے زائد عرصے سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ میں اور مسٹر جناح رفتہ رفتہ ایسے مقام پر پہنچ رہے ہیں جہاں ہمارے درمیان ایسے مسائل پر پھوٹ پڑ جائے گی جن کا سندھ کے مستقبل سے گہرا تعلق تھا۔''[9]

24 ر اکتوبر کو جناح نے صوبائی پارلیمانی بورڈ کے ساتوں ارکان کو بلایا اور انہیں رسمی طور پر بتایا کہ ''مرکزی پارلیمانی بورڈ نے صوبائی اسمبلی کے لئے مسلم لیگی امیدواروں کے انتخاب کے بارے میں قطعی فیصلہ کرلیا ہے۔ لہٰذا ان امیدواروں کی فہرست کے اعلان سے پہلے تم تحریری طور پر اسی فیصلہ کی پابندی کا وعدہ کرو۔'' جب جی۔ ایم۔ سید نے ایسا کرنے سے انکار کیا تو جناح نے اسے دو تین مرتبہ اس انکار کے نتائج کا احساس دلایا مگر سید بالاصرار انکار کرتا رہا۔ اس موقع پر جی۔ ایم۔ سید کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کے ایک معتمد خاص آغا غلام نبی پٹھان نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور اس نے تحریری عہد نامے پر دستخط کر دیئے۔ اس کے بعد یہ مجلس برخاست ہوئی تو مرکزی بورڈ کی طرف سے صوبائی اسمبلی کی 35 مسلم نشستوں میں سے 28 نشستوں کے لئے لیگی امیدواروں کا اعلان کر دیا گیا اور یہ بھی اعلان کیا گیا کہ بقیہ سات نشستوں کے لئے امیدواروں کے ناموں کا فیصلہ بعد میں ہوگا۔ لیگی امیدواروں کی فہرست میں جی۔ ایم۔ سید اور خان بہادر کھوڑو کے نام شامل تھے لیکن سر غلام حسین کا نام نہیں تھا۔ تاہم ڈیلی گزٹ کی رپورٹ یہ تھی کہ ''اب جی۔ ایم۔ سید کی مسلم لیگ سے بغاوت یقینی ہوگئی ہے لیکن اس بغاوت کا اعلان کچھ عرصہ بعد کیا جائے گا۔''

25 ر اکتوبر کو جناح نے کراچی میں ایک جلسۂ عام کو خطاب کیا جس میں انہوں نے سندھ مسلم لیگ کے جھگڑے کا پس منظر بتاتے ہوئے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ مرکزی پارلیمانی بورڈ کی 12 دن کی کوشش اور انکی اپنی کئی دن کی کوشش کے باوجود اس جھگڑے کا تسلی بخش طریقے سے تصفیہ نہیں ہوسکا۔ لہٰذا مرکزی بورڈ نے اپنے منتخب کردہ امیدواروں کا اعلان کر دیا ہے۔

سید گروپ کی جناح سے بغاوت اور اس کا لیگ سے اخراج

27 ر اکتوبر کو جناح کراچی سے بذریعہ ہوائی جہاز احمد آباد کے لئے روانہ ہوئے تو ہوائی اڈے پر انہیں الوداع کہنے والوں میں جی۔ایم۔سید شامل نہیں تھا۔ جناح کی روانگی سے چند گھنٹے بعد سید گروپ کی طرف سے مسلم لیگ کے خلاف بغاوت کی پہلی علامت کا مظاہرہ کیا گیا جبکہ پیر علی محمد راشدی نے مرکزی اسمبلی کے انتخابات کے لئے مسلم لیگی امیدوار یوسف ہارون کے مقابلے میں اپنے کاغذات نامزدگی داخل کئے۔ سید گروپ کی بغاوت کی دوسری علامت یہ تھی کہ جی۔ایم۔سید نے اسی دن بذریعہ تار صوبائی لیگ کونسل کا اجلاس طلب کیا تھا تاکہ مرکزی پارلیمانی بورڈ کے فیصلے سے پیدا شدہ صورتحال پر غور کیا جا سکے۔ اس پر سیاسی حلقوں کی رائے یہ تھی کہ سید کی صوبائی لیگ مرکزی مسلم لیگ کے سرکاری امیدواروں کے مقابلے میں اپنے امیدوار کھڑے کرے گی۔

9 ر نومبر کو دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے سندھ کے پیر علی محمد راشدی کو مسلم لیگ سے خارج کر دینے کا فیصلہ کیا کیونکہ اس نے نواب زادہ لیاقت علی خان کے تحریری استفسار پر اس امر کی وضاحت نہیں کی تھی کہ وہ مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں مسلم لیگ کے امیدوار یوسف ہارون کا کیوں مقابلہ کر رہا ہے۔ راشدی نے اس فیصلہ کے لئے ایک مقامی کانگرسی لیڈر نچل داس وزیرانی سے بھی بات چیت کی تھی کیونکہ وزیرانی کو مسلم لیگ میں ایک نئی اسمبلی پارٹی کی نمود میں دلچسپی تھی اور اس کا اخبار ''سندھ آبزرور'' یوسف ہارون کے مقابلے میں راشدی کی حمایت کر رہا تھا۔ اس اخبار کا کہنا یہ تھا کہ 'راشدی سندھ کے مسلمانوں میں ذہین ترین آدمی ہے۔''[10]

11 ر نومبر کو راشدی نے سید گروپ کے کارکنوں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''مجھے لیگ ہائی کمان کے متذکرہ فیصلے پر ذرا سا بھی افسوس نہیں ہوا اور میں نے انتخابات میں حصہ لینے کے لئے بہرصورت تہیہ کیا ہوا ہے۔ اس نے کہا کہ سندھیوں کے پاس جناح کے بے ہودہ نظریۂ پاکستان کی حمایت کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ سندھ میں ہم خود کفیل ہیں۔ جناح نے ہمیں کیا دیا ہے۔ وہ جس منزل کی طرف ہمیں لے جا رہا ہے اس سے سندھ کو کوئی

فائدہ نہیں پہنچے گا۔ہم سندھ پر اس حملے کو برداشت نہیں کر سکتے ۔ یہ بہتر ہوگا کہ جناح اور لیگ ہائی کمان سندھ کو اپنے حال پر چھوڑ دے۔''[11]

12 رنومبر کو ''بلوچی گاندھی'' عبدالصمد اچکزئی نے ایک بیان میں راشدی کے اس موقف کی تائید کی۔اس نے قوم پرست مسلمانوں اور بالخصوص سندھ کے علماء سے اپیل کی کہ وہ منظم ہوکر پیر علی محمد راشدی کی حمایت کریں جو مسلم لیگ کے بے ہودہ دعوؤں اوراس کے ہندوستان کے حصے بخرے کرنے کے نصب العین کی مخالفت کررہا ہے۔مسلم لیگ کا یہ نصب العین غیر اسلامی ہے اوراس سے ہمارا ملک اسی طرح کمزور ہوگا جس طرح کہ عرب ممالک اپنے باہمی افتراق کی وجہ سے منتشر ہیں اور ابھی تک غلام ہیں۔[12]

18 رنومبر کو آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے صدر نواب محمد اسماعیل نے جی۔ایم۔سید کو ایک تار بھیجا جس میں اس کی جواب طلبی کی گئی کہ اس کے خلاف مرکزی اسمبلی کے لئے لیگ کے سرکاری امیدوار یوسف ہارون کی مخالفت کرنے کی بنا پر کیوں نہ انضباطی کاروائی کی جائے۔تار میں کہا گیا تھا کہ سید، کانگرس کے نچل داس وزیرانی کے ساتھ مل کر لیگی امیدوار کے خلاف سرگرم عمل ہے۔نواب اسماعیل خان نے جی۔ایم۔سید کو یہ تار نوابزادہ لیاقت علی خان کے نام خان بہادر کھوڑو کے ایک خط کی وصولی کے بعد بھیجا۔کھوڑو نے اس خط میں سفارش کی تھی کہ کراچی کے جنوبی حلقہ کے لئے ہاشم گزدر کو لیگ کا ٹکٹ دیا جائے کیونکہ اس طرح سید گروپ کے خلاف مرکزی مسلم لیگ کا پلہ بھاری ہو جائے گا۔

23 رنومبر کو میر پور خاص میں صوبہ لیگ کے زیر اہتمام ایک جلسۂ عام ہوا جس میں جی۔ایم۔سید، عبدالمجید سندھی اور دوسرے مقامی لیڈروں نے اپنی تقریروں میں مصالحانہ رویہ اختیار کیا۔شیخ عبدالمجید سندھی نے اعلان کیا کہ صوبائی لیگ نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کی جانب سے جی۔ایم۔بھرگری، قاضی احمد اور سید غلام حیدر شاہ صوبائی اسمبلی کی رکنیت کے امیدوار ہوں گے۔
27 رنومبر کو جی۔ایم۔سید نے نواب اسماعیل خان کے 18 رنومبر کے تار کے جواب میں صلح پسندی کا اظہار کیا۔اس نے اپنے جوابی تار میں لکھا کہ میں مسلم لیگ کو اب بھی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرتا ہوں۔اس پر نواب اسماعیل کا جواب الجواب یہ تھا کہ ''ازرہ کرم اپنے اخباری بیان میں مسلم لیگ کے امیدوار یوسف ہارون کی کھلم کھلا حمایت کریں اور علی محمد راشدی سے اپنی

بے تعلقی کا اظہار کریں۔'' جب سید نے نواب اسماعیل کی اس خواہش کی تعمیل کر دی تو سیاسی حلقوں کو یہ محسوس ہوا کہ شاید اب جی۔ ایم۔ سید کی صوبائی مسلم لیگ اور محمد علی جناح کی مرکزی مسلم لیگ میں مصالحت ہو جائے گی۔ بظاہر اب سید کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ مرکزی بورڈ نے ابھی تک صوبائی اسمبلی کی جن نشستوں کے لئے لیگی امیدواروں کا اعلان نہیں کیا ان میں سے تین چار نشستیں اسکے گروپ کو دے دی جائیں۔

2 ر دسمبر 1945ء کو شیخ عبدالمجید نے اپنے طویل مضمون میں کہا کہ میں نے میر پور خاص کے جلسۂ عام میں جو اعلان کیا تھا اب اس کا اعادہ کرتا ہوں۔ میرا اعلان یہ ہے کہ میں ہتھیار ڈالنے کو تیار ہوں۔ بشرطیکہ اس طرح مسلم لیگ کے مختلف دھڑے ایک دوسرے کو تباہ و برباد کرنے سے رک جائیں اور مسلم لیگ کی یکجہتی اور وقار کو ملحوظ رکھیں۔ حیرت ہے کہ مرکزی پارلیمانی بورڈ نے صرف جی۔ ایم۔ سید کو انضباطی کاروائی کی دھمکی دی ہے اور اس نے کسی دوسرے دھڑے کے کسی لیڈر کو اس سلوک کا مستحق نہیں سمجھا۔ میں جماعتی اخراج اور قطع تعلق میں یقین نہیں رکھتا کیونکہ اس طرح مسلم لیگ کا شیرازہ بکھر جائے گا اور اگر انضباطی کاروائی ضروری ہی ہے تو پھر لیگ کے ان سرکاری امیدواروں کو جماعت سے خارج کیوں نہیں کیا جاتا جو ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں اور مسلمہ رشوت خور ہیں۔ وہ مسلم لیگ کے ساتھ صرف اسی وقت تک رہیں گے جب تک وہ لیگ کے نام پر کسی عہدہ پر قائم رہ سکیں گے۔''[13] جی۔ ایم۔ سید اور شیخ عبدالمجید کے اس مصالحانہ رویے کی بظاہر وجہ یہ تھی کہ انہوں نے تقریباً ایک ماہ تک سندھ کے مختلف علاقوں کا دورہ کر کے یہ محسوس کر لیا تھا کہ سندھی مسلمانوں کی بہت بھاری اکثریت قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ ہے اور وہ کسی ایسے فرد یا گروہ کی حمایت نہیں کریں گے جو مرکزی مسلم لیگ کی مخالفت کرے گا۔

ان کا یہ احساس دسمبر کے پہلے ہفتہ میں مزید پختہ ہو گیا جبکہ مرکزی اسمبلی کی مسلم نشست کے پولنگ کے موقع پر مسلم رائے دہندگان نے بھاری اکثریت میں مسلم لیگ کے سرکاری امیدوار یوسف ہارون کو ووٹ دیئے۔ علی محمد راشدی نے خاکسار جماعت کے ٹکٹ پر اس کا مقابلہ کیا تھا۔ 11 ر دسمبر کو اس انتخاب کے نتیجہ کا اعلان ہوا تو معلوم ہوا کہ یوسف ہارون کو 17165 ووٹ ملے تھے اور علی محمد راشدی کے حق میں صرف 7887 ووٹ ڈالے گئے۔ دونوں امیدواروں کے ووٹوں میں اتنا زیادہ فرق اس لحاظ سے بہت اہمیت کا حامل تھا کہ علی محمد راشدی کی

حمایت میں خاکسار جماعت کے علاوہ جمعیت العلمائے ہند، انڈین نیشنل کانگرس اور مسلم لیگ کے سید گروپ نے پورا زور لگایا تھا۔ جس دن اس انتخابی نتیجہ کا اعلان ہوا اسی دن خان بہادر محمد ایوب کھوڑو نواب زادہ لیاقت علی خان کی طلبی پر دہلی گیا اور پھر 13 ردسمبر کو دہلی میں مرکزی پارلیمانی بورڈ کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ سندھ اسمبلی کی بقیہ چھ مسلم نشستوں کے لئے محمد ہاشم گزدر (کراچی سٹی جنوبی)، قاضی فضل اللہ (لاڑکانہ نارتھ)، سردار نور محمد خان (اپر سندھ فرنٹیئر ڈسٹرکٹ ایسٹ) اور سردار سہراب خان (اپر سندھ فرنٹیئر ڈسٹرکٹ سنٹرل) کو لیگ ٹکٹ دیئے گئے ہیں۔ بقیہ ساتویں نشست کے بارے میں لیگ کے ٹکٹ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

18 ردسمبر کو نواب زادہ لیاقت علی خان کراچی پہنچا۔ اس کے ہمراہ قاضی محمد عیسیٰ بھی تھا۔ انکے یہاں آنے کا مقصد جی۔ ایم۔ سید اور اس کے چار ساتھیوں کے خلاف ان الزامات کی تحقیقات کرنا تھا کہ انہوں نے مرکزی اسمبلی کے لئے مسلم لیگی امیدوار سیٹھ یوسف ہارون کی مخالفت کی تھی۔ مرکزی پارلیمانی بورڈ کی جانب سے ان پانچوں سے جواب طلبی کی گئی تھی۔ ان کی کراچی میں آمد سے پہلے 15 ردسمبر کو صوبائی اسمبلی کے انتخابات کے لئے کاغذات نامزدگی داخل کئے جا چکے تھے اور امیدواروں میں سید گروپ کے وہ چار امیدوار بھی شامل تھے جنہیں مرکزی پارلیمانی بورڈ قبل ازیں ٹکٹ دے چکا تھا۔ 20 ردسمبر کو جی۔ ایم۔ سید کی نوابزادہ لیاقت علی خان سے ملاقات ہوئی تو سید نے اس الزام سے انکار کیا کہ اس نے مسلم لیگ کے سرکاری امیدوار یوسف ہارون کی مخالفت کی تھی اور پیر علی محمد راشدی کی حمایت میں کوئی کام کیا تھا۔ البتہ اس نے یہ اعتراف کیا کہ اس نے مسلم لیگی امیدوار کی حمایت میں کوئی کام نہیں کیا تھا۔

نواب زادہ لیاقت علی خان نے خان بہادر کھوڑو، یوسف ہارون اور سید گروپ کے بعض دوسرے مخالفین سے بھی ملاقاتیں کیں اور پھر 21 ردسمبر کو ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ ''مرکزی پارلیمانی بورڈ نے (سید گروپ کے) جن چار امیدواروں کو ضلع نواب شاہ کے حلقوں کے لئے ٹکٹ دیئے تھے وہ واپس لے لئے گئے ہیں کیونکہ انہوں نے مرکزی اسمبلی کے لئے مسلم لیگ کے سرکاری امیدوار یوسف ہارون کی مخالفت کی تھی۔ اب ان کی جگہ (کھوڑو گروپ) کے غلام رسول جتوئی، سید نور محمد شاہ، محمد حاذق اور غلام نبی دیراج کو لیگ کے ٹکٹ دیئے گئے ہیں۔''
نواب زادہ لیاقت علی خان کے اس فیصلے کے اعلان کے بعد جی۔ ایم۔ سید نے مرکزی مسلم لیگ

کے خلاف بغاوت کا رسمی طور پر اعلان کر دیا اور اس طرح کانگرس اور دوسرے ہندو عناصر کی سندھ مسلم لیگ میں پھوٹ ڈلوانے کی دیرینہ خواہش اور کوشش بار آور ہوئی۔

جی۔ ایم۔ سید نے 26 ؍دسمبر کو اس سلسلے میں ایک بیان جاری کیا تھا جس میں اس نے مرکزی مسلم لیگ کی اتھارٹی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ مرکزی پارلیمانی بورڈ کے اس فیصلے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن افراد نے مسلم لیگ پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے وہ دراصل اسلام اور پاکستان کے نام پر اپنے مفادات کا تحفظ کرنا چاہتے ہیں...... آل انڈیا مسلم لیگ کی پالیسی عملی طور پر مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کے کنٹرول میں ہے۔ ہمارے یہ دوست بظاہر ہمیں ہندو انڈیا کے غلبہ سے آزاد کروانے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن دراصل یہ ہم پر اپنا غلبہ قائم کرنا چاہتے ہیں اور مرکزی لیگ پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے لئے نہ صرف ہمارے صوبہ کے رجعت پسند عناصر کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں بلکہ وہ یہاں کے مسلم عوام کو دائمی طور پر مقید رکھنے کے کام میں بھی شریک ہیں...... جن لوگوں کو مسلم لیگ میں اختیار حاصل ہے وہ اپنے طبقہ کے مفادات کے تحفظ کے لئے ایسی صوبائی اسمبلیاں تشکیل کرنا چاہتے ہیں جو دستور ساز اسمبلی کے لئے صرف ایسے افراد منتخب کریں جو ان مفاد پرستوں کے غلبہ کو دوام دے سکیں، وہ مذہب کے نام پر ہندو سرمایہ داروں کو نکال کر ان کی جگہ مسلمان سرمایہ داروں کو مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس وقت تک ہندوستان کی آزادی نہیں چاہتے جب تک ہندو پاکستان کے اصول کو تسلیم نہ کر لیں۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا وہ برطانیہ کے خلاف ترقی پسند عناصر کے ساتھ مل کر مشترکہ نصب العین اختیار کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ وہ اپنے حلقے میں عوام الناس کے نمائندوں کو ان کا جائز مقام دینے پر آمادہ نہیں ہیں۔ وہ مسلم یکجہتی کے نام پر ہم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم وہ سب کچھ کریں جو وہ مفاد پرستوں کو برسر اقتدار رکھنے کے لئے کرتے ہیں۔ جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا ہمیں سر غلام حسین جیسے لوگوں کے لئے پاکستان بنانے کو کہا جا رہا ہے تو ان کا تحکمانہ جواب یہ ہوتا ہے کہ جب تک ہم اپنی منزل حاصل نہیں کر لیتے اس وقت تک معاشی تقسیم کا سوال مت اٹھاؤ...... لہٰذا میرا یہ فیصلہ ہے کہ (1) مجھے جو لیگ ٹکٹ دیا گیا ہے میں اسے واپس کرتا ہوں تا کہ میرے مخالفین کھلم کھلا میدان میں آسکیں۔ (2) میں آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ سے استعفیٰ دیتا ہوں۔ (3) میں لیگ کی مرکزی تنظیم کی اتھارٹی کو اس وقت تک تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں جب تک

مرکز پر موجودہ قیادت کی اجارہ داری قائم رہے گی۔(4) میں سندھ میں مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی ازسرنو تشکیل کروں گا۔(5) میں صوبائی لیگ کی مقرر کردہ کمیٹی کی منظوری سے اپنے امیدوار کھڑے کروں گا۔"[14] تاہم جی۔ایم۔سید کی یہ شعلہ بیانی اس وقت کوئی خاص مؤثر ثابت نہ ہوئی اور سندھ کی مسلم رائے عامہ کی بہت بھاری اکثریت قائداعظم محمد علی جناح اور اس کی مسلم لیگ سے وابستہ رہی۔

29 ردسمبر کو نواب زادہ لیاقت علی خان نے آگرہ سے ایک بیان میں جی۔ایم۔سید کے اس الزام کی تردید کی کہ اس نے یا قاضی عیسیٰ نے یقین دلایا تھا کہ سید گروپ کے جن ارکان نے یوسف ہارون کے انتخاب کی مخالفت کر کے لیگ ڈسپلن کی خلاف ورزی کی تھی ان کے خلاف کوئی انضباطی کاروائی نہیں کی جائے گی۔ نواب زادہ نے انکشاف کیا کہ جی۔ایم۔سید نے 20 ردسمبر کو اس کے نام ایک خط میں تحریری طور پر وعدہ کیا تھا کہ "وہ اور اسکی صوبائی مسلم لیگ اسمبلی کے ہر صوبائی امیدوار کی حمایت کریں گے جسے مرکزی پارلیمانی بورڈ مسلم لیگ کا ٹکٹ دے گا۔"

2 رجنوری کو مرکزی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن قاضی عیسیٰ نے نئی دہلی سے ایک بیان میں کہا کہ "جی۔ایم۔سید نے مسلم لیگ کے خلاف اس لئے بغاوت نہیں کی کہ وہ مسلم لیگ کی پالیسی اور پروگرام سے متفق نہیں۔ اس نے بغاوت صرف اس لئے کی ہے کہ اس کے چار دوستوں سے لیگ ٹکٹ واپس لے لئے گئے تھے۔" خان عیسیٰ نے اس الزام کی تردید کی کہ لیگ لیڈر شپ رجعت پسند ہے اور کہا کہ سید کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ وہ سندھ کے مصیبت زدہ عوام کے حقوق کا علمبردار ہے۔ اس نے سندھ اسمبلی کے لئے جن امیدواروں کو چنا ہے ان میں کوئی غریب اور ہاری نہیں ہے بلکہ ان امیدواروں میں بڑے بڑے جاگیردار ہیں جنہیں سندھ کے غریب عوام کے حقوق و مفادات میں کوئی دلچسپی نہیں۔" اسی دن یعنی 2 رجنوری کو جی۔ایم۔سید کا ایک اور رفیق خاص آغا غلام نبی پٹھان کی طرح اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔ ہاشم گزدر نے صوبہ لیگ کے نائب صدر کی حیثیت سے آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری نوابزادہ لیاقت علی خان کو، جو کراچی میں اپنا متذکرہ فیصلہ صادر کرنے کے بعد واپس دہلی جا چکا تھا، ایک تار بھیجا جس میں کہا گیا تھا کہ "جی۔ایم۔سید نے جو اقدام کیا ہے میں کلی طور پر اس کے خلاف ہوں۔" اسی طرح صوبائی لیگ کے متعدد دوسرے لیڈروں نے نواب زادہ کے نام اپنے تاروں میں سید کے اقدام کی مذمت کی اور یقین دلایا کہ وہ ہر حالت میں آل انڈیا مسلم لیگ کا ساتھ دیں گے۔

3رجنوری1946ءکومیرٹھ میں مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا جس میں جی۔ایم۔ سید کے طرز عمل کو خلاف ضابطہ قرار دیتے ہوئے اسے مسلم لیگ سے خارج کر دیا گیا۔مجلس عاملہ کی رائے یہ تھی کی سید کا 26 ردسمبر کا بیان نہ صرف گمراہ کن اور لیگ کے مفاد کے خلاف ہے بلکہ اس سے مسلم لیگ کے ضوابط کی صریح خلاف ورزی ہوئی ہے۔لہٰذا مجلس عاملہ نے اس کو صوبائی لیگ کی صدارت سے برطرف کر دیا اور مسلم لیگ سے اس وقت تک نکال دیا جب تک مجلس عاملہ یہ پابندی خود نہ ہٹائے۔ ہاشم گز در نائب صدر کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ سید سے چارج لے لے۔ مجلس عاملہ سے سید گروپ کے ان دس ارکان کو مسلم لیگ سے علیحدہ کر دیا گیا جنہوں نے لیگ کے منتخب کردہ امیدواروں کے خلاف انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تھا۔مجلس عاملہ نے سندھ کے صوبائی انتخابات کی نگرانی کے لئے ایک چھ رکنی کمیٹی بھی مقرر کی جو خان بہادر کھوڑو، ہاشم گز در، غلام نبی پٹھان، حاتم علوی، میر غلام علی تالپور اور یوسف ہارون پر مشتمل تھی۔

جی۔ایم۔سید کے لیگ سے اخراج کے بعد نوائے وقت کی قلابازیاں

لاہور کے اخبار نوائے وقت کو جی۔ایم۔سید کے لیگ سے اخراج پر بہت افسوس ہوا۔ اس اخبار کی ادارتی رائے میں سید کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ وہ ''بعض غلط کار مشیروں کے زیر اثر ''سندھ۔سندھیوں کے لئے'' کا نعرہ لگا کر سندھی و غیر سندھی مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے کا موجب بن رہے تھے۔سندھ کی مسلم سیاست کی تعمیر میں غیر سندھی مسلمانوں کا بڑا حصہ ہے اور انہوں نے اس صوبہ کی گراں بہا خدمات سرانجام دی ہیں۔قدرتی طور پر مسٹر سید کی یہ نئی تحریک ان مسلم عناصر کو ناگوار گزری اور انہوں نے اس کے خلاف شدید احتجاج کیا۔اس وقت مسٹر سید، شیخ عبدالمجید سندھی، مسٹر علی محمد راشدی اور مسٹر نچل داس وزیرانی کے زیر اثر تھے۔مگر تھوڑا ہی عرصہ بعد انہیں اپنی غلطیوں کا احساس ہوا تو انہوں نے اس تحریک کو مختلف بے ضرر مفہوم پہنانے کی کوشش کی مگر انکی ہر دلعزیزی کو جو دھکا لگنا تھا وہ لگ چکا تھا۔مسٹر جی۔ایم۔سید نے دوسری ٹھوکر اس وقت کھائی جب وہ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی پر زور دے کر مسٹر نچل داس وزیرانی کو وزارت میں لائے۔مسٹر وزیرانی سیاسیات ہند میں ایک ابلیسی قوت سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ انہیں مسلمانوں کی سیاسی، اقتصادی خوشحالی اور ترقی کے ہر امکان سے دلی نفرت ہے......مسٹر سید کا

نقص صرف یہی نہیں کہ وہ مستقل مزاج نہیں بلکہ وہ غور وفکر کی صلاحیت سے بھی محروم ہیں اور انہوں نے یہ کام مسٹر راشدی اور مسٹر وزیرانی کو سونپ رکھا ہے اور سید صاحب کے ان مشیروں نے انہیں ایسی غلط پوزیشن میں ڈال دیا کہ لیگ مجلس عاملہ کے پاس انہیں لیگ سے خارج کئے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔''[15] یہ مسٹر جی۔ایم۔سید وہی ہے جس کے بارے میں نوائے وقت کی 7/مارچ 1945ء کی رائے یہ تھی کہ وہ اس شدت کے ساتھ اصول پرور ہیں کہ ''انکے ایسے استقلال اور کریکٹر کی پختگی کی مثال مسٹر جناح کے سوا مسلم لیگ کے شاید ہی کسی لیڈر میں مل سکے۔'' مگر اب 4/جنوری 1946ء کو نوائے وقت کی رائے یہ تھی کہ ''مسٹر سید کا نقص صرف یہ نہیں کہ وہ مستقل مزاج نہیں بلکہ وہ غور وفکر کی صلاحیت سے بھی محروم ہیں۔''

جی۔ایم۔سید کے بارے میں نوائے وقت کی اس صحافتی قلابازی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ جنوری 1945ء میں پورے برصغیر میں مسلم لیگ کی عوامی لہر نے ایک طوفان کی شکل اختیار کر لی تھی۔ مدیر نوائے وقت بھی سر غلام حسین ہدایت اللہ کی طرح ''معاملہ فہم اور حقائق آشنا'' تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس زمانے میں مسلم لیگ کی مرکزی قیادت کو ''شتر مرغ'' کا خطاب دینا یا اس پر دوست پروری کے الزامات عائد کرنا دریا میں رہ کر مگر مچھ سے الجھنے والی بات تھی۔ کوئی سمجھدار صحافی اس غلطی کا مرتکب نہیں ہوسکتا تھا۔ مارچ 1945ء میں وہ مسلم لیگ میں انتہا درجہ کی مرکزیت کے خلاف تھا مگر اب جنوری 1946ء میں اس کی رائے یہ تھی کہ ''سندھ کی سیاست کی تعمیر میں غیر سندھی مسلمانوں کا بہت بڑا حصہ ہے اور انہوں نے گراں بہا خدمات سرانجام دی ہیں۔''
دوسری وجہ یہ تھی کہ حکومت سندھ نے 30/جنوری 1945ء کو لکھی کے جنگل سے حروں کا قطعی طور پر قلع قمع کرنے کے لئے ایک نئی پالیسی کا اعلان کیا تھا۔ اس پالیسی کے تحت یہ طے پایا تھا کہ اس جنگل کو صاف کر کے اس کی زمین برائے کاشت دیہاتی عوام میں بانٹ دی جائے گی۔ پھر مئی میں حکومت سندھ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ لکھی جنگل کی زمینوں پر پنجابیوں کو آباد کیا جائے گا۔ صوبائی لیگ کونسل نے جی۔ایم۔سید کی زیر صدارت 6/جون کو اس فیصلے کی پرزور مخالفت کی تھی اور حکومت سندھ پر زور دیا تھا کہ وہ ان زمینوں پر غیر سندھیوں کو نہ لائے کیونکہ اس طرح سندھ کے لئے تازہ مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ اس قرارداد کی منظوری پر نوائے وقت نے کوئی تنقیدی تبصرہ نہیں کیا تھا کیونکہ ان دنوں وہ سر غلام حسین ہدایت اللہ کو سیاسیات میں ایک ابلیسی قوت تصور کرتا تھا اور کہتا تھا

کہ ''اس شخص نے سندھ میں مسلم لیگ کو اس قدر نقصان پہنچایا ہے کہ اس کی تلافی نہیں ہوسکتی۔'' مگر سندھ میں بعض پنجابی آباد کاروں نے احتجاج کیا تو 12 راکتوبر کو جی۔ایم۔سید اور اس کے ساتھیوں نے ایک مشترکہ بیان میں اس امر کی وضاحت کی کہ ''سندھ میں غیر سندھیوں کو درآمد کرنے کے خلاف ان کے رویہ کا مطلب یہ نہیں کہ وہ پنجابی مسلمانوں کے خلاف ہیں اور سندھ میں انہیں ان کے زیر کاشت رقبہ سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم پاکستان کے مطالبہ کے علمبردار ہیں اس لئے ہم مختلف صوبوں کے مسلمانوں کے درمیان امتیاز نہیں کرسکتے۔ ہم نے لکھی جنگل کی زمینوں کے بارے میں جو قرارداد منظور کی ہے اس کا پنجابی مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارا مطالبہ صرف یہ ہے کہ یہ زمین اس کے اصل مالکوں کے پاس ہی رہنے دی جائے۔ ان مالکان اراضی میں پنجابی تھانیدار بھی شامل ہیں۔ ہمارے اس مطالبے کی تکمیل سے پنجابی مسلمانوں کے مفادات کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ سندھ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ اس سلسلے میں جو قرارداد منظور کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ سندھ میں دوسرے صوبوں کے ہندوؤں کو مزید درآمد نہ کیا جائے کیونکہ اس طرح یہاں کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی آبادی کے تناسب میں تبدیلی آجائے گی اور بیراجوں کے علاقوں کا بہت سا قابل کاشت رقبہ بھی ہندوؤں کے قبضہ میں چلا جائے گا۔'' نوائے وقت نے اس بیان پر کوئی تبصرہ نہ کیا کیونکہ بظاہر یہ اس کے لئے اطمینان بخش تھا۔ پھر جب 4 رنومبر کو حکومت سندھ نے پھر اعلان کیا کہ لکھی جنگل کو صاف کر کے اس کی زمین پر فوج سے فارغ ہونے والے سپاہیوں کو آباد کیا جائے گا اور اس مقصد کے لئے ایک اسپیشل کمشنر کا تقرر کر دیا گیا ہے تو سید گروپ نے یوسف ہارون کے خلاف اپنی انتخابی مہم کے دوران اس پالیسی کی مخالفت کی اور مطالبہ کیا کہ اس جنگل کی زمین کے سندھی مالکان کو بے دخل نہ کیا جائے لیکن نوائے وقت نے اس انتخابی پروپیگنڈے کو بھی قابل تنقید نہ سمجھا۔ اسے جی۔ایم۔سید کے سندھی اور غیر سندھی کے نعرے پر اعتراض صرف 3 رجنوری 1946ء کو ہوا جبکہ سید اور اس کے ساتھیوں کو مسلم لیگ سے خارج کر دیا گیا تھا۔ اب جی۔ایم۔سید میں کوئی اچھائی باقی نہیں رہی تھی اور سر غلام حسین ہدایت اللہ میں کسی برائی کا نام ونشان نہیں تھا۔ اب مسلم لیگ کی مرکزی قیادت کا رویہ شتر مرغ کا سا نہیں تھا اور نہ ہی مسلم لیگ کے اندر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ ''سر غلام حسین ہدایت اللہ سے ترجیحی سلوک کیوں کیا جارہا ہے۔''

جناح۔سیّدتضاد......ایک جائزہ۔ایک موازنہ

دراصل جی۔ایم۔سیداوراسکے ساتھیوں کامسلم لیگ سے اخراج اس تضاد کامنطقی نتیجہ تھا جوسیداور قائداعظم جناح کے درمیان جولائی 1944ء میں صوبائی مسلم لیگ کی ہدایت اللہ وزارت کے خلاف قراردادوں کی بنا پر پیدا ہوا تھا۔اس کے بعدان دونوں شخصیتوں کے درمیان تضاد کی شدت میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا۔جی۔ایم۔سید کو شکایت تھی کہ مسلم لیگ کی مرکزی قیادت صوبائی معاملات میں بے جامداخلت کر کے رجعت پسند جاگیرداروں،کی پشت پناہی کرتی ہےاورمسلم لیگ کی مرکزی قیادت کو یہ شکایت تھی کہ جی۔ایم۔سید جماعتی نظم وضبط کی پابندی نہیں کرتااورآئے دن کوئی نہ کوئی جھگڑا پیدا کر کے لیگ کی تنظیم اوراس کے نصب العین کونقصان پہنچاتا رہتا ہے۔یہ دونوں شکائیتیں صداقت سے سراسر عاری نہیں تھیں۔جی۔ایم۔سید کا یہ الزام غلط نہیں تھا کہ سندھ کے مسلمانوں کا جاگیردار طبقہ نہایت دقیانوسی اورعوام دشمن تھااورمسلم لیگ کی مرکزی قیادت 1944ء کے بعد سے اس طبقے کی پشت پناہی کرتی رہی تھی۔اس کا یہ الزام بھی بے بنیادنہیں تھا کہ میروں،پیروں اوروڈیروں کا سرغنہ سرغلام حسین ہدایت اللہ برطانوی سامراج کا پشتینی پٹھواور بدترین قسم کا موقع پرست تھا۔اس کا کوئی سیاسی نظریہ نہیں تھا۔وہ مسلم لیگ کا وفادارنہیں تھا۔وہ 1938ء میں اس جماعت میں محض اس لئے شامل ہوا تھا کہ اس طرح اسے اپنے اقتدارکو برقراررکھنے کی امید تھی۔اس کا یہ الزام بھی حقیقت سے خالی نہیں تھا کہ مسلم لیگ میں انتہادرجہ کی مرکزیت کارجحان پایا جاتا تھااورصوبائی مسلم لیگیوں کوعملی طور پرکوئی اختیارحاصل نہیں تھا۔قائداعظم محمدعلی جناح کا طریقۂ کارواقعی غیرجمہوری تھااوروہ اپنی کل ہندسیاسی حکمت عملی کی کامیابی کی خاطرصوبائی معاملات میں مداخلت کرنے میں کوئی تامل نہیں کرتے تھے۔اس کا یہ الزام بھی بہت حدتک صحیح تھا کہ مسلم لیگ میں بمبئی،مدراس،کلکتہ،حیدرآباد(دکن)لکھنؤ،الہٰ آباد میرٹھ اور دہلی وغیرہ کے ایسے جاگیرداروں اورسرمایہ داروں کی کمی نہیں تھی جواسلام اور پاکستان کے نام پرمسلم اکثریتی صوبوں پراپناسیاسی،معاشرتی اورمعاشی غلبہ قائم کرناچاہتے تھے۔ان مفاد پرست عناصرکومسلم اکثریتی صوبوں کے پسماندہ عوام کے حقوق ومفادات کا کوئی خیال نہیں تھااور اس کا یہ الزام بھی مبنی برصداقت تھا کہ پنجاب کے شاونسٹ اورمفاد پرست عناصر سندھ کے وسیع

معاشی ذرائع پر اپنی حریصانہ نظریں جمائے ہوئے تھے اور وہ ہر لمحہ ان ذرائع پر گِدھوں کی طرح جھپٹنے کے موقع کے منتظر تھے۔ انکے نزدیک اسلام، مسلم قومیت اور پاکستان کا مطلب یہی تھا۔

جی۔ایم۔سید کا کہنا یہ تھا کہ وہ 1938ء میں مسلم لیگ میں اس لئے شامل ہوا تھا کہ اس صوبہ کے ہندو ساہوکار، زمیندار اور سرمایہ دار غریب عوام کو کوئی سیاسی، معاشرتی اور معاشی رعایت دینے پر آمادہ نہیں تھے۔ اسے امید تھی کہ مسلم لیگ سندھ کے ہاریوں اور دوسرے مظلوم مسلم عوام کو ہندو اقلیت کے استحصالی چنگل سے نجات دلا کر انہیں ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن کرے گی مگر مسلم لیگ کے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے اسکی امید کو پاکستان کے قیام سے پہلے ہی خاک میں ملا دیا لیکن اس کا یہ موقف بالکل صحیح نہیں تھا۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ خود اس کا عملی طور پر ہاریوں کے حقوق و مفادات سے کبھی تعلق نہیں رہا تھا۔ وہ ہاری کمیٹی کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ جن لوگوں کو لیگ ٹکٹ دلوانا چاہتا تھا ان میں سے کوئی ایک بھی ہاری یا مزدور نہیں تھا۔ نوائے وقت کی اسکے اس موقف پر یہ تنقید بالکل بے جا نہیں تھی کہ اس کے بیان میں غریب اور امیر، سرمایہ دار اور مزدور اور زمیندار اور ہاری کے امتیازات کا ذکر بے معنی تھا۔ وہ جن لوگوں کو ٹکٹ دلانا چاہتا تھا وہ غریب، مزدور اور ہاری نہیں تھے۔ غلام مصطفیٰ بھرگری اور حسین شاہ کو اسی طرح اپنی ریاست اور امارت پر ناز تھا جس طرح یوسف ہارون اور محمود ہارون کو۔ سید خیر شاہ اور سید حیدر شاہ کہاں کے مزدور اور غریب تھے اور علی محمد راشدی کو ہاری کون کہہ سکتا تھا۔

جی۔ایم۔سید نے اپنی ان جائز یا ناجائز شکایات کے ازالہ کے لئے جو طریقۂ کار اختیار کیا تھا وہ بھی حقیقت پسندانہ نہیں تھا۔ اس کی شخصیت میں معاملہ فہمی اور حقائق شناسی کی صلاحیت کی بہت کمی تھی۔ اس کی خود پسندی اور انانیت سندھ کے غریب عوام کے اجتماعی حقوق اور مفادات پر غالب تھی۔ وہ انتہا درجے کا ہٹ دھرم اور برخود غلط تھا اور ان وجوہ کی بنا پر اس کی سیاسی بصیرت کا دائرہ بہت محدود تھا اور اس کی سیاسی تدابیر ناقص ہوتی تھیں۔ اگر وہ برطانوی سامراج، انڈین نیشنل کانگرس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے مقاصد اور تدابیر پر گہری نظر رکھتا اور پھر اس کے بعد کے عالمی حالات اور ہندوستان کے حالات کو اچھی طرح پیش نظر رکھتا تو وہ ایسی غلطیاں نہ کرتا جن کی وجہ سے سندھ کی عنان سیاست کلی طور پر دقیانوسی جاگیرداروں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ اسے ایک تجربہ کار سیاسی لیڈر کی حیثیت سے یہ معلوم ہونا چاہیے تھا کہ 1921ء کے

بعد پورے برصغیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مسلسل خون خرابے اور پھر 38-1937ء میں ہندو اکثریتی صوبوں میں کانگرسی وزارتوں کی فرقہ پرستانہ پالیسیوں کے باعث ان دونوں فرقوں کے درمیان معاندانہ تضاد کی خونی خلیج اس قدر وسیع ہوگئی تھی کہ اسے محض آئیڈیلزم، پندونصائح یا طعن وتشنیع کے زور پر عبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ قائداعظم اوران کی مسلم لیگ کی سیاست 38-1937ء میں چمکی تھی اور 1945ء میں یہ اتنی طاقتور ہوچکی تھی کہ کوئی سمجھدار مسلمان لیڈر اس سے ٹکر لینے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا اور نہ ہی اسے کرنی چاہیے تھی۔ اس عرصے میں جناح کی سیاست میں اتنا زور پیدا ہو چکا تھا کہ پنجاب کے سر سکندر حیات خان، آسام کے سر سعد اللہ اور بنگال کے مولوی فضل الحق جیسے دیوہیکل سیاسی لیڈروں کو اس کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے تھے۔ سر خضر حیات خان ٹوانہ نے جب اپریل 1944ء میں قائداعظم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا تھا تو پنجابی مسلمانوں میں اس کا نام ایک گالی بن گیا تھا۔ 1938ء کے بعد دو ایک سال تک جناح کی پالیسی یہ تھی کی حکومت برطانیہ اور کانگرس، آل انڈیا مسلم لیگ کو مسلمانان ہند کی ایک ''بااختیار'' جماعت تسلیم کریں اور پھر اس کے ساتھ 1916ء کے ''لکھنؤ پیکٹ'' کی قسم کا کوئی سمجھوتہ کریں لیکن ستمبر 1939ء میں عالمی جنگ شروع ہونے کے بعد جب گاندھی اور اسکی کانگرس نے جناح اوران کی مسلم لیگ سے کسی تصفیہ کے بغیر فوری آزادی کا مطالبہ کیا تو ان دونوں شخصیتوں ،دونوں جماعتوں اور دونوں فرقوں کے درمیان تضاد کی خلیج اور بھی وسیع ہوگئی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی 23/مارچ 1940ء کی قرارداد لاہور دراصل آل انڈیا کانگرس کی 16/مارچ کی رام گڑھ کی قرارداد کے نہلے پر دہلے کی حیثیت رکھتی تھی اور وائسرائے لنلتھگو (Linlithgow) نے حکومت برطانیہ کو اپنی سرکاری رپورٹوں میں یہی لکھا تھا۔ پھر جب 1942ء میں گاندھی اور اس کی کانگرس کی ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی پرتشدد تحریک ناکام ہوگئی تو جناح اوران کی مسلم لیگ کی سیاست کو پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا۔ کیونکہ اس زمانے میں ہندو مسلم تضاد بالکل لاینحل ہو چکا تھا اور مسلمانان ہند کا درمیانہ طبقہ جنگ کے بعد ہندوراج کے تصور سے بہت خوفزدہ تھا۔

حیرت ہے کہ جی۔ایم۔سید جیسا تجربہ کار لیڈر ان سیاسی حقائق کو نظر انداز کر کے 45-1944ء میں کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان ایک ایسے تصفیہ پر زور دیتا تھا جو جناح اور اس کی مسلم لیگ کی سیاسی پوزیشن کو کمزور کرنے کا باعث بن سکتا تھا۔ نواب زادہ لیاقت علی خان بھی

اسی قسم کے تصفیے کے حق میں تھا اور اس نے 1944ء میں اس مقصد کے لئے جناح سے بالا بالا بھولا بھائی ڈیسائی کے ساتھ ایک خفیہ معاہدہ بھی کیا تھا۔ پھر 1945ء میں شملہ کانفرنس کے دوران بھی وہ اس معاہدے کو جامۂ عمل پہنانے کے حق میں تھا مگر جب قائداعظم جناح کے بگڑے ہوئے تیور دیکھے تو اس نے اپنی جاگیردارانہ موقع پرستی کے باعث سر تسلیم خم کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کیا اور وہ اپنی ذلت واہانت کو صندل کے شربت کی طرح پی گیا۔ جناح 46-1945ء کے عام انتخابات سے قبل برطانیہ اور کانگرس سے کوئی تصفیہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کی حکمت عملی یہ تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو ان انتخابات میں شاندار کامیابی حاصل کی جائے اور پھر مسلمانان ہند کے بااختیار قائد اعظم کی حیثیت سے کوئی باعزت تصفیہ کیا جائے۔ چونکہ سندھ میں درمیانہ طبقہ نہ ہونے کے برابر تھا اس لئے جناح ایک نہایت حقیقت پسند سیاست دان کی حیثیت سے اس صوبہ میں وہ پالیسی اختیار نہیں کر سکتے تھے جو انہوں نے اپریل 1944ء میں پنجاب میں اختیار کی تھی۔ یہاں ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ مطلوبہ انتخابی کامیابی کے لئے مٹھی بھر درمیانہ طبقہ کے نمائندہ جی۔ایم۔سید کی بجائے میروں، پیروں اور جاگیرداروں پر انحصار کریں۔ جناح کی کل ہند سیاست کا تقاضا یہی تھا اور بدقسمتی سے جی۔ایم۔سید اس تلخ حقیقت کو سمجھنے سے قاصر تھا یا وہ سمجھتا تو تھا لیکن اس کی ہٹ دھرمی اور انانیت اُسے اس پر عمل کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔

جی۔ایم۔سید کی سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آتی تھی کہ آخر کانگرس اور ہندوؤں کے دوسرے مفاد پرست عناصر ہر اس مسلمان فرد یا گروہ کی پشت پناہی اور حوصلہ افزائی کیوں کرتے ہیں جس میں جناح اور اس کی مسلم لیگ کے خلاف بغاوت کا رجحان پایا جاتا تھا۔ ہندو اخبارات اور کانگرس کی مسلمانوں میں ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی یہ پالیسی جناح اور اس کی مسلم لیگ کی روز افزوں سیاسی قوت کا سب سے بڑا ستون تھی۔ ہندو اخبارات اور سیاسی لیڈر جناح کی جتنی زیادہ مخالفت کرتے تھے وہ اسی تناسب سے مسلمانوں میں مقبول ہوتے جاتے تھے۔ 45-1944ء میں کراچی سے ہندوؤں کے دو انگریزی اخبارات ''ڈیلی گزٹ'' اور ''سندھ آبزرور'' شائع ہوتے تھے۔ اگر ان اخبارات کی ان دو سالوں کی فائلوں پر نظر ڈالی جائے تو صاف پتہ چل جاتا ہے کہ دسمبر 1945ء میں جی۔ایم۔سید کی سیاسی خودکشی میں سب سے بڑا کردار کن عناصر نے ادا کیا تھا۔ یہ اخبارات جناح کے نام کے ساتھ تو ''پاکستان کا ہز میجسٹی سلطان بہادر'' اور ''لوئیس چہار دہم'' کے

اشتعال انگیز القابات لکھتے تھے لیکن وہ جی۔ایم۔سید اور اس کے ساتھیوں کو اصول پرور، محب الوطن اورعوام دوست کے القابات سے نوازتے تھے۔ڈیلی گزٹ کی رائے میں پیر علی محمد راشدی سندھی مسلمانوں میں ''ذہین ترین'' شخص تھا۔جب مسلمانوں کے تعلیم یافتہ عناصر یہ اخبارات پڑھتے تھے تو ان کا اولین تاثر یہ ہوتا تھا کہ یہ متعصب اخبارات جن مسلمان عناصر کی تعریف وتوصیف کرتے ہیں ان کا وجود مسلمانان ہند کے اجتماعی مفادات کے لئے ضرورنقصان دہ ہوگا۔ان کا دوسرا تاثر یہ ہوتا تھا کہ یہ اخبارات محمد علی جناح کے خلاف ہر روز محض اس لئے دشنام طرازی کرتے ہیں کہ وہ مسلمانان ہند کے حقوق و مفادات کا حقیقی علمبردار ہے اور فی الواقع مسلمانوں کا قائداعظم ہے۔سندھ کی مسلم رائے عامہ اس عمومی تاثر سے بیگانہ نہیں رہ سکتی تھی۔یہی وجہ تھی کہ جونہی جی۔ایم۔سید نے جناح اوران کی مسلم لیگ سے رشتہ منقطع کیا تو صوبہ میں اس کی سیاسی ساکھ راتوں رات تقریباً ختم ہوگئی۔

جی۔ایم۔سید مسلم لیگ کے خلاف غیر جمہوری اور آمرانہ طریقے اختیار کرنے کا جوالزام عائد کرتا تھا اگرچہ وہ حقیقت سے بعید نہیں تھا لیکن یہ بات برصغیر کی بورژوا سیاست میں کوئی انوکھی نہیں تھی۔ برصغیر کی سیاست کے ہر طالب علم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ انڈین نیشنل کانگرس میں آئیڈیل بورژوا جمہوریت کی کارفرمائی نہیں تھی بلکہ اس جماعت کا ہر اہم فیصلہ صرف ایک شخص کرتا تھا اور اس کا نام موہن داس کرم چند گاندھی تھا۔کانگرس میں بالعموم کسی بھی شخص کو گاندھی سے اختلاف رائے کی جرأت نہیں ہوتی تھی اور اگر سوبھاش چندر بوس جیسا کوئی شخص ایسی جرأت کرتا تھا تو اس کے لئے کانگرس میں کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی۔ ہر شخص کو معلوم تھا کہ 1920ء میں تحفظ خلافت کے لئے عدم تعاون کی تحریک چلانے کا فیصلہ گاندھی اورصرف گاندھی نے کیا تھا۔لالہ لاجپت رائے، مدن موہن مالویہ، موتی لال نہرو اور بہت سے دوسرے کانگرسی لیڈر اس فیصلے کے خلاف تھے مگر ان میں کسی کو گاندھی کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔1930ء میں سول نافرمانی کی تحریک چلانے کا فیصلہ بھی گاندھی اورصرف گاندھی کا تھا۔باقی سارے کانگرسی لیڈروں کو طوعاً وکرھاً اس فیصلے پر عمل کرنا پڑا تھا۔1931ء کے اوائل میں وائسرائے ارون (Irwin) نے برطانیہ کی لیبر حکومت کی ہدایت کے مطابق گول میز کانفرنس کے بارے میں معاہدہ گاندھی اورصرف گاندھی سے کیا تھا حالانکہ کانگرس میں اس کے پاس کوئی عہدہ

نہیں تھا۔ ستمبر 1931ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں کانگرس کی نمائندگی کے لئے گاندھی اور صرف گاندھی گیا تھا۔ پھر اگست 1942ء میں ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ گاندھی اور صرف گاندھی نے کیا تھا۔ کانگرس نے اس مقصد کے لئے جو قرارداد منظور کی تھی اس میں کہا گیا تھا کہ ''گاندھی جی اس تحریک کے ڈکٹیٹر ہونگے اور وہی تحریک شروع کرنے کی تاریخ اور اس کے لائحہ عمل کا فیصلہ کریں گے۔'' مسلمانان ہند نے محمد علی جناح کو کانگرسی راج کے تلخ تجربے کے بعد دسمبر 1938ء میں قائداعظم بنایا تھا لیکن آل انڈیا کانگرس اس سے بہت پہلے گاندھی کو''باپو جی''اور''مہاتما جی'' بنا چکی تھی۔ سیٹھ جی۔ڈی۔ برلا کے بیان کے مطابق ''کانگرس میں جب کبھی ''باپو جی'' (گاندھی) کے ساتھ اختلاف ہوتا ہے تو وہ آخر میں کہہ دیتے ہیں اچھا میں تمہارا فارمولا مان لیتا ہوں بشرطیکہ اس کی تعبیر مجھ پر چھوڑ دی جائے۔''[16] کانگرس میں گاندھی کی آمریت کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ بہت سے ہندو مؤرخین بھی یہ مانتے ہیں کہ کانگرس کی مجلس عاملہ اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے جلسوں میں گاندھی کی رائے فیصلہ کن ہوتی تھی۔ بہت سے فیصلے وہ از خود کرتا تھا اور کانگرس بعد میں ان کی توثیق کر دیتی تھی۔ لیکن جی۔ایم۔سید کو صرف مسلم لیگ میں جناح کی آمریت واستبدادیت نظر آتی تھی لیکن وہ کانگرس میں گاندھی کی آمریت ومہاتمیت سے بالکل بے خبر تھا۔

جی۔ایم۔سید کی جانب سے ''سندھ۔سندھیوں کے لئے ہے'' کا نعرہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ پنجاب کے سر فضل حسین، سر سکندر حیات اور سر خضر حیات کا یہ نعرہ تھا کہ ''پنجاب پنجاب ہے، پانچ دریاؤں کی اس سرزمین میں کسی غیر پنجابی کو مداخلت کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔'' پنجاب کے وزیراعلیٰ سر خضر حیات خان کا 14ر دسمبر 1944ء کو صوبائی اسمبلی میں اعلان یہ تھا کہ ''ہم کسی غیر پنجابی کی خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، مداخلت برداشت نہیں کر سکتے۔''[17] پنجاب کے جاگیرداروں کے سرغنہ کے اس اعلان کا مطلب یہ تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر قائد اعظم محمد علی جناح کو پنجاب کے معاملات میں مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں اور یہی بات سندھ کے درمیانہ طبقہ کا نمائندہ جی۔ایم۔سید کہتا تھا لیکن ان دونوں میں فرق یہ تھا کہ پنجاب کا جاگیردار 1944-45ء میں اپنے اس صوبائی موقف پر سختی سے قائم رہا جبکہ جی۔ایم۔سید نے اس عرصے میں کئی مرتبہ ایسا کیا کہ اس نے پہلے تو مرکزی قیادت کے فیصلے کو مان لیا مگر بعد میں اپنے تحریری

وعدے سے منحرف ہو گیا۔ جناح کو اس کی یہی وعدہ خلافی اور بے اصولی سخت ناگوار گزرتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ جناح نے اس کی ایک سے زیادہ مرتبہ توہین کی تھی۔ جہاں تک لکھی جنگل کی زمینوں پر پنجابیوں کی آبادکاری کی مخالفت کا تعلق تھا اس پر نوائے وقت یا پنجابی شاونسٹوں کا کوئی اور ترجمان اعتراض نہیں کر سکتا تھا کیونکہ پنجاب کی سرکاری زمینوں کے بارے میں پنجابی شاونسٹوں کا بھی یہی موقف تھا۔ اس سلسلے میں نوائے وقت کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ ''جنگ کے بعد جو غیر پنجابی سپاہی فوج سے علیحدہ ہونگے انہیں پنجاب کی سرکاری زمینوں پر آباد نہ کیا جائے ...... پنجاب کی غیر آباد زمین رسماً و عرفاً ضرور حکومت کی ملکیت ہے لیکن دراصل یہ زمین اہل پنجاب کی ملکیت ہے...... زیر بحث تجویز میں پنجاب کی زمین کی خریدار حکومت ہند ہے۔ حکومت ہند مجوزہ نوآبادیوں میں جن لوگوں کو بسائے گی ظاہر ہے ان کی غالب اکثریت غیر پنجابیوں پر مشتمل ہوگی۔ پنجابی تناسب آبادی کے مطابق اس تقسیم میں حصہ حاصل کر سکتے ہیں۔ ایک لاکھ ایکڑ زمین میں جو نئے خاندان آباد ہونگے ان میں یقیناً ہندوؤں کا تناسب مسلمانوں کی نسبت بہت زیادہ ہوگا۔ پنجاب میں مسلمانوں کو آئینی طور پر جو اکثریت حاصل ہے وہ اس وقت بھی بالکل برائے نام اور نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر نوآبادیوں میں پچاس ہزار ہندو خاندان بھی آباد کئے گئے تو کچھ عرصہ بعد مسلمانوں کے تناسب آبادی پر جو اثر پڑے گا وہ ظاہر ہے۔ اس وقت بھی باہر سے جو صنعتی مزدور پنجاب میں لائے جا رہے ہیں وہ سو فیصد ہندو ہیں۔ اگر زرعی زمینوں پر بھی ہندو آباد کئے گئے تو مسلمانوں کی پوزیشن سخت خراب ہو جائے گی...... اگر حکومت پنجاب کو یہ زمین حکومت ہند کے ہاتھ بیچنا ہی ہے تو کم از کم اتنا ضرور ہونا چاہیے کہ پنجاب کی مجوزہ نوآبادیوں میں زمین صرف پنجابی سپاہیوں کو دی جائے۔ اس سے ہمارے تناسب آبادی پر بھی اثر نہیں پڑے گا۔ پنجابی سپاہیوں کی بھی حق رسی ہوگی اور قدیم اضلاع کی زمینوں پر اس وقت جو بوجھ ہے وہ بھی ہلکا ہو جائے گا کیونکہ زیادہ تر پنجابی سپاہی ان ہی اضلاع سے تعلق رکھتے ہیں...... یہ مسئلہ پنجابیوں کے آپس کے اختلافات سے بالا ہے اور سبھی کو بلا لحاظ عقائد سیاسی اس سے گہرا تعلق ہے۔ اس لئے کم از کم اس سوال پر سارے پنجابیوں کو بالعموم اور مسلمانوں اور زمینداروں کو بالخصوص متحد ہو کر حکومت پر زور دینا چاہیے کہ فوجی سپاہیوں کی بہتری کے لئے ضرور تدبیر کی جائے۔ ہم اس کے زبردست مؤید ہیں لیکن اہل پنجاب کی آئندہ ترقی کے امکانات کو بالکل ختم نہ کر دیا جائے۔''[18] گویا نومبر 1944ء

میں نوائے وقت سیاسی عقائد سے بالاتر ہو کر پنجاب کے حقوق کے بارے میں بہت فکر مند تھا اور اس مقصد کے لئے وہ سارے پنجابیوں کو بالعموم اور پنجابی مسلمانوں اور زمینداروں کو بالخصوص متحد ہونے کی تلقین کرتا تھا۔ اسے سرکاری زمینوں پر پنجابی سکھوں اور ہندوؤں کی آبادکاری پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اسے اعتراض تھا تو صرف یہ کہ یہاں غیر پنجابیوں کو آباد نہ کیا جائے۔ پنجاب کے یونینسٹ جاگیرداروں کی پنجابیت بھی سیاسی عقائد اور فرقہ وارایت سے بالاتر تھی۔ وہ پنجاب میں کسی غیر پنجابی کی خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم مداخلت برداشت نہیں کرتے تھے لیکن اگر سندھ میں اس قسم کی بات جی۔ ایم۔ سید یا کوئی اور سندھی لیڈر کہتا تھا تو اُسے اسلام، مسلم قومیت اور مطالبہ پاکستان کا دشمن قرار دیا جاتا تھا۔

باب: 6

1946ء کے انتخابات اور سندھ کی پاکستان میں شمولیت

انتخابات کے بعد جی۔ایم سید اور کانگرس کی ''کولیشن پارٹی'' کا قیام

جی۔ایم۔سید اپنی متذکرہ سیاسی بے بصیرتی اور بے تدبیری کے باوجود اور مسلم لیگیوں کی جانب سے اس پر اسلام، مسلم قومیت اور مطالبہ پاکستان سے غداری کے الزامات کے باوجود، 18رجنوری کو اپنے حلقہ سے بلا مقابلہ منتخب ہو گیا کیونکہ اس کا حریف اس کے حق میں دستبردار ہو گیا تھا۔اس وقت تک سندھ اسمبلی کی ساٹھ نشستوں میں سے دس امیدواروں کا بلا مقابلہ انتخاب ہو چکا تھا جن میں صوبائی لیگ کا قائم مقام صدر ہاشم گزدر بھی شامل تھا۔ 21رجنوری کو صوبائی اسمبلی کی بقیہ 50 نشستوں کے لئے پولنگ شروع ہوئی جو پانچ چھ دن تک جاری رہی۔ 29رجنوری کو اس پولنگ کے نتیجہ کا اعلان ہوا تھا تو پارٹی پوزیشن یہ تھی:

مسلم لیگ	28
کانگرس	21
سید گروپ (پروگریسو لیگ)	4
مولا بخش گروپ (نیشنلسٹ)	3
یورپین	3
لیبر	1

30رجنوری کو جی۔ایم۔سید نے ایک انٹرویو میں کہا کہ ''لیگ ہائی کمان سے

اختلافات کے باوجود میں پکا مسلم لیگی ہوں اور مجھے مسلم لیگ کے نصب العین اور اغراض و مقاصد پر ایمان ہے۔ میں کانگرس میں ہرگز شامل نہیں ہوں گا۔'' اس پر نوائے وقت کی قیاس آرائی یہ تھی کہ ''جی۔ایم۔سید دوبارہ مسلم لیگ میں شامل ہو رہے ہیں۔ مسٹر سید لیگ ہائی کمان سے اختلافات کے باوجود مسلم لیگ کے نصب العین کے خلاف نہیں جا سکتے...... مسٹر ہاشم گزدر سید صاحب کی طرف سے ایک فارمولا لے کر دہلی جا رہے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ مسلمانوں کی یہ تفریق ختم ہو جائے گی......اس صورت میں مسلم لیگ وزارت بے حد مضبوط ہو گی''[1] مگر نوائے وقت کی یہ قیاس آرائی غلط ثابت ہوئی۔ ہاشم گزدر 30 رجنوری کو جی۔ایم۔سید کا جو فارمولا لے کر دہلی گیا وہ لیگ ہائی کمان کے لئے قابل قبول نہیں تھا۔ اس فارمولا میں ایک مطالبہ یہ تھا کہ ''سید گروپ کو مسلم لیگ کے اندر فارورڈ بلاک کے طور پر کام کرنے کی اجازت دی جائے۔'' اس کے برعکس لیگ ہائی کمان کا مطالبہ یہ تھا کہ ''جی۔ایم۔سید اور اس کے ساتھیوں کو غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے چاہئیں اور انہوں نے ماضی میں لیگ کے نظم و ضبط کی جو خلاف ورزی کی ہے اس پر اظہار ندامت کرنا چاہیے۔'' چونکہ ان دونوں مطالبوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا اس لئے ہاشم گزدر کی مصالحتی کوشش ناکام ہو گئی اور 2 رفروری کو جی۔ایم۔سید نے ابوالکلام آزاد اور سردار پٹیل کے ساتھ بات چیت کرنے کے بعد کانگرس کے ساتھ مل کر مخلوط وزارت بنانے کا اعلان کر دیا۔ جی۔ایم۔سید نے اپنے اس فیصلے کی وجہ یہ بتائی کہ ہندوستان کی آزادی کے بغیر پاکستان کا قیام ناممکن ہے اور آزادی کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین خوشگوار تعلقات استوار کرنا بہت ضروری ہے۔ اس نے مزید کہا کہ وہ آزادیٔ ہند اور آزاد ہندوستان میں آزاد پاکستان کی خاطر اپنی جدوجہد جاری رکھے گا۔

سید اور کانگرس کے اتحاد (Coalition) کی پہلی شرط یہ تھی کہ ''صوبائی اسمبلی میں کانگرس پارٹی کا وجود بالکل ختم ہو جائے گا اور وہ ایک علیحدہ جماعت کی حیثیت سے کام نہیں کرے گی بلکہ پارٹی کو سید گروپ میں مدغم کر دیا جائے گا اور اس نئی اسمبلی پارٹی کا قائد جی۔ایم۔سید ہو گا۔'' اس پر نوائے وقت کا تبصرہ یہ تھا کہ ''ہمارے پرانے اور محترم دوست مسٹر جی۔ایم۔سید نے جس سرعت کے ساتھ اور جن حیرت انگیز حالات میں آخری پلٹا کھایا ہے وہ دریائے سندھ کے لئے بھی حیران کن ہو سکتا ہے...... مسٹر جی۔ایم۔سید نے نہ اپنے 30 رجنوری کے بیان کا پاس کیا

اور نہ اس معمولی ضابطۂ اخلاق کی پیروی مناسب سمجھی کہ مسٹر گز در کے کراچی واپس آنے تک ہی آخری فیصلہ نہ کریں......مغرور و متمرد پٹیل نے سندھ کے متلون مزاج جی۔ایم۔سید کے قدموں پر سر رکھ دیا اور 21 ممبروں پر مشتمل کانگرس پارٹی نے چار ممبروں پر مشتمل نام نہاد پروگریسو مسلم لیگ کی قیادت قبول کر لی۔مسٹر جناح نے مسٹر جی۔ایم۔سید کی یہ درخواست ٹھکرا دی کہ اگر سید گروپ کو وزارت میں نمائندگی دی جائے تو وہ مسلم لیگ میں شامل ہونے پر آمادہ ہیں۔اس لئے کہ مسٹر جناح کے نزدیک اصول ہمیشہ اقتدار پر غالب رہے ہیں۔دوسری طرف سردار پٹیل سر کے بل چل کر مسٹر سید کے حضور میں پہنچے اور 21 ہندو کانگرس کے ممبروں کو بطور تحفہ انکی خدمت میں پیش کر دیا۔مسلمانان ہند قائد اعظم کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ایک مرتبہ پھر کریکٹر کی بلندی اور سیرت کی پختگی کا ثبوت دیا۔“[2]

جی۔ایم۔سید کی ایسی ہی متلون مزاجی، ہوس اقتدار اور انانیت پسندی اسکے مسلم لیگ سے اخراج کا باعث بنی تھی اور اب اس کی یہی کوتاہ اندیشانہ روش اس کی قطعی سیاسی موت کا باعث بنی۔برصغیر کے ہر باشعور شخص کو معلوم تھا کہ عام انتخابات کے بعد برطانیہ، کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان ہندوستان کے آئینی و سیاسی مستقبل کے بارے میں تصفیہ کی بات چیت ہوگی۔کانگرس نے اسی خیال سے عام انتخابات کے فوراً بعد یہ پالیسی اختیار کر لی تھی کہ برصغیر کے کسی بھی مسلم اکثریتی صوبے میں مسلم لیگ کی وزارت نہ بننے دی جائے تا کہ آئندہ آئینی گفت وشنید کے دوران یہ موقف اختیار کیا جا سکے کہ مسلم لیگ مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت نہیں ہے۔اس نے اسی پالیسی کے تحت جی۔ایم۔سید کو وزارت اعلیٰ کا لالچ دے کر اس کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا تھا۔سید پنجاب کے سر خضر حیات خان ٹوانہ کی طرح محض جناح کے ساتھ ذاتی عناد کی وجہ سے کانگرس کے اس فریب میں آ گیا اور اس طرح وہ خود اپنی قطعی سیاسی موت کا باعث بنا۔اب وہ مسلمانان ہند کی نظر میں واقعی ایک مردود و ملعون سیاسی لیڈر تھا۔وہ ہندوؤں کا ایجنٹ تھا اور مسلمانوں کے حقوق و مفادات کا بدترین دشمن تھا۔اب وہ سیاسی طور پر ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں سے واپسی نا ممکن تھی۔جی۔ایم۔سید نے 2 رفروری کو کانگرس کے ساتھ اتحاد (Coalition) کے اعلان کے فوراً بعد پیرزادہ عبدالستار اور بعض دوسرے مسلم لیگی ارکان اسمبلی کو وزارتوں کے لالچ دے کر بہت کوشش کی کہ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی میں پھوٹ پڑ جائے مگر سندھ کی مسلم رائے عامہ کا دباؤ اتنا

زیادہ تھا کہ اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ حاتم علوی کے 5رفروری کے ایک بیان کے مطابق ''لیگ ٹکٹ پر منتخب شدہ ممبر مخالفین کی تمام سعی کے باوجود سواداعظم سے کٹنے کے لئے تیار نہیں تھے۔'' تاہم اس کے اگلے دن 6رفروری کو ابوالکلام آزاد نے کراچی میں ایک بیان جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ ''صوبہ سندھ کی موجودہ سیاسی صورتحال پر غور وفکر کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کانگرس پارٹی کو اب اپنی علیحدہ پوزیشن ختم کر دینی چاہیے اور مسٹر جی۔ ایم۔ سید اور حاجی مولا بخش سے مل کر کولیشن وزارت قائم کرنی چاہیے۔''[3]

غلام حسین ہدایت اللہ کی مسلم لیگ وزارت کا قیام

7رفروری کو آل انڈیا مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری نواب زادہ لیاقت علی خان کراچی پہنچا اور اس کی موجودگی میں مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے سر غلام حسین ہدایت اللہ کو اپنا لیڈر اور خان بہادر محمد ایوب کھوڑو کو ڈپٹی لیڈر منتخب کر لیا۔ قبل ازیں سر غلام حسین ہدایت اللہ ایک انٹرویو میں کہہ چکا تھا کہ ''اگر مجھے وزارت بنانے کے لئے بلایا گیا تو میں یقینی طور پر وزارت بنا سکوں گا۔ وزراء کے نام اس وقت میری جیب میں ہیں۔'' 8رفروری کو سندھ کے نئے گورنر سر فرانسس موڈی (Francis Mudie) کی دعوت پر سر غلام حسین ہدایت اللہ نے اپنی نئی وزارت بنانے کا اعلان کر دیا اور اسی دن اس نے اور اس کے تین وزراء خان بہادر کھوڑو، پیر الٰہی بخش اور خان بہادر میر غلام علی خان تالپور نے حلف وفاداری اٹھا لئے۔ سر غلام حسین نے حلف اٹھانے کی رسم کی ادائیگی کے فوراً بعد کانگرس پارٹی کے لیڈر کو ایک مراسلہ روانہ کیا جس میں اسے کابینہ میں اقلیت کے دو نمائندوں کی سفارش کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس پر کانگرس اسمبلی کے لیڈر پروفیسر گھنشام کا جواب یہ تھا کہ ''کانگرس پارٹی صرف ہندوؤں کی نمائندگی ہی نہیں کرتی۔ علاوہ ازیں یہ پارٹی اب سندھ اسمبلی کی کولیشن پارٹی میں مدغم ہو چکی ہے اس لئے سر غلام حسین کو چاہیے کہ وہ کولیشن پارٹی کے لیڈر مسٹر سید سے ہر قسم کی گفت وشنید کریں'' اور جی۔ ایم۔ سید کا بیان یہ تھا کہ ''صوبائی گورنر نے سر غلام حسین کو وزارت سازی کی دعوت دے کر غیر آئینی اقدام کیا ہے۔'' 11رفروری کو نواب زادہ لیاقت علی خان نے کراچی کے عیدگاہ میدان میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''اگرچہ کانگرس ہمیشہ مسلم لیگ کو نظر انداز کرتی رہی ہے تاہم ہم نے ان کو ہندو وزراء کا

انتخاب کرنے کا حق دیا ہے جسے محض اس لئے قبول نہیں کیا گیا کہ وہ چند غدار مسلمانوں کی مدد سے سندھ میں ہندو راج قائم کر سکیں۔''[4]

جب نواب زادہ لیاقت علی خان نے یہ تقریر کی اس وقت تک جی۔ایم۔سید سر غلام حسین ہدایت اللہ کی نئی مسلم لیگی وزارت کے،خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کرنے کا نوٹس دے چکا تھا اور اس کے ساتھ اس نے یہ کوشش بھی جاری رکھی کہ وزارتوں اور دوسرے عہدوں کے لالچ دے کر لیگ اسمبلی پارٹی میں پھوٹ ڈلوائی جائے۔موجودہ پروگرام اور سابقہ روایات کے مطابق یہ تحریک عدم اعتماد آئندہ ماہ بجٹ سیشن کے دوران پیش ہونا تھی۔سر غلام حسین ہدایت اللہ نے 13رفروری کو جی۔ایم۔سید کی جانب سے تحریک عدم اعتماد کے اس نوٹس کا ذکر کیا اور کہا کہ ''ہم جی۔ایم۔سید کی طرف سے اس قسم کے نوٹسوں کے عادی ہیں مگر اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے لئے انگور ابھی کھٹے ہیں۔'' سر غلام حسین نے مزید کہا کہ ''مسٹر سید صرف ہندو ارکان کے لیڈر رہیں۔ کانگرس نے ان کو اپنا لیڈر تسلیم کیا ہے جبکہ کانگرس کے تقریباً تمام ارکان ہندو ہیں۔شاید یہ بزرگ نہیں جانتے کہ مسٹر جی۔ایم۔سید ابھی تک نعرۂ پاکستان بلند کر رہے ہیں۔یہ وہی سید ہیں جنہوں نے اسمبلی میں دو سال پہلے پاکستان کا ریزولیوشن پیش کیا اور اسے منظور کروایا تھا۔'' 14رفروری کو سر غلام حسین نے اس مسئلہ پر پھر تبصرہ کرتے ہوئے افسوس ظاہر کیا کہ ''جس صوبے میں مسلمان 70 فیصد ہیں۔وہاں مسٹر سید کی بدولت 21 کانگرسی ممبر مسلمانوں پر اپنا تسلط جمانا چاہتے ہیں۔'' اس نے مطالبہ کیا کہ سندھ اسمبلی کے ارکان کی تعداد بڑھا کر 120 کر دی جائے اور اس میں 85 نشستیں مسلمانوں کے لئے مخصوص کر دی جائیں۔نوائے وقت کا سر غلام حسین کے اس مطالبہ پر یہ تبصرہ تھا کہ ''اس اقدام کے بغیر اس صوبہ میں پائیدار وزارت کا قیام ناممکن ہے۔اس وقت 35 مسلمان ممبروں اور 25 غیر مسلم ممبروں میں صرف دس کا فرق ہے۔اگر پانچ مسلمان بھی غیر مسلموں کے ساتھ مل جائیں تو مسلمانوں کی 30 ممبروں پر مشتمل پارٹی بھی مضبوط وزارت نہیں کر سکتی۔'' سر غلام حسین کے اس بیان اور اس پر نوائے وقت کے اس تبصرہ کا مطلب یہ تھا کہ سندھ میں نئی لیگی وزارت کی کشتی ڈانواں ڈول ہو رہی تھی۔انہیں یہ خطرہ لاحق تھا کہ جب صوبائی اسمبلی کا بجٹ سیشن شروع ہوگا تو بعض لیگی ارکان عہدوں کے لالچ کے تحت اچانک حزب اختلاف سے جا ملیں گے اور اس طرح ان کی وزارت کا تختہ الٹ جائے گا۔

اس بجٹ سیشن کے انعقاد سے تقریباً ایک ہفتہ قبل وہ نو (9) شرائط شائع کر دی گئیں جن کے تحت 2 رفروری کو جی۔ایم۔سید کی پروگریسو مسلم لیگ اور کانگرس پارٹی کے درمیان قائد اعظم جناح کی مسلم لیگ کے خلاف گٹھ جوڑ ہوا تھا۔ ان شرائط سے ظاہر ہوتا تھا کہ جی۔ایم۔سید سندھ کی مسلم رائے عامہ سے کس قدر خوف زدہ تھا اور کانگرس کی قیادت جناح کی مسلم لیگ کی مخالفت میں موقع پرستی کی کس حد تک جا سکتی تھی۔ عام انتخابات کے دوران سید گروپ کے حامی اخبارات مسلمانان سندھ سے ان الفاظ میں اپیل کرتے رہے تھے ''پاکستان کے مجاہد جی۔ایم۔سید کو ووٹ دو'' اور ''سندھ مسلم لیگ کے امیدواروں کو ووٹ دو۔'' انتخابات کے بعد 30 رجنوری کو جی۔ایم۔سید کا بیان یہ تھا کہ ''لیگ ہائی کمان سے اختلافات کے باوجود میں پکا مسلم لیگی ہوں اور مجھے مسلم لیگ کے نصب العین اور اغراض و مقاصد پر ایمان ہے'' اور پھر 2 رفروری کو اس نے سردار پٹیل اور ابوالکلام آزاد سے بات چیت کرنے کے بعد کانگرس کے ساتھ گٹھ جوڑ کی جو شرائط طے کی تھیں ان میں پہلی شرط یہ تھی کہ اس کے حامیوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ پروگریسو مسلم لیگ کے رکن بنے رہیں اور اپنے پاکستان کا نصب العین قائم رکھیں۔ مسلم اکثریت والے صوبہ جات میں کامل حق خود ارادیت کا مطالبہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں سدراہ نہیں ہوگا۔ گویا کانگرس کی مرکزی قیادت کے لئے صرف جناح کا مطالبہ پاکستان ناقابل قبول تھا۔ اسے جی۔ایم۔سید جیسے عناصر کے نعرۂ پاکستان پر کوئی اعتراض نہیں تھا بشرطیکہ اس طرح جناح کی مسلم لیگ کی صفوں میں پھوٹ پڑ جائے۔

جس وقت اس گٹھ جوڑ کی شرائط شائع ہوئی تھیں اس سے تقریباً دو ہفتے قبل 19 رفروری 1946ء کو برطانیہ کے نئے لیبر وزیر اعظم کلیمنٹ ایٹلی کی طرف سے یہ اعلان ہو چکا تھا کہ ''عنقریب ہندوستان میں ایک وزارتی مشن بھیجا جائے گا جو مقامی لیڈروں سے بات چیت کر کے یہ منصوبہ پیش کرے گا کہ آئندہ ہندوستان کا آئین کس نوعیت کا ہونا چاہیے۔ دستور ساز اسمبلی کی تشکیل کس طرح ہو اور بڑی پارٹیوں کی حمایت سے وائسرائے کی نئی ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل کس طرح ہو۔'' لہٰذا اب ان شرائط کی اشاعت کا مقصد یہ تھا کہ سندھ کی مسلم رائے عامہ کو یہ یقین دلایا جائے کہ سید گروپ کانگرس کے ساتھ کولیشن کے باوجود مجوزہ وزارتی مشن کے دورۂ ہند کے دوران مسلمانان ہند کے حقوق و مفادات کے منافی کوئی کارروائی نہیں کرے گا۔ بقیہ آٹھ شرائط یہ

تھیں: (1) سید گروپ اپنے حقوق کے حصول کے لئے ہندو مسلم اتحاد کو مدنظر رکھے گا اور با قاعدہ جناح کی مسلم لیگ کی طرح اختلافات کی خلیج کو وسیع نہیں کرے گا۔ (2) یہ گروپ نیشنلسٹ مسلمانوں کو ایک علیحدہ جماعت تصور کرے گا۔ (3) وزارتی فرائض کی بجا آوری کے لئے کولیشن کی تمام رکن پارٹیاں یکساں ذمہ دار ہونگی۔ (4) فیصلہ کثرت رائے سے ہوگا۔ (5) یہ کولیشن کانگرس کے انتخابی منشور کے مطابق اصلاحی کام کرے گی (6) یہ کولیشن لوکل باڈیز میں مخلوط طریقۂ انتخاب رائج کر سکے گی (7) وزارت میں موجودہ ہندو مسلم تناسب قائم رکھا جائے گا۔ (8) وزیر اعلیٰ ہمیشہ مسلمان ہوگا۔''[5]

9 رمارچ کو یعنی بجٹ سیشن شروع ہونے سے صرف تین دن پہلے وزیر اعلیٰ سر غلام حسین ہدایت اللہ نے ایک بیان میں رائے ظاہر کی کہ سندھ میں مستحکم وزارت قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انتخابات نئے سرے سے ہوں۔ ایک پارٹی کے ارکان کا اغوا مفید ثابت نہ ہوگا کیونکہ جو آدمی ایک پارٹی سے غداری کر سکتا ہے وہ دوسری پارٹی سے بھی کب تک وفاداری کا حلف نبھا سکتا ہے۔ گورنر موجودہ کابینہ کو برخاست کر کے نئے انتخابات کے احکامات جاری کر سکتا ہے۔ ایسی وزارت جو برائے نام اکثریت رکھتی ہو وہ صوبہ کی بہبودی کے لئے کیا کر سکتی ہے۔ سر غلام حسین کے اس بیان کا پس منظر یہ تھا کہ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے اسمبلی کے سپیکر کے انتخاب میں حصہ لینے کے لئے میران شاہ کو نامزد کیا تھا لیکن صوبہ لیگ کے قائم مقام صدر ہاشم گزدر نے اس عہدہ کے لئے اپنے انتخاب کے لئے اندر خانے جی۔ ایم۔ سید سے ساز باز کر لی تھی اور وہ کولیشن پارٹی کی حمایت سے یہ سپیکری حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ اطلاع مسلم لیگ کی مرکزی قیادت کو ملی تھی تو نواب زادہ لیاقت علی خان نے گزدر کے نام ایک تار میں اس امر پر حیرت کا اظہار کیا تھا کہ ''سپیکر کے انتخاب میں آپ مسلم لیگ کے نامزد امیدوار کے خلاف حصہ لینے کے آرزومند ہیں۔'' نواب زادہ نے مزید لکھا تھا کہ '' آپ کا فرض ہے کہ آپ مسلم لیگ پارٹی کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ مجھے توقع ہے کہ آپ اپنا فرض پورا کریں گے۔''[6] جس دن نواب زادہ لیاقت علی خان نے یہ تار ارسال کیا اسی دن کراچی کے عیدگاہ میدان میں مسلم لیگ کے زیر اہتمام ایک جلسۂ عام ہوا جس میں متعدد مقامی مسلم لیگی لیڈروں نے ہاشم گزدر کی ''غداری'' کی سخت مذمت کی اور ہاشم گزدر کے بیان کے مطابق تو ''بعض گھٹیا مقرروں نے عوام کو اشتعال بھی دلایا کہ وہ مجھے گولی یا

چاقو سے ہلاک کر دیں۔ حالانکہ میں اپنی پارٹی کے بعض ارکان کے کہنے پر سپیکری کا امیدوار بنا تھا۔ انہوں نے مجھے یہ بات اس لئے کہی تھی کہ وہ فرقہ وارانہ تنازعہ کے ہمیشہ کے لئے تصفیہ کی خاطر میری رضا کارانہ مساعی کو مستحسن تصور کرتے تھے۔''[7]

12 ؍مارچ کو وزیر اعلیٰ سر غلام حسین ہدایت اللہ نے صوبہ کا سالانہ بجٹ پیش کیا اور 15 ؍مارچ کو سید میران شاہ (مسلم لیگ) صوبائی اسمبلی کا بلا مقابلہ سپیکر منتخب ہو گیا۔ ہاشم گز دراس سے دو دن پہلے مسلم لیگ کے سامنے سر تسلیم خم کر کے مقابلے سے دستبردار ہو گیا تھا۔'' اسی دن پروفیسر گھنشام جٹھن نند (کانگرس) نے ایک صوبائی وزیر میر غلام علی تالپور کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کر دی جبکہ جی۔ ایم۔ سید کے بقول ایک سابق کمیونسٹ قاضی مجتبیٰ نے کراچی میں اس کے مکان کے سامنے بھوک ہڑتال شروع کر دی تھی۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ نے اس تحریک عدم اعتماد کے پیش نظر جی۔ ایم۔ سید کی مسلم لیگ میں شمولیت کے لئے اس سے از سر نو بات چیت کا سلسلہ شروع کر دیا جو چار پانچ دنوں تک جاری رہا۔ زیر غور تجویز یہ تھی کہ سید گروپ مسلم لیگ میں شامل ہو جائے گا اور پھر مسلم لیگ اور کانگرس کی ایک مخلوط وزارت قائم کی جائے گی مگر یہ بیل وزیر اعلیٰ غلام حسین اور خان بہادر کھوڑو کی خواہش اور کوشش کے باوجود منڈھے نہ چڑھی کہ صدر مسلم لیگ قائداعظم محمد علی جناح کا بالاصرار موقف یہ تھا کہ جی۔ ایم۔ سید سے اس وقت تک مصالحت کی کوئی بات نہیں ہو سکتی جب تک وہ دشمن کیمپ سے وابستہ ہے اور مسلم لیگ کے ساتھ مکمل اور غیر مشروط وفاداری کا عہد نہیں کرتا۔

صلح کی بات چیت کی ناکامی کے بعد 20 ؍مارچ کو پروفیسر گھنشام کی تحریک عدم اعتماد پر رائے شماری ہوئی تو سر غلام حسین کی وزارت صرف ایک ووٹ کی اکثریت سے جیت گئی۔ تحریک کے حق میں 29 اور اس کے خلاف 30 ووٹ ڈالے گئے۔ یورپین گروپ کے تین ارکان نے وزارت کے حق میں ووٹ دیئے۔ جی۔ ایم۔ سید نے اس تحریک کی ناکامی کے بعد یہ اعلان کیا کہ وہ ہندو۔ مسلم تنازعہ کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے برصغیر کے 40 ممتاز مسلمان زعما کا ایک اجلاس منعقد کرے گا۔ ان ممتاز مسلمان لیڈروں کی فہرست میں پنجاب کے افتخار الدین کا نام بھی شامل تھا۔ چونکہ اس زمانے میں پنجاب کا درمیانہ طبقہ پنجاب کے سر خضر حیات خان ٹوانہ اور سندھ کے جی۔ ایم۔ سید کی غداری سے بہت برہم تھا اس لئے افتخار الدین کو فوراً یہ اعلان کرنا پڑا کہ

''میں مسٹر سید کے گزشتہ چھ ماہ کے طرز عمل کے پیش نظر اس اجلاس میں شرکت نہیں کروں گا۔ ایک مسلمان کے لئے ہندو مسلم اتحاد کو مضبوط کرنے کا مقصد مسلم لیگ کو تقویت پہنچانے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ مسٹر سید اور دوسرے غیر لیگی مسلم زعما کا نظریہ مسلم لیگ کے لئے نقصان دہ ہے۔ میں مسٹر سید سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ غیر مشروط طور پر لیگ میں آ جائیں اور مسلمانوں کی آزادی کے لئے کام کریں''[8] لیکن سید پر اپنے سابق کانگرسی رفیق کی اپیل کا کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے اپنی سابقہ روایت کے مطابق اندرون خانہ ساز باز کے ذریعے لیگ اسمبلی پارٹی کے ایک رکن میر بندے علی تالپور کو وزارت کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔

اس ساز باز کا انکشاف 24/مارچ کی شام کو ہوا جبکہ میر بندے علی تالپور نے ہدایت اللہ وزارت کے خلاف ایک بیان جاری کیا اور پھر اگلے دن 25/مارچ کو ایک مطالبہ زر پر رائے شماری کے نتیجے میں حزب اختلاف نے ہدایت اللہ وزارت کو ایک ووٹ کی اکثریت سے (29 اور 30) شکست دے دی۔ میر بندے علی تالپور (مسلم لیگ) نے اپوزیشن کے ساتھ ووٹ دیا۔ وزارت کی شکست کے بعد جی۔ ایم۔ سید اور نچل داس وزیرانی نے ایوان میں ہی سر غلام حسین کے استعفیٰ کا مطالبہ کیا مگر سپیکر نے اس مطالبہ کو نظر انداز کر کے وزیر اعلیٰ کی تجویز کے مطابق اسمبلی کا اجلاس غیر معین عرصے کے لئے ملتوی کر دیا۔ 26/مارچ کو لیگ کے باغی رکن میر بندے علی تالپور کو وزارت میں شامل کر لیا گیا اور اس طرح اسے 24 گھنٹے میں ہی اپنی بلیک میلنگ کا انعام مل گیا۔ ''میر بندے علی گورنمنٹ ہاؤس میں حلف وفاداری اٹھا کر سر غلام حسین ہدایت اللہ کی جائے رہائش پر پہنچا جہاں اسے لیگ پارٹی کے ارکان اور لیگی وزراء نے مبارک باد پیش کی۔''

صوبائی وزارت میں اس ڈرامائی توسیع کے بعد اسمبلی کا سیشن دوبارہ شروع ہوا تو سر غلام حسین ہدایت اللہ نے یکم اپریل کو سالانہ بجٹ پر جوابی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''کانگرس نے میر بندے علی تالپور کی شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھانا چاہا اور انہیں کولیشن کی قیادت تک پیش کر دی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو شخص بھی لیگ سے علیحدہ ہو جائے وہ ان کی قیادت کے لئے مناسب ترین شخصیت بن جاتا ہے۔ سر غلام حسین نے کہا کہ میر بندے علی نے دانشمندی کا ثبوت دیا اور لیگ پارٹی میں وہ دوبارہ شامل ہو گئے۔ اب کانگرس کے موجودہ لیڈر (مسٹر سید) بھی لیگ میں دوبارہ شامل ہو جائیں گے۔'' سر غلام حسین کی اس تقریر کے بعد ایک مطالبہ زر پر رائے شماری

ہوئی تو 29 کے مقابلہ میں 30 کی نسبت سے مطالبہ زر منظور ہو گیا لیکن اس کی سیاسی قیمت یہ ادا کرنا پڑی کہ اس کے اگلے دن 2 ر اپریل کو پیر زادہ عبدالستار بھی محض لیگ سے الگ ہونے کی دھمکی کی بنا پر ہی وزیر بن گیا اور اس طرح صوبائی کابینہ کے ارکان کی تعداد چھ ہو گئی جو سب کے سب مسلم لیگی تھے۔

سر غلام حسین ہدایت اللہ کی تقریر میں جی۔ایم۔سید کے دوبارہ مسلم لیگ میں شامل ہونے کا امکانات کا پس منظر یہ تھا کہ برطانیہ کے وزیر اعظم ایٹلی کے 19 ر فروری کے اعلان کے مطابق وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس کی قیادت میں ایک وزارتی مشن 24 ر مارچ کو دہلی پہنچ چکا تھا۔اس لئے پنجاب کے دو مسلم زعما میاں افتخار الدین اور میاں بشیر احمد کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح سید گروپ کی لیگ ہائی کمان سے مصالحت ہو جائے تا کہ وزارتی مشن کے روبرو مسلم لیگ کے موقف کو تقویت ملے۔جی۔ایم۔سید اپنی پرانی شرائط پر لیگ میں واپس آنے پر آمادہ تھا۔سر غلام حسین ہدایت اللہ، خان بہادر کھوڑو اور ہاشم گزدر وغیرہ کی خواہش اور کوشش تھی کہ اس کا مطالبہ تسلیم کر لیا جائے مگر صدر مسلم لیگ قائداعظم جناح رضامند نہ ہوئے۔ان کا موقف بھی وہی پرانا تھا کہ سید غیر مشروط طور پر لیگ سے وفاداری کا یقین دلائے اور اپنی سابقہ غلطیوں پر اظہار افسوس کرے تو اسے لیگ میں دوبارہ شامل کیا جا سکتا ہے بصورت دیگر اس کے لئے لیگ میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

جی۔ایم۔سید، اکھنڈ بھارت کا مخالف، ہندوستان کی کئی حصوں میں تقسیم کا خواہاں، اس کا پنجابی غلبے کا خوف اور پاکستان کی مخالفت

2 ر اپریل کو جی۔ایم۔سید نے اپنی پروگریسو مسلم لیگ کے نمائندہ کی حیثیت سے دہلی میں وزارتی مشن سے ملاقات کی اور پھر اس نے ایسوسی ایٹڈ پریس سے ایک انٹرویو میں کہا کہ ''مجھے مسلم لیگ سے کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے۔میں اب تک مسلم لیگی رہا ہوں اور اب بھی مسلم لیگی اور پاکستانی ہوں۔مسلم لیگ کے حامیوں سے میرا اختلاف صرف طریق کار پر ہے۔ میرا نظریۂ پاکستان بھی مختلف ہے۔میں چاہتا ہوں کہ پاکستان ایک سوشلسٹ سٹیٹ ہو۔ جہاں ہر شخص کو مساوی حقوق اور مواقع حاصل ہوں۔اس کے بغیر آزادی کا کوئی فائدہ نہیں۔''[9]

سید دہلی سے 9 ر اپریل کو کراچی پہنچا تو اس نے ایک اخباری انٹرویو میں یہ خدشہ ظاہر

کیا کہ اگر پاکستان کے مرکز میں پاکستانی صوبوں کو آبادی کے تناسب سے نمائندگی دی گئ تو پنجاب کو سندھ کے مقابلے میں پانچ گنا نمائندگی حاصل ہوگی اور سندھ کو پنجابی اپنی کالونی بنالیں گے۔ مسٹر سید نے بتایا کہ ''انہوں نے وزارتی مشن کے سامنے یہ سفارش پیش کی کہ صوبوں کے علاوہ ہندوستانی ریاستوں کو بھی خودمختارانہ حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ ہر آزاد اور خودمختار ریاست کے لئے علیحدہ علیحدہ مجالس دستور ساز ہوں۔ اسی طرح مرکز کے لئے علیحدہ مجلس دستور ساز ہو جس میں مسلمانوں اور ہندوؤں کو مساوی نمائندگی حاصل ہو۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کو چالیس چالیس فیصدی اور باقی اقلیتوں کو بیس فیصدی، ہر آزاد ریاست کو مرکز سے علیحدہ ہونے کا اختیار ہو۔ اب جبکہ کانگرس ایک اکھنڈ ہندوستان اور مسلم لیگ تقسیم شدہ ہندوستان کی طالب ہے تو یہی تجویز بہترین ثابت ہوگی۔ مسٹر سید نے بتایا کہ جمیعت العلمائے ہند، مجلس احرار، کرشک پرجا پارٹی، مومن کانفرنس اور دوسری نیشنلسٹ مسلمان جماعتیں اس تجویز کے حق میں ہیں۔ مسٹر سید نے بتایا کہ دہلی میں میں نے کانگرسی لیڈروں سے بھی گفت وشنید کی اور انہیں سندھ کی صورتحال سے آگاہ کیا۔ مسٹر جناح نے میرے ساتھ ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا جب تک میں بلاشرط اطاعت کرنے کے بعد آئندہ بھی لیگ کا تابع رہنے کا وعدہ نہ کروں اس وقت تک وہ میرے ساتھ ملاقات نہیں کریں گے۔''[10]

جی۔ایم۔سید کے اس آئینی فارمولا میں کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ اس کا یہ فارمولا 1942ء کے کرپس پلان کے عین مطابق تھا جسے کانگرس اور مسلم لیگ دونوں ہی مسترد کر چکی تھیں۔ پنجاب کے یونینسٹ جاگیرداروں کا بھی یہی موقف تھا۔ یہ فارمولا مسلم لیگ کے مقابلے میں کانگرس کے لئے بالکل ہی ناقابل قبول تھا۔ اس فارمولے پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہندوستان بہت سی آزاد وخودمختار ریاستوں میں تقسیم ہوجاتا تھا اور یہ صورت کانگرس کی بورژوا قیادت کبھی قبول نہیں کرسکتی تھی۔ کانگرس کا ''مہاتما'' گاندھی تو مسلم لیگ کا مطالبہ پاکستان منظور کر کے ''بھارت ماتا'' کے دو تین ٹکڑے کرنے کو بھی ناقابل معافی ''پاپ'' سمجھتا تھا۔ وہ جی۔ایم۔سید کے فارمولے کے مطابق ہندوستان کے بیسیوں ٹکڑے کرنے پر کیسے رضامند ہوسکتا تھا۔

سندھ پر پنجابیوں کے غلبہ کے بارے میں جی۔ایم۔سید کا خدشہ بے بنیاد نہیں تھا کیونکہ اگرچہ 23 رمارچ 1940ء کی قرارداد لاہور میں کہا گیا تھا کہ مسلمانان ہند صرف اس

دستوری خاکے کوقبول کریں گے جو ذیل کے بنیادی اصولوں پر مرتب کیا جائے گا۔ ''جغرافیائی طور پر متصلہ وحدتوں (units) کے منطقے اس طرح وضع کئے جائیں کہ ضروری علاقائی ردو بدل کے ساتھ جن خطوں میں مسلمانوں کی عددی اکثریت ہے مثلاً ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی زون، ان کو باہم ملا کر خودمختار مملکتیں بنا دی جائیں جن کے ترکیبی یونٹ آزاد و خودمختار ہونگے'' لیکن 9/اپریل کو دہلی میں مسلمانوں کے ''لیجسلیٹو کنونشن'' میں قرارداد لاہور کی نفی کی گئی تھی۔ اس کنونشن کی قرارداد یہ تھی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا نصب العین پاکستان ہے جو پنجاب، سندھ، بلوچستان، سرحد، بنگال اور آسام کے صوبوں پر مشتمل ایک ''سٹیٹ'' میں تبدیل کر دیا جائے۔ کنونشن کی یہ قرارداد سراسر غیر آئینی تھی کیونکہ 23/مارچ کی قرارداد لاہور 1941ء کے بعد مسلم لیگ کے آئین کا حصہ بن چکی تھی اور اس میں مجلس عاملہ، مرکزی کونسل اور سالانہ سیشن کے مندوبین کی منظوری کے بغیر کوئی ترمیم نہیں ہوسکتی تھی۔ غالباً جی۔ ایم۔ سید کو کنونشن کی یہ قرارداد ناقابل عمل نظر آتی تھی۔ اسے بجا طور پر خدشہ تھا کہ اگر اس قرارداد کے مطابق ہندوستان کی تقسیم ہوئی تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلم اکثریتی علاقوں میں پنجابیوں کا غلبہ ہو جائے گا۔ جی۔ ایم۔ سید، خان عبدالغفار خان کے برعکس اکھنڈ ہندوستان کے حق میں نہیں تھا۔ وہ سارے صوبوں کے لئے مساوی حق اختیاری کا طالب تھا۔

نوائے وقت نے سید کے اس انٹرویو پر یہ سرخی لگائی تھی کہ ''پنجابی مسلمان سندھ کو اپنی کالونی بنالیں گے...... مسٹر سید کا شرانگیز پروپیگنڈا۔'' حالانکہ اس انٹرویو میں یہ خدشہ ظاہر کیا گیا تھا کہ ''سندھ کو پنجابی اپنی کالونی بنالیں گے۔''[11] اس میں مذہب کی کوئی تخصیص نہیں کی گئی تھی لیکن نوائے وقت نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ سید کے انٹرویو کا رخ صرف ''پنجابی مسلمانوں'' کی طرف تھا۔ یہ اخبار قرارداد لاہور کے مطابق پاکستان کے ترکیبی یونٹوں کو خودمختاری دینے پر آمادہ نہیں تھا بلکہ یہ مذہب کے نام پر بلوچیوں، سندھیوں اور پٹھانوں کے حقوق غصب کرنے کا عزم رکھتا تھا۔ یعنی اس کی خواہش یہ نہیں تھی کہ قرارداد لاہور کے مطابق پاکستان کے ترکیبی یونٹوں کو خودمختاری ملے اور وہ مساوی حقوق کے ساتھ برضا و رغبت ایک وفاقی وحدت میں منسلک ہوں بلکہ وہ واحد مسلم قومیت کے نام پر واقعی ایک پنجابی سلطنت قائم کرنے کا متمنی تھا اور جو کوئی بلوچوں، سندھیوں اور پٹھانوں کے حقوق کا ذکر کرتا تھا اسے وہ کمیونسٹ اور اسلام دشمن قرار دیتا تھا لیکن

جب وہ پنجابیوں کے مخصوص مفادات کے تحفظ کے لئے واویلا کرتا تھا تو اسے اپنے اس علاقائی شاونزم (Chauvinism) اور اسلامی مساوات و اخوت کے اصول میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا تھا۔ پنجاب کے مفادات کے تحفظ کے لئے اس کے موقف اور پنجابی جاگیرداروں کے موقف میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس معاملے میں وہ سیاسی عقائد سے بالاتر ہوکر ان سے اتفاق و اتحاد کرتا تھا۔ اس کا اسلامی نظریہ دراصل ایک عالمگیر نظریۂ اخوت نہیں تھا بلکہ وہ پنجابی شاونزم کا بدنما نظریہ تھا جس پر اس نے اسلام کا دلکش لبادہ پہنا رکھا تھا اور اس طرح وہ پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے علاوہ یہاں کے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے استحصالی عزائم کی بھی ترجمانی کرتا تھا۔ ان سب کے اس موقف کی ایک بڑی بنیاد یہ تھی کہ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد برطانوی سامراج 1942ء کے کرپس پلان کے برعکس ہندوستان کے مختلف صوبوں اور ریاستوں کو خود اختیاری دینے پر آمادہ نہیں تھا۔ جون 1945ء کے بعد اسے سوویت یونین سے پھر زبردست خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر پورے ہندوستان کا بالعموم اور شمال مغربی ہندوستان کا بالخصوص سیاسی و دفاعی ڈھانچہ متحد نہ رہا تو سوویت یونین زود یا بدیر برصغیر کو ہڑپ کرلے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد بھی سوویت یونین کے خلاف پنجاب بدستور بازوئے شمشیر زن کی حیثیت کا حامل رہے۔ علامہ اقبال کے 1930ء کے خطبہ میں اور سر سکندر حیات کی 1939ء کی سکیم میں پنجاب کی جانب سے یہی ضمانت دی گئی تھی۔

13 رمئی کو وزارتی مشن کے گروپنگ پلان کا اعلان ہوا تو سندھ سے سب سے پہلے شیخ عبدالمجید سندھی نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ اس نے 21 رمئی کو ایک بیان میں رائے ظاہر کی کہ اس پلان کو مدنظر رکھ کر کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان مفاہمت ہوسکتی ہے۔ اس نے کہا کہ ہندوستان کے مسئلہ کا واحد حل انڈین یونٹوں میں ہندو مسلم مساوی نمائندگی اور بااختیار یونین کابینہ کی تشکیل ہے...... وزارتی مشن نے گروپنگ کی جو سکیم پیش کی ہے وہ ناقابل اعتماد ہے اور وہ مسلم لیگ کے لئے غالباً ناقابل قبول ہوگی۔ ایشیا کی آزادی و ترقی کے لئے پائیدار ہندو مسلم مصالحت ضروری ہے۔

23 رمئی کو سندھ کے ہندو کانگرسی لیڈر نچل داس وزیرانی نے اپنے ایک بیان میں سندھ کے مسلمانوں کو سندھی بھائی ہونے کی حیثیت سے یہ مشورہ دیا کہ وہ مجوزہ شمال مغربی

گروپ میں شامل ہونے سے انکار کردیں کیونکہ اس گروپ میں اکثریت پنجابی مسلمانوں کی ہوگی اور پنجابی مسلمانوں کی ذہنیت سب کومعلوم ہے کہ وہ سندھیوں کواپنا اجیر بنانے کی کوشش کریں گے مثلاً نارتھ ویسٹرن ریلوے میں ہی پنجابیوں نے کسی سندھی کونہیں گھسنے دیا۔ نچل داس وزیرانی سندھ کے ہندوساہوکاروں، ہندوزمینداروں اورسرمایہ داروں کا نمائندہ تھا۔ یہ شخص 38-1937 میں ہندومہاسبھا کا رکن تھا اوراس نے صوبائی اسمبلی میں کوئی ایسا قانون منظورنہیں ہونے دیا تھا جس سے ہندوؤں کے زمیندار اور بورژوا طبقوں کے مفادات پر زد پڑنے کا خدشہ ہوسکتا تھا۔ 45-1944 میں جب ہندوؤں نے کانگرس کی لہرمحسوس کی تو یہ کانگرس میں شامل ہوگیا تھا اور پھر اس نے 2رفروری 1946ءکو جی۔ایم۔سید کی زیر قیادت کولیشن پارٹی کی تشکیل میں فیصلہ کن کردارادا کیا تھا۔ چونکہ یہ سیاسی جوڑتوڑ کے فن میں بڑا ماہر تھا اس لئے کانگرس کی مرکزی قیادت اسے سندھ مسلم لیگ میں پھوٹ ڈلوانے کے لئے مؤثر طریقے سے استعمال کرتی تھی۔ سردار پٹیل، ابوالکلام آزاد اور دوسرے مرکزی کانگرسی لیڈروں کواس کے سندھی شاونزم اور انڈین نیشنلزم میں کوئی تضاد نظرنہیں آتا تھا۔

کانگرسی لیڈروں نے اعلانیہ طور پر جی۔ایم۔سید کے اس آئینی فارمولا پر بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا جس کے تحت اس نے ہندوستان کے سارے صوبوں اور ریاستوں کے لئے مکمل حق خوداختیاری کی تجویز پیش کی تھی۔ کانگرسی لیڈروں کی اس قسم کی موقع پرستی، بے اصولی اور تنگ نظری کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان مفاہمت کے راستے میں حائل تھی۔

25رمئی کوسندھ کے وزیر مال اور آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن خان بہادر محمد ایوب کھوڑو نے ایک انٹرویو میں نچل داس وزیرانی کے اس مشورے پرعمل کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ سندھی مسلمانوں کو پنجاب کے ساتھ گروپنگ پر کوئی اعتراض نہیں کیونکہ یہ اقدام پاکستان کے اصول سے مناسبت رکھتا ہے۔ بلاشبہ پنجابی مسلمان سندھی مسلمانوں سے زیادہ قابل ہیں۔سندھ کی آبادی گنجان نہیں ہے۔اس لئے یہاں باہر سے آنے والوں کا فراخدلی سے خیر مقدم کیا جائے گا۔[12] سندھ کے وزیر اعلیٰ سرغلام حسین ہدایت اللہ نے اس مسئلہ پرلب کشائی نہ کی۔ وہ صرف اپنی وزارت کے بارے میں فکر مند تھا۔ اسے امید تھی کہ ''وزارتی مشن کے پلان کے تحت کانگرس اور مسلم لیگ کا اتحاد ہوگا اور مرکز اور صوبوں میں کانگرس۔ لیگ کولیشن

حکومتیں قائم ہو جائیں گی'' لیکن کراچی کے اخبار ڈیلی گزٹ اور دوسرے ہندو اخبارات نے جون کے اوائل میں پیر علی محمد راشدی کا ایک بیان شائع کیا جس میں نچل داس وزیرانی کے مشورے کی تائید کی گئی تھی۔ راشدی کا کہنا یہ تھا کہ سندھی مسلمان پنجاب کے ساتھ مل کر گروپ بنانے کو تیار نہیں۔ وہ شمال مغربی ہندوستان میں مجوزہ پاکستانی فیڈریشن کے مخالف ہیں۔ [13] پیر علی محمد راشدی کی سیاسی زندگی کی ابتدا مطالبہ پاکستان کے زبردست حامی کی حیثیت سے ہوئی تھی لیکن 1945ء میں وہ مسلم لیگ سے محض اس لئے الگ ہو گیا تھا کہ اسے مرکزی اسمبلی کے انتخابات کے لئے لیگ کا ٹکٹ نہیں دیا گیا تھا۔ اس نے اس انتخاب میں خاکسار جماعت کے ٹکٹ پر مسلم لیگی امیدوار یوسف ہارون کا مقابلہ کیا تھا مگر بری طرح شکست کھائی تھی۔ دسمبر 1945ء میں جب جی۔ ایم۔ سید نے صوبائی اسمبلی کے لئے لیگ کے ٹکٹوں کی تقسیم کے مسئلہ پر اختلاف کی وجہ سے قائداعظم جناح کی مسلم لیگ سے علیحدگی اختیار کر لی تھی تو راشدی سید گروپ کی پروگریسو مسلم لیگ کا بہت بڑا مؤید بن گیا تھا۔

مرکزی دستور ساز اسمبلی کے ارکان کا انتخاب اور لیگ وزارت کو عدم اعتماد کا خطرہ

6 رجون کو مرکزی مسلم لیگ کونسل نے قائداعظم جناح کے مشورے کے مطابق وزارتی مشن کے منصوبے کی منظوری دے دی تو اس کے تقریباً دو ہفتے بعد کراچی میں سرکاری طور پر اعلان کیا گیا کہ مرکزی دستور ساز اسمبلی کے انتخاب کے لئے سندھ اسمبلی کا اجلاس 11 رجولائی کو ہوگا اور اس اعلان کے ساتھ ہی سید گروپ کی طرف سے سر غلام حسین کی وزارت کے خلاف تحریک عدم اعتماد کا نوٹس دے دیا گیا۔ یہ نوٹس اس امید کے تحت دیا گیا تھا کہ دستور ساز اسمبلی کے ارکان کے انتخاب کے مسئلہ پر مسلم لیگ پارٹی میں لازمی طور پر پھوٹ پڑ جائے گی اور اس وجہ سے نہ صرف وزارت کا تختہ الٹنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی بلکہ پروگریسو مسلم لیگ کے امیدوار شیخ عبدالمجید سندھی کا انتخاب بھی یقینی ہو جائے گا۔ مسلم لیگ کے امیدوار خان بہادر کھوڑو، ہاشم گزدر اور پیرزادہ عبدالستار تھے۔ چنانچہ 8 رجولائی کو بالکل وہی ہوا جس کی سید گروپ کو امید تھی۔ خان بہادر حاجی فضل محمد لغاری اور سردار بہادر خان کھوسو لیگ اسمبلی پارٹی سے مستعفی ہو کر سید گروپ سے جا ملے اور پارٹی کا ایک اور رکن علی محمد مری مسوری کے صحت افزا مقام پر قیام کے

دوران ''سخت بیمار'' ہو گیا۔

9 رجولائی کو جی۔ ایم۔ سید نے صوبائی گورنر سر فرانسس موڈی کے نام ایک خط میں دعویٰ کیا کہ ''چونکہ اس کی کولیشن پارٹی کو ایوان میں اکثریت کی حمایت حاصل ہو گئی ہے اس لئے سر غلام حسین ہدایت اللہ سے استعفیٰ طلب کیا جائے اور مجھے وزارت سازی کا موقع دیا جائے۔'' سید کے اس خط کے جواب میں سر غلام حسین ہدایت اللہ اور وزارتی گروپ کے دوسرے ارکان کا موقف یہ تھا کہ چونکہ صوبائی اسمبلی کا اجلاس وائسرائے کی ہدایت کے مطابق فقط دستور ساز اسمبلی کے ارکان کے انتخاب کے لئے بلایا جا رہا ہے اس لئے اس اجلاس میں کوئی اور کاروائی نہیں ہو سکتی۔ یہ اجلاس صرف دو دن جاری رہے گا لہٰذا اس میں تحریک عدم اعتماد پیش ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ 9 رجولائی کو جی۔ ایم۔ سید کے مکان پر سندھ کے 40 مسلمان لیڈروں کا اجتماع ہوا جس میں سندھ پراونشل مسلم لیگ پروگریسو بلاک کی تشکیل کا اعلان کیا گیا۔ شیخ عبدالمجید سندھی اس نئی تنظیم کا صدر منتخب ہوا۔ اس اجتماع میں لیگ اسمبلی پارٹی سے الگ ہونے والے دو ارکان خان بہادر حاجی فضل محمد خان لغاری اور سردار بہادر خان کھوسو نے بھی شرکت کی۔

11 رجولائی کو جب صوبائی اسمبلی کا اجلاس ہوا تو سید کی کولیشن پارٹی کی طرف سے ہدایت اللہ وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس موقع پر کانگرس پارٹی کے لیڈر آر۔ کے۔ سدھوا نے ایوان میں ایک دستاویز پیش کی جس میں اسمبلی کے 60 ارکان میں سے 32 ارکان نے اپنے دستخطوں سے وزارت پر عدم اعتماد کا اظہار کیا ہوا تھا مگر سپیکر نے یہ تحریک پیش کرنے کی اجازت نہ دی۔ اس نے اپنی اس رولنگ کی تائید میں صوبائی گورنر کا ایک خط پڑھ کر سنایا جس میں کہا گیا تھا کہ یہ اجلاس وائسرائے کی ہدایت کے مطابق صرف دستور ساز اسمبلی کے ارکان کے انتخاب کے لئے بلایا گیا ہے۔ سپیکر کی اس رولنگ کے بعد دستور ساز اسمبلی کے ارکان کے انتخاب کے لئے رائے شماری ہوئی۔ ہندوؤں کی ایک نشست کے لئے جے رام داس دولت رام کا انتخاب ہوا اور مسلمانوں کی تین نشستوں کے چار امیدواروں خان بہادر کھوڑو، ہاشم گزدر، پیرزادہ عبدالستار اور شیخ عبدالمجید سندھی کے درمیان سخت مقابلہ ہوا۔ اس انتخاب کے نتیجہ کا اعلان 12 رجولائی کو ہوا تو تینوں مسلم لیگی امیدوار خان بہادر کھوڑو، پیرزادہ عبدالستار اور ہاشم گزدر کامیاب ہو گئے۔ اول الذکر دونوں کو نو نو ووٹ ملے۔ مسٹر گزدر اور شیخ

عبدالمجید نے آٹھ آٹھ ووٹ حاصل کئے مگر جب دوسری ترجیح کے لئے ووٹ گنے گئے تو گز در بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گیا۔

13 رجولائی کو جی۔ ایم۔ سید نے صوبائی گورنر سے انٹرویو کی درخواست کی مگر گورنر نے اسے یہ کہہ کر ملنے سے انکار کر دیا کہ اس انٹرویو سے کوئی مفید مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ سید نے انٹرویو کے لئے اپنی درخواست میں لکھا تھا کہ میری کولیشن پارٹی کو 31 ارکان اسمبلی کی حمایت حاصل ہے۔ لہٰذا اسمبلی کا اجلاس رمضان سے قبل 2 راگست کو دوبارہ طلب کیا جائے تا کہ ایوان میں وزارت کے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ ہو سکے۔ اس پر گورنر کا جواب یہ تھا کہ مطلوبہ اجلاس رمضان کے بعد ستمبر میں طلب کیا جائے گا۔ جب سید کو کورا جواب موصول ہوا تو اس نے ایک بیان میں صوبائی گورنر کے رویے پر سخت نکتہ چینی کی اور کہا کہ اب ہدایت اللہ وزارت محض اس وجہ سے قائم ہے کہ اسمبلی کے ارکان کو اپنے آئینی حقوق کے استعمال کی اجازت نہیں دی گئی۔

15 رجولائی کو جی۔ ایم۔ سید نے وائسرائے کے نام ایک خط میں درخواست کی کہ وہ سندھ کی صورتحال میں مداخلت کرے اور گورنر سندھ کے نام حکم جاری کرے کہ 2 راگست سے قبل صوبائی اسمبلی کا اجلاس بلایا جائے تا کہ کولیشن پارٹی کو موجودہ وزارت کا تختہ الٹنے کا موقع مل سکے کیونکہ یہ وزارت ایوان کا اعتماد کھو چکی ہے اور اسمبلی کے 60 ارکان میں کولیشن پارٹی کے ارکان کی تعداد 32 ہے اور وزارت کے حامی ارکان کی تعداد 28 ہے۔ سید نے اسی دن وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس (Pethick Lawrence) کے نام بھی اس مضمون کی ایک عرضداشت ارسال کی اور اسی دن ہی گورنر سر فرانسس موڈی بذریعہ ہوائی جہاز تین ہفتوں کی چھٹی پر زیارت (بلوچستان) چلا گیا۔

17 رجولائی کو صوبائی وزیر مال خان بہادر کھوڑو نے سندھ کالج کے ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے سندھ میں آئے دن کے وزارتی بحران کی وجہ یہ بتائی کہ ''یہاں کے سیاسی لیڈر ناتجربہ کار ہیں اور ان کی سیاسی عمر صرف 9 سال ہے۔ اس نے کہا کہ صوبہ میں موجودہ غیر مستحکم صورتحال زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ اگر یہی صورت حال جاری رہی تو آئے دن وزارتیں بدلتی رہیں گی۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ از سرِ نو انتخابات کرائے جائیں۔''

آل انڈیا کانگرس کے نئے صدر جواہر لال نہرو نے 21 رجولائی کو ایک بیان کے

ذریعے سندھ کے اس جھگڑے میں مداخلت کی۔ اس نے اپنے بیان میں سندھ کے گورنر کے اس رویے پر نکتہ چینی کی کہ اس نے 12 رجولائی کو عدم اعتماد کی تحریک کی اجازت دیئے بغیر اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا تھا۔ اس نے کہا کہ ''یہ موجودہ دستور اساسی کی شدید خامی ہے کہ ارکان اسمبلی کو اجلاس طلب کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ آئندہ دستور میں اس خامی کو دور کر دینا چاہیے۔ اپوزیشن ممبران اسمبلی کو میرا مشورہ یہی ہے کہ وہ اپنے اپنے حلقے میں جائیں اور گورنر کے اس غیر جمہوری فعل کی مذمت کریں۔ رائے عامہ کو بایں طور پر بیدار کرنا چاہیے کہ اسمبلی کے اجلاس کو بہت جلد طلب کرنا ناگزیر ہو جائے۔''

جی۔ایم۔سید کی پروگریسو مسلم لیگ کی سیہون کانفرنس ......سندھ، پنجاب الحاق کی مخالفت

24 رجولائی کو سندھ پروگریسو مسلم لیگ کے زیر اہتمام سیہون میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت کے فرائض شیخ عبدالمجید نے ادا کئے۔ کانفرنس نے ایک قرارداد منظور کی جس کی رو سے سندھ اور پنجاب کی گروپ بندی کی مخالفت کی گئی۔ جی۔ایم۔سید اور اس کی پارٹی کے دیگر ارکان نے اپنی تقریروں میں بتایا کہ سندھ کو 1935ء میں بڑی مشکلات کے بعد بمبئی سے علیحدگی کا حق حاصل ہوا تھا۔ اگر سندھ کو پھر پنجاب سے ملا دیا گیا تو اس سے مسلمانان سندھ کو بہت تکلیف ہوگی۔ [14] سید گروپ کی اس قرارداد سے قبل 23 رمئی کو کانگرس کے ایک مقامی ہندو لیڈر نچل داس وزیرانی ایک بیان میں سندھی مسلمانوں کو سندھی بھائی ہونے کی حیثیت سے مشورہ دے چکا تھا کہ وہ مجوزہ شمال مغربی گروپ میں شامل ہونے سے انکار کر دیں کیونکہ اس گروپ میں اکثریت پنجابی مسلمانوں کی ہوگی اور وہ سندھیوں کو اپنا اجیر بنانے کی کوشش کریں گے اور سید گروپ کے ایک سرگرم رکن پیر علی محمد راشدی نے جون کے اوائل میں ایک بیان میں کہا تھا کہ سندھی مسلمان پنجاب کے ساتھ مل کر گروپ بنانے کو تیار نہیں کیونکہ وہ پاکستان فیڈریشن کے خلاف ہیں۔

جی۔ایم۔سید کی پروگریسو مسلم لیگ کی جانب سے وزیرانی اور راشدی کے ان بیانات کے بعد 24 رجولائی کو یہ ہنگامہ خیز قرارداد منظور کرنے کی دو تین وجوہ تھیں۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس وقت تک قائداعظم جناح اور اس کی مسلم لیگ کے بارے میں جی۔ایم۔سید اور اس

کے مٹھی بھر حامیوں کا رویہ اس قدر معاندانہ ہو چکا تھا کہ وہ ہر اس تجویز کی مخالفت کرتے تھے جو مسلم لیگ کے لئے قابل قبول ہوتی تھی۔ 2/فروری 1946ء سے انہوں نے اپنی سیاسی تقدیر پوری طرح کانگرس کے ساتھ وابستہ کر دی تھی حالانکہ کانگرس کی مرکزی قیادت صوبوں کی خودمختاری کے بارے میں مسلم لیگ سے بھی زیادہ مخالف تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ آل انڈیا کانگرس کا نیا صدر جواہر لال نہرو وزارتی مشن کے منصوبے کی منظوری کے بارے میں اپنی جماعت کی مجلس عاملہ کے 25/جون کے فیصلے اور پھر آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے 6/جولائی کے فیصلے سے منحرف ہو چکا تھا۔ اس نے 10/جولائی کو ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ وزارتی مشن نے صوبوں کی لازمی گروپ بندی کے بارے میں جو تجویز پیش کی ہے، ہم اس کے پابند نہیں ہوں گے۔ ہم نے صرف دستور ساز اسمبلی میں شریک ہونا منظور کیا ہے۔ یہ اسمبلی کلی طور پر خودمختار ہو گی اور جیسا چاہے گی دستور منظور کرے گی۔ برصغیر کے کسی صوبے کو کسی گروپ میں شامل ہونے پر ابتدا میں بھی مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً آسام کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی اسمبلی کے ذریعے ابھی اس فیصلے کا اعلان کر دے کہ وہ گروپ نمبر 1 میں (یعنی بنگال کے ساتھ) شامل نہیں ہونا چاہتا اور شروع سے ہی گروپ نمبر 3 (ہندو اکثریتی گروپ) میں شامل ہو گا۔ نہرو کی اس عجیب و غریب تعبیر کا مطلب یہ تھا کہ وزارتی مشن منصوبہ پر عمل نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ آسام کے علاوہ صوبہ سرحد اور صوبہ سندھ بھی کانگرس کے جوڑ توڑ کی وجہ سے گروپ نمبر 2 (یعنی شمال مغربی مسلم اکثریتی گروپ) میں شامل ہونے سے انکار کر سکتے تھے۔ جب سید کی پروگریسو لیگ نے یہ قرارداد منظور کی تھی اس وقت واقعی اسمبلی میں اسکی کولیشن پارٹی کو اکثریت حاصل تھی اور وہ اسمبلی سے رسمی طور پر یہ اعلان کروا سکتا تھا کہ سندھ پنجاب کے ساتھ گروپ بندی پر آمادہ نہیں۔ اس گروپ کی قرارداد کی تیسری وجہ یہ تھی کہ پنجاب کے بیشتر مسلمان لیڈروں اور اخبارات نے صوبوں کی گروپ بندی کے منصوبہ کی حمایت کی تھی کیونکہ انہیں اس سکیم میں علامہ اقبال کے 1930ء کے خواب کی تعبیر نظر آتی تھی۔ اگر وزارتی مشن منصوبہ کے مطابق گروپ بندی ہو جاتی تو بلوچوں، سندھیوں اور پٹھانوں پر واقعی پنجابیوں کا غلبہ قائم ہو جاتا۔ سندھ پر پنجابیوں کے غلبہ کا خدشہ کوئی نیا نہیں تھا۔ جب یہ علاقہ بمبئی سے الگ ہوا تھا اس وقت سے وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی حلقے کی طرف سے اس خدشہ کا اظہار ہوتا رہا تھا۔ 45-1944ء میں صوبہ لیگ نے بھی جی۔ ایم۔ سید کی زیر صدارت ایک سے زیادہ مرتبہ قراردادوں کے ذریعے

اس خدشے کا اظہار کیا تھا۔

27 ر جولائی کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے جواہر لال نہرو کے 10 ر جولائی کے بیان کے پیش نظر اپنا 6 ر جون کا فیصلہ منسوخ کر دیا اور اعلان کیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ مسلمانان ہند برطانیہ کی غلامی اور اونچی ذات کے ہندوؤں کے غلبہ سے نجات حاصل کرنے کے لئے راست اقدام کریں۔ اس سلسلے میں پہلا قدم یہ ہوگا کہ سارے مسلمان انگریزوں کے عطا کردہ خطابات واپس کر دیں گے۔

سندھ اسمبلی کا ڈیڈ لاک، گورنر کی جانب سے اسمبلی توڑنے اور نئے انتخابات کرانے کا اعلان

مسلم لیگ کونسل کے اس اعلان کے دو دن بعد 29 ر جولائی کو کراچی میں سرکاری طور پر اعلان کیا گیا کہ صوبائی گورنر نے حزب اختلاف کے قائد جی۔ ایم۔ سید کی درخواست کے پیش نظر صوبائی اسمبلی کا اجلاس 5 ر ستمبر کو طلب کیا ہے۔ اس اعلان کے فوراً بعد دونوں فریقوں کی طرف سے اندرون خانہ ساز باز اور جوڑ توڑ کی پھر ایک زبردست مہم شروع ہوگئی۔ اس کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ خان بہادر لغاری نے اپنے قصبہ سجاول میں دو صوبائی وزراء سے ملاقات کے بعد یہ اعلان کیا کہ ''میں اپنے حلقہ کے لوگوں کے کہنے پر پھر مسلم لیگ میں شامل ہوگیا ہوں۔'' دوسری طرف سید گروپ کی طرف سے دعویٰ کیا گیا کہ اس نے مزید دو لیگی ارکان کی حمایت حاصل کر لی ہے اور اب حزب اختلاف کی تعداد 33 ہوگئی ہے۔ اسی دن بیگم ارونا آصف علی کراچی پہنچی اور اس نے کانگرسی کارکنوں کو مشورہ دیا کہ وہ مزدوروں اور غریب کسانوں سے رابطہ پیدا کر کے اس صوبہ میں اپنی جماعت کو مضبوط بنائیں۔ اسکی واپسی کے فوراً ہی بعد کراچی میں مختلف سرکاری محکموں کے چھوٹے ملازمین کی ہڑتالیں شروع ہوگئیں جو تقریباً دو ہفتے تک جاری رہیں۔

15 ر اگست کو دہلی کے اخبار اسٹیٹس مین میں یہ خبر شائع ہوئی کہ سندھ صوبہ لیگ کے صدر ہاشم گزدر نے جی۔ ایم۔ سید سے ملاقات کر کے مؤخر الذکر کی مسلم لیگ میں دوبارہ شمولیت اور لیگ کے مجوزہ ڈائریکٹ ایکشن کی رہنمائی کے مسئلہ پر بات چیت کی ہے۔ صوبہ کے وزیر تعمیرات عامہ خان بہادر کھوڑو نے بھی سید سے ملاقات کر کے صوبہ کی موجودہ صورتحال پر گفتگو کی

ہے لیکن اسی دن ہدایت اللہ وزارت کے ایک پارلیمنٹری سیکرٹری محمد یوسف چانڈیو نے اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا کہ میں نے ابھی تک مسلم لیگ اسمبلی پارٹی سے مستعفی ہونے یا کولیشن پارٹی میں شامل ہونے کا فیصلہ نہیں کیا۔ میں اس سلسلے میں دو ایک دن میں کوئی فیصلہ کروں گا۔ یعنی اس نے دونوں فریقوں سے سودابازی کا دروازہ کھلا رکھا تھا۔

16 راگست کو مسلم لیگ نے پورے برصغیر میں ڈائریکٹ ایکشن ڈے منایا تو کلکتہ میں بے مثال فرقہ وارانہ قتل عام ہوا۔ ایک ہی دن میں 170 افراد مارے گئے اور 1000 زخمی ہوئے لیکن کراچی اور سندھ کے دوسرے شہروں میں امن وامان رہا حالانکہ صوبہ کے وزیر اعلیٰ سر غلام حسین ہدایت اللہ نے اسی دن مسلم کالج ہوسٹل میں ایک جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے مسلم رائے عامہ سے اپیل کی تھی کہ وہ ان سات گمراہ مسلمانوں کو دوبارہ مسلم لیگ میں شامل ہونے پر مجبور کریں جو ہمیں کلی طور پر تباہ کر رہے ہیں۔ اس نے اس حقیقت کی نشاندہی کی کہ صوبائی کانگرس کے 22 ہندو ارکان اسمبلی متحد ہیں اور ان میں کوئی ایک بھی وزارت میں شامل نہیں ہوگا۔ اگر یہ بے راہرو مسلمان لیگ سے باہر رہیں تو سندھ کے مسلمانوں کو ایسی طاقتور رائے عامہ پیدا کرنی چاہیے کہ یہ مسلم لیگ میں شامل ہونے پر مجبور ہو جائیں۔ وزیر محصولات پیر الٰہی بخش نے اس جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اگر مرکز میں کانگرسی حکومت قائم ہوئی تو بنگال کی طرح سندھ بھی اپنی آزادی کا اعلان کر دے گا۔ ہم مرکز میں کانگرسی حکومت کو کسی حالت میں بھی قبول نہیں کریں گے۔ 23 راگست کو صوبہ لیگ کے صدر ہاشم گزدر نے بھی اسی قسم کا اعلان کیا۔ اس نے کہا کہ جس دن مرکز میں کانگرس کی عبوری حکومت قائم ہوئی اسی دن سندھ اپنی مکمل آزادی کا اعلان کر دے گا مگر جب 6 رستمبر کو کانگرس نے دہلی میں عبوری حکومت قائم کر لی تو کراچی میں کسی نے بھی مکمل آزادی کا اعلان نہیں کیا۔ وزیر اعلیٰ سر غلام حسین ہدایت اللہ کا تبصرہ یہ تھا کہ سید اور دوسرے لوگوں کے بیانات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں اور پیر الٰہی بخش کا کہنا یہ تھا کہ ''ہم اس سلسلے میں مرکزی لیگ ہائی کمان کی ہدایت کا انتظار کرتے رہے ہیں۔'' اسی دن جی۔ ایم۔ سید کی کولیشن پارٹی کی طرف سے وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی چھ تحریکیں پیش کرنے کا نوٹس دیا گیا تھا۔

5 رستمبر کو 29 رجولائی کے سرکاری اعلان کے مطابق صوبائی اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو سپیکر سید میراں محمد شاہ نے اچانک اپنے استعفیٰ کا اعلان کر دیا۔ اس نے یہ استعفیٰ وزیر اعلیٰ سر غلام

حسین ہدایت اللہ کی خواہش کے مطابق دیا تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ اسمبلی کی کاروائی مزید چند دنوں کے لئے ملتوی ہو جائے تاکہ وزیر اعلیٰ کو اپنی پارٹی پوزیشن مضبوط کرنے کا موقع مل سکے۔ چار صوبائی وزراء نے بھی اسی مقصد کے لئے استعفے وزیر اعلیٰ کے حوالے کر دیئے تھے۔ جی۔ایم۔سید نے اس صورتحال کے پیش نظر گورنر کے نام ایک خط میں درخواست کی کہ وہ مسلم لیگ کی وزارت کو مستعفی ہونے کی ہدایت کرے اور حزب اختلاف کو وزارت سازی کا موقع دے۔سید کا دعویٰ تھا کہ لیگ اسمبلی پارٹی کے ارکان کی تعداد 27 ہے اور اگر 3 یورپین ارکان ان کی حمایت کریں تو وزارت کے حامیوں کی تعداد 30 ہوگی اور حزب اختلاف کے ارکان کی تعداد بھی 30 ہے۔لہٰذا لیگ پارٹی کو اب برسر اقتدار رہنے کا کوئی آئینی حق نہیں ہے مگر گورنر نے سید کی اس درخواست کو قبول نہ کیا اور اسمبلی کے نئے سپیکر کے انتخاب کے لئے 10 ستمبر کی تاریخ مقرر کر دی۔

9 ستمبر کو گورنمنٹ ہاؤس سے ایک اعلان جاری ہوا جس میں بتایا کہ گورنر نے چار وزراء...... میر غلام علی تالپور، پیر الٰہی بخش، پیرزادہ عبدالستار اور میر بندے علی تالپور کے استعفے منظور کر لئے ہیں اور پھر جب 10 ستمبر کو اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو ڈپٹی سپیکر مس جیٹھی سپاہی ملانی نے اپنے استعفیٰ کا اعلان کر دیا۔جب اس کے استعفیٰ کا اعلان سپیکر کی عدم موجودگی میں اسمبلی کے سیکرٹری نے پڑھ کر سنایا تو معلوم ہوا کہ اب اجلاس کی صدارت کرنے والا کوئی نہیں رہا اور سیاسی مبصرین کا فیصلہ یہ تھا کہ اب صوبائی گورنر کے پاس اسمبلی کو برخاست کر کے نئے عام انتخابات کروانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔مسلم لیگی زعما یہی چاہتے تھے۔سر غلام حسین ہدایت اللہ، خان بہادر کھوڑو اور ہاشم گزدر کئی دن سے اپنی تقریروں اور بیانات میں یہی مطالبہ کر رہے تھے۔

دہلی کے اخبار سٹیٹس مین کی ایک رپورٹ کے مطابق ڈپٹی سپیکر کے استعفیٰ کے بعد ایوان میں جو بحرانی صورتحال پیدا ہو گئی تھی اس کے پیش نظر ایوب کھوڑو کا تبصرہ یہ تھا کہ ''اگر آئندہ دو ایک دن میں کسی پارٹی نے واضح اکثریت حاصل نہ کی تو گورنر راج کا نفاذ ناگزیر ہو جائے گا۔ اس نے کہا کہ چونکہ مسلم لیگ غیر مسلم لیگی مسلمانوں کو کابینہ میں شامل کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتی اس لئے صوبہ میں مسلم لیگ اور کانگرس کی مفاہمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' اس اخبار کی مزید اطلاع یہ تھی کہ ''حزب اختلاف کے قائد جی۔ایم۔سید نے صوبائی گورنر کے نام ایک یادداشت میں درخواست کی ہے کہ اسمبلی کی کاروائی شروع کرنے کے لئے کسی چیئرمین کو نامزد کیا جائے۔

اس نے وزیر ہند اور وائسرائے کو بھی یادداشتیں بھیجی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ وزارت کو اکثریت کی حمایت حاصل نہیں ہے۔ سپیکر نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ اسمبلی مفلوج ہو گئی ہے اور اس بنا پر صوبہ کے آئین، امن اور ترقی کے لئے خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ یہ سارا خلجان گورنر اور تین یورپین ارکان نے پیدا کیا ہے جن کے رویہ سے ہندوستانیوں کے اختلافات میں شدت پیدا ہوئی ہے اور آئین کے خوش اسلوبی سے عمل درآمد کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہوئی ہے۔ یورپی ارکان کی جانبداری نے جو تعطل پیدا کیا ہے اس کی وجہ سے گورنر راج نافذ ہو جائے گا اور صوبائی خودمختاری ختم ہو جائے گی۔ اگر یورپی ارکان غیر جانبدار رہیں تو سارے فرقوں کی نمائندہ وزارت کو استحکام ملے گا اور گورنر کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ غیر جانبدار ہو اور آئینی تقاضوں کو پورا کرے۔ گورنر کا فرض ہے کہ وہ سر غلام حسین کی وزارت سے استعفیٰ طلب کر کے حزب اختلاف کو وزارت سازی کا موقع دے۔ جی۔ ایم۔ سید نے اپنی یادداشت کے آخر میں وزیر ہند اور وائسرائے سے مزید درخواست کی کہ وہ آئین کی دفعہ 54 کے تحت مداخلت کر کے سندھ کی دستوری صورتحال کو مزید خراب ہونے سے بچائیں۔"

11 ستمبر کو سندھ کی کانگرس پارٹی کے قائد آر۔ کے۔ سدھوا نے ایک بیان میں رائے ظاہر کی کہ "صوبہ کے موجودہ دستوری ڈیڈ لاک کا واحد حل یہ ہے کہ یہاں ایک آل پارٹی حکومت قائم ہو۔ نئے انتخابات کرانے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔"[15] مگر گورنر سر فرانسس موڈی نے جی۔ ایم۔ سید اور آر۔ کے۔ سدھوا کے واویلا کو نظر انداز کر کے صوبائی اسمبلی کو توڑ دیا اور یہ اعلان کیا کہ صوبہ میں مناسب وقت پر عام انتخابات ہوں گے۔ بظاہر گورنر کے اس اعلان کی وجہ یہ تھی کہ 5 ستمبر کے بعد سر غلام حسین ہدایت اللہ نہ صرف حزب اختلاف کے سید گروپ اور مولا بخش گروپ کے سات مسلم ارکان میں سے کسی ایک کو بھی وزارت کا لالچ دینے کے باوجود لیگ پارٹی میں شامل نہیں کر سکا تھا بلکہ اس کی اپنی پارٹی کے دو پارلیمنٹری سیکرٹری سید نور شاہ اور محمد یوسف چانڈیو اپنے عہدوں سے مستعفی ہو گئے تھے اور اس امر کا قوی امکان پیدا ہو گیا تھا کہ وہ حزب اختلاف سے جا ملیں گے۔

جی۔ ایم۔ سید نے گورنر کے اس اقدام پر سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ گورنر کی جانب سے کولیشن پارٹی کی سخت مخالفت سے ظاہر ہوتا ہے کہ "اس نے تہیہ کیا ہوا ہے کہ اگر صوبہ

میں سر غلام حسین کی وزارت نہیں ہوگی تو کوئی وزارت بھی نہیں ہوگی۔'' 13 ستمبر کو جی۔ایم۔سید اور پروفیسر گھنشام نے گورنر سے ملاقات کر کے اس سے درخواست کی کہ وہ عام انتخابات میں غیر ضروری تاخیر نہ کرے اور پھر 15 ستمبر کو سید نے اپنی پروگریسو مسلم جماعت کے پارلیمانی بورڈ کی تشکیل کا اعلان کیا۔ اس پر صوبہ کا وزیر تعمیرات عامہ ایوب کھوڑو بہت برہم ہوا اور اس نے 17 ستمبر کو ایک بیان میں سندھ کے آئینی بحران کی ذمہ داری کانگرس پر عائد کی۔ اس نے کہا کہ سندھ کا موجودہ بحران سندھ اسمبلی میں کانگرس کی سازشوں کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس نے کانگرس کو متنبہ کیا کہ وہ آئندہ صوبہ کے مسلمانوں میں تفرقہ اندازی نہ کرے۔ کھوڑو نے الزام عائد کیا کہ ''ایک طرف تو کانگرس صوبوں اور مرکز میں تعاون کی طلب گار ہے اور دوسری طرف وہ سندھ کے مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانے کی مسلسل کوشش کر رہی ہے اور اس کی کولیشن پارٹی کے ارکان مسلم لیگ کا مقابلہ کرنے کے لئے دہلی سے رقوم حاصل کرتے ہیں جبکہ کانگرس عام انتخابات میں کسی بھی مسلم نشست کے لئے اپنا امیدوار کھڑا نہیں کر رہی اس لئے کانگرس کی طرف سے سندھ کے لیگ دشمن مسلم عناصر کی مالی امداد کا کوئی جواز نہیں۔ سندھ کے مسلمان نہ تو ہندوؤں میں دھڑے بندی کرواتے ہیں اور نہ ہی وہ ہندوؤں کے حلقہ ہائے انتخابات میں کوئی مداخلت کرتے ہیں۔ کانگرس کو بھی چاہیے کہ وہ مسلمانوں کے معاملات میں مداخلت نہ کرے۔ اسے مسلم رائے دہندگان کے فیصلے کا انتظار کرنا چاہیے۔ کانگرس کے سرمایہ کے زور پر مسلم جماعت کا جو پارلیمانی بورڈ بنایا گیا ہے اس کا مقصد محض یہ ہے کہ عوام کو دھوکا دیا جائے۔''[16] کھوڑو کا یہ بیان 18 ستمبر کو شائع ہوا تو اس سے اگلے دن 19 ستمبر کو کراچی میں گورنمنٹ ہاؤس سے اعلان کیا گیا کہ ''صوبہ کے عام انتخابات 2 دسمبر کو ہونگے اور کاغذات نامزدگی کی وصولی یکم نومبر کو ہوگی'' اور پھر 21 ستمبر کو سر غلام حسین ہدایت اللہ کی سربراہی میں پانچ رکنی نئی عبوری وزارت کی تشکیل ہوئی۔ محکموں کی تقسیم اس طرح تھی:۔

1۔	وزیر اعلیٰ سر غلام حسین ہدایت اللہ	خزانہ اور نظم ونسق
2۔	پیر الٰہی بخش	مال
3۔	میر غلام علی تالپور	خوراک، سول سپلائز اور ترقیات

4۔ بندے علی خان تالپور زراعت وصنعت
5۔ عبدالستار پیرزادہ تعلیم، صحت اور لوکل سیلف گورنمنٹ

سندھ پروگریسو مسلم جماعت کے صدر شیخ عبدالمجید کو اس یک جماعتی عبوری وزارت کی تشکیل پر اتنا غصہ آیا کہ اس نے ایک بیان میں وائسرائے سے مطالبہ کیا کہ صوبائی گورنر کو فوراً واپس بلالیا جائے۔ اس نے کہا کہ ''سر فرانسس موڈی کی اس کاروائی سے یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ وہ اب تاج برطانیہ کا نمائندہ نہیں رہا اور اسے تاج برطانیہ اور آئین کی اعلیٰ روایات کا بھی کوئی لحاظ نہیں۔ اس نے اب ایسے افراد کی منظوری سے سندھ کے مطلق العنان بادشاہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے جنہیں اسمبلی کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔''[17]

گورنر موڈی کے خلاف سید گروپ کا یہ احتجاج بے جا نہیں تھا۔ سندھ کی تاریخ کا کوئی سنجیدہ طالب علم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ اس گورنر نے جنوری 1946ء میں اپنے عہدے کا چارج سنبھالنے کے بعد جتنے اقدامات کئے وہ سب کے سب مسلم لیگ کے حق میں اور جی۔ ایم۔ سید کی کولیشن پارٹی کے خلاف تھے۔ اس نے 8 رفروری کو سر غلام حسین ہدایت اللہ کو وزارت سازی کی دعوت دی حالانکہ لیگ اسمبلی پارٹی کو ایوان میں اکثریت کی حمایت حاصل نہیں تھی۔ 20 رمارچ کو جب اس وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش ہوئی تھی تو یہ تین یورپی ارکان کی حمایت کی بنا پر شکست سے بچ گئی تھی اور یہ بات بعید از امکان نہیں کہ ان تین یورپی ارکان نے گورنر موڈی کی ہدایت کے مطابق وزارت کی حمایت میں ووٹ دیئے تھے۔ 25 رمارچ کو ایک مطالبہ زر پر رائے شماری کے دوران ہدایت اللہ وزارت کو ایک ووٹ کی اکثریت سے شکست ہوئی لیکن اس کے باوجود یہ وزارت قائم رہی اور گورنر نے اس سے استعفیٰ طلب نہ کیا بلکہ اس نے اگلے دن لیگ پارٹی کے باغی رکن میر بندے علی تالپور کو کابینہ میں شامل کرنے کی اجازت دے کر اپنی جانبداری کا کھلم کھلا مظاہرہ کیا۔ 11 رجولائی کو اسمبلی میں ہدایت اللہ وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک اس لئے پیش نہ ہو سکی کہ گورنر نے سپیکر کے نام اپنے خط میں لکھا کہ یہ اجلاس محض مرکزی دستور ساز اسمبلی کے ارکان کے انتخاب کے لئے بلایا گیا ہے۔ 13 رجولائی کو گورنر نے جی۔ ایم۔ سید سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا اور جب اس سے تحریری طور پر درخواست کی گئی کہ اسمبلی کا خصوصی اجلاس بلا تاخیر بلایا جائے تاکہ

وزارت کے مستقبل کا فیصلہ ہو سکے تو اس کا جواب یہ تھا کہ اسمبلی کا آئندہ اجلاس رمضان کے بعد ستمبر میں ہوگا۔ 5 ر ستمبر کو جب سپیکر نے استعفٰی دے دیا تو پارلیمانی روایت کے مطابق ڈپٹی سپیکر کی زیر صدارت اسمبلی کی کاروائی جاری رہنی چاہیے تھی مگر ایسا نہ ہوا اور گورنر نے نئے سپیکر کے انتخاب کے لئے 10 ر ستمبر کی تاریخ مقرر کر دی جبکہ تینوں یورپی ارکان اسمبلی لیگ پارٹی کی حمایت کرتے رہے۔ جب 10 ر ستمبر کو ڈپٹی سپیکر کے مستعفی ہونے کے بعد دو پارلیمنٹری سیکرٹریوں نے بھی استعفے دے دیئے تو یورپی ارکان کی حمایت کے باوجود ہدایت اللہ وزارت ایوان کا اعتماد کھو بیٹھی تھی۔ اگر اس موقع پر کسی بھی شخص کی زیر صدارت ایوان میں رائے شماری کرائی جاتی تو یہ وزارت قائم نہیں رہ سکتی تھی مگر گورنر نے 12 ر ستمبر کو اسمبلی توڑ کر اسے اپنا جمہوری و آئینی حق استعمال کرنے سے محروم کر دیا اور پھر 21 ر ستمبر کو اس نے غلام حسین ہدایت اللہ کو یک جماعتی وزارت بنانے کی اجازت دے کر ثابت کر دیا کہ آئندہ عام انتخابات میں بھی اس کا رویہ غیر جانبدارانہ نہیں ہوگا۔

چودھری خلیق الزماں سندھ میں گورنر موڈی کی لیگ نوازی پر بڑی ممنونیت کا اظہار کرتا ہے وہ لکھتا ہے کہ ''سندھ میں صورتحال بہت کمزور تھی۔ جی۔ ایم۔ سید اور سر ہدایت اللہ کسی بھی معاملہ پر ایک دوسرے سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ سید، سر ہدایت اللہ کے خلاف جو شکایات کرتا تھا ان میں بعض خاصی وزنی تھیں لیکن مسٹر جناح کو خطرہ تھا کہ اس مرحلے پر کوئی بھی تبدیلی مسلمانوں کے لئے تباہ کن ہوگی۔ سر فرانسس موڈی شملہ کانفرنس کی ناکامی کے فوراً ہی بعد جولائی 1945ء میں اس صوبہ کا گورنر مقرر ہو گیا تھا۔ یو۔ پی میں کانگرسی راج کے ابتدائی دور میں جبکہ وہ رفیع احمد قدوائی کے ماتحت ریونیو سیکرٹری تھا، پاکستان کے بارے میں خواہ اس کے کچھ ہی خیالات تھے لیکن میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت تک (جولائی 1945ء تک) وہ مسلمانوں کے نصب العین کے بارے میں قائل ہو چکا تھا۔ سندھ میں صرف وہی ایک مستحکم عنصر تھا۔ وہاں دونوں پارٹیوں کی طاقت اتنی برابر تھی کہ اگر اسمبلی کا سیشن ہوتا تو لیگ وزارت ختم ہو جاتی۔ دو پارلیمنٹری سیکرٹری دوسری طرف چلے گئے تھے اور سپیکر نے بھی نوٹس دے دیا تھا کہ اگر اسے وزیر نہ بنایا گیا تو وہ بھی اپوزیشن سے جا ملے گا۔ سر فرانسس موڈی نے وائسرائے کو ٹیلی فون پر اس صورتحال سے آگاہ کیا۔ وائسرائے کی تجویز یہ تھی کہ وہ اسمبلی کے سیشن کی

صدارت کے لئے کسی غیر جانبدار شخص کی تلاش کرے۔ اس پر سر فرانسس نے کہا کہ وہ کسی ایسے شخص کو نہیں ڈھونڈ سکتا جس کی غیر جانبداری پر اعتبار کیا جا سکے چنانچہ سر فرانسس نے اسمبلی توڑنے اور نئے انتخابات کی تجویز پیش کی۔ لیکن جب وائسرائے نے اس تجویز سے اتفاق نہ کیا تو رولز آف بزنس (Rules of Business) کے مطابق یہ تجویز برائے فیصلہ وزیر ہند ایمری☆ کے پاس بھیج دی گئی۔ وزیر ہند نے گورنر سے اتفاق کیا اور اسمبلی توڑ دی گئی۔ میں نے یہ سب کچھ ان معلومات کی بنیاد پر بیان کیا ہے جو خود سر فرانسس موڈی نے مجھے بتائی تھیں۔ اس نے سندھ کو لیگ کی تاریخ کے ایک انتہائی نازک موقع پر بچایا تھا۔''[18]

گورنر موڈی نے لیگ کی طرفداری کیوں کی؟

چودھری خلیق الزماں کا اس زمانے میں آل انڈیا مسلم لیگ کے صف اول کے لیڈروں میں شمار ہوتا تھا لیکن اس کی سیاسی بے بصیرتی اور جہالت کا یہ عالم تھا کہ 1961ء تک (جبکہ اس کی کتاب شائع ہوئی تھی) یہ باور کرتا تھا اور دوسروں کو بھی یہ باور کرانے کی کوشش کرتا تھا کہ 1946ء میں سندھ میں سر فرانسس موڈی کی مسلم لیگ نوازی کی وجہ محض یہ تھی کہ وہ اس وقت تک مسلمانوں کے نصب العین کا قائل ہو چکا تھا اور برطانوی سامراج کی پالیسی کا اس کی اس جانبداری سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ چودھری خلیق الزماں کی طرح پنجاب میں بھی ایسے لال بجھکڑ موجود تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ اس صوبہ میں 1941ء میں گورنر برٹرینڈ گلینسی (Bertrand Glancy) نے مسلم لیگ کی وزارت محض اس لئے نہیں بننے دی تھی کہ اسے شک تھا کہ مسلم لیگ کے ساتھ غیر مسلم پارٹیاں کولیشن کو تیار نہ ہوں گی۔ اگرچہ پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی سب سے بڑی پارٹی تھی لیکن گورنر گلیسنی نے اس پارٹی کے قائد نواب ممدوٹ کو وزارت سازی کی دعوت دینے کی بجائے ابوالکلام آزاد کے ساتھ اشتراک عمل کر کے یہاں یونینسٹ پارٹی، اکالی پارٹی اور کانگرس پارٹی کی کولیشن وزارت بنوا دی تھی۔ سر فیروز خان نون کی رائے یہ تھی کہ 1947ء کے اوائل میں سر خضر حیات خان کے استعفیٰ کے بعد پنجاب کے گورنر سر ایوان جینکنز

☆ یاد رہے کہ ستمبر 1946ء میں وزیر ہند کے عہدے پر ایمری (Amery) نہیں بلکہ پیتھک لارنس (Pethick Lawrence) فائز تھا۔ خلیق الزمان نے سہواً یہاں سابقہ وزیر ہند ایمری کا نام لکھ دیا ہے۔

(Evan Jenkins) نے مسلم لیگ پارٹی کے قائد نواب ممدوٹ کو محض اس لئے وزارت سازی کی دعوت نہیں دی تھی کہ وہ مسلمانوں کا دشمن اور سکھوں کا دوست تھا۔ اگر ایسے احمقانہ بیانات کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ سندھ اور پنجاب کے گورنر اپنے اپنے صوبوں میں فی الواقعی مطلق العنان بادشاہوں کی طرح حکومت کرتے تھے اور دہلی اور لندن میں کوئی ان سے باز پرس کرنے والا نہیں تھا۔

سندھ کے گورنر سر فرانسس موڈی کی 1946ء میں مسلم لیگ نوازی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ برطانوی سامراج اس زمانے میں انتقال اقتدار کی بات چیت کے دوران برصغیر میں سیاسی قوت کا توازن سراسر کانگرس کے حق میں نہیں ہونے دینا چاہتا تھا اگرچہ 46-1945ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ نے جداگانہ طریقۂ انتخاب کے تحت بے مثال کامیابی حاصل کی تھی لیکن اس کے باوجود چار مسلم اکثریتی صوبوں میں سے دو صوبوں یعنی سرحد اور پنجاب میں غیر لیگی حکومتیں قائم ہوگئی تھیں۔ اگر پہلے سندھ اور پھر بنگال میں بھی کانگرس نواز حکومتیں قائم ہو جاتیں تو کانگرس کی سیاسی قوت میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا اور پھر جواہر لال نہرو کا یہ دعویٰ صحیح ثابت ہو جاتا کہ برصغیر میں صرف دو ہی قوتیں ہیں ایک برطانیہ اور دوسری کانگرس۔ لہٰذا ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں ان دونوں قوتوں کے درمیان مکمل آزادی کا فیصلہ ہونا چاہیے۔ ہندو مسلم تنازعہ کا تصفیہ بعد میں خود بخود ہو جائے گا۔ برطانیہ کے سامراجی ارباب اقتدار اتنے احمق نہیں تھے کہ وہ ہندوستان میں کانگرس کو واحد سیاسی قوت تسلیم کر کے اس کی شرائط پر یہاں سے دستبردار ہو جاتے۔ وہ یہاں سے رخصت ہونے سے پہلے خود اپنی ساری شرائط منوانا چاہتے تھے اور ایسا صرف اسی صورت ممکن ہو سکتا تھا کہ مسلم لیگ کو ایک طاقتور تیسرا فریق تسلیم کیا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ وائسرائے ویول نے جولائی 1945ء میں محض اس بنا پر شملہ کانفرنس کی ناکامی کا اعلان کیا کہ صدر مسلم لیگ قائد اعظم جناح کسی غیر لیگی مسلمان کو عبوری مرکزی حکومت میں شامل کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے تھے اور یہی وجہ تھی کہ ستمبر 1946 میں وزیر ہند نے سندھ کے گورنر موڈی کی یہ تجویز منظور کر لی تھی کہ اسمبلی کو توڑ کر صوبہ میں از سر نو انتخاب کرائے جائیں۔ بظاہر گورنر موڈی کو یقین تھا کہ نئے عام انتخابات میں سید گروپ اور مولا بخش گروپ کا خاتمہ بھی ہو جائے گا اور مسلم لیگ کسی نہ کسی ہندو کو ساتھ ملا کر مستحکم وزارت بنا سکے گی۔

سندھ کے گورنر کی لیگ نوازی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ 1946ء میں برطانیہ کے حکمران طبقے میں اور برصغیر میں اس طبقے کی انتظامی مشینری میں ایسے عناصر کی کمی نہیں تھی کہ جو یہ محسوس کرتے تھے کہ اگر ہندوستان میں بلاشرکت غیرے کانگرس کا راج قائم ہوگیا تو پھر برصغیر کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ایسی خانہ جنگی ہوگی کہ برطانیہ کے سارے سامراجی منصوبے اس خانہ جنگی کے خون میں غرق ہوجائیں گے۔ یہ عناصر ہندوستان کی افواج میں فرقہ وارانہ خانہ جنگی سے بہت ڈرتے تھے۔ انہیں خطرہ تھا کہ اگر ایسا ہوا تو ہندوستان کی وحدت و سالمیت کے پرخچے اڑ جائیں گے اور سوویت یونین اس خون خرابے سے فائدہ اٹھائے گا۔ وائسرائے ویول انہی عناصر سے تعلق رکھتا تھا چنانچہ اس نے اگست 1946ء میں کلکتہ کے فرقہ وارانہ قتل عام کے بعد گاندھی اور جواہر لال نہرو پر بہت زور دیا تھا کہ وہ مسلم لیگ کو مرکز کی عبوری حکومت میں ضرور شامل کریں مگر جب کانگرسی زعما اس کی اس تجویز پر عمل کرنے کو تیار نہ ہوئے اور انہوں نے 2 ستمبر کو خود ہی حکومت بنالی تھی تو پورے ہندوستان کی فرقہ وارانہ کشیدگی میں بے انتہا اضافہ ہوا اور پھر نوا کھلی، بہار، گڑھ مکتیشر، ہزارہ اور پنجاب کے مختلف اضلاع میں اتنی فرقہ وارانہ خونریزی ہوئی کہ مارچ 1947ء میں کانگرس کی مجلس عاملہ نے خود ہی برصغیر کی تقسیم کے اصول کو تسلیم کرلیا۔☆

سندھ کے گورنر موڈی کو نہ صرف وائسرائے ویول کے اس نقطۂ نگاہ سے پورا اتفاق تھا بلکہ وہ صوبہ سرحد کے گورنر سر اولف کیرو (Olf Caroe) کے اس نظریے سے بھی اتفاق کرتا تھا کہ برصغیر کے بارے میں سوویت یونین کے عزائم کو ناکام بنانے کے لئے ضروری ہے کہ شمال مغربی علاقوں میں مسلمانوں کو سیاسی طور پر منظم و مضبوط کیا جائے اور اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس علاقے میں مسلم لیگ کی کسی نہ کسی طرح حمایت کی جائے۔ مزید برآں سر فرانسس موڈی پنجاب کے سابق گورنر سر میلکم ہیلی (Malcom Hailey) کی طرح برطانوی بیوروکریسی کے ان ارکان میں سے تھا کہ جنہیں ہندوؤں کے سرکش بورژوا لیڈروں کے مقابلے میں مسلمانوں کے فرمانبردار جاگیردار اچھے لگتے تھے۔ سید غلام مصطفیٰ کے بیان کے مطابق 45-1944ء میں

☆ تفصیل کے لیے دیکھئے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ۔ پاکستان کیسے بنا؟ ص ص 452, 453 جلد دوم ایڈیشن سوم

سندھ کے ایسے خطاب یافتہ مسلم جاگیرداروں میں ایسے خان بہادر تھے جو تھانیدار کے پاؤں کو ہاتھ لگا کر اس کے سامنے دوزانو ہو کر چٹائی پر بیٹھتے تھے۔

دوبارہ انتخابات میں لیگ کی بھرپور اکثریت سے کامیابی اور دوبارہ لیگی وزارت کا قیام

19 ستمبر کو انتخابی پروگرام کے اعلان کے بعد تھوڑے ہی دنوں میں پتہ چل گیا کہ مسلم لیگ کو ان انتخابات میں مطلوبہ کامیابی حاصل ہوگی اور سید گروپ کا اور مولا بخش گروپ کا سیاسی خاتمہ ہو جائے گا۔ مزید برآں کانگرس کی غیر فرقہ واریت بھی بے نقاب ہوگئی جبکہ اخبارات میں یہ خبریں شائع ہوئیں کہ کانگرس ان انتخابات میں کسی بھی مسلم نشست کے لئے اپنا امیدوار کھڑا نہیں کرے گی البتہ وہ سید کی پروگریسو جماعت کی حمایت کرے گی۔ ان خبروں پر نوائے وقت کا تبصرہ یہ تھا کہ ''اگر کانگرس سید گروپ کو مالی مدد نہ دے اور مسلمانوں کو اپنا جھگڑا خود چکانے کے لئے چھوڑ دے تو جس طرح کانگرس سندھ اسمبلی کی سب ہندو نشستوں پر قابض ہو جائے گی اُسی طرح مسلم لیگ سندھ اسمبلی کی ساری (مسلم) نشستیں جیت لے گی۔ ہماری رائے میں کانگرس سید گروپ پر اپنا روپیہ فضول برباد کر رہی ہے۔ اس گروپ کی شکست کے آثار ابھی سے پیدا ہیں۔ اول اول یہ اعلان کیا گیا تھا کہ سید گروپ ہر مسلم نشست کے لئے لیگ کا مقابلہ کرے گا۔ پھر یہ کہا گیا تھا کہ صرف تیس نشستوں کے لئے مقابلہ کیا جائے گا اور تیسرے اعلان میں یہ بتایا گیا کہ نیشنلسٹ اپنی ساری توجہ بارہ نشستوں پر مرتکز کریں گے اور آج ایک چوتھا اعلان نظر سے گزرا ہے۔ جس میں یہ کہا گیا کہ نیشنلسٹ دس نشستیں جیتنے کی امید رکھتے ہیں یعنی انتخاب شروع ہونے سے دو ماہ پہلے سید گروپ 25 نشستوں سے تو مقابلہ کئے بغیر فرار ہو گیا۔ یہی رفتار رہی تو شاید باقی نشستوں کے لئے بھی مقابلہ کی نوبت نہ آنے پائے۔ یہ سب اعلانات کراچی کے ہندو اخبارات نے ہی شائع کئے ہیں اس لئے ان کی سچائی پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اخبار مسٹر سید کے حق میں تو جھوٹ بول سکتے ہیں مگر ان کے خلاف ہرگز جھوٹ نہیں بولیں گے۔''[19]

پروگرام کے مطابق 2 نومبر کو کاغذات نامزدگی کی پڑتال ہوئی تو تین مسلم لیگی، تین

یورپین اور بارہ کانگرسی ہندوامیدوار بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔ کامیاب لیگی امیدواروں میں ایوب کھوڑو اور سید محمد میران شاہ بھی شامل تھے

19 ستمبر کو ضلع دادو کے قصبہ سیہون میں سید گروپ کے ایک پر جوش حامی سید مراد علی شاہ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس قتل کے بارے میں مسلم لیگی اخبارات کی اطلاع یہ تھی کہ ''مسلم لیگ کے چند کارکن جن میں سے ایک کے ہاتھ میں بھرا ہوا ریوالور تھا، آپ سے گفتگو کر رہے تھے کہ ناگہاں ریوالور چل گیا اور گولی سید مراد علی شاہ کو لگ گئی۔''

اس قتل کے دو دن بعد نوائے وقت میں ''دارالسلام'' کے نامعلوم شخص ''لطیف'' کا ایک انتہائی اشتعال انگیز مضمون شائع ہوا جس میں جی۔ ایم۔ سید کے اس بیان پر سخت نکتہ چینی کی گئی تھی کہ ''اگر گروپنگ پلان کے تحت سندھ کا پنجاب سے الحاق ہو گیا تو پنجاب والے سندھ پر چھا جائیں گے اور سندھ کی تہذیب پنجابی تہذیب کے زیر اثر آجائے گی...... ہم نے اسلامیات میں یہ چیز نہیں دیکھی۔ یہاں تو مسلمانوں کو صرف ایک ہی تہذیب ملی ہے جس پر کسی مسلمان کو فخر و ناز ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی تہذیب مسلمانوں کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتی۔ یہاں کوئی خاص جغرافیائی تہذیب کوئی معنی نہیں رکھتی...... سندھ کا ایک برخود غلط سید صرف سندھی تہذیب کو پنجابی تہذیب کے اثر سے بچانے کے لئے تمام ملت اسلامیہ سے برسر پیکار ہو گیا ہے...... اپنے ایک بیان میں جسے کانگرس اور ہندو پریس میں نمایاں جگہ دے کر شائع کیا گیا اور جس پر ہندوستان ٹائمز نے ایڈیٹوریل بھی لکھا۔ مسٹر سید نے کہا کہ اگر صوبوں کی گروپ بندی ہو گئی تو اس کا سب سے برا نتیجہ یہ نکلے گا کہ سندھ کی زبان پر اردو زبان غالب آجائے گی اور سندھ سندھی بولی سے محروم ہو جائے گا...... غالباً ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں پہلا موقع ہے جب اردو زبان کی مخالفت ایک مسلمان نے کی ہو اور وہ مسلمان جو سید بھی ہے...... اے ملت اسلامیہ! کیا تمھاری غیرت کے نام چیلنج نہیں ہے جو سید کی طرف سے تم تک پہنچا ہے اور تم نے یہ چیلنج قبول نہیں کر لیا ہے اور اگر قبول کر لیا ہے تو اس کا تمہیں جواب دینا ہوگا۔ اے سندھ کے غیور مسلمانو! خواب غفلت سے بیدار ہو جاؤ اور مناسب تلافیٔ مافات کرو اور وہ اس طرح ہے کہ مسٹر سید کی سیاسی موت پر مہر تصدیق ایک رسمی ضابطے کی طرح ثبت کر دی جائے۔''[20]

اس مضمون سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ 1946ء میں پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے عزائم

بے انتہا خطرناک صورت اختیار کر چکے تھے اور اس زمانے میں بلوچوں، سندھیوں اور پٹھانوں کے بعض عناصر کی جانب سے پنجابیوں کے غلبہ کے بارے میں جن خدشات کا اظہار کیا جارہا تھا وہ بے بنیاد نہیں تھے۔ یہ طبقہ فی الحقیقت، اسلامی تہذیب اور اسلامی قومیت کے نام پر شمال مغربی ہندوستان کے غیر پنجابی علاقوں کو اپنے زیر تسلط کرنے کا عزم رکھتا تھا۔ یہ طبقہ اپنے اس سامراجی عزم کی وجہ سے اتنا اندھا ہو چکا تھا کہ اسے نہ صرف برصغیر بلکہ دنیا کے کسی حصہ میں بھی کوئی جغرافیائی تہذیب نظر نہیں آتی تھی اور جو لوگ اردو نہیں جانتے تھے یا نہیں جاننا چاہتے تھے انہیں وہ مسلمان ہی نہیں سمجھتا تھا۔ یہ طبقہ اسلامی تہذیب اور اسلامی قومیت کی لاٹھی سے ان تمام عناصر کو لہولہان کرنا چاہتا تھا جو پنجابی شاونزم کے بارے میں خدشہ کا اظہار کرتے تھے۔ جس دن نوائے وقت میں یہ مضمون شائع ہوا تھا اسی دن ہی یہ خبر بھی شائع ہوئی تھی کہ ''حیدرآباد میں شیخ عبدالمجید سندھی اور دوسرے مسلمانوں نے ایک جلسہ منعقد کیا لیکن اسے منتشر کر دیا گیا۔ سامعین میں سے بعض زخمی ہوئے۔ پولیس موقع پر پہنچ گئی اور امن بحال کرنے میں بمشکل کامیاب ہوئی۔''

25 رنومبر کو صدر مسلم لیگ قائداعظم محمد علی جناح کراچی پہنچے لیکن دو تین دن کے بعد ہی انہیں اپنا دورۂ سندھ منسوخ کرنا پڑا کیونکہ حکومت برطانیہ نے وزارتی مشن منصوبہ کے بارے میں تبادلۂ خیالات کے لئے کانگرس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں کو لندن بلایا تھا اور جناح نے یہ دعوت قبول کر لی تھی۔ 28 رنومبر کو کراچی سے روانگی سے قبل جناح نے ایک بیان میں اسلامیان سندھ سے اپیل کی کہ وہ سندھ اسمبلی کی ہر نشست کو جیتنے کے لئے متحد ہو جائیں۔ ''اس اتحاد میں نہ صرف مسلمانوں کی نجات کا راز مضمر ہے بلکہ صوبہ کے تمام عوام کی بھلائی بھی اسی میں ہے کیونکہ اس صورت میں سندھ میں ایک ایسی پائیدار وزارت قائم ہو سکے گی جو عوام کی بہتری کے لئے کام کرے گی اور اس صورت میں سندھ کی اقلیتوں کے تعاون سے صحیح معنوں میں مفید اصلاحی قوانین نافذ کئے جا سکتے ہیں۔''

2 ردسمبر کو پولنگ شروع ہوئی جو تقریباً ایک ہفتہ تک جاری رہی۔ جب 13 ردسمبر کو سارے نتائج کا اعلان مکمل ہوا تو پارٹی پوزیشن اس طرح تھی: مسلم لیگ 35، کانگرس 19، یورپین 3، سید گروپ 2 اور انڈی پینڈنٹ ہندو 1۔ سید گروپ کے دو کامیاب امیدواروں میں سے ایک حاجی مولا بخش تھا جو زمینداروں کے حلقہ سے منتخب ہوا تھا اور دوسرا سردار خان کھوسو تھا جس نے

صرف 16 ووٹوں کی اکثریت سے کامیابی حاصل کی تھی۔خود جی۔ایم۔سید بھی ہار گیا۔اس کے مقابل مسلم لیگی امیدوار قاضی محمد اکبر نے 4115 ووٹ حاصل کئے جبکہ جی۔ایم۔سید کو صرف 1246 ووٹ ملے۔اس پر نوائے وقت کی سرخی یہ تھی کہ ''جی۔ایم۔سید کو قوم سے غداری کا صلہ مل گیا۔'' لیکن جی۔ایم۔سید کا الزام یہ تھا کہ ''مسلم لیگ نے یہ انتخاب، دھونس، دھاندلی، غنڈہ گردی اور جعلسازی سے جیتا ہے۔صوبہ کی ساری سرکاری مشینری لیگی امیدواروں کے حق میں برسرِعمل رہی۔کلکٹروں، ڈپٹی کلکٹروں، مختارکاروں اور پولیس کے چھوٹے بڑے اہل کاروں نے دورے کر کے مسلم رائے دہندگان کو لیگ کی حمایت پر مجبور کیا۔لیگ کے مخالفین کے پانی کے پائپ بند کر دیئے گئے۔لینڈ گرانٹس منسوخ کر دی گئی اور اسلحہ اور کنٹرول شاپس کے لائسنس منسوخ کر دیئے گئے۔بعض حلقوں میں بیلٹ بکس بھی توڑے گئے اور لیگی امیدواروں کے حق میں جعلی پرچیاں ڈال کر انہیں کامیاب کرایا گیا۔'' غالباً جی۔ایم۔سید کا یہ بیان مبالغہ آرائی سے خالی نہیں تھا لیکن یہ بالکل بے حقیقت اور بے وزن بھی نہیں تھا۔صوبہ کا گورنر سر فرانسس موڈی تھا جو کھلم کھلا مسلم لیگ کے حق میں تھا۔صوبائی وزارت مسلم لیگی تھی اور اس کے ارکان کا سیاسی خلوص و دیانت سے کبھی بھی تعلق نہیں رہا تھا۔لہٰذا ان سے کوئی بھی انتخابی بدعنوانی غیر متوقع نہیں تھی۔

انتخابی نتائج کے سرکاری اعلان کے تقریباً ایک ہفتہ بعد 23 / دسمبر کو بندے علی خان تالپور کی کوٹھی پر نئی سندھ لیگ اسمبلی پارٹی کا اجلاس ہوا تو معلوم ہوا کہ پارٹی قیادت کے انتخاب کے مسئلہ پر دو دھڑوں میں منقسم ہے۔ایک دھڑا ایوب کھوڑو کا تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ اسے پارٹی کی اکثریت کی حمایت حاصل ہے۔دوسرا دھڑا سر غلام حسین ہدایت اللہ کا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ پارٹی کی قیادت تبدیل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔صدر مسلم لیگ قائداعظم جناح اس دن کراچی ہی میں تھے اور بندے علی تالپور کی کوٹھی ہی میں ٹھہرے ہوئے تھے لیکن وہ اپنی ناسازیٔ طبع کے باعث پارٹی کے اجلاس میں شریک نہیں ہوئے تھے اور ان کی عدم موجودگی میں پارٹی کے ارکان اپنے نئے قائد کے بارے میں کسی قطعی فیصلہ پر نہیں پہنچ سکے تھے۔

25 / دسمبر کو قائداعظم نے ایوب کھوڑو سے دو گھنٹے تک ملاقات کی جس کے بعد ایسوسی ایٹڈ پریس نے یہ خبر دی کہ ''کھوڑو اب مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کی قیادت کا امیدوار نہیں رہا لہٰذا موجودہ وزیر اعلیٰ شیخ غلام حسین ہدایت اللہ بلا مقابلہ لیگ پارٹی کا لیڈر منتخب ہو جائے گا........

پرسوں رات صوبائی لیگ کی مجلس عاملہ نے شیخ غلام حسین ہدایت اللہ کے خلاف عدم اعتماد کی قرار داد پر غور کیا تھا مگر یہ قرارداد منظور نہیں کی گئی تھی۔"

3رجنوری 1947ء کو سندھ لیگ اسمبلی پارٹی کا اجلاس شام کو قائداعظم جناح کی جائے سکونت پر منعقد ہوا۔ قائداعظم نے اس اجلاس میں شرکت کی۔ پارٹی نے متفقہ طور پر شیخ غلام حسین ہدایت اللہ کو پارٹی کا لیڈر اور ایوب کھوڑو کو ڈپٹی لیڈر منتخب کرلیا۔ نئی وزارت سابق وزراء پر ہی مشتمل تھی۔ وزیراعلیٰ شیخ غلام حسین ہدایت اللہ فنانس اور سروسز کا انچارج تھا۔ میر بندے علی تالپور کے پاس لا اینڈ آرڈر کا محکمہ تھا۔ میر غلام علی تالپور کے پاس صنعت، خوراک اور محنت کے محکمے تھے۔ پیرزادہ عبدالستار مالیہ، جنگلات اور محصولات کا انچارج تھا۔ پیر الٰہی بخش پر تعلیم اور لوکل سیلف گورنمنٹ کی ذمہ داری تھی اور ایوب کھوڑو حسب سابق تعمیرات عامہ کا وزیر تھا۔ پارٹی کی اسی میٹنگ میں ہاشم گزدر کو سیکرٹری منتخب کیا گیا اور کابینہ کو مشورے دینے کے لئے پانچ ارکان کی مشاورتی کمیٹی کی بھی تشکیل ہوئی تھی یہ سب کچھ متفقہ طور پر ہوا تھا کیونکہ کسی کو قائداعظم جناح کے سامنے اونچا سانس لینے کی بھی جرأت نہیں تھی۔

سندھ کے سارے لیگی لیڈروں کو معلوم تھا کہ جب اکتوبر 1946ء میں مسلم لیگ نے مرکز کی عبوری حکومت میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا تھا تو مرکزی وزراء کی نامزدگی قائداعظم نے کی تھی۔ انہوں نے اس سلسلے میں کسی سے مشورہ نہیں کیا تھا۔ جب وائسرائے ہاؤس سے لیگی وزراء کے ناموں کا اعلان ہوا تھا تو خواجہ ناظم الدین اور نواب اسمٰعیل جیسے جغادری مسلم لیگی ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے تھے لیکن ان میں سے کسی کو اپنی مایوسی کا اظہار کرنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ سندھ کے سارے لیگی لیڈروں کو یہ بھی معلوم تھا کہ جی۔ایم۔سید نے 45-1944ء میں قائداعظم کی حکم عدولی کی تھی تو دسمبر 1945ء میں اس کی سیاسی موت واقع ہوگئی تھی اور اب دسمبر 1946ء کے انتخابات میں اس کی سیاسی تدفین کی آخری رسم ادا ہوگئی تھی۔ سب کو یہ بھی پتہ تھا کہ 1946ء کے اوائل میں ملک سر فیروز خان نون پنجاب لیگ اسمبلی پارٹی کا قائد بننا چاہتا تھا مگر جب شیلانگ (آسام) سے قائداعظم نے بذریعہ ٹیلی فون نواب ممدوٹ کے حق میں فیصلہ صادر کیا تھا تو نون کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ وہ قیادت کی امیدواری سے دستبردار ہوکر اس عہدہ کے لئے خود نواب ممدوٹ کا نام تجویز کرے۔

اس پس منظر میں ایوب کھوڑو یا کوئی اور مائی کا لال قائداعظم کے انتخاب سے اختلاف نہیں کرسکتا تھا۔ پارٹی کے اجلاس میں اس انتخاب سے قبل قائداعظم نے جو تقریر کی تھی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ''میں نے پچھلے آٹھ دس دنوں میں ہر طبقہ کے لوگوں سے ملاقات کی۔ ملت کے ہر بہی خواہ کی یہی خواہش تھی کہ سندھ لیگ پارٹی کی صفوں میں کامل یک جہتی، تعاون اور خوشگواری کے مراسم رہیں۔ میں نے لیگ پارٹی کے ارکان سے تبادلۂ خیالات کیا اس کے بعد سندھ لیگ اسمبلی پارٹی کی قیادت کے لئے کوئی مقابلہ نہ رہا۔ ان حالات میں پارٹی کے سامنے صرف یہی صورت حال باقی رہ گئی تھی کہ وہ شیخ غلام حسین ہدایت اللہ کو پارٹی کا لیڈر اور مسٹر ایم۔ اے۔ کھوڑو کو ڈپٹی لیڈر منتخب کرے۔'' انڈین نیشنل کانگرس میں بھی بے چاری ''جمہوریت بیگم'' کی یہی حالت تھی۔ ابوالکلام آزاد کے بیان کے مطابق جولائی 1946ء میں سردار پٹیل کانگرس کا صدر بننا چاہتا تھا لیکن جب باپو جی گاندھی نے اپنا فیصلہ جواہر لال نہرو کے حق میں صادر کر دیا تو سردار پٹیل یا کسی اور مائی کے لال کو ''مہاتما جی'' کے اس انتخاب سے اختلاف کی جرأت نہ ہوئی اور نہرو متفقہ طور پر صدر منتخب ہو گیا۔

لیگ اور وزارت کی جانب سے مسلمانوں کے حق میں اصلاحات اور ہندو۔ مسلم تضاد میں شدت

لیگ اسمبلی پارٹی کے متذکرہ اجلاس میں کابینہ کے لئے ایک آٹھ نکاتی پروگرام پر عمل درآمد کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ اس پروگرام کے اہم نکات یہ تھے کہ صوبہ میں لازمی پرائمری تعلیم دی جائے گی۔ کسانوں کی شکایات کے ازالہ کے لئے مؤثر اقدام کئے جائیں گے۔ بلیک مارکیٹ اور رشوت ستانی کا ازالہ کیا جائے گا، ساہوکاروں پر کنٹرول کیا جائے گا اور سندھ یونیورسٹی بل اسمبلی کے پہلے اجلاس میں منظور کیا جائے گا۔ تاہم اس وزارت کے قیام کے تھوڑے ہی دن بعد کراچی کی بندرگاہ کی گودیوں میں کام کرنے والے قلیوں نے اپنی اجرتوں میں اضافہ کے لئے ہڑتال کر دی۔ یہ ہڑتال چند دن بعد اس وقت ختم ہوئی جبکہ صوبائی وزیر اعلیٰ نے ہڑتالیوں کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا کہ آئندہ دن کے وقت کام کرنے کا معاوضہ 3 روپے 2 آنے یومیہ اور رات کے وقت کام کرنے کا 3 روپے 12 آنے یومیہ ملا کرے گا۔ اس ہڑتال کے خاتمہ کے چند دن بعد

30رجنوری کوکراچی کے کارخانوں میں کام کرنے والے کوئی چار ہزار مزدوروں نے ہڑتال کردی اور وہ اوزار ہاتھوں میں لئے سندھ سیکرٹریٹ کی طرف چل پڑے مگر پولیس نے ان مظاہرین کوسیکرٹریٹ کی حدود میں داخل ہونے سے روک دیا۔

18رفروری کونئی سندھ اسمبلی کا بجٹ سیشن شروع ہونے سے پہلے لیگ اسمبلی پارٹی کا ایک اور اجلاس ہوا جس میں پارٹی کے آٹھ نکاتی پروگرام کے بارے میں اہم فیصلے کئے گئے۔ قائداعظم جناح نے بھی اس اجلاس میں شرکت کی۔ ان اہم فیصلوں میں سے ایک فیصلہ یہ تھا کہ غیر جانبدار ماہرین کی ایک کمیٹی قائم کی جائے گی جو کاشتکاروں کے حالات اور شکایات معلوم کرے گی۔ اس کمیٹی کی رپورٹ یکم جولائی 1947ء سے پہلے کے اجلاس میں پیش کردی جائے گی۔ اس کمیٹی میں سر راجر تھامس (Roger Thomas) (چیئرمین) مسٹر۔ مسعود۔ آئی۔ سی ایس اور مسٹر صدیقی شامل کئے گئے تھے۔ اس سلسلے میں یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ جن مسلمان کسانوں نے زمینیں خریدنے کی درخواست کی ہے انہیں زمینیں دی جائیں اور ان زمینوں پر انہیں حقوق ملکیت بھی دیئے جائیں۔ وزیر مال سے درخواست کی گئی کہ وہ اس سلسلے میں پنجاب کا 1935ء میں منظور کردہ قانون انتقال اراضی پیش نظر رکھتے ہوئے ایک بل تیار کریں جس کو سندھ اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں پیش کیا جائے گا۔

28رفروری کو اسمبلی کے بجٹ سیشن کے دوران سندھ یونیورسٹی بل پانچ دن کی گرما گرم بحث کے بعد منظور کرلیا گیا۔ کانگرس پارٹی بطور احتجاج اس لئے واک آوٹ کرگئی کہ ایوان نے حکومت کی یہ ترمیم منظور کرلی تھی کہ کوئی تعلیمی ادارہ صوبہ سندھ سے باہر کسی یونیورسٹی سے الحاق کا مجاز نہیں ہوگا۔ کانگرسی ارکان کے لئے یہ ترمیم کسی صورت قابل قبول نہیں تھی۔ کانگرس کو بل کی اس شق پر بھی اعتراض تھا کہ یونیورسٹی سینیٹ میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی۔ وزیراعلیٰ سر غلام حسین ہدایت اللہ نے اس اعتراض کے جواب میں کہا کہ ''ہندو ارکان اسمبلی کی طرف سے اس اہم بل کی مخالفت کی وجہ محض مسلم دشمنی کا جذبہ ہے...... یہ کوشش ہورہی ہے کہ صوبہ سندھ کی مسلم اکثریت کو کوئی فائدہ نہ پہنچ سکے...... اگر مسلم اکثریت کو یونیورسٹی سینیٹ میں زیادہ نمائندگی دی جائے تو اس میں کیا نقصان ہوتا ہے کیونکہ یہ مسلم اکثریت کا صوبہ ہے...... مسلمانوں کو تو یہ حق ملنا چاہیے کہ وہ یونیورسٹی کے انتظام میں زیادہ اثر قائم رکھیں۔''[21]

21/مارچ کووزیراعلیٰ سرغلام حسین نے صوبائی اسمبلی میں اعلان کیا کہ ''آئندہ صوبہ میں سرکاری ملازمتوں میں تناسب آبادی کے لحاظ سے ہر قوم کو ملازمت دی جائے گی۔ نئے تناسب کے مطابق مسلمانوں کو 70 فیصدی اور غیر مسلموں کو 30 فیصدی ملازمتیں دی جائیں گی۔ قبل ازیں مسلمانوں کو صرف 60 فیصدی ملتا تھا۔'' اسی دن سندھ لیگ اسمبلی پارٹی نے ایک سب کمیٹی بنائی جس کے ذمہ یہ کام لگایا گیا کہ وہ ''آزاد وخود مختار'' سندھ کا آئین بنائے گی۔ اس سب کمیٹی میں صوبہ کے تمام وزراء کے علاوہ ہاشم گزدر اور قاضی فضل اللہ بھی شامل تھے اور اسے یہ اختیار دے دیا گیا تھا کہ وہ پبلک میں سے ایسے چھ ارکان کو بھی شامل کر لے جنہیں آئین سازی کا تجربہ ہو اور یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ دو ماہ تک اسمبلی پارٹی کو اپنی رپورٹ پیش کر دے۔''[22]

24/مارچ کو کراچی میں یوم پاکستان کی تقریب پر ایک پبلک جلسہ میں صوبہ لیگ کے صدر یوسف ہارون نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ سندھ کو آزاد وخود مختار صوبہ بنانے اور مزید اختیارات حاصل کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔

سندھ لیگ اسمبلی کی جانب سے ''آزاد وخود مختار'' سندھ کے آئین کی تشکیل کے لئے سب کمیٹی کی تشکیل اور صدر صوبہ لیگ یوسف ہارون کی طرف سے سندھ کو ''آزاد وخود مختار'' صوبہ بنانے اور مزید اختیارات حاصل کرنے کے لئے تیار رہنے کی اپیل کی وجہ یہ تھی کہ برطانیہ کے وزیر اعظم ایٹلی کے 20/فروری 1947ء کے اعلان کے مطابق نیا وائسرائے ماؤنٹ بیٹن (Mountbatten) ہندوستان پہنچ گیا تھا اور اس کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ جون 1948ء تک سیاسی اقتدار ہندوستانیوں کے سپرد کر دے۔ چونکہ قبل ازیں مارچ 1942ء میں سرسٹیفورڈ کرپس کے پلان اور مئی 1946ء میں لارڈ پیتھک لارنس کے وزارتی مشن کے پلان اور دسمبر 1946ء میں وائسرائے ویول کے منصوبے میں یہ گنجائش موجود تھی کہ ہندوستان کے صوبے ''آزاد وخود مختار'' ریاستوں کی حیثیت اختیار کر سکیں گے۔ اس لئے پنجاب اور سندھ کے مسلم جاگیرداروں کو یہ غلط فہمی تھی کہ برطانیہ کی برصغیر سے دستبرداری کے بعد وہ اپنی آزاد وخود مختار جاگیری ریاستیں قائم کر سکیں گے لیکن مارچ کے اواخر میں جناح نے آزاد وخود مختار سندھ کی تجویز مسترد کر دی اور سندھی لیڈروں کو ہدایت کی کہ وہ اپنی آزاد وخود مختار ریاست کے لئے کوئی آئین سازی نہ کریں۔ جناح ایک متحد اور طاقتور پاکستان کے متمنی تھے۔[23]

2/اپریل کو سندھ اسمبلی نے ''دیہی قرضوں اور انتقال اراضی'' کا بل منظور کر لیا۔ کانگرس پارٹی اس موقع پر ایوان سے غیر حاضر رہی کیونکہ اس بل میں ساہوکاروں کے نام زمین کی منتقلی پر کچھ پابندی عائد کی گئی تھی۔ کانگرس پارٹی اس بل کی منظوری سے اس قدر ناراض تھی کہ ایک ممتاز لیڈر رنچل داس وزیرانی نے 11/اپریل کو صوبائی گورنر سے ملاقات کر کے درخواست کی کہ وہ اس بل کی منظوری نہ دے کیونکہ اس سے صرف ہندوؤں کو نقصان پہنچے گا مگر گورنر نے اس کی یہ درخواست منظور کرنے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ یہ بل غریب، ان پڑھ اور بے شعور عوام کو صدیوں کی بے انصافی سے نجات دلانے کے لئے منظور کیا گیا ہے۔ یہ بل کاشت کاروں کے لئے بے حد اہمیت رکھتا ہے اور یہ بات نا قابل فہم ہے کہ اس سے صرف ہندوؤں کو نقصان پہنچے گا۔ جب وزیرانی گورنر سے مایوس ہو کر واپس آیا تو سندھ ہندو مہاسبھا کے ممتاز لیڈر شام داس گڈوانی نے ایک بیان میں کانگرسی ارکان اسمبلی سے مطالبہ کیا کہ وہ اسمبلی کی رکنیت سے مستعفی ہو جائیں کیونکہ ہندو رائے دہندگان کی جانب سے ان پر جو فرض عائد ہوتا ہے وہ اس کی ادائیگی میں نا کام رہے ہیں اور اب انہیں ہندوؤں کا اعتماد حاصل نہیں رہا۔ [24]

23/اپریل کو کراچی میں سندھ کے ہندوؤں کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں فیصلہ کیا گیا کہ سندھ کی مسلم لیگی حکومت جو سندھ یونیورسٹی قائم کر رہی ہے اس کا بائیکاٹ کیا جائے گا کیونکہ اس یونیورسٹی کے سینیٹ اور دوسرے ملحقہ اداروں میں اکثریتی فرقہ کو قانونی طور پر زیادہ نمائندگی دی گئی ہے۔ کانفرنس میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں ہندو گریجویٹوں سے کہا گیا کہ وہ مجوزہ یونیورسٹی کی فیلوشپ قبول نہ کریں اور ایک اور قرارداد میں طے کیا گیا کہ ایک وفد بمبئی، بنارس اور دہلی بھیجا جائے گا جو وہاں کی یونیورسٹیوں سے یہ کہے گا کہ وہ اپنے اپنے دستور میں تبدیلی کر کے سندھ کے تعلیمی اداروں کا اپنے ساتھ الحاق کریں اور چوتھی قرارداد میں صوبائی گورنر سے مطالبہ کیا گیا کہ سندھ اسمبلی نے حال ہی میں جو سندھ لینڈ ہولڈرز مارٹگیجز بل (Landholders Mortgages Bill) منظور کیا ہے اسے مسترد کر دیا جائے۔ اسی دن صوبائی حکومت نے سندھ کے ایک سابق ہندو وزیر ڈاکٹر ہیمنداس وڈوانی کو اپنا اعزازی مشیر مقرر کیا اور یہ طے کیا کہ حکومت اقلیتی مفادات سے متعلقہ متنازعہ امور کے بارے میں ڈاکٹر ہیمنداس سے مشورہ کرتی رہے گی۔ ڈاکٹر ہیمنداس نے یہ ذمہ داری قبول کر لی اور اس نے ایک انٹرویو میں سندھ سے ہندوؤں کے

اخراج کی مخالفت کی کیونکہ اس کی رائے میں ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے کہا کہ ''چونکہ کانگرس کی مرکزی اور صوبائی قیادت سندھی ہندوؤں کے مفادات کا تحفظ نہیں کر سکے گی اس لئے سندھی ہندوؤں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ صوبہ کی لیگی وزارت سے تعاون کریں...... ڈاکٹر ہیمند اس نے امید ظاہر کی کہ لینڈ مارٹگیجز بل میں مناسب ترمیم کردی جائے گی۔''[25]

''سندھ آزاد ہوگا یا پاکستان میں یا ہندوستان میں شامل ہوگا؟''...... مسلم اور ہندو رہنماؤں کے مابین کشمکش

24/اپریل کو نئی دہلی سے ایک خبر شائع ہوئی کہ ''سندھ کے مسلم لیگی بنگال کے مسلم لیگیوں کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ ہندوستان کے سارے مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل پاکستان کی ایک واحد ریاست کی تشکیل نہ کی جائے۔ سندھ کے سابق وزیر اعلیٰ اللہ بخش مرحوم کا بیٹا رحیم بخش اس سلسلہ میں جناح سے یہ مطالبہ کر چکا ہے کہ سندھ کو ایک الگ آزاد ریاست کا درجہ ملنا چاہیے اور یہ آزادی ہونی چاہیے کہ وہ ہندوستان یونین یا پنجاب کے ساتھ معاہداتی تعلقات قائم کرے۔ اس مسئلہ پر دستور ساز اسمبلی کے لئے مسلم لیگی نمائندوں کی کانفرنس میں غور ہوگا جو عنقریب لاہور میں منعقد ہو رہی ہے۔''[26] اس خبر کی بنیاد محض ہندو پریس کی لیگ دشمنی یا پاکستان دشمنی پر نہیں تھی۔ یہ بات صحیح ہے کہ رحیم بخش نے مارچ کے اواخر میں سندھ لیگ اسمبلی کی 21/مارچ کی قرارداد کے مطابق قائداعظم جناح سے ملاقات کر کے اُن سے اس مسئلہ پر بات چیت کی تھی۔

اپریل میں قائداعظم جناح کی وائسرائے ماؤنٹ بیٹن سے بات چیت کے دوران متحدہ بنگال کی ایک آزاد و خود مختار ریاست کی تجویز زیر بحث آئی تھی اور جناح نے اس کی مخالفت نہیں کی تھی بلکہ انہوں نے بعد میں بنگال کے مسلم لیگی لیڈر سید حسین شہید سہروردی کو یہ اجازت دی تھی کہ وہ سرت چندر بوس کے ساتھ مل کر اس مقصد کے لئے مہم چلائے۔☆ چونکہ سندھ کے بیشتر مسلمان لیڈروں کو پنجابیوں کے غلبہ کا خدشہ لاحق رہتا تھا اس لئے ان کی خواہش و کوشش یہ تھی کہ سندھ کو بھی بنگال کی طرح آزادی و خود مختاری کا حق ملنا چاہیے۔ پنجابیوں کے غلبہ کا خدشہ صرف جی۔ ایم۔ سید یا اس کے مٹھی بھر ساتھیوں کو ہی نہیں تھا بلکہ بہت سے سندھی مسلم زعما اس خدشہ میں

☆ تفصیل کے لیے دیکھئے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ۔ پاکستان کیسے بنا؟ ص ص 441,30 جلد دوم ایڈیشن سوم

مبتلا تھے۔فرق صرف یہ تھا کہ سید نے 1945ء کے بعد اس خدشہ کا کھلم کھلا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا جبکہ دوسرے مسلم لیگی لیڈر اپنی وقتی سیاسی مصلحتوں کے باعث اس مسئلہ پر لب کشائی نہیں کر سکتے تھے لیکن مئی کے دوسرے ہفتے میں صوبوں کی آزادی وخود مختاری کی تجویز دفن ہوگئی جبکہ شملہ میں ماؤنٹ بیٹن اور جواہر لال نہرو کے درمیان یہ سمجھوتہ ہوگیا کہ ہندوستان کو کسی صورت میں بھی دو سے زیادہ حصوں میں تقسیم نہیں کیا جائے گا۔☆

اس سمجھوتے کے بعد پاکستان کی ایک واحد ریاست کا قیام یقینی نظر آنے لگا تو سندھ کے وزیر ترقیات پیر زادہ عبدالستار نے 23رمئی کو ایک بیان میں کہا کہ ''اب پاکستان کا حصول تقریباً یقینی ہوگیا ہے۔ہمیں اقتدار لینے کے لئے ہر ممکن طریقے سے تیار رہنا چاہیے......سندھ ہندوستان میں باب الاسلام رہا ہے اب یہ باب الپاکستان بھی ہوگا۔سندھ پہلا صوبہ تھا جس نے پاکستان کی قرارداد منظور کی تھی اور یہ پہلا صوبہ ہوگا جو اپنے کو پاکستان کی عظیم اسلامی ریاست کا ایک یونٹ ہونے کا اعلان کرے گا......اسلام کے دشمنوں اور انتشار پسندوں نے حال ہی میں آزاد وخود مختار صوبوں کا نعرہ لگانا شروع کیا ہے۔ان کا نعرہ ہندوستان میں اسلامی اتحاد کو تباہ کرنے کی آخری امید کی حیثیت رکھتا ہے۔عصر حاضر میں سرحد اور سندھ جیسے صوبوں کے لئے آزاد وخود مختار ریاستوں کی حیثیت سے زندہ رہنا ممکن نہیں......کہا جاتا ہے کہ سندھ سے دستور ساز اسمبلی کے ایک ہندو رکن جے رام داس دولت رام اور بعض دوسرے لوگوں نے ایک میمورنڈم پیش کیا ہے جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ سندھ کو پاکستان کے بجائے ہندوستان سے منسلک کیا جائے۔یہ میمورنڈم دراصل سندھ کی 27 فیصدی ہندو اقلیت کی جانب سے صوبہ پر اپنی خواہش ٹھونسنے کے مترادف ہے اور یہ ایک لغو کوشش ہے۔سندھی اور غیر سندھی یا ملکی اور غیر ملکی کے نعرے سے بھی کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا......جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ہم مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کا کشادہ دلی سے خیر مقدم کرتے ہیں۔پاکستان ان کا بھی ایسا ہی وطن ہے جیسا کہ ہمارا ہے۔''[27]

جب پیر زادہ عبدالستار نے یہ بیان دیا تھا تو اس وقت وائسرائے ماؤنٹ بیٹن برصغیر کی تقسیم کے بارے میں حکومت برطانیہ کی آخری منظوری لینے کے لئے لندن گیا ہوا تھا۔اس تقسیم کا فیصلہ 10رمئی کو شملہ میں ماؤنٹ بیٹن اور جواہر لال نہرو کے درمیان خفیہ بات چیت کے دوران ہوا تھا

☆ تفصیل کے لیے دیکھئے۔پاکستان کی سیاسی تاریخ۔پاکستان کیسے بنا؟ ص ص 62, 463 جلد دوم ایڈیشن سوم

اور یہ بھی طے ہو گیا تھا کہ کونسا علاقہ کس ڈومینین میں شامل ہوگا۔

26رمئی کو سندھ کانگرس اسمبلی پارٹی کے لیڈر پروفیسر گھنشام اور ڈپٹی لیڈر نچل داس وزیرانی یکا یک ہندو مہا سبھا کی ایک ذیلی تنظیم سروا سندھ ہندو پنچایت میں شامل ہو گئے۔ اس پر صوبائی کانگرس کے ایک ممتاز لیڈر آر۔ کے۔ سدھوا کو سخت افسوس ہوا۔ اس کی رائے تھی کہ ان ہندو لیڈروں کا یہ اقدام سندھ میں کانگرسیوں کی شکست خوردہ ذہنیت کا مظہر ہے۔[28] 27رمئی کو سندھ کا وزیر تعلیم پیر الٰہی بخش حیدر آباد (دکن) گیا اور وہاں اس نے ایک اخباری انٹرویو میں کہا کہ ''پاکستان کے ترکیبی یونٹوں کے اندرونی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں ہوگی۔ بعض امور مثلاً فوج اور خارجی معلاملات پاکستان کی مرکزی حکومت کو دیئے جائیں گے لیکن یہ سارے مسائل پاکستان کی الگ دستور ساز اسمبلی میں طے کئے جائیں گے اور یہ اسمبلی عنقریب معرض وجود میں آجائے گی۔ اس نے امید ظاہر کی کہ کراچی پاکستان کا دارالحکومت ہوگا اور دستور ساز اسمبلی بھی اسی شہر میں ہو گی۔''[29] پیر الٰہی بخش نے مزید کہا کہ ''سندھ کی نئی یونیورسٹی حیدر آباد (دکن) کی عثمانیہ یونیورسٹی کے خطوط پر قائم ہوگی۔ اس کا ذریعۂ تعلیم اردو ہوگا اور انگریزی ثانوی زبان کی حیثیت سے لازمی ہو گی۔ اس نے کہا کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کافی عرصے سے ذریعۂ تعلیم بنی ہوئی ہے۔ میں اپنے یہاں قیام کے دوران دیکھوں گا کہ اس ادارے نے یہ کام کس طرح سرانجام دیا ہے۔''[30]

2رجون کو یعنی برصغیر کی تقسیم کے اعلان سے ایک دن پہلے، سندھ یونیورسٹی ایکٹ نافذ کر دیا گیا اور سرکاری طور پر اعلان کیا گیا کہ اب سندھ کے سارے تعلیمی اداروں کا صوبہ سے باہر کی کسی یونیورسٹی کے کوئی الحاق نہیں رہا۔ حکومت نے پرائمری سکولوں میں اردو کو لازمی مضمون قرار دینے کا بھی فیصلہ کیا ہے تاہم سندھی زبان کی تعلیم بدستور جاری رہے گی۔ یونیورسٹی کے چانسلر سرفرانسس موڈی نے یونیورسٹی سینیٹ کے 50 ارکان نامزد کئے ہیں جن میں سے 35 مسلمان اور 15 غیر مسلم ہوں گے۔ تاہم 5رجون کو کراچی کے شہریوں کی کمیٹی کے چیئرمین درگا داس اڈوانی نے سندھ کے غیر مسلموں پر زور دیا کہ وہ سندھ یونیورسٹی کا بائیکاٹ کریں۔ سندھ پروانشل کانگرس کمیٹی کے صدر چوئتھ رام گڈوانی نے بائیکاٹ کی تحریک کی حمایت کی اور کہا کہ اقلیتی فرقوں کے ارکان کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ دل نہ چھوڑیں اور اپنے اس اعتقاد پر پختگی سے قائم رہیں کہ ان کے حقوق ومفادات کو زیادہ دیر تک نقصان نہیں پہنچے گا۔[31] چوئتھ رام گڈوانی کے اس بیان کا بظاہر مطلب یہ تھا کہ

پاکستان زیادہ دیر تک قائم نہیں رہے گا اور سندھ پر دوبارہ ہندوؤں کی بالادستی قائم ہو جائے گی۔

11 رجون کو سندھ کے وزیر تعلیم پیر الٰہی بخش نے نئی دہلی میں ایک بیان کے ذریعے ہندوستان بھر کے مسلمان صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کو دعوت دی کہ وہ کراچی میں آ کر اپنے تجارتی اور صنعتی ادارے قائم کریں۔ ''حکومت سندھ نے نئے کارخانوں کی عمارتوں کی تعمیر کے لئے ایک اسٹیٹ ٹریڈنگ بورڈ قائم کر دیا ہے۔ جو مسلمان سرمایہ دار کراچی آئیں گے انہیں ہر قسم کی سہولتیں مہیا ہوں گی۔ انہیں کوئی مشکل درپیش نہیں ہو گی۔ انہیں صرف یہی کرنا ہو گا کہ وہ عمارتوں کا قبضہ لے کر ان میں اپنے کارخانے شروع کر دیں...... اگر صنعت کار اپنی عمارتیں بنانا چاہیں گے تو حکومت انہیں ہر قسم کا خام مال مہیا کرے گی۔ حکومت سندھ نے مزدوروں کے لئے مکانات تعمیر کرنے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔''[32] 14 رجون کو نئی دہلی میں مسلم لیگی حلقوں نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ پاکستان مغربی پنجاب، سندھ، بلوچستان، سرحد اور مشرقی بنگال کی خود مختار ریاستوں کا وفاق ہو گا۔ اس وفاق کے یونٹوں کو سارے داخلی معاملات پر مکمل اختیار حاصل ہو گا۔ صرف خارجہ امور اور سارے پاکستان پر اثر انداز ہونے والے دوسرے امور کے بارے میں اشتراک عمل ہو گا۔[33]

لیکن سندھ کے ہندوؤں کی نظر میں نئی دہلی سے جاری کردہ پیر الٰہی بخش اور مسلم لیگی حلقوں کے اس قسم کے بیانات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ انہوں نے برصغیر کی تقسیم کے بارے میں حکومت برطانیہ کے 3 رجون کے اعلان کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ ان کے سندھ کالجیٹ بورڈ کی 16 رجون کی قرارداد یہ تھی کہ ان کے سارے کالجوں کا بمبئی یونیورسٹی کے ساتھ الحاق بدستور قائم رہے گا۔ اس پر صوبائی وزیر تعلیم پیر الٰہی بخش کا ردعمل یہ تھا کہ جو تعلیمی ادارے بمبئی یونیورسٹی سے ملحق رہیں گے انہیں کوئی سرکاری گرانٹ نہیں دی جائے گی اور جو طلباء ان اداروں میں تعلیم حاصل کریں گے انہیں کوئی سرکاری وظیفہ نہیں ملے گا۔ حکومت نے ان اداروں کو جو سرکاری زمین دے رکھی ہے وہ ان سے لے لی جائے گی۔ جو طلباء ان اداروں سے تعلیم حاصل کریں گے انہیں گورنمنٹ میڈیکل، ایگریکلچرل اور انجینئرنگ کالجوں میں داخلہ نہیں ملے گا اور انہیں سرکاری ملازمتیں بھی نہیں دی جائیں گی اور جو اساتذہ ایسے سکولوں میں پڑھائیں گے جن کا الحاق سندھ یونیورسٹی سے نہیں ہو گا انہیں حال ہی میں قائم شدہ ٹیچرز ٹریننگ کالج میں داخلہ نہیں ملے گا۔[34] سندھ کالجیٹ بورڈ کی اس قرارداد سے دو دن قبل آل انڈیا کانگرس کمیٹی برصغیر کی تقسیم کے منصوبے کو

منظور کر چکی تھی۔ اس منصوبے کے تحت یہ فیصلہ ہوا تھا کہ برصغیر میں پاکستان اور ہندوستان کی دو خودمختار ڈومینین (Dominions) قائم ہوں گی۔ لہٰذا سندھ کا لجیٹ بورڈ کی اس قرارداد پر عمل درآمد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

سندھ اسمبلی کا پاکستان کے حق میں فیصلہ اور لیگی رہنماؤں کی جانب سے اقلیتوں کے تحفظ کی یقین دہانی

23 رجون کو کراچی میں یوسف ہارون کی زیرصدارت سندھ مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس میں مرکزی لیگ کے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا گیا جس کے تحت اس نے 10 رجون کو برصغیر کی تقسیم کے بارے میں حکومت برطانیہ کے 3 رجون کے منصوبے کو منظور کیا تھا۔ صوبائی کونسل نے اس سلسلے میں جو قرارداد منظور کی اس میں سندھ اسمبلی کے مسلم ارکان کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ سندھ کی پاکستان دستور ساز اسمبلی میں شمولیت کے حق میں ووٹ دیں۔ یہ قرارداد آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن ایوب کھوڑو نے پیش کی۔ اس نے اپنی تقریر میں یقین ظاہر کیا کہ سندھ کے مسلمانوں کو پاکستان میں شامل ہونے سے بہت فائدہ ہوگا اور ان کا مستقبل روشن ہوگا بالخصوص جب کراچی پاکستان کا دارالحکومت بن جائے گا۔ یہ قرارداد متفقہ طور پر منظور ہوئی تو اس کے بعد صوبائی اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر بدرالدین نے ایک قرارداد پیش کی جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ حکومت پاکستان سوشلسٹ اصولوں پر قائم ہونی چاہیے۔ اس قرارداد پر بڑی گرما گرم بحث ہوئی جس کے دوران ایوب کھوڑو نے کہا کہ ابھی پاکستان دستور ساز اسمبلی وجود میں نہیں آئی اس لئے ایک ایسے ادارے کو اس قسم کا مشورہ کیسے دیا جا سکتا ہے جس کا ابھی تک وجود ہی نہیں ہے۔ کھوڑو کی اس تقریر کے بعد بدرالدین کی قرارداد پر بحث غیر معین عرصہ کے لئے ملتوی کر دی گئی۔ کونسل کے اجلاس کے آخر میں سندھ کے مختلف اضلاع کے غریب کسانوں میں بے چینی کے مسئلہ پر غور کیا گیا اور لیگ وزارت کو ہدایت کی گئی کہ وہ اس سلسلے میں بلا تاخیر قانون سازی کا کام سرانجام دے۔''[35]

صوبائی کونسل کی اس میٹنگ کے فوراً بعد وزیر اعلیٰ غلام حسین ہدایت اللہ نے اپنے ایک بیان میں پہلے تو اس یقین کا اظہار کیا کہ پاکستان کے معاشی لحاظ سے ترقی کرنے کے قوی امکانات موجود ہیں اور پھر سندھی ہندوؤں سے اپیل کی گئی کہ وہ لیگ کی حکومت سے تعاون

کریں۔اس نے ان شرانگیز افواہوں کی تردید کی کہ صوبائی حکومت ہندوؤں کی جائیدادوں پر قبضہ کرنے کی تجویز پرغور کررہی ہے اور یہ کہ انہیں فرقہ وارانہ بدامنی کا شکار ہونا پڑے گا۔اس نے کہا کہ جو لوگ اس قسم کی ڈراؤنی افواہیں پھیلا رہے ہیں ان کا رویہ نہایت افسوس ناک اور غیر ذمہ دارانہ ہے۔ 25رجون کوصوبائی وزیر ترقیات پیرزادہ عبدالستار نے بھی ایک بیان میں کہا کہ پاکستان مسلمانوں اور ہندوؤں کا مشترکہ ورثہ ہے اور اس ملک میں اقلیتوں کا پوری طرح تحفظ کیا جائے گا۔اس نے کہا کہ سندھ اس حقیقت پر فخر کرسکتا ہے کہ یہاں صدیوں سے فرقہ وارانہ ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور اب حال ہی میں صرف ہمارا ہی ایک ایسا صوبہ ہے جس میں کوئی فرقہ وارانہ بدامنی نہیں ہوئی ہے...... پاکستان میں سندھیوں کے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے رجحان کو تقویت ملے گی۔سندھی ہندوؤں کو یہاں سے کسی اور جگہ جانے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔''

26رجون کو سندھ اسمبلی نے ایک قرارداد میں فیصلہ کیا کہ سندھ پاکستان کی نئی آئین ساز اسمبلی میں شامل ہوگا۔ 33 ووٹ قرارداد کے حق میں اور 20 ووٹ خلاف تھے۔ کانگرسی ارکان نے قرارداد کی مخالفت کی تھی ۔دوقوم پرست مسلمان غیر جانب دار رہے اور تین یورپی ارکان نے رائے شماری میں حصہ نہیں لیا۔اس طرح سندھ نے واضح اکثریت کے ساتھ پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کیا۔

وزیر اعلیٰ غلام حسین ہدایت اللہ اور وزیر ترقیات پیرزادہ عبدالستار کی یقین دہانیوں کا کانگرس کے ہندو لیڈروں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ پاکستان میں مسلمانوں کے ساتھ اشتراک عمل، تعاون اور ہم آہنگی پر آمادہ نہیں تھے۔انہوں نے اپنی معاشرتی تنگ نظری اور سیاسی کوتاہ اندیشی کا مظاہرہ 27رجون کو کیا جب کہ انہوں نے اپنے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ سرحد، پنجاب، بلوچستان اور سندھ کی اقلیتوں کے لئے کراچی میں الگ یونیورسٹی قائم کی جائے گی۔ یہ فیصلہ کرنے والوں میں صوبائی کانگرسی لیڈر پروفیسر گھنشام بھی شامل تھا اور تخمینہ تھا کہ اس منصوبہ پر تقریباً 25 لاکھ روپے خرچ ہوں گے۔اس فیصلے کی وجہ یہ تھی کہ جب جون کے تیسرے ہفتے میں نئی سندھ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تھا تو بمبئی یونیورسٹی کے چانسلر نے مبارک باد کا پیغام بھیجا تھا جس سے سندھ کے کانگرسیوں اور دوسرے ہندوؤں کو یہ یقین ہوگیا تھا کہ انہوں نے سندھ میں اپنے جو تعلیمی ادارے قائم کرر کھے ہیں آئندہ ان کا بمبئی یونیورسٹی سے الحاق نہیں ہوسکے گا لہٰذا انہیں مسلم لیگی حکومت کی

قائم کردہ نئی سندھ یونیورسٹی سے الگ ایک ہندو یونیورسٹی کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ تاہم مسلم لیگی زعما کی طرف سے سندھی ہندوؤں کے خدشات دور کرنے اور ان کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش جاری رہی۔

17 رجولائی کو وزیر اعلیٰ غلام حسین ہدایت اللہ اور وزیر تعلیم پیر الٰہی بخش نے اپنی تقریروں میں قائداعظم جناح کی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے یقین دلایا کہ سندھ میں اقلیتوں کے حقوق کی پوری پوری نگہداشت کی جائے گی...... ان کے جان و مال کی حفاظت آج تک کی جاتی رہی ہے اور آئندہ بھی حفاظت کی جائے گی۔ 28 رجولائی کو صدر صوبہ لیگ یوسف ہارون نے ایک اپیل ہندوؤں اور غیر مسلموں کے نام جاری کی جس میں ان سے التماس کی کہ 15 راگست کو مسلم قوم جو تقریب سعید منا رہی ہے اس میں غیر مسلم بھی حصہ لیں کیونکہ پاکستان اب مسلمانوں اور ہندوؤں کا مشترکہ وطن بن چکا ہے۔[36] آل انڈیا ہندو پنچایت کے صدر مکھی گوبندرام نے بھی گو مسلم لیگی لیڈروں کی ان اپیلوں کا قدرے مثبت جواب دیا لیکن نچل داس وزیرانی اور متعدد دوسرے کانگرسی لیڈروں کے علاوہ سید گروپ کے بعض مسلمان لیڈروں کا پاکستان کے خلاف زہرآلود پروپیگنڈا جاری رہا۔

سندھی اور غیر سندھی کا نعرہ، سر غلام حسین کی گورنری کا اعلان اور وزارت اعلیٰ کے لئے لیگی رہنماؤں کی کشمکش

کانگرسی رہنماؤں اور سید گروپ نے اپنے معاندانہ پروپیگنڈے میں آخری حربے کے طور پر سندھیوں اور غیر سندھیوں کے دیرینہ مسئلہ کو ہوا دینے کی کوشش کی۔ یہ حربہ بہت خطرناک تھا کیونکہ اس وقت تک نہ صرف کراچی، حیدرآباد اور بعض دوسرے شہروں میں بمبئی، کلکتہ، مدراس، حیدرآباد (دکن) لاہور اور چینوٹ سے مسلمان سرمایہ داروں کی آمد شروع ہوگئی تھی بلکہ کراچی کو پاکستان کا دارالحکومت بنانے کی تیاریوں کے سلسلے میں متعدد مسلمان سرکاری افسر اور دوسرے ملازمین بھی آنے شروع ہو گئے تھے اور بعض سرمایہ دار ہندوؤں نے بھی اپنے اہل وعیال کو سندھ سے صوبہ بمبئی کے محفوظ مقامات پر بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ مسلم لیگی زعما اس خطرناک پروپیگنڈے سے خاصے پریشان ہوئے کیونکہ سندھی مسلمانوں کے بعض حلقوں میں اس کا اثر ہو رہا تھا۔

29ر جولائی کو صوبہ لیگ کے صدر یوسف ہارون نے اس سلسلے میں ایک بیان جاری کیا جس میں اس نے سندھی مسلمانوں کو خبردار کیا کہ ''وہ اس منظم پروپیگنڈا سے متاثر نہ ہوں جو چند شر پسندوں کی طرف سے مسلمانوں کی یکجہتی اور اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لئے کیا جارہا ہے۔ یہ شر پسند پاکستان کو نقصان پہنچانے کی خاطر سندھ کے مسلمانوں اور دوسرے صوبوں سے آنے والے مسلمانوں میں نفاق پیدا کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ ہمارے قائداعظم بارہا ہمیں یہ انتباہ کر چکے ہیں کہ ہم کبھی یہ تصور بھی نہ کریں کہ ہم میں سے کوئی پٹھان ہے، کوئی سندھی اور کوئی پنجابی۔ اس کفر پرستی کو کالعدم کرنے کے لئے قائداعظم نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا...... صوبائی تعصب کو کسی صورت برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے بہت ہی تکلیف ہوتی ہے کہ میرے سندھی بھائیوں میں اس قسم کی تشویش پھیل رہی ہے کہ ان پر اجنبی مسلط کئے جارہے ہیں۔ ہم سندھی مسلم جانتے ہیں کہ صدیوں سے ہم زندگی کے ہر شعبے میں اپنے ہندو بھائیوں کے اقتدار تلے دبے رہے۔ اس وقت کسی نے سندھ سندھیوں کا نعرہ نہ لگایا۔ اب جبکہ پاکستان کی فلاح و بہبود کے لئے ہمیں ہر قسم کے اشخاص کی خدمات کی ضرورت ہے اس وقت اس قسم کا پروپیگنڈا شر انگیزی کے سوا اور کچھ نہیں۔''[37]

یوسف ہارون کے اس بیان سے دو تین دن پہلے لیگ ہائی کمان کی طرف سے یہ اعلان کیا جاچکا تھا کہ 14 راگست کو سندھ کا موجودہ گورنر سر فرانسس موڈی مغربی پنجاب کی گورنری کا عہدہ سنبھالے گا اور سندھ میں شیخ غلام حسین ہدایت اللہ گورنر ہوگا۔ اس اعلان کا ایک مقصد متذکرہ زہریلے پروپیگنڈے کے اثر کو زائل کرنا تھا اور یہ بتانا تھا کہ سندھ کا گورنر سندھی ہی ہوگا اور کسی غیر سندھی کو اس عہدے پر مسلط نہیں کیا جائے گا لیکن اس اعلان کے جاری ہوتے ہی لیگ اسمبلی پارٹی میں وزارت اعلیٰ کے لئے مختلف دھڑوں کے درمیان رسہ کشی شروع ہوگئی۔ ایوب کھوڑو کے علاوہ پیرزادہ عبدالستار اور پیر الٰہی بخش بھی اس عہدہ کے امیدوار تھے۔ اقتدار کی اس رسہ کشی میں قائداعظم جناح کا نام بھی استعمال کیا گیا چنانچہ جناح نے نئی دہلی سے ایک بیان میں اس تاثر کو زائل کیا کہ وہ کسی خاص شخص کو سندھ کا وزیر اعلیٰ بنانے کے خواہاں ہیں۔ جناح کا بیان یہ تھا کہ ''سندھ کے ایک وزیر عبدالستار نے مجھے عندالملاقات بتایا ہے کہ سندھ لیگ اسمبلی کے انتخابات کے سلسلے میں میرا نام خواہ مخواہ لیا جارہا ہے اور بتایا جارہا ہے کہ میں کسی خاص شخص کو سندھ لیگ اسمبلی پارٹی کا لیڈر بنانے کا مؤید اور خواہاں ہوں حالانکہ میں نے یہ وضاحت کردی ہے کہ لیڈر

منتخب کرنا خود صوبائی اسمبلی پارٹی کا کام ہے...... مجھے افسوس ہے کہ خواہ مخواہ لوگوں نے اس سلسلہ میں میرا نام لینا ضروری خیال کیا ہے......ایسی تمام افواہیں بے بنیاد ہیں۔''[38]

پیرزادہ عبدالستار کے اس سفر دہلی کا پس منظر یہ تھا کہ یہ شخص سندھ میں سیاسی موقع پرستوں کا بادشاہ تھا۔ 1946ء سے قبل اس کی مسلم لیگ اور مطالبہ پاکستان کے ساتھ وفاداری میں بھی کوئی استواری نہیں تھی۔ یہ ہر اس لیگی یا غیر لیگی دھڑے کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے کے لئے ہمہ وقت آمادہ رہتا تھا جو اسے اقتدار کی کرسی پیش کرتا تھا۔ اسے سیاسی ہوا کا رخ پہچاننے میں بڑی مہارت تھی۔ اسے 2/اپریل 1946ء کو صوبائی کابینہ میں محض اس لئے شامل کیا گیا تھا کہ اسمبلی میں سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت کی حالت پتلی تھی۔ چونکہ اس سے تین چار دن پہلے میر بندے علی خان تالپور، سر غلام حسین کی کمزور پارٹی پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر وزیر بنا تھا، اس لئے اس نے بھی وزیراعلیٰ سر غلام حسین کی کمزور پارٹی پوزیشن سے فائدہ اٹھایا اور سیدھا وزارت کی کرسی پر جا بیٹھا اور اس کے بعد نوائے وقت کی رپورٹ کے مطابق وزارتی حلقوں کا دعویٰ یہ تھا کہ ''اب وزارت چٹان کی طرح مضبوط ہے۔'' جولائی 1946ء میں یہ سر غلام حسین کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر دستور ساز اسمبلی کا رکن منتخب ہوا۔ ستمبر میں صوبائی اسمبلی کے ٹوٹنے کے بعد سر غلام حسین کی سربراہی میں جو عبوری حکومت بنی تو اس میں شامل ہوا اور پھر عام انتخابات کے بعد جنوری 1947ء میں سر غلام حسین کی نئی مسلم لیگی وزارت کا رکن بنا کیونکہ اس وقت تک اس نے ہوا کا رخ دیکھ کر اپنے آپ کو ایوب کھوڑو کے مقابلے میں سر غلام حسین کے دھڑے سے وابستہ کر لیا تھا۔ مئی 1947ء میں جب پاکستان کا قیام یقینی نظر آنے لگا تو اس نے مرکزی لیگ ہائی کمان کے ہر موقف اور اس کی ہر خواہش کی تائید و حمایت میں زوردار بیان دینے شروع کر دیئے اور انہی بیانات کے زور پر اسے امید تھی کہ وہ قیام پاکستان کے بعد صوبہ سندھ کا پہلا وزیراعلیٰ بن جائے گا۔ اسے ایوب کھوڑو کے خلاف نامزد گورنر غلام حسین ہدایت اللہ کی بھی حمایت حاصل تھی۔ اس کا خیال تھا کہ قائداعظم جناح کی جانب سے غیر جانبداری کے اعلان سے لیگ اسمبلی پارٹی میں اس کا پلہ بھاری ہو جائے گا کیونکہ صدر صوبہ لیگ یوسف ہارون جسے مرکزی لیگ ہائی کمان کا منظور نظر سمجھا جاتا تھا، اس کا پرجوش حامی تھا لیکن جب 5/اگست کو اسمبلی پارٹی کا اجلاس ہوا تو ایوب کھوڑو بلا مقابلہ قائد منتخب ہو گیا۔ دسمبر 1946ء کے عام انتخابات کے بعد کھوڑو کے دھڑے

کے ارکان اکثریت میں تھے لیکن جنوری 1947ء میں وہ وزیر اعلیٰ محض اس لئے نہیں بن سکا تھا کہ قائداعظم جناح کا فیصلہ غلام حسین ہدایت اللہ کے حق میں تھا لیکن اب جبکہ قائداعظم نے اعلانیہ اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر دیا تھا تو غلام حسین کے دھڑے کے مقابلے میں کھوڑو کا دھڑا اور بھی مضبوط ہو گیا تھا۔ لہٰذا پیرزادہ عبدالستار، میر غلام علی تالپور، میر بندے علی خان تالپور اور پیر الٰہی بخش کو اس کے حق میں دستبردار ہونا پڑا اور جب چند دن کے بعد ایوب کھوڑو نوزائیدہ مملکت پاکستان کے صوبہ سندھ کا وزیر اعلیٰ بنا تو اس کی چار رکنی کابینہ میں پیرزادہ عبدالستار اور میر بندے علی خان تالپور کے نام شامل نہیں تھے۔

ایک سوسالہ برطانوی عہد میں سندھ کی مسلم سیاست کا خلاصہ

سندھ کی سیاست کے تقریباً ایک سوسالہ تاریخی پس منظر کے مختصر جائزہ سے پتہ چلتا ہے کہ برطانوی سامراج نے فروری 1843ء میں فوجی حکمت عملی کے تحت مسلم اکثریت کے اس علاقے کو زیر تسلط کرنے کے بعد سات ہزار میروں، پیروں، سیدوں، جاگیرداروں اور وڈیروں کے جس وفادار طبقہ کو تقریباً 40 لاکھ بے زمین ہاریوں، غریب کسانوں اور دوسرے مظلوم عوام کی سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی ترقی کی راہ میں ایک آہنی دیوار بنائے رکھا، یہ طبقہ ایک طرف تو برطانوی سامراج سے اس قدر مرعوب اور خوفزدہ ہو گیا تھا کہ یہ ہر انگریز کو فوق البشر سمجھتا تھا اور انگریزوں کی انتظامیہ کے چھوٹے سے چھوٹے اہلکار کے سامنے بڑی بے حمیتی و بے غیرتی کے ساتھ سربسجود ہونے میں کوئی تامل نہیں کرتا تھا لیکن دوسری طرف یہ اپنے غریب عوام پر اس قدر ظلم وستم کرتا تھا کہ یوں لگتا تھا کہ ان کی بھاری اکثریت اپنی ہزاروں سال پرانی اعلیٰ پایہ کی تہذیب و ثقافت کی وارث ہونے کے باوجود انسانی ارتقا کے عبوری دور میں سے نہیں نکل پائی۔

چونکہ اس مراعات یافتہ طبقے نے 1857ء کی جنگ آزادی میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا اس لئے یہ پہلے تو انگریزوں کے انتقامی جبر وتشدد سے محفوظ رہا اور پھر 1870ء میں حکومت برطانیہ نے مسلمانان ہند کی قدرے فلاح و بہبود کے لئے جونئی پالیسی اختیار کی یہ اس سے بھی متاثر نہ ہوا۔ یہ طبقہ بدستور بے ضمیری، آرام کوشی، مفت خوری اور اخلاق باختگی کی زندگی بسر کرتا رہا جبکہ لاکھوں غریب عوام قرون وسطیٰ کے جاگیرداری نظام کی استبدادی چکی میں پستے رہے۔ انگریزی اقتدار

کی ابتدا میں اس علاقے کو انتظامی لحاظ سے تقریباً چار سال تک ایک الگ صوبہ کا درجہ حاصل رہا تھا لیکن جب اکتوبر 1847ء میں سر چارلس نیپیئر کے مستعفی ہونے کے بعد یہ علاقہ بمبئی پریذیڈنسی سے ملحق کر دیا گیا تو اس کے سیاسی ارتقا کے سارے دروازے بالکل بند ہو گئے۔ یوں تو میروں کے چالیس سالہ عہد اقتدار میں بھی اس علاقے کی انتظامیہ پر ہندوؤں کی ہی اجارہ داری تھی اور ساہوکاری اور تجارت بھی انہی کے ہاتھوں میں تھی لیکن 1847ء کے بعد کے کمشنری راج میں ان شعبوں پر ہندوؤں کی گرفت اور بھی مضبوط ہو گئی۔ جبکہ اکثر مسلمان میروں، پیروں اور جاگیرداروں نے بھنگ نوشی اور دوسری ہر قسم کی بدکرداریوں کو اپنی زندگی کا شعار بنائے رکھا۔

1861ء میں کراچی اور کوٹری کے درمیان ریلوے لائن کی تعمیر ہوئی تو اس علاقے کی سیاست، معیشت اور ثقافت پر ہندو ساہوکاروں اور کاروباری سرمایہ داروں کا اور بھی زیادہ غلبہ ہو گیا لیکن اس عرصے میں کراچی میں چمڑے کی برآمدی تجارت کرنے والے مسلمان سوداگروں کا بھی ایک چھوٹا سا طبقہ پیدا ہوا اور اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ نے بھی جنم لینا شروع کر دیا۔ چنانچہ کراچی کے مسلمانوں کے اس شہری عناصر نے کچھ تو اپنی کاروباری ضروریات کے تحت اور کچھ سر سید احمد خان کی علی گڑھ تحریک سے متاثر ہو کر جدید تعلیم کی طرف توجہ کی اور انگریزوں کے تعاون کے ساتھ 1885ء میں محمڈن ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھ کر اس کے زیر اہتمام سندھ مدرسہ قائم کیا مگر سندھ کے مسلمان جاگیرداروں کی بے حسی، انگریزوں کی عدم دلچسپی اور ہندو ساہوکاروں کی مخالفت کے باعث سندھی مسلمانوں میں جدید تعلیم کی تحریک کوئی خاص ترقی نہ کر سکی جبکہ پنجاب کے مسلمانوں میں نہ صرف سر سید احمد خان کی کوششوں کے باعث بلکہ مختلف صوبائی مسلم انجمنوں کی مساعی سے جدید تعلیم کا رجحان کچھ نہ کچھ زور پکڑ گیا تھا اور اس طرح پنجاب میں مسلمانوں کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کی نمود کی رفتار سندھ کے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کی نمود کی رفتار سے مقابلتاً خاصی تیز رہی حالانکہ پنجاب کا برطانوی سلطنت کے ساتھ الحاق سندھ کے الحاق سے پانچ چھ سال بعد میں ہوا تھا۔

چونکہ سندھ بمبئی پریذیڈنسی کے ریگولیٹڈ علاقے کا ایک حصہ تھا اس لئے یہاں ہندو ساہوکاروں کو پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا اور انہوں نے 1890ء سے لے کر 1896ء کے درمیان صرف چھ سال کے عرصے میں مسلمان زمینداروں کا 22 فیصد رقبہ ہتھیا لیا تھا۔ چنانچہ اس

زمانے میں جب ایک سے زیادہ مرتبہ سندھ کے پنجاب کے ساتھ الحاق کی تجاویز پر غور ہوا تو ہندو ساہوکاروں نے اسکی سخت مخالفت کی کیونکہ پنجاب میں برطانوی سامراج کی فوجی نوعیت کی انتظامیہ اس پالیسی پر عمل پیرا تھی کہ مالکان اراضی کو ساہوکاروں کے چنگل سے حتی الامکان محفوظ رکھا جائے۔ پنجاب میں اس قسم کے دیوانی قوانین نافذ نہیں ہوئے تھے جیسے کہ اس سے پہلے صوبجات بنگال، بہار، مدراس اور بمبئی میں نافذ کئے گئے تھے۔

جب انگریزوں کی انتظامیہ کے ہندو اہلکاروں اور ساہوکاروں کا استحصال نا قابل برداشت ہو گیا تو 96-1892ء میں حروں نے پیر پگاڑو کے خلیفہ وریام کی زیر قیادت بغاوت کی۔ ان باغیوں کی بھاری اکثریت بے زمین اور مقروض ہاریوں پر مشتمل تھی مگر انگریزوں کی انتظامیہ میروں، پیروں، جاگیرداروں، وڈیروں، ساہوکاروں اور کاروباری سرمایہ داروں کے بھرپور تعاون سے اس بغاوت کو کچلنے میں کامیاب ہوگئی۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوؤں کے درمیانہ طبقہ اور سرمایہ داروں کی حقوق طلبی اور مسلمانوں کے چھوٹے سے درمیانہ طبقہ کی ماضی پرستی کے باعث پورے برصغیر میں خاصی سیاسی ہلچل ہوئی مگر سندھ کے میروں، پیروں اور جاگیرداروں کا طبقہ محوخواب ہی رہا۔ اس طبقہ کو سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی ترقی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

تاہم جب بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں ''مہاتما'' گاندھی کی زیر قیادت ''تحفظ خلافت'' کی تحریک شروع ہوئی تو سندھ کے میروں، پیروں اور سیدوں میں یکایک زبردست مذہبی جوش پیدا ہوگیا۔ چونکہ جی۔ ایم۔ سید کی سیاسی زندگی کی ابتدا اسی جذباتی تحریک سے شروع ہوئی تھی اس لئے اس کی ساری سیاسی زندگی بے شمار ٹھوکریں کھانے کے باوجود توازن واستحکام سے بیگانہ رہی۔

1921ء کے بعد جب پورے برصغیر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ خانہ جنگی کا جولامتناہی سلسلہ شروع ہوا اس سے سندھی مسلمان بھی ناگزیر طور پر متاثر ہوئے۔ چنانچہ 1925ء میں آل انڈیا مسلم لیگ نے شیخ عبدالمجید سندھی کی تحریک پر یہ مطالبہ کیا تھا کہ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے اسے صوبہ کا درجہ دیا جائے اور پھر اس کے بعد یہ مطالبہ مسلمانان ہند کے مطالبات کی لمبی فہرست کا ایک مستقل حصہ بن گیا۔ 1929ء میں محمد علی جناح کے چودہ نکات

میں بھی یہ مطالبہ سرفہرست تھا۔ جب 32-1930ء گول میز کانفرنس میں یہ مطالبہ تسلیم کرلیا گیا تو یہ امید پیدا ہوئی کہ اب سندھی مسلمان بھی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکیں گے۔ اس وقت تک ہندو ساہوکار سندھ کی 20 فیصد اراضی کے مالک بن چکے تھے اور 30 فیصد اراضی ان کے پاس رہن تھی۔ 1930ء میں سکھر بیراج کی تعمیر کی وجہ سے ہندوؤں کی تجارت کو بہت فروغ ملا تھا۔ بمبئی، کاٹھیاواڑ، گجرات اور یو۔ پی کے ہندو بنیے دھڑا دھڑ سندھ میں آنا شروع ہو گئے تھے اور پنجاب کی جالندھر ڈویژن کے لوگ بھی کوڑیوں کے بھاؤ زرخیز نہری زمینیں حاصل کرنے کے لئے وہاں پہنچ رہے تھے۔

اس صورتحال میں جب 1937ء میں سندھ کو صوبائی خودمختاری حاصل ہوئی تو سندھ کے میروں، پیروں اور جاگیرداروں کا خیال یہ تھا کہ اب وہ جاگیردارانہ مفادات کا تحفظ کرسکیں گے اور وہاں کے مختصر سے درمیانہ طبقہ کو امید تھی کہ اب اس کے لئے بھی ترقی کی راہیں کھل جائیں گی لیکن انہیں ایک دو سال کے تجربے سے احساس ہوا کہ ہندو بنیے کے چنگل سے نجات حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ان کے اس احساس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اسمبلی کے کانگرسی اور غیر کانگرسی ہندو ارکان ایسا قانون منظور نہیں ہونے دیتے تھے جس سے ان کے مفادات کے تقاضے پورے ہو سکتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ 38-1937ء میں ہندو اکثریتی صوبوں میں کانگرسی حکومتوں کی فرقہ پرستانہ پالیسیوں کی وجہ سے برصغیر کے مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ نے جو واویلا کیا تھا اس کا اثر سندھی مسلمانوں پر بھی ہوا تھا۔ چنانچہ اکتوبر 1938ء میں سر عبداللہ ہارون، جی۔ ایم۔ سید، شیخ عبدالمجید سندھی اور دوسرے سندھی مسلمان زعما مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔ لیگ کے پلیٹ فارم سے سب سے پہلے انہوں نے ہی یہ نعرہ لگایا تھا کہ ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں اور ہندوستان میں آئندہ کا آئینی ڈھانچہ اس طرح مرتب ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کو مکمل آزادی حاصل ہو سکے لیکن 1938ء میں کراچی کی لیگ کانفرنس کے فوراً ہی بعد کانگرس نواز وزیراعلیٰ خان بہادر اللہ بخش لیگ اسمبلی پارٹی میں پھوٹ ڈلوانے میں کامیاب ہو گیا جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ سندھ کے مسلمان جاگیرداروں نے کسی نظریے کی بنا پر لیگ میں شمولیت اختیار نہیں کی تھی بلکہ ان کے اقدام کے پس پردہ ہندو مسلم تضاد اور اس تضاد کی بنا پر پیدا شدہ مسلم لیگ کی عوامی لہر کارفرما تھی۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ اس موقع پر لیگ سے غداری کرنے والوں میں

شامل تھا اور اس نے انعام کے طور پر وزارت کا عہدہ لیا تھا۔

1939ء میں ہنومان مندر کی ناجائز تعمیر اور مسجد منزل گاہ کی واگزاری کے واقعات پیش آئے۔ ان واقعات کے فوراً بعد ہی جنوری 1940ء میں جی۔ ایم۔ سید اور بعض دوسرے لیگی ارکان نے محض الٰہ بخش وزارت کا تختہ الٹنے کے لئے ہندو ارکان اسمبلی سے گٹھ جوڑ کر لیا اور پھر جناح کے نام ایک خط میں کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان اتحاد و تعاون کی تجویز پیش کی۔ اگرچہ جناح نے اس تجویز سے اتفاق نہ کیا تاہم جی۔ ایم۔ سید کی کوشش سے 18/ مارچ کو میر بندے علی تالپور کی وزارت بن گئی جسے کانگرسی ارکان اسمبلی کی تائید و حمایت حاصل تھی اور جس میں سید خود بھی شامل تھا۔ 23/ مارچ 1940ء کو لاہور میں قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد مسلمان ارکان اسمبلی کی مسلم لیگ اور مطالبہ پاکستان کے ساتھ وابستگی کی بنیاد ان کے ذاتی مفادات پر ہی قائم رہی اور جی۔ ایم۔ سید کی زیر قیادت صوبہ کے درمیانہ طبقہ کے نمائندے بھی جاگیردارانہ دھڑے بندیوں اور جوڑ توڑ میں مصروف رہے۔ انہوں نے اپنے گروہی یا انفرادی مفادات کی خاطر آل انڈیا مسلم لیگ کی پالیسی یا اس کے نصب العین کی کبھی پرواہ نہیں کی تھی۔ لہٰذا صوبائی وزارتیں بنتی رہیں اور ٹوٹتی رہیں اور سندھ پورے برصغیر میں اپنے سیاسی عدم استحکام کی وجہ سے بدنام ترین صوبہ تصور ہونے لگا۔

1941-42ء میں پیر صبغت اللہ المعروف پیر پگاڑو کی زیر قیادت حروں کی بغاوت ہوئی جسے فوجی کارروائی کے ذریعے بڑی سختی سے کچل دیا گیا۔

مارچ 1943ء میں جبکہ کانگرسی ہندو ارکان جیلوں میں تھے، سندھ اسمبلی میں جی۔ ایم۔ سید کی پیش کردہ یہ قرارداد منظور کی گئی کہ ہندوستان کے مسلم اکثریتی علاقوں میں مسلمانوں کی الگ آزاد قومی ریاستیں قائم کی جائیں بصورت دیگر خانہ جنگی ہوگی جس کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔ لیگ کی اس قرارداد کی منظوری کے بعد مسلم لیگ اسمبلی پارٹی پھر دھڑے بندی کا شکار ہوگئی۔ جب صدر مسلم لیگ جناح نے صوبہ کی سطح پر اقتدار کی اس رسہ کشی میں سر غلام حسین ہدایت اللہ کا ساتھ دیا تو 1944-45ء میں جی۔ ایم۔ سید نے اپنے گروہی مفادات کی خاطر آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت کو ایک سے زیادہ مرتبہ چیلنج کیا اور پھر دسمبر 1945ء میں اس نے مسلم لیگ سے قطع تعلق کر لیا۔

جنوری 1946ء کے عام انتخابات کے بعد سندھ کے مسلمان جاگیرداروں اور درمیانہ طبقہ کے عناصر کی جانب سے جوڑتوڑ، ساز باز اور مفاد پرستی کے مظاہرے جاری رہے۔ حتیٰ کہ صوبائی گورنر سر فرانسس موڈی نے صوبہ میں مسلم لیگ کی مستحکم وزارت کے قیام کے لئے دسمبر 1946ء میں پھر عام انتخابات کرادیئے جن کے نتیجے میں سر غلام حسین ہدایت اللہ کی خالص مسلم لیگی وزارت قائم ہوگئی اور جی۔ایم۔سید کی سیاست کا جنازہ نکل گیا۔ لیکن اس موقع پر بھی قائداعظم محمد علی جناح کو لیگ پارٹی میں اتحاد و اتفاق قائم رکھنے کے لئے اپنے صدارتی فرائض سرانجام دینے پڑے۔ ایوب کھوڑو وزارت اعلیٰ کا امیدوار تھا اور بظاہر اسے اسمبلی میں لیگ پارٹی کے ارکان کی حمایت حاصل تھی لیکن جب جناح کا فیصلہ سر غلام حسین کے حق میں صادر ہوا تو کھوڑو کو وقتی طور پر سر تسلیم خم کرنا پڑا۔

جب 25/جولائی 1947ء کو قیام پاکستان سے تقریباً تین ہفتے پہلے غلام حسین ہدایت اللہ کو صوبائی گورنر کے عہدہ کے لئے نامزد کیا گیا تو ایوب کھوڑو، پیرزادہ عبدالستار، پیر الٰہی بخش اور میر بندے علی تالپور کے درمیان حصول اقتدار کے لئے پھر کھینچا تانی ہوئی جس کا نتیجہ ایوب کھوڑو کے حق میں برآمد ہوا۔ 5/اگست کو کھوڑو بلا مقابلہ لیگ اسمبلی پارٹی کا قائد منتخب ہوا اور 16/اگست کو اس نے پاکستان کے نئے صوبہ سندھ میں اپنی نئی چار رکنی وزارت کی تشکیل کی جس میں پیرزادہ عبدالستار شامل نہیں تھا۔ وزراء کے نام اور ان کے محکمے یہ تھے۔:

1۔	وزیراعلیٰ ایم اے کھوڑو	فنانس، ڈویلپمنٹ، پی، ڈبلیو، ڈی۔
2۔	پیر الٰہی بخش	تعلیم، لوکل سیلف گورنمنٹ، میڈیکل، پبلک ہیلتھ، رینٹ کنٹرولر۔
3۔	میر غلام علی تالپور	فوڈ، سول سپلائیز، ایگریکلچرل انڈسٹریز، لیبر۔
4۔	قاضی فضل اللہ	ریونیو اور ایکسائیز۔

یہ وزارت سندھ کی صوبائی خودمختاری کی دس سالہ تاریخ میں بارھویں وزارت تھی۔ تاہم صوبہ کو پھر بھی سیاسی استحکام نصیب نہ ہوا۔ میروں، پیروں اور دوسرے جاگیرداروں کی گروہی سیاست، درمیانہ طبقہ کے جائز و ناجائز علاقائی مفادات، سندھیوں اور غیر سندھیوں کے درمیان حقیقی تضادات، اسلامی اخوت اور مسلم قومیت کے کھوکھلے نعروں، صوبائی معاملات میں

مرکزی حکومت کی جائز و ناجائز مداخلت اور کئی ایک دوسرے عوامل کے باعث صوبائی وزارتیں
حسب سابق بنتی اور ٹوٹتی رہیں جس کی تفصیل اگلے حصے میں بیان کی گئی ہے۔

جزو دوم

قیام پاکستان کے بعد

(1947ء تا 1951ء)

باب: 7

صوبائی خودمختاری کی علمبردار،
مسلم لیگی کھوڑو وزارت کی برطرفی

پاکستان میں شامل چھوٹے صوبوں کو پنجابی غلبے کا خطرہ

پاکستان کے چھوٹے اور پسماندہ صوبوں کے لوگوں کو پنجابیوں کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی غلبہ کا خطرہ اس مملکت خداداد کے ظہور میں آنے کے بعد یکا یک لاحق نہیں ہو گیا تھا۔ انہوں نے اپنے اس خطرہ کا اظہار 1946ء میں ہی شروع کر دیا تھا جبکہ مرکزی اور صوبائی انتخابات میں مسلم لیگ کی بے مثال کامیابی کے پیش نظر برصغیر کی کسی نہ کسی طرح تقسیم کے امکانات بالکل واضح ہو گئے تھے۔ 24/جولائی 1946ء کو جبکہ برطانیہ کے وزارتی مشن کا گروپنگ پلان کھلے عام زیر بحث تھا، سندھ میں جی۔ایم۔سید کی پروگریسو مسلم لیگ نے شیخ عبدالمجید کی زیر صدارت ایک قرارداد میں یہ مطالبہ کیا تھا کہ اس پلان کے تحت اب سندھ کو پنجاب کے ساتھ منسلک نہ کیا جائے۔ جی۔ایم۔سید اور اس کی پارٹی کے دیگر ارکان کا موقف تھا کہ ''سندھ کو 1935ء میں بڑی مشکلات کے بعد بمبئی سے علیحدگی کا حق حاصل ہوا تھا۔ اگر سندھ کو پھر پنجاب سے ملا دیا گیا تو اس سے مسلمانان سندھ کو سخت تکلیف ہوگی۔''[1]

ابوالکلام آزاد لکھتا ہے کہ جب 3/جون 1947ء کو کانگرس کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں برصغیر کی تقسیم کا منصوبہ زیر بحث تھا تو صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب نے پٹھانستان کا مطالبہ اس موقف کی بنیاد پر پیش کیا تھا کہ بہت سے پٹھان اپنی ایک چھوٹی سی

ریاست کو ترجیح دیں گے کیونکہ انہیں پنجاب کے غلبہ کا خطرہ لاحق تھا لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن اب کسی نئے مطالبہ پر کان دھرنے کو تیار نہیں تھا۔[2]

پنجابیوں کے غلبہ کا یہ خطرہ محض ''صوبائی تعصب'' یا ''غیر اسلامی رجحانات'' کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ اس کی حقیقی وجوہ تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ پنجاب میں تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کی تعداد اچھی خاصی تھی اور اس بنا پر یہ امر یقینی تھا کہ نوزائیدہ پاکستان کی سول انتظامیہ میں غالب اکثریت پنجابیوں کی ہوگی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ صوبہ پنجاب نظام آبپاشی کی وجہ سے برصغیر کے مسلم اکثریتی علاقوں میں سب سے زیادہ خوشحال تھا اور یہاں کے لوگ زیادہ صحت مند، زور آور اور تنومند تھے۔ وہ زندگی کے نئے شعبوں میں قسمت آزمائی کرنے کی صلاحیت وسکت رکھتے تھے۔ لہٰذا یہ امر بھی یقینی تھا کہ پاکستان کے تجارتی اور صنعتی شعبوں میں بھی پنجابیوں ہی کی اکثریت ہوگی۔ تیسری اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ فوج اور پولیس میں پنجابیوں کی تقریباً اجارہ داری تھی اس لئے سارے سیاسی، معاشرتی اور معاشی حقوق ومفادات کی تقسیم کے فیصلے کا ان کے حق میں ہونا ناگزیر تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ اسلامی اخوت ومساوات کے بلند بانگ نعروں کے باوجود بھینس اسی کی ہوگی جس کے پاس لاٹھی ہوگی۔ زمانۂ قدیم کے اس معاشرتی قانون کے پیش نظر برصغیر کے بعض مسلم حلقوں کی رائے یہ تھی کہ علامہ اقبال نے دسمبر 1930ء میں شمالی مغربی ہندوستان کے صوبجات بلوچستان، سندھ، پنجاب اور سرحد کو یکجا کر کے ایک خودمختار ریاست قائم کرنے کی جو تجویز پیش کی تھی اور پھر جولائی 1939ء میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خان نے اپنی جو زونل سکیم پیش کی تھی ان دونوں کا مقصد دراصل ایک ''پنجابی سلطنت'' قائم کرنا تھا۔ سندھ کے مسلمانوں کے چھوٹے سے درمیانہ طبقے کو پنجابیوں کے ان عزائم کا عملی تجربہ 1932ء کے بعد سکھر بیراج کے علاقے میں ہو چکا تھا۔ اس علاقے میں جن پنجابیوں نے زمینیں حاصل کی تھیں ان کے جارحانہ طرز معاشرت اور احساس برتری نے سندھی عوام میں کوئی اچھے اثرات مرتب نہیں کئے تھے۔ غالباً اسی وجہ سے سندھ میں پنجابیوں کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ ''اگر تم ایک پنجابی کو اندر آنے کی اجازت دو گے تو دوسرا لازمی طور پر چپکے سے آ جائے گا اور جب دو اکٹھے ہو جائیں تو اپنی ذات اور اپنے گھر کا خیال رکھو...... اگر سانپ اور پنجابی مہاجر بیک وقت نظر آ جائیں تو سانپ کو چھوڑ دو اور پنجابی کو مارو''[3] ...... ''پنجابیوں کے کردار میں ایک نقص یہ ہے کہ جہاں کہیں پنجابی جاتا ہے وہ اپنی

ایک پنجابی بستی اور پنجابی انتظامیہ قائم کر لیتا ہے اور صرف پنجابیوں کو ملازم رکھتا ہے۔ وہ اپنے سارے رشتہ داروں کو بلا لیتا ہے اور پھر اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کی تقرریوں کے لئے اپنے سارے اختیارات استعمال کرتا ہے۔"[4]

سندھی مسلمان ہندو غلبہ سے نجات کی خاطر پاکستان میں شامل ہوئے مگر جلد ہی مہاجر غلبہ کا خطرہ لاحق ہو گیا

سندھ کے بعض حلقوں میں پنجابیوں کے بارے میں متذکرہ افسوس ناک تاثرات کے ساتھ جب قیام پاکستان کے دو دن بعد 16 / اگست 1947ء کو مقامی جاگیردار محمد ایوب کھوڑو کی زیر قیادت صوبائی کابینہ کی تشکیل ہوئی تو صوبہ کے درمیانہ طبقہ کو پنجابیوں کے علاوہ مشرقی افریقہ، بمبئی، کلکتہ، رنگون، کاٹھیاواڑ، یو۔ پی، دہلی اور حیدر آباد (دکن) کے علاوہ ہندوستان کے بعض دوسرے علاقوں سے آمدہ عناصر سے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ پنجاب کے مسلم درمیانہ طبقہ کی طرح سندھ کے مسلم درمیانہ طبقہ کی جانب سے بھی مطالعہ پاکستان کی پرزور تائید وحمایت کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ہندو اقلیت کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی استحصال سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

صوبہ میں ہندوؤں کی آبادی کا تناسب 27 فیصد تھا لیکن 1935ء کے ایکٹ کے تحت صوبائی اسمبلی میں انکی سیاسی نمائندگی 40 فیصد تھی۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ صوبہ میں کوئی ایسی وزارت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکتی تھی جو ان کی کٹھ پتلی نہ ہو اور اسمبلی میں کوئی ایسا قانون نہیں بن سکتا تھا۔ جس کا کوئی فائدہ مسلمانوں کو پہنچ سکتا تھا۔ جی۔ ایم۔ سید کے بیان کے مطابق اس کی اور عبدالمجید سندھی وغیرہ کی مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ کانگرس کے ہندو ارکان اسمبلی نے انتقال اراضی کے بل اور قرضوں کے بارے میں مصالحتی بل کی اتنی مخالفت کی تھی کہ بل منظور نہیں ہو سکے تھے۔ کانگرسی ہندوؤں نے یہ رویہ اس حقیقت کے باوجود اختیار کیا تھا کہ ہندو اکثریت کے صوبوں کی کانگرسی وزارتیں اس قسم کے قوانین منظور کر چکی تھیں۔ اگرچہ صوبہ میں ہندوؤں کی بڑی بڑی زمینداریاں بھی تھیں لیکن ان کی غالب اکثریت کراچی، حیدرآباد اور دوسرے شہروں میں رہتی تھی۔ وہ ساہوکارہ کرتے تھے اور تجارت اور سرکاری دفاتر میں ان کا غلبہ

تھا۔[5] لہٰذا سندھی مسلمان جب مطالبہ پاکستان کی حمایت کرتے تھے تو ان کی اس حمایت کی بنیاد اس امید پر تھی کہ انہیں اس طرح سندھ کی خودمختار ریاست میں ہندوؤں کے استحصالی غلبہ سے گلو خلاصی کرانے کا موقع ملے گا اور ان کے لئے سیاسی، معاشرتی اور معاشی ترقی کی راہیں کھلیں گی۔ یہ بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ قیام پاکستان کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کا اس قدر وسیع پیمانہ پر تبادلۂ آبادی ہوگا کہ شعبۂ تجارت میں ہندو استحصالیوں کی جگہ بمبئی، کلکتہ، رنگون، کاٹھیاواڑ، لاہور اور چنیوٹ کے بوہرے، خوجے، میمن، سید، پراچے اور شیخ لے لیں گے اور سرکاری دفاتر پر یو۔ پی، دہلی، حیدرآباد (دکن) کے ''اہل زبان'' قبضہ کرلیں گے۔

سندھ مسلم لیگ نے ہندوؤں کو جانے سے روکا، کانگرس نے انہیں ترک وطن پر مجبور کیا

سندھ سے ہندوؤں کا انخلا ستمبر 1947ء میں ہی شروع ہوگیا تھا جبکہ آل انڈیا کانگرس کے صدر اچاریہ کرپلانی نے اس علاقے کا دورہ کر کے اپنے ہم مذہبوں کو ترغیب دی تھی کہ وہ عارضی طور پر ترک وطن کر کے صوبہ میں ایک ایسا معاشی بحران پیدا کردیں جس پر مقامی مسلمان قابو نہیں پاسکیں گے۔ چودھری محمد علی اچاریہ کرپلانی کے اس دورے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اگست 1947ء میں پنجاب میں جو فرقہ وارانہ قتل عام شروع ہوا تھا اسکا صوبہ سندھ پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا تھا۔ بعض مقامات پر معمولی فسادات ہوئے تھے لیکن ان پر جلد ہی قابو پالیا گیا تھا۔ صوبہ میں بالعموم امن وامان کو کوئی گزند نہیں پہنچا تھا لیکن پاکستان کی معیشت کو مفلوج کرنے کی سوچی سمجھی کوشش کے تحت سندھی ہندوؤں کو پاکستان چھوڑنے پر آمادہ کرلیا گیا۔ انہیں یہ امید دلائی گئی تھی کہ چند ماہ کے اندر اندر پاکستان کا شیرازہ بکھر جائے گا اور وہ اپنے گھروں کو واپس آسکیں گے۔ اس زمانے میں کانگرس کا صدر سندھ نژاد کرپلانی تھا اور سندھ میں اس کا کافی اثر ورسوخ تھا۔ وہ اکھنڈ بھارت کا علمبردار تھا۔ جب کانگرس نے تقسیم کے منصوبے کو منظور کرلیا تو اس نے کانگرس پارٹی کو دعوت دی کہ اسے ہندوستان کو ایک مضبوط، خوشحال، جمہوری اور سوشلسٹ مملکت بنانا چاہیے اور یہ اعلان کیا کہ ایسا کر کے ہی ہندوستان اپنے علیحدہ ہونے والے بچوں کو دوبارہ اپنی آغوش میں واپس لاسکتا ہے کیونکہ جو آزادی ہم نے حاصل کی ہے وہ اکھنڈ بھارت کے

بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ کرپلانی ستمبر کے تیسرے ہفتے میں کراچی آیا اور قائداعظم سے ملاقات کی۔ قائداعظم نے اسے یقین دلایا کہ حکومت پاکستان امن بحال رکھنے، اقلیتوں کی پوری حفاظت کرنے اور انہیں مساوی حقوق دینے کا مصمم ارادہ رکھتی ہے۔ اس کے باوجود کرپلانی نے ہندوؤں میں بددلی پھیلانے کی مساعی جاری رکھیں اور اس مقصد کے لئے ان کی اس وقت کی مشکلات کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا اور یہ پیشین گوئی کی کہ اگر وہ جلد ہی پاکستان سے نکل کر چلے نہ گئے تو ان کا مستقبل بہت تاریک ہوگا۔ چنانچہ پرامن حالات کا دور دورہ اور قائداعظم کی طرف سے اقلیتوں کے لئے مساوی حقوق اور حفاظت کی بار بار یقین دہانیوں کے باوجود سندھی ہندوؤں کا عام انخلا شروع ہوگیا جس سے تارکین وطن اور پاکستان دونوں کو نقصان پہنچا۔''[6]

چودھری خلیق الزماں کے بیان کے مطابق جب وہ اکتوبر 1947ء کے اوائل میں گاندھی کی ہدایت کے مطابق اس مقصد کے لئے کراچی آیا کہ وہ سندھی ہندوؤں کو اس بات کی ترغیب دے کہ وہ ترک وطن کر کے ہندوستان نہ جائیں تو اس نے قائداعظم سے ملاقات سے قبل جب سندھ کے وزیراعلیٰ کھوڑو سے ملاقات کی اور اس سے سندھی ہندوؤں کے رویے کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے صدر کانگرس کرپلانی کے خلاف غصہ کا اظہار کیا کیونکہ کرپلانی ہندوؤں کو ترک وطن سے منع نہیں کرتا تھا حالانکہ کھوڑو قائداعظم جناح کی پوری منظوری کے ساتھ ہندوؤں کو ان کے جان و مال کے تحفظ کا یقین دلانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ کھوڑو ہندوستان کے ہائی کمشنر کو ساتھ لے کر لاڑکانہ بھی گیا تاکہ وہاں کے ہندوؤں کو ہندوستان جانے سے روکا جائے مگر اسے اپنی اس کوشش میں کامیابی نہ ہوئی۔[7]

چودھری محمد علی اور خلیق الزماں کے یہ بیانات مبنی برصداقت ہیں کیونکہ اس امر کی بے شمار دستاویزی شہادتیں موجود ہیں کہ کانگرسی لیڈروں نے برصغیر کی تقسیم کو خلوص دل سے قبول نہیں کیا تھا اور انہوں نے پاکستان کی پیدائش کے ابتدائی دنوں میں ہی اسے ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ سردار پٹیل اور بعض دوسرے کانگرسی لیڈروں نے پنجاب میں جبری تبادلۂ آبادی کے لئے فرقہ پرست سکھوں کی اکالی پارٹی سے کھلم کھلا اشتراک عمل کیا تھا اور دہلی میں مسلمانوں کا قتل عام کرایا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے مشترکہ سپریم فوجی کمانڈر لارڈ آکنلیک (Auchinlack) کی 28 ستمبر 1947ء کی سرکاری رپورٹ کے مطابق ہندوستان کی کابینہ یہ تہیہ کئے ہوئے تھی کہ پاکستان

مستحکم بنیادوں پر قائم نہ ہو سکے۔ مزید برآں اس امر کی بھی دستاویزی شہادت موجود ہے کہ گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح اور حکومت سندھ کا مصمم ارادہ تھا کہ سندھ میں فرقہ وارانہ امن وامان قائم رہے تاکہ سندھی ہندوؤں کے عام انخلا کے نتیجہ میں صوبہ کی معاشی زندگی میں بحران نہ ہونے پائے۔

قائداعظم کی 11 راگست 1947ء کی پالیسی تقریر سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہے۔ اس میں انہوں نے پاکستانی قومیت کو مذہب وملت اور رنگ ونسل سے بالاتر قرار دے کر غیر مسلموں کو ہر شعبۂ زندگی میں مکمل مساوی حقوق کا یقین دلایا تھا۔ چودھری خلیق الزماں، جی۔ایم۔سید، نواب محمد یامین خان اور خان عبدالغفار خان اور متعدد دوسرے پاکستانی اور ہندوستانی لیڈروں کی رائے میں قائداعظم نے اپنی اس تقریر میں اس دوقومی نظریے کو خیرباد کہہ دیا تھا جس کا وہ قیام پاکستان سے پہلے پرچار کیا کرتے تھے۔ اس تقریر میں لفظ ''قوم'' کو بار بار دہرایا گیا تھا اور بیان میں کہا گیا تھا مذہب کا کاروبار مملکت سے کوئی تعلق نہیں اور وہ صرف فرد کے ذاتی ایقان و ایمان کا معاملہ ہے۔ بظاہر گورنر جنرل کی اسی پالیسی کے تحت حکومت سندھ نے 30 راکتوبر کو ایک پانچ رکنی ''امن بورڈ'' قائم کر کے اس کے ذمے یہ کام کیا تھا کہ وہ صوبہ میں فرقہ وارانہ امن وامان قائم رکھنے میں حکومت کی امداد کرے اور ہندوؤں کو ترک وطن سے باز رکھے۔ یہ بورڈ پروفیسر جیٹھ مل پرس رام، پروفیسر این۔آر۔ملکانی، شیخ عبدالمجید، مکھی گووندرام پریتم داس اور آغا غلام نبی پٹھان پر مشتمل تھا۔[8] 6 رنومبر کو صوبائی وزیر اعلیٰ☆ کھوڑو نے اس امن بورڈ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مغربی پنجاب کا وزیر اعلیٰ اس بات پر آمادہ ہو گیا ہے کہ وہ ان مہاجرین کو واپس اپنے صوبے میں لے لیگا جنہیں سندھ میں کھپایا نہیں جا سکتا۔ کراچی میں متروکہ مکانات ایسے مہاجرین کو الاٹ نہیں کئے جائیں گے جن کا یہاں کوئی مستقل کاروبار نہیں ہے اور یہ کہ پنجاب اور مارواڑ سے مزید مہاجرین کے لئے جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اگر آئندہ کوئی مہاجرین آئے تو انہیں بولاری اور میرپورخاص کے کیمپوں میں بھیج دیا جائے گا۔[9]

13 رنومبر کو کھوڑو نے کراچی میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ وہ عنقریب ہندوؤں کے نمائندہ ارکان کو صوبہ میں انتظامیہ کی ذمہ داریوں میں شریک

☆ قیام پاکستان کے بعد ابتدائی چند برسوں کے دوران صوبائی وزیر اعلیٰ کے لیے صوبائی وزیر اعظم (Premier) کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔

کرے گا اور صوبائی اسمبلی کے کانگرسی ارکان کو بلا کران سے اقلیت کے مسائل کے بارے میں تبادلۂ خیال کرے گا[10] اور پھر 17 رنومبر کو اس نے کراچی کلب کے ایک عشائیہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''جو لوگ جلدی میں ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تھے وہ اب جلا وطنی کی تلخی کی بنا پر پچھتا رہے ہونگے لہٰذا ہمیں ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ وہ واپس آ جائیں۔ میں بڑی گرم جوشی کے ساتھ انہیں دعوت دیتا ہوں کہ وہ اپنے آبائی گھروں کو واپس آ جائیں۔ انہیں یہاں واپس آنے کا پورا حق حاصل ہے اور میں اس تجویز سے اتفاق کرتا ہوں کہ انہیں بلانے کے لئے بمبئی اور جودھپور وغیرہ میں ایک وفد بھیجا جائے۔ میں اپنا ایک ذاتی نمائندہ اس وفد کے لئے نامزد کرنے پر تیار ہوں۔ اگر سندھ کے یہ سپوت واپس آ جائیں تو ہم جشن منائیں گے۔''[11]

تاہم سندھی ہندوؤں کے لئے وزیر اعلیٰ کھوڑو کی یہ گرم جوشی بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ نہ صرف یہ کہ جو ہندو کرپلانی کے مشورے کے مطابق بمبئی، جودھپور اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں چلے گئے تھے ان میں سے کوئی ایک بھی واپس نہ آیا بلکہ جو باقی رہ گئے تھے ان کا عام انخلا بھی بڑی تیزی سے جاری رہا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اکتوبر، نومبر میں دہلی سے مرکزی حکومت کے تقریباً 25 ہزار مسلم ملازمین کراچی پہنچ گئے تھے اور ان کے پاس رہنے کے لئے کوئی مکان نہیں تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ حکومت سندھ کی سرد مہری کے باوجود مشرقی پنجاب کے تقریباً ڈیڑھ لاکھ مہاجرین نے صوبہ کے مختلف علاقوں میں پہنچ کر سخت فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کر دی تھی۔ اگرچہ مرکزی حکومت نے ستمبر 1947ء میں اس سلسلے میں صوبائی حکومتوں کی امداد کیلئے ایک وزارت بحالیات مہاجرین قائم کر دی تھی اور کابینہ کی ایک ہنگامی کمیٹی کا قیام بھی عمل میں لایا گیا تھا۔ پھر وسط اکتوبر میں پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد کے لئے مشترکہ مہاجر کونسلیں بھی قائم کی تھیں جن کا مقصد یہ تھا کہ مہاجرین کی آبادکاری کے لئے پالیسی کی تشکیل کی جائے اور مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی سرگرمیوں میں ہم آہنگی پیدا کی جائے لیکن حکومت سندھ کے لئے مرکز کی جانب سے اس معاملے میں کسی قسم کی مداخلت قابل قبول نہیں تھی۔ اس کی وجہ وہی تھی کہ سندھ کے چھوٹے سے درمیانہ طبقہ اور بڑے جاگیردار طبقہ کو صوبہ میں پنجابیوں اور دوسرے غیر سندھی عناصر کے غلبہ کا خطرہ تھا۔ انہیں اندیشہ تھا کہ اگر صوبہ سندھ میں مہاجرین کی آمد پر کوئی روک نہ لگائی گئی تو یہاں زود یا بدیر غیر سندھیوں کی اکثریت ہو جائے گی اور اس طرح سندھیوں کے لئے

سیاسی، معاشرتی اور معاشی ترقی کی راہیں بدستور مسدود رہیں گی۔ وہ چاہتے تھے کہ سندھی ہندوؤں کے عام انخلا کے باعث جو سیاسی و معاشی خلا پیدا ہوا ہے اس سے صرف سندھیوں ہی کو فائدہ اٹھانا چاہیے۔ انہیں مسلم قومیت اور اسلامی اخوت کے نعرے میں عملی طور پر کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کے نزدیک سندھ کے سیاسی، معاشرتی، معاشی، ثقافتی اور تہذیبی مفادات اسلامی جذبۂ اخوت سے بالاتر تھے۔

مہاجرین کے بارے میں دوسرے صوبوں کا معاندانہ رویہ

یہ کہنا غلط ہوگا کہ متذکرہ رجحان صرف سندھ کے درمیانہ اور جاگیردار طبقوں میں ہی پایا جاتا تھا اور اس کی بنیاد محض علاقائی شاونزم پر تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں پاکستان کے سارے صوبوں میں مفاد پرستوں نے مہاجرین کی آبادی کے راستے میں حتی الامکان رکاوٹیں حائل کی تھیں۔ مغربی پنجاب میں مہاجرین اور مقامی مفاد پرستوں کے درمیان تضاد کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ مہاجرین نے لاہور اور صوبہ کے متعدد دوسرے شہروں میں صوبائی حکومت کی سردمہری اور مقامی حکام و بااثر سیاسی عناصر کی سنگدلی کے خلاف مظاہرے کئے تھے۔ ساہیوال میں انبالہ ڈویژن کے مہاجرین پر گولی چلائی گئی تھی جبکہ انہوں نے ضلع کے ڈپٹی کمشنر راجہ حسن اختر کے بنگلے کے سامنے مظاہرہ کر کے اپنی فوری آبادکاری کا مطالبہ کیا تھا۔ بعض مقامی عناصر مہاجرین کو پناہ گیر کی بجائے فنا گیر کہتے تھے کیونکہ وہ غیر مسلموں کی متروکہ جائیدادوں کو لوٹتے تھے اور دروازوں اور کھڑکیوں کو توڑ کر ان کی لکڑی کو بطور ایندھن استعمال کرتے تھے۔ لاہور اور صوبہ کے دوسرے تقریباً سارے شہری و دیہاتی علاقوں میں بہت سے مقامی حکام اور بااثر سیاسی عناصر نے غیر مسلموں کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیدادوں پر قبضہ کر لیا تھا اور وہ ان جائیدادوں سے مہاجرین کے حق میں دستبردار نہیں ہوتے تھے۔ لاہور کے شاہی قلعہ اور ایجرٹن روڈ کی ایک کوٹھی میں غیر مسلموں کے زیورات، نقدی اور دوسری نہایت قیمتی منقولہ جائیدادوں کے انبار لگ گئے تھے جنہیں اعلیٰ حکام اور بااثر سیاسی عناصر نے آپس میں ہی تقسیم کر لیا تھا۔ سندھی مفاد پرستوں کی طرح مغربی پنجاب کے ان مقامی مفاد پرستوں میں بھی مسلم قومیت اور اسلامی اخوت کا کوئی جذبہ موجود نہیں تھا حالانکہ خانماں برباد مہاجرین ان کے اپنے ''پنجابی بھائی'' تھے۔

ان سرکاری وغیر سرکاری مقامی لیڈروں کی دست درازی اتنی زیادہ تھی کہ ایک نامور مسلم لیگی لیڈر میاں افتخار الدین نے 18 ستمبر 1947ء کو صوبائی حکومت میں وزیر بحالیات کا عہدہ سنبھالنے کے فوراً بعد ''مقامی مہاجرین'' کے خلاف زبردست مہم شروع کر دی تھی۔ اس نے پہلے تو اپنی تقریروں اور بیانات کے ذریعے مقامی مفاد پرستوں سے اپیلیں کیں کہ وہ غیر مسلموں کی شہری و دیہی جائیدادوں سے دستبردار ہو کر مہاجرین کی آبادکاری کے کام میں سہولت پیدا کریں لیکن جب اس کی ان اپیلوں کا کوئی اثر نہ ہوا تو اس نے 27 ستمبر کو ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ جن ''مقامی مہاجرین'' نے غیر مسلموں کی زرعی اراضی اور شہری جائیدادوں پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے انہیں بے دخل کرنے کے لئے قانون سازی کی جائے گی۔ حکومت متروکہ جائیدادوں کے ایسے نجی سودوں اور تبادلوں کو تسلیم نہیں کرے گی جو مہاجرین کے جائز مفادات کے لئے نقصان دہ ہیں [12] لیکن اسے اپنے اس مقصد میں کامیابی نہ ہونی تھی اور نہ ہوئی۔ بالآخر وہ تقریباً دو ماہ کے بعد اپنے اس عہدہ سے مستعفی ہو گیا کیونکہ وہ نہ صرف ''مقامی مہاجرین'' کو بے دخل کرنے میں ناکام ہوا تھا بلکہ نواب ممدوٹ کی حکومت نے مہاجرین کی آبادکاری کے لئے اس کے مرتب کردہ منصوبہ پر عمل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے منصوبے کا خلاصہ یہ تھا کہ مہاجرین کی آبادکاری کے کام کی تکمیل کرتے ہوئے امیر اور غریب کے فرق کو ملحوظ خاطر نہ رکھا جائے لیکن پنجاب کے وزیر اعلیٰ نواب ممدوٹ اور پاکستان کے وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خان کو اس منصوبہ میں ''غیر اسلامی نظریۂ اشتراکیت کی بو آتی تھی۔ اس لئے اُنہوں نے اسے مسترد کر دیا۔ ان کا جذبۂ اسلامی مساوات'' نہ صرف ''مقامی مہاجرین'' کی بے دخلی کے خلاف تھا بلکہ اس کے تحت امیر اور غریب کے درمیان فرق کو قائم رکھنا بھی ضروری تھا۔

مغربی پنجاب کی طرح صوبہ سرحد میں بھی خان عبدالقیوم خان کی حکومت مشرقی پنجاب کے مہاجرین پر ان بااثر ''مقامی مہاجرین'' کو ترجیح دیتی تھی جنہوں نے غیر مسلموں کی منقولہ و غیر منقولہ جائیدادوں پر ناجائز قبضہ کر لیا تھا۔ عبدالقیوم خان مشرقی پنجاب کے مہاجرین کو صوبہ سرحد میں داخل ہی نہیں ہونے دیتا تھا اور اعلانیہ کہتا تھا کہ اس صوبہ میں مہاجرین کی آبادکاری کی کوئی گنجائش نہیں حالانکہ یہاں سے تقریباً 269000 غیر مسلم ترک وطن کر کے ہندوستان چلے گئے تھے۔ ان مہاجرین اور مقامی لوگوں کے درمیان تضاد نے قیام پاکستان کے بعد دو تین ماہ کے اندر

ہی معاندانہ صورت اختیار کر لی تھی۔ اسی طرح مشرقی بنگال میں بھی صوبہ بہار کے اہل زبان مہاجرین کا خیر مقدم نہیں کیا گیا تھا اور ان مہاجرین اور مقامی لوگوں کے درمیان تضاد نے قیام پاکستان کے بعد دو تین ماہ کے اندر معاندانہ صورت اختیار کر لی تھی۔ وہاں بھی یہ حقیقت کسی سے مخفی نہیں تھی کہ مقامی لوگوں کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی مفادات عملاً مسلم قومیت اور اسلامی جذبہ اخوت سے بالاتر تھے۔ قومی زبان کا تنازعہ اسی حقیقت کا ایک مظہر تھا۔''

سندھ مسلم لیگ اور سندھ حکومت نے مہاجروں کی آبادکاری کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا

سندھیوں کو مشرقی پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے مہاجرین سے سب سے زیادہ خطرہ اس لئے محسوس ہوتا تھا کہ ان کی آبادی کم تھی اور مادی وسائل بہت زیادہ تھے۔ 1941ء کے اعداد و شمار کے مطابق ریاست خیر پور سمیت صوبہ سندھ کا کل علاقہ 56447 مربع میل تھا جس میں سے تقریباً دو کروڑ 25 لاکھ ایکڑ رقبہ دریائے سندھ سے سیراب ہو سکتا تھا۔ جبکہ اس کی آبادی صرف 4404908 نفوس پر مشتمل تھی جن میں سے تقریباً 9 لاکھ غیر مسلم تھے۔ کراچی کی آبادی 247791 تھی جس میں ہندوؤں کی بھاری اکثریت تھی۔ سندھیوں کو خدشہ تھا کہ اگر انہوں نے مشرقی پنجاب، یو۔پی، دہلی، حیدرآباد (دکن)، بمبئی، کاٹھیاواڑ اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے مہاجرین کے سیلاب کا سدباب نہ کیا تو ان کی جداگانہ سیاسی، معاشی، ثقافتی اور تہذیبی ہستی ختم ہو جائے گی۔ وہ مسلم قومیت اور اسلامی اخوت کے نعروں کو محض ایک فریب تصور کرتے تھے جس کا مقصد ان کے وسیع مادی وسائل کو لوٹنا تھا۔ وہ اپنی پانچ ہزار سالہ تہذیب و ثقافت پر نازاں تھے اس لئے وہ اپنی جداگانہ تہذیبی و ثقافتی ہستی کو بہر قیمت قائم رکھنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ 3 / جون 1947ء کو برصغیر کی تقسیم کے منصوبے کے اعلان سے تقریباً دو ماہ قبل انہوں نے سندھ کو ایک آزاد اور خودمختار ریاست بنانے کی تجویز پر سنجیدگی سے غور کیا تھا۔ صوبائی لیگ اسمبلی پارٹی نے وزیراعلیٰ غلام حسین ہدایت اللہ کی زیر صدارت ایک سب کمیٹی مقرر کی تھی جس کے ذمے یہ کام کیا گیا تھا کہ وہ سندھ کی آزاد و خودمختار ریاست کے لئے آئین مرتب کرے اور پھر غلام حسین ہدایت اللہ نے یہ تجویز آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے

اجلاس منعقدہ دہلی میں بھی پیش کی تھی [13] اور پھر 28 رجولائی 1947ء کو حکومت سندھ کے ایک پریس نوٹ میں صوبہ سندھ میں زرعی اراضی کے پنجابی اور بلوچی متلاشیوں کو متنبہ کیا گیا تھا کہ وہ ''آئندہ اس مقصد کے لئے طویل سفر کی زحمت نہ اٹھائیں۔ خواہ مخواہ بے آرام نہ ہوں اور غیر ضروری اخراجات برداشت نہ کریں کیونکہ اب لائیڈ بیراج کے علاقے میں کوئی رقبہ برائے فروخت نہیں ہے۔ اگرچہ اس علاقے میں قانوناً سب لوگ زمین خرید سکتے ہیں لیکن گزشتہ پانچ برسوں میں یہاں اتنی زمین فروخت ہوئی ہے کہ اب مشکل ہی سے 100 ایکڑ کا کوئی ٹکڑا دستیاب ہوسکتا ہے۔''[14]

20 راکتوبر 1947ء کو صوبائی لیگ کونسل نے ایک قرارداد منظور کی جس میں یہ سفارش کی گئی کہ پاکستان کے لئے ایک ایسا سوشلسٹ آئین مرتب کیا جائے جس کے تحت ہر صوبہ کو اندرونی معاملات میں مکمل آزادی حاصل ہو اور پاکستان یونین کے سارے چھوٹے بڑے یونٹوں کو ایگزیکٹو قانون ساز اداروں میں مساوی نمائندگی حاصل ہو۔''[15] اس قرارداد کا پس منظر یہ تھا کہ مرکزی حکومت نے ستمبر 1947ء میں ایک وزارت بحالیات مہاجرین قائم کر کے حکومت سندھ پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا کہ وہ ہندوؤں کی شہری و دیہی متروکہ جائیدادوں پر مسلم مہاجرین کو آباد کرے۔ مرکزی وزیر بحالیات فضل الرحمٰن کا 19 رستمبر کو اعلان یہ تھا کہ سندھ میں مشرقی پنجاب کے 30000 مہاجرین کے لئے 50000 ایکڑ اراضی مخصوص کر دی گئی ہے۔ چنانچہ صوبائی لیگ کونسل کا اجلاس وزیر اعلیٰ کھوڑو کی خواہش کے مطابق اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوا تھا۔ اس وقت تک تقریباً ایک لاکھ پنجابی مہاجرین صوبہ سندھ میں پہنچ چکے تھے۔ 3 رنومبر کو سندھ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کا اجلاس ہوا جس میں لیگ کونسل کی متذکرہ قرارداد کی توثیق کرتے ہوئے اس امر پر بے اطمینانی کا اظہار کیا گیا کہ مرکزی حکومت میں بعض صوبوں کو مناسب نمائندگی حاصل ہے لیکن صوبہ سندھ کا کوئی ایک نمائندہ بھی وہاں موجود نہیں ہے۔ پارٹی نے ایک اور قرارداد کے ذریعے صوبائی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ تجارت، زراعت اور سرکاری ملازمتوں میں سندھی مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کرے اور ایسے مناسب اقدامات کرے کہ مہاجرین میں سے غیر پسندیدہ عناصر ان سہولتوں سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں جو انہیں سندھی عوام کی جانب سے مہیا کی گئی ہیں۔ سندھ کے ذرائع محدود ہیں اگر مہاجرین کی آبادکاری کا سارا بوجھ

اس صوبہ پر ڈال دیا گیا تو اس طرح نہ صرف صوبہ سندھ کے جائز مفادات کو نقصان پہنچے گا بلکہ نتیجتاً یہ امر خود پاکستان کے لئے بھی ضرر رساں ہوگا۔''[16]

سندھ لیگ کونسل اور اسمبلی پارٹی کی ان قراردادوں کے پیش نظر مرکزی حکومت نے دسمبر کے اوائل میں لاہور میں ایک بین الصوبائی مہاجر کانفرنس منعقد کی جس کی صدارت وزیر اعظم لیاقت علی خان نے کی اور شرکاء میں گورنر پنجاب سر فرانسس موڈی، مرکزی وزیر بحالیات راجہ غضنفر علی خاں، مغربی پنجاب کے وزیر اعلیٰ نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ، صوبہ سندھ کے وزیر اعلیٰ محمد ایوب کھوڑو، صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ مسٹر عبدالقیوم خان، حکومت پاکستان کے سیکرٹری جنرل چودھری محمد علی اور دوسرے متعلقہ اعلیٰ حکام شامل تھے۔ اس کانفرنس میں مہاجرین کی آباد کاری کے مسئلہ پر طویل غور وخوض اور بحث وتمحیص کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ صوبہ سندھ میں 5 لاکھ، صوبہ سرحد میں ایک لاکھ، بہاولپور اور خیر پور کی ریاستوں میں 50 ہزار اور بلوچستان میں 50 ہزار مہاجرین کو آباد کیا جائے گا۔ بقیہ سارے مہاجرین کی آباد کاری مغربی پنجاب میں ہوگی۔ [17] چودھری محمد علی کے بیان کے مطابق اس وقت تک 46 لاکھ 80 ہزار مہاجرین مغربی پنجاب میں آ چکے تھے۔ جن میں سے 39 لاکھ 20 ہزار کو لانے کا انتظام فوجی تنظیم ''انخلا'' نے کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مغربی پنجاب سے جتنے تارکین وطن گئے تھے ان سے 17 لاکھ زائد مہاجرین کو اس صوبہ میں بسایا جانا تھا۔ [18]

تاہم اس کانفرنس کے تقریباً ایک ہفتہ بعد یہ خبر شائع ہوئی کہ حکومت سندھ نے 5 لاکھ مہاجروں کے اس کوٹے کو لینے سے معذوری ظاہر کر دی ہے جس کا فیصلہ صوبائی وزرائے اعلیٰ کی حالیہ کانفرنس میں ہوا تھا۔ اب وزیر اعلیٰ کھوڑو صرف 150000 مہاجرین کو آئندہ چھ ماہ میں آباد کرنے پر آمادہ ہے اور کہتا ہے کہ وہ مزید مہاجرین کو اس وقت لے گا جب کہ غلہ، زمین اور صنعت دستیاب ہوگی۔ اس نے بین الصوبائی کانفرنس کے فیصلے سے انحراف اس حقیقت کے باوجود کیا ہے کہ اب تک سندھ میں 244000 مہاجرین پہنچ چکے ہیں۔ [19] چودھری محمد علی کہتا ہے کہ کھوڑو کا یہ انکار بے جا تھا۔ سندھ میں متروکہ اور غیر مزارعہ اراضی کے بڑے وسیع رقبے موجود تھے جن پر مہاجرین کو آباد کیا جا سکتا تھا لیکن قائداعظم کے ارشاد کے باوجود حکومت سندھ نے 150000 سے زائد مہاجرین کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ [20] اس خبر کی اشاعت کے چار پانچ دن بعد حیدرآباد میں جب اجمیر کے مہاجر آئے تو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے جس کے بعد شہر میں کرفیو لگا

دیا گیا۔ کھوڑو کے 20 ر دسمبر کے بیان کے مطابق اس فساد میں 30 افراد مارے گئے۔ 20 زخمی ہوئے اور 200 افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ اسی دن کراچی میں انجمن مہاجرین کے ایک وفد نے محمد قمر الدین خان کی زیر قیادت مرکزی وزیر بحالیات راجہ غضنفر علی خان سے ملاقات کی جس کے دوران وزیر موصوف نے بتایا کہ عنقریب ایک صوبائی مشاورتی کمیٹی تشکیل کی جائے گی جس میں پانچ سرکاری نمائندے اور پانچ مہاجرین کے نمائندے شامل ہونگے۔ اس صوبائی کمیٹی کے ماتحت ضلع، تحصیل اور قصبہ کی سطح پر بھی مشاورتی کمیٹیاں قائم کی جائیں گی جنہیں مہاجرین کے مسائل حل کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔[21] راجہ غضنفر علی خان کے اس بیان کا مطلب یہ تھا کہ مہاجرین کے مسئلے پر مرکزی حکومت اور سندھ کی صوبائی حکومت کے درمیان کھلم کھلا تصادم شروع ہو گیا تھا۔ مرکزی حکومت کا فیصلہ یہ تھا کہ سندھ میں کم از کم 5 لاکھ مہاجرین کو آباد کیا جائے گا لیکن حکومت سندھ نے لیگ کونسل اور لیگ اسمبلی پارٹی کی قراردادوں کے مطابق یہ تہیہ کیا ہوا تھا کہ وہ صوبائی معاملات میں مرکز کی مداخلت کو برداشت نہیں کرے گی اور سندھی مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ مہاجرین کو قبول نہیں کرے گی۔

24 ر دسمبر کو سندھ کے وزیر اعلیٰ کھوڑو نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ ''سندھی ہندوؤں کو ترک وطن کر کے ہندوستان نہیں جانا چاہیے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ اپنے آبائی وطن کو چھوڑیں۔ مغربی پاکستان میں صرف سندھ ہی ایک صوبہ ہے جس میں ہندوؤں کی ابھی تک اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ ایک جمہوری حکومت میں یہ اچھی بات ہوتی ہے کہ اکثریت اور اقلیت آپس میں مل کر کام کریں۔ جو ہندو سندھ سے چلے گئے ہیں ان کی وجہ سے صوبہ کی معیشت میں کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ تقریباً 3 لاکھ ہندو رفتہ رفتہ اور پر امن طریقے سے یہاں سے گئے ہیں اس لئے ان کے انخلا سے سندھ کی معیشت پر مقابلتاً بہت کم اثر پڑا ہے۔ جو مسلمان ہندوستان سے آئے ہیں انہوں نے کراچی میں ہندوؤں کی جگہ کاروبار شروع کر دیا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ حیدرآباد، سکھر اور شکار پور میں بھی مسلم مہاجرین کو آباد کیا جائے گا اور وہ ہندوؤں کا چھوڑا ہوا کاروبار سنبھال لیں گے۔ کراچی میں مزید مہاجرین کے لئے گنجائش نہیں ہے۔ انہیں چاہیے کہ وہ اندرون سندھ کے شہروں میں رہائش اختیار کریں۔ آئندہ کراچی میں سرکاری ملازمین کے علاوہ صرف ان لوگوں کے لئے مکانات وغیرہ کی درخواستیں قبول کی جائیں گی جو اس بات کا ثبوت فراہم کریں گے کہ ان کے

پاس سرمایہ کاری کے لئے خاصی رقم موجود ہے۔ کراچی میں محتاجوں اور غریبوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ لہٰذا انہیں کراچی آنے کا ارادہ ترک کر دینا چاہیے کیونکہ اس طرح انہیں مشکلات درپیش ہوں گی اور ہمارے لئے خواہ مخواہ مسائل پیدا ہوں گے۔"[22]

کھوڑو کے اس بیان کا صاف مطلب یہ تھا کہ اسے لاہور، چنیوٹ، بمبئی، کلکتہ، مدراس، رنگون اور مشرقی افریقہ سے سرمایہ دار مسلمانوں کی کراچی میں آمد پر کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ سندھ میں مسلم سرمایہ دار طبقہ کی عدم موجودگی میں درآمدی اور برآمدی تجارت اور صنعت کاری کے لئے انکے وجود کو برداشت کئے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ البتہ وہ غریب اور چھوٹے درمیانہ طبقہ کے مسلم مہاجرین کو ناپسند کرتا تھا کیونکہ وہ نہ صرف شہروں میں پرچون کا کاروبار کرنے کے لئے متروکہ دکانیں اور مکانات مانگتے تھے بلکہ وہ اس متروکہ زرعی اراضی کا بھی مطالبہ کرتے تھے جس پر مغربی پنجاب کی طرح "مقامی مہاجروں" نے قبضہ کرلیا ہوا تھا۔ چونکہ صوبائی لیگ کونسل اور لیگ اسمبلی پارٹی اس کی پشت پناہی کرتی تھیں اس لئے اسے غلط فہمی تھی کہ وہ اس معاملے میں مرکزی حکومت سے ٹکر لے سکتا ہے۔ اس لئے اس کے عزائم بہت بلند تھے۔ اس کی قطعی رائے تھی کہ بلوچستان کو سندھ میں مدغم کر دینا چاہیے۔ بلوچستان معاشی اور مواصلاتی اعتبار سے سندھ پر انحصار کرتا ہے اور دریائے سندھ کے پانی سے اس میں آبپاشی بھی ہوسکتی ہے۔ اگر بلوچستان سندھ میں مدغم ہوجائے تو زرمبادلہ کی بچت ہوگی اور غیر ضروری انتظامیہ کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ بلوچستان کے بیشتر لوگ اس تجویز کے حق میں ہیں۔"[23]

کھوڑو کے اس باغیانہ رویہ کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اکتوبر 1947ء کے اوائل میں چودھری خلیق الزماں کی آمد کے بعد یو۔پی، دہلی، حیدرآباد (دکن) وغیرہ سے مسلم درمیانہ طبقہ کے تعلیم یافتہ مہاجرین کی لائن لگ گئی تھی۔ یہ لوگ ہوائی جہازوں اور بحری جہازوں کے ذریعے کراچی پہنچتے تھے اور آتے ہی دکانوں، مکانوں اور ملازمتوں کا مطالبہ کرنے لگتے تھے۔ وہ اس مقصد کے لئے مسلم قومیت اور اسلامی اخوت کے نعروں کو مؤثر ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے اس لئے وہ اسلام کی رو سے کراچی اور سندھ کی متروکہ جائیدادوں کے حقدار تھے۔ وزیراعظم لیاقت علی خان ہر ممکن طریقے سے ان "اسلام پسند" اور "اہل زبان" نقلی مہاجرین کی حوصلہ افزائی کرتا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس طرح نہ صرف

کراچی بلکہ پورا سندھ اس کی سیاسی قوت کا سرچشمہ بن جائے گا لیکن سندھیوں کے لئے اس طرح ایک نیا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ قبل ازیں صرف پنجابیوں کے غلبہ سے ڈرا کرتے تھے لیکن اب ان کے لئے پنجابیوں کے علاوہ ''اہل زبان'' مہاجرین بھی حقیقی خطرہ کا باعث بن گئے تھے۔ اُنہیں یوں محسوس ہوتا تھا کہ پنجابی اور ''اہل زبان'' مہاجرین مل کر پورے سندھ کو سیاسی، معاشرتی، معاشی، ثقافتی اور تہذیبی لحاظ سے ہڑپ کر لیں گے۔ چنانچہ اسی احساس کے تحت 31ر دسمبر کو سندھ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے ایک قرارداد کے ذریعے اس تجویز کی مخالفت کی کہ چودھری خلیق الزماں کو سندھ کے زمینداروں کے حلقہ سے ضمنی انتخاب لڑنے کے لئے مسلم لیگ کا ٹکٹ دیا جائے گا۔ صوبائی اسمبلی میں یہ نشست غلام حسین ہدایت اللہ کے گورنر بننے کی وجہ سے خالی ہوئی تھی۔ چودھری خلیق الزماں نے یہ نشست حاصل کرنے کے لئے ضلع لاڑکانہ میں ایک قطعہ اراضی خرید لیا تھا اور اس کے بعد لیگ کے ٹکٹ کے لئے درخواست دے دی تھی۔ لیکن سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن کی رائے یہ تھی کہ اگرچہ اسے ہندوستان کے مسلم مہاجرین کے ساتھ پوری ہمدردی ہے لیکن اسمبلی کی نشست صوبہ سندھ کے باشندہ کو ہی ملنی چاہیے۔ لہٰذا اس نے سندھ کے وزیر اعلیٰ کھوڑو اور صوبائی مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کے ارکان سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ ''چودھری خلیق الزماں کو لیگ کا ٹکٹ نہ دیں بلکہ اس کی بجائے کسی مقامی مسلم باشندہ کو نامزد کر دیں۔''[24]

کراچی میں مہاجروں کا ہندوؤں کے خلاف فساد جسے قائداعظم نے فوج کے ذریعے کنٹرول کیا

جس دن سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن نے متذکرہ قرارداد منظور کی اسی دن مرکزی حکومت کے ایک سرکاری اعلان میں بتایا گیا کہ سندھ کے پیرزادہ عبدالستار کو پاکستانی کابینہ میں شامل کر لیا گیا ہے اور وہ محکمہ خوراک وزراعت اور صحت کا انچارج ہوگا۔ مرکزی حکومت کے اس اعلان کا مطلب یہ تھا کہ ایم۔اے۔کھوڑو کے خلاف اعلیٰ سطح پر کارروائی شروع ہو گئی تھی۔ پیرزادہ عبدالستار سندھ کا نہایت موقع پرست لیڈر تھا اور وہ محض مرکزی وزارت کے لالچ کے تحت کھوڑو کے مخالف دھڑے میں شامل ہو گیا تھا اور اس طرح سیاسی مبصروں کو پتہ چل گیا تھا کہ اب سندھ میں کھوڑو کے سیاسی اقتدار کا ستارہ ڈوبنے والا ہے۔

اس سیاسی پیش گوئی کو دو تین دن بعد مزید تقویت مل گئی جبکہ مولانا عبدالحامد بدایونی نے کراچی میں ایک جلسۂ عام منعقد کیا جس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ سندھ کے تمام مسلم مہاجروں کی جماعتوں کو ایک کر دیا جائے۔ مسلم مہاجرین کی تمام جماعتوں کے نمائندگان، ممتاز مسلم تاجران اور مقامی لیگ کے لیڈروں نے شرکت کی۔ پیر الٰہی بخش وزیر حکومت سندھ، مسٹر ایس۔ ایچ۔ رضا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کراچی، مسٹر صلاح الدین احمد ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ این۔ ڈبلیو۔ ریلوے، پروفیسر حلیم وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی اور قاضی محمد عیسیٰ صدر بلوچستان مسلم لیگ حکومت کی جانب سے شریک ہوئے۔ مولانا عبدالحلیم میرٹھی نے صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ مولانا عبدالحامد بدایونی اور ڈاکٹر امیر حسن صدیقی نئی جماعت کے صدر و سیکرٹری منتخب کئے گئے جو سندھ کے تمام مسلم مہاجرین کی نمائندگی کرتی تھی۔ مہاجرین کو امداد دینے اور ان کو از سر نو بسانے کے لئے چار مزید کمیٹیاں بنائی گئیں جن کے نام یہ تھے۔ استقبالیہ، زراعت، تجارت اور ملازمت۔ [25] اس جلسہ میں سندھ کے صوبائی وزیر پیر الٰہی بخش کی موجودگی اس امر کی نشاندہی کرتی تھی کہ کھوڑو کے سیاسی قلعہ میں شگاف پڑ گیا ہے اور پیرزادہ عبدالستار کے بعد اب پیر الٰہی بخش اس شگاف میں سے فرار ہونے ہی والا ہے۔ اندر خانے کھوڑو کے خلاف منصوبہ تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ اب نہ صرف کھوڑو کے اقتدار کا خاتمہ ہونے والا تھا بلکہ سندھ میں صوبائی خود مختاری کا دیرینہ تصور بھی مٹنے والا تھا۔ مسلم قومیت اور اسلامی اخوت کے علمبرداروں نے اپنی توپوں کا رخ کھوڑو کی طرف موڑ دیا تھا۔ اس کے خلاف ''سنگین الزام'' یہ تھا کہ وہ نہ صرف ہندوؤں کی شہری اور دیہی متروکہ جائیدادیں مہاجرین کے حوالے کرنے میں پس و پیش کر رہا تھا اور ڈیڑھ لاکھ سے زائد مہاجرین کو قبول کرنے سے انکار کر رہا تھا بلکہ جو ہندو ابھی تک سندھ میں رہ گئے تھے انہیں تلقین کر رہا تھا کہ وہ ترک وطن کر کے ہندوستان نہ جائیں۔ بالفاظ دیگر وہ اصلی اور نقلی مسلم مہاجرین کے مقابلے میں سندھ کے پرانے مسلم اور ہندو باشندوں کو ترجیح دیتا تھا۔

ان حالات میں مولانا عبدالحامد بدایونی کی متحدہ جماعت کی تشکیل کے اگلے ہی دن یعنی 6 رجنوری کو اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ''آج رتن تالاب (کراچی) کے سکھ گوردوارہ میں بدامنی کی افسوس ناک وارداتیں ہوئیں۔ جہاں اڑھائی سو سکھ مرد، عورتیں اور بچے بمبئی جانے کے لئے مقیم تھے۔ گوردوارہ کو آگ لگا دی گئی۔ تقریباً 70 اشخاص زخمی ہوئے۔ مسلح پولیس فوراً پہنچی

اور اس نے گولی چلا کر ہجوم کو منتشر کیا۔ بعد ازاں فساد توپ خانہ میدان اور رام باغ تک پھیل گیا۔ جہاں ہندوؤں کے بعض مکانات لوٹ لئے گئے۔ پولیس نے ہجوم پر قابو پانے کے لئے دو مقامات پر گولی چلائی۔ وزیر اعلیٰ سندھ مسٹر کھوڑو مجسٹریٹ مسٹر رضا کی معیت میں فوراً گوردوارہ پہنچے جہاں سے وہ دوسرے فساد زدہ علاقوں میں گئے اور ہندوؤں کو محفوظ مقامات پر پہنچا دیا گیا۔ سوراج بھون اور آریہ سماج کی عمارت جلا دی گئی۔ ایک سرکاری اعلان کے مطابق شہر میں کرفیو لگا دیا گیا ہے۔ کرفیو کی پابندیاں توڑنے والوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا جائے گا اور آج لوٹ مار کرنے والے کئی اشخاص گولیوں سے ہلاک کر دیئے گئے۔[26] جب دو تین دن بعد مزید کوئی فساد نہ ہوا تو 9 رجنوری کو مرکزی وزیر بحالیات راجہ غضنفر علی خان نے حکومت سندھ کو مبارک باد دی کہ اس نے فسادیوں کے خلاف سخت رویہ اختیار کر کے پاکستان کے دارالحکومت کو لاقانونیت سے بچا لیا ہے۔

لیکن سر ظفر اللہ خان کا بیان یہ ہے کہ کراچی کے فساد پر ایک ہی دن میں قابو پا لینے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ حکومت سندھ نے فسادیوں کے خلاف سخت رویہ اختیار کیا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح کو اس فساد کی خبر ملنے پر بہت رنج ہوا تھا۔ چنانچہ ''انہوں نے فوراً سکندر مرزا صاحب سیکرٹری وزارت دفاع کو طلب فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ فلاں وقت تک مجھے رپورٹ آنی چاہیے کہ شہر میں بالکل امن ہو چکا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو مجھے کسی اور کو سیکرٹری دفاع مقرر کرنا پڑے گا۔ سکندر مرزا نے یہ حکم سنتے ہی واپس آ کر کراچی کے کمانڈر، جنرل اکبر خان کو بلا کر وہی الفاظ ان سے کہے جو قائداعظم نے ان سے کہے تھے۔ جنرل اکبر خان نے اس حکم کی فوراً تعمیل کی۔ اس نے فوراً موقع پر پہنچ کر فسادیوں پر گولی چلائی جس سے 11 فسادی مارے گئے اور ایک زخمی ہوا اور اس طرح قائداعظم کی جانب سے مقرر کردہ وقت سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے شہر میں امن وامان بحال ہو گیا۔''[27] ہوڈسن ظفر اللہ خان کے اس بیان کی تائید کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''بالائی سندھ کے 184 سکھ شرنارتھی کراچی کے گوردوارے میں جمع ہوئے تھے۔ ان پر مسلمانوں کے ایک ہجوم نے حملہ کیا جس میں 64 سکھ مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ اس کے بعد فسادیوں نے شہر میں غیر مسلموں کی دکانوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ جب جناح کو یہ اطلاع ملی تو اس نے فوج کو یہ حکم دیا کہ ہر فسادی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا جائے اور کسی کو گرفتار نہ کیا جائے۔ اس حکم پر پوری طرح عمل نہ ہوا۔ لیکن بہت جلدی امن بحال ہو گیا اور اس فساد کا براہ راست کوئی ردِعمل بھی نہیں ہوا۔''[28]

کیا اس فساد میں مولانا عبد الحامد بدایونی جیسے مُلاؤں اور ہاشم رضا جیسے سرکاری اہلکاروں کا ہاتھ تھا؟ اس سوال کا جواب قطعی طور پر نفی میں نہیں دیا جا سکتا۔ واقعاتی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عناصر اس فساد میں کسی نہ کسی حد تک ملوث تھے۔ اس سلسلے میں ان حقائق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ (1) جو مہاجرین یو۔ پی، دہلی، حیدر آباد (دکن) اور بمبئی وغیرہ سے کراچی میں وارد ہوئے تھے انہیں مکانات اور ذرائع روزگار کی تلاش میں بڑی مشکل پیش آ رہی تھی اور وزیر اعلیٰ کھوڑو اس سلسلے میں ان کی مؤثر امداد کرنے کے بجائے ہندوؤں کو تلقین کرتا تھا کہ وہ ترک وطن کر کے ہندوستان نہ جائیں۔ (2) مہاجرین نے حکومت سندھ کی اس پالیسی کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے کئی مرتبہ رینٹ کنٹرولر کے دفتر کے سامنے مظاہرے کئے تھے۔ (3) سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن نے 31 دسمبر کو مطالبہ کیا تھا کہ چودھری خلیق الزماں کو زمینداروں کے حلقے سے سندھ اسمبلی کا ضمنی انتخاب لڑنے کے لئے مسلم لیگ کا ٹکٹ نہ دیا جائے۔ (4) 5 جنوری 1948ء کو عبد الحامد بدایونی نے مسلم مہاجرین کی متحدہ جماعت بنائی تھی اور اس مقصد کے لئے جو جلسہ ہوا تھا اس میں سرکاری حکام نے بھی شرکت کی تھی۔ (5) 6 جنوری کو سکھوں اور ہندوؤں کے، خلاف فساد ہوا جسے قائد اعظم کے حکم کے مطابق ایک ہی دن میں کچل دیا گیا۔ (6) گورنر جنرل قائد اعظم محمد علی جناح نے شہر میں فوراً امن وامان بحال کرنے کا حکم صوبہ سندھ کے وزیر اعلیٰ کھوڑو یا مرکزی وزیر داخلہ کو نہیں دیا تھا بلکہ انہوں نے یہ کام سیکرٹری دفاع سکندر مرزا کے سپرد کیا تھا۔ (7) 10 جنوری کو حکومت سندھ نے ایک پریس نوٹ میں اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ اس فساد کے دوران جن مسلم مہاجرین نے ہندوؤں کے مکانوں اور دکانوں پر زبردستی قبضہ کر لیا تھا انہیں وہاں سے نکال کر جائیدادیں ہندوؤں کو واپس کر دی جائیں گی اور اندورن سندھ ہندوؤں کی جائیدادوں کے جو سستے سودے ہو رہے ہیں انہیں تسلیم نہیں کیا جائے گا۔[29]

12 جنوری کو وزیر اعلیٰ سندھ کھوڑو نے صوبائی امن بورڈ کے ارکان سے ملاقات کر کے 6 جنوری کے فساد پر افسوس کا اظہار کیا اور ان افواہوں کا مضحکہ اڑایا کہ ''حکومت پاکستان'' فسادیوں سے ہمدردی کا اظہار کر رہی ہے۔[30] 6 جنوری کے بعد دس بارہ دن میں مزید تقریباً 18 ہزار ہندو ترک وطن کر کے ہندوستان چلے گئے۔[31] دسمبر 1947ء میں کھوڑو نے کراچی کے

روز نامہ ڈان میں ایک سلسلۂ مضامین میں یہ الزام عائد کیا کہ اس فساد کے دوران پولیس نے حکومت سندھ سے تعاون نہیں کیا تھا۔ ''جب یہ فساد ہوا تو ہندوؤں کے کاروباری عناصر بہت سراسیمہ ہوئے اوران کا ایک وفد بھاگتا ہوا تقریباً 11 بجے قبل دوپہر میرے دفتر میں پہنچا۔ میں نے اسی وقت سپرنٹنڈنٹ پولیس شریف خان کو ٹیلی فون کیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ فوراً موقع پر پہنچ کر امن وامان بحال کرے۔ اس کے دو ایک گھنٹے بعد ہندو دکاندار پھر میرے پاس آئے اور انہوں نے بتایا کہ پولیس نے فساد ختم کرنے کے لئے کوئی کاروائی نہیں کی اور قتل وغارت اور لوٹ مار کا سلسلہ جاری ہے۔ چنانچہ میں صورتحال کا جائزہ لینے کے لئے ذاتی طور پر موقع پر پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس صرف دس سپاہیوں کے ہمراہ 500 کے مجمع کے سامنے کھڑا ہے۔ اس نے کہا کہ اس ہجوم کو قابو میں نہیں کیا جا سکتا اور اگر اس نے گولی چلائی تو مجمع اسے مار ڈالے گا۔ میں نے کراچی کے اے۔آئی۔جی سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا کہیں پتہ نہ لگ سکا۔ تقریباً چار گھنٹے بعد سہ پہر کو فوج بلوائی گئی کیونکہ پولیس بالکل تعاون نہیں کر رہی تھی۔''[32]

کراچی میں اس فساد کے بعد وزیر اعلیٰ سندھ کا مسلم مہاجرین کے بارے میں رویہ قدرے نرم پڑ گیا۔ بظاہر اس کی پہلی وجہ یہ تھی کہ کراچی کی بیوروکریسی حکومت سندھ سے تعاون نہیں کرتی تھی۔ سید ہاشم رضا جیسے حکام کی ہمدردیاں ''اہل زبان'' مہاجرین کے ساتھ تھیں اور وہ کراچی سے ہندوؤں کو نکال کر ان کی جگہ اپنے مہاجرین کو آباد کرنے کے حق میں تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان بھی زیادہ سے زیادہ ''اہل زبان'' مہاجرین کو کراچی میں آباد کرنے کے حق میں تھا۔ اگرچہ 6 رجنوری کو فساد کے موقع پر وہ کراچی میں نہیں تھا تاہم بطور وزیر اعظم اسے اس فساد کا نوٹس لینا چاہیے تھا۔ اس نے نہ تو اس فساد کی مذمت میں کوئی بیان دیا تھا اور نہ ہی سکھوں اور ہندوؤں سے اظہار ہمدردی کیا جنہیں اس فساد میں جانی اور مالی نقصان پہنچا تھا۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ مہاجرین مسلم قومیت اور اسلام کے نام پر ہندوؤں کی جائیدادوں پر قبضہ کرنے کے خواہاں تھے اور عبدالحامد بدایونی اور شبیر احمد عثمانی جیسے مولانا صاحبان مہاجرین کی اس خواہش کی بنیاد پر اپنی اسلام فروشی کی دکان چمکانا چاہتے تھے۔

کراچی کی سندھ سے علیحدگی اور مہاجرین کی آباد کاری کے سوالات پر سندھ۔ مرکز تنازعہ میں شدت

کھوڑو کے رویے میں متذکرہ تبدیلی اس کے کام نہ آئی اور چند دن بعد سندھ مسلم لیگ کے روزنامہ الوحید میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ''مرکزی حکومت نے حکومت سندھ کے نام ایک مراسلے میں لکھا ہے کہ اگر کراچی کو پاکستان کا مستقل دارالحکومت بنایا گیا تو حکومت سندھ کو اپنا دارالحکومت حیدرآباد میں منتقل کرنا پڑے گا۔ کراچی کے نظم ونسق کی ذمہ داری مرکزی حکومت سنبھال لے گی۔'' الوحید کا اس خبر پر اداریہ یہ تھا کہ ''حکومت سندھ کو مرکزی حکومت کا یہ ناجائز مطالبہ مسترد کر دینا چاہیے۔ سندھ کے عوام اور حکومت یہ مطالبہ کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔ قائداعظم نے یقین دلایا تھا کہ کراچی پاکستان کا عارضی دارالحکومت ہوگا۔ حکومت پاکستان کو سندھ کی مہمان نوازی سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے۔''[33]

حکومت پاکستان کی جانب سے اس فیصلہ کی ایک وجہ یہ تھی کہ کراچی میں مہاجرین کی آباد کاری کے بارے میں نواب زادہ لیاقت علی خان کی حکومت پاکستان اور محمد ایوب کھوڑو کی حکومت سندھ کے درمیان شدید اختلاف رائے تھا اس لئے شہر کا نظم ونسق چلانے میں بڑی مشکل پیش آرہی تھی۔ یہ دوعملی زیادہ دیر تک نہیں چل سکتی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وزیراعظم لیاقت علی خان کراچی کی انتظامیہ کو براہ راست اپنے ماتحت لاکر یہاں زیادہ سے زیادہ ''اہلِ زبان'' مہاجرین کو آباد کرنا چاہتا تھا تاکہ یہ شہر اس کے لئے ایک محفوظ حلقۂ انتخاب بن جائے اور تیسری وجہ یہ تھی کہ لاہور، چنیوٹ، بمبئی، کلکتہ، کاٹھیاواڑ اور دوسرے علاقوں سے جو مسلم سرمایہ دار یہاں آئے تھے وہ اپنے کاروبار میں حکومت سندھ کی مداخلت برداشت نہیں کرتے تھے۔ وہ براہ راست صرف مرکزی حکومت سے رابطہ رکھنا چاہتے تھے۔ وہ کراچی کو پاکستان کا مستقل دارالحکومت بنانے کے حق میں تھے کیونکہ یہ ایک صاف ستھرا جدید شہر تھا اور اس کی آب و ہوا معتدل تھی۔ ایک عمدہ بندرگاہ کے علاوہ فضائی اڈہ بھی موجود تھا جن سے مشرقی پاکستان اور باہر کی دنیا کے ساتھ فوری طور پر ذرائع مواصلات بہم پہنچ رہے تھے۔ مسلم لیگ کے صدر قائداعظم محمد علی جناح نے 3 رجون 1947ء کو برصغیر کی تقسیم کے منصوبے کے اعلان کے بعد غالباً اس آخری وجہ کی

بنا پر اپنے مولد شہر کو پاکستان کا دارالحکومت بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان دنوں غلام حسین ہدایت اللہ سندھ کا وزیر اعلیٰ تھا۔ چنانچہ اسے اور دوسرے صوبائی وزراء کو دہلی طلب کر کے ہدایت کی گئی کہ وہ کراچی میں مرکزی حکومت کے دفاتر، مرکزی اسمبلی اور سرکاری ملازمین کے لئے مناسب انتظامات کریں۔ یہ وزراء 13 رجون 1947ء کو واپس کراچی پہنچے تھے تو صوبائی وزیر مواصلات عبدالستار پیرزادہ نے ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ ''پاکستان کا مستقل دارالحکومت شمالی پنجاب میں کہیں ایبٹ آباد کے نزدیک ہوگا۔''[34] بظاہر پیرزادہ کے اسی بیان کے پیش نظر سندھ مسلم لیگ کے روزنامہ الوحید نے لکھا تھا کہ قائداعظم نے یقین دلایا تھا کہ کراچی پاکستان کا عارضی طور پر دارالحکومت ہوگا۔ اب مرکزی حکومت سندھ کی مہمان نوازی سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہے لیکن خود پیرزادہ اس معاملے میں منقار زیر پر ہی رہا کیونکہ مرکزی وزارت کے عہدہ نے اس کے لبوں پر مہر لگا دی تھی۔

22 رجنوری 1948ء کو لاہور میں گورنر سر فرانسس موڈی کی زیر صدارت مغربی پنجاب اور سندھ کی حکومتوں کے وزرائے اعلیٰ اور متعلقہ اعلیٰ حکام کا اجلاس ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ سندھ میں مشرقی پنجاب سے آمدہ مزید مہاجرین آباد کئے جائیں گے۔ اس اجلاس کے بعد وزیر اعلیٰ سندھ ایم۔ اے۔ کھوڑو نے ایک بیان اس امر پر فخر کا اظہار کیا کہ حکومت سندھ مہاجرین کی آمد کے باعث پیدا شدہ قومی بحران پر قابو پانے کی کوشش میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ ہم اپنے وسائل کی قلت کے باوجود ان بدنصیب مہاجرین کو پناہ دے کر ان کی ہر ممکن امداد کریں گے۔ اس کانفرنس کے سات فیصلوں میں سے ایک اہم فیصلہ یہ تھا کہ مہاجرین کونسل کراچی، روہڑی اور حیدر آباد میں تین فوجی افسر متعین کرے گی جو مہاجرین کی آبادکاری کے کام میں حکومت سندھ کی امداد کریں گے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سندھ میں بنوک شمشیر مہاجرین کو آباد کرایا جائے گا۔ تاہم واپس کراچی پہنچ کر وزیر اعلیٰ سندھ کھوڑو نے ایسوسی ایٹڈ پریس کو بتایا کہ سندھ میں مزید صرف ایک لاکھ مہاجرین کو آباد کیا جا سکے گا۔ اس سے زیادہ مہاجرین کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے لیکن وزیر بحالیات راجہ غضنفر علی خان کا اصرار تھا کہ سندھ کو مزید چار لاکھ مہاجرین قبول کرنے ہوں گے۔ چنانچہ 28 رجنوری کو اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے مرکزی کابینہ کا اجلاس ہوا جس میں کھوڑو نے بھی خصوصی دعوت پر شرکت کی۔ بڑی بحث وتمحیص کے بعد فیصلہ یہی ہوا کہ سندھ میں مزید چار لاکھ

مہاجرین کی آبادکاری ہوگی اور 29 رجنوری کو مغربی پنجاب سے سندھ کے لئے مہاجرین کے قافلوں کی روانگی شروع ہوگئی۔ ان مہاجرین میں سابق فوجیوں کی بھی خاصی تعداد تھی۔

ظاہر ہے کہ اس فیصلہ پر سندھ کے وزیراعلیٰ کھوڑو اور درمیانہ طبقہ کے سندھی شاونسٹوں کو خوشی نہیں ہوسکتی تھی۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ کراچی کے مستقبل کے بارے میں مرکزی حکومت اور حکومت سندھ کے درمیان جو خط و کتابت جاری تھی اس میں اتفاق رائے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ چنانچہ سندھ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے 30 رجنوری 1948ء کو ایک قرارداد میں یہ واضح کیا کہ ''سندھی طلبا کراچی کو سندھ سے علیحدہ کرنے کی تجویز کے خلاف ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس مسئلے پر پورے سندھ میں استصواب کرایا جائے۔ کراچی شہر چند افراد کی ملکیت نہیں ہے بلکہ سارے سندھی عوام اس کے مالک ہیں۔''[35] فیڈریشن کے اسی اجلاس میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ ''سندھی طلبا روزنامہ ڈان کا بائیکاٹ کریں گے اور جو ہاکر ڈان فروخت کریں گے انہیں ہوسٹل میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ بائیکاٹ کی وجہ یہ بتائی گئی کہ یہ اخبار سندھیوں کے خلاف پروپیگنڈہ کرتا ہے اور جو بات بھی صوبہ سندھ کے لئے اچھی ہوتی ہے وہ اسے بہت بری لگتی ہے۔'' سندھی طلبا کے اس فیصلے کا پس منظر یہ تھا کہ روزنامہ ڈان کاٹھیاواڑ کے میمنوں کے سرمایہ دار طبقہ کے ایک رکن یوسف ہارون کی زیرنگرانی شائع ہو رہا تھا اور یہی شخص اس کے سارے اخراجات برداشت کرتا تھا۔ چونکہ اس کا طبقہ کھوڑو حکومت کے سندھی شاونزم کے خلاف تھا اور کراچی کو صوبہ سندھ سے الگ کرنے کے حق میں تھا اس لئے ''جو بات صوبہ سندھ کے لئے اچھی ہوتی تھی وہ اسے بہت بری لگتی تھی۔''[36]

9 رفروری کو سندھ صوبائی لیگ کونسل نے ایک قرارداد میں کراچی کو سندھ سے الگ کرنے کی تجویز پر سخت احتجاج کیا۔ کونسل نے اس سلسلے میں جو قرارداد منظور کی اس میں کہا گیا تھا کہ (1) کراچی صدیوں سے صوبہ سندھ کا ایک قدرتی جزو رہا ہے اور اب یہ شہر صوبہ کی معاشی، تجارتی، صنعتی، تعلیمی اور ثقافتی ہستی کا ایک مرکز بن گیا ہے اگر اس موقع پر صوبہ کے اعصابی مرکز کو اس سے الگ کرنے کی کوشش کی گئی تو سندھ کی نشوونما ختم ہوجائے گی۔ (2) کراچی کو سندھ سے الگ کرنے کی تحریک 1940ء کی قرارداد لاہور کے منافی ہوگی کیونکہ اس میں پاکستان کے ہر یونٹ کی علاقائی سالمیت کی ضمانت دی گئی تھی۔ بصورت دیگر پاکستان کا نصب العین محض ایک

خواب ہی رہتا۔ (3) اس تحریک کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے کیونکہ سندھی عوام نے ہندوستان و پاکستان کے مختلف علاقوں سے آنے والے لاکھوں مسلم بھائیوں کا خیر مقدم کر کے جس اسلامی اخوت کا مظاہرہ کیا ہے اس کا انہیں بہت برا بدلہ ملے گا۔ (4) کونسل سندھ کے سارے نمائندوں، وزیروں، ارکان اسمبلی، مسلم لیگیوں اور سندھ و پاکستان کے دوسرے سارے خیر خواہوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اس غیر دانشمندانہ اور غیر مدبرانہ تحریک کی ہر ممکن طریقے سے مزاحمت کریں۔ (5) کونسل نے ایک سب کمیٹی مقرر کی ہے جو قائداعظم اور دوسرے متعلقہ حلقوں سے ملاقات کرنے کے علاوہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے دوسرے مناسب اقدامات کرے گی۔"[37] کونسل کی اس قرارداد کی منظوری سے قبل بعض سندھیوں نے گورنر جنرل ہاؤس کے سامنے مظاہرہ کیا تھا اور یہ مطالبہ کیا تھا کہ کراچی کو سندھ سے الگ نہ کیا جائے۔

اس سے اگلے دن یعنی 10 رفروری کو صوبائی اسمبلی میں متفقہ طور پر ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں کہا گیا تھا کہ صوبائی اسمبلی کو حکومت پاکستان کی اس تحریک پر سخت تشویش لاحق ہوئی ہے کہ کراچی شہر کو سندھ کی انتظامیہ کے کنٹرول سے لے کر براہ راست مرکزی حکومت کے ماتحت کر دیا جائے گا۔ لہٰذا یہ اسمبلی مطالبہ کرتی ہے کہ کراچی کو کسی قیمت پر مرکزی انتظامیہ کے حوالے نہ کیا جائے کیونکہ اس طرح صوبہ سندھ کی معیشت تباہ ہو جائے گی۔ 1940ء کی قرارداد لاہور کی خلاف ورزی ہوگی جس میں پاکستان کے خود مختار یونٹوں کی علاقائی سالمیت کی ضمانت دی گئی تھی اور صوبہ کے عوام کے جذبۂ حُب الوطنی کو سخت ٹھیس لگے گی۔[38]

حکومت پاکستان نے ان قراردادوں کا جواب 13 رفروری کو ایک آرڈیننس کی صورت میں دیا جس میں بتایا گیا تھا کہ حکومت ملک میں رشوت ستانی کے انسداد کے لئے ایک سپیشل سنٹرل پولیس فورس کی تشکیل کرے گی جسے مرکزی اور صوبائی دونوں ہی حلقوں میں مناسب کارروائی کرنے کے اختیارات حاصل ہونگے۔[39] اس آرڈیننس کے ذریعے نہ صرف پاکستان کے وفاقی یونٹوں کی خلاف ورزی کی گئی تھی بلکہ صوبائی وزراء اور حکام کو بھی متنبہ کیا گیا تھا کہ اگر انہوں نے مرکز کی حکم عدولی کی تو یہ سپیشل فورس حرکت میں آ جائے گی۔ تاہم حکومت سندھ نے 14 رفروری کو ایک پریس نوٹ میں اعلان کیا کہ بعض اخباری اطلاعات کے مطابق مغربی پنجاب سے دو لاکھ مہاجرین کا جو پیدل قافلہ روانہ ہونے والا ہے اسے صوبہ سندھ میں قبول نہیں کیا جائے

گا۔حکومت سندھ نے مزید صرف ایک لاکھ مہاجرین کو آباد کرنے کی ذمہ داری قبول کر رکھی ہے جو ریل گاڑیوں کے ذریعے آ رہے ہیں۔صوبہ میں اس سے زیادہ مہاجرین کو آباد کرنے کی گنجائش نہیں ہے اور پھر 16 رفروری کو سندھ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے اعلان کیا کہ وہ کراچی کو سندھ سے الگ کرنے کی تجویز کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے 20 رفروری یعنی جمعہ کو پورے سندھ میں ''یوم کراچی'' منائے گی۔ [40]

19 رفروری کو حکومت سندھ کے پنجابی ہوم سیکرٹری این۔اے فاروقی نے ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ ''صوبہ میں سندھیوں اور غیر سندھیوں کے درمیان طبقاتی منافرت پیدا ہوگئی ہے۔اس منافرت میں بہت سے مہاجرین کی آمد سے بہت اضافہ ہوا ہے۔جو لوگ پروپیگنڈا کے ذریعے اس منافرت کو ہوا دے رہے ہیں انہیں یہ احساس نہیں کہ اگر سندھیوں اور غیر سندھیوں کے درمیان کوئی تصادم ہوا تو یہ دونوں فریقوں کے علاوہ صوبہ سندھ کے لئے بھی تباہ کن ہوگا۔'' فاروقی انڈین سول سروس کا افسر تھا اور اس بنا پر غالباً اس نے مرکزی حکومت کی خواہش کے مطابق یہ انتباہی بیان دیا تھا لیکن اس کا یہ انتباہ بے اثر ثابت ہوا۔سندھی طلبا حسب اعلان 20 رفروری کو ''یوم کراچی'' منانے کے لئے کراچی کے علاوہ سندھ کے دوسرے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں اپنے سکولوں اور کالجوں سے غیر حاضر رہے اور انہوں نے ہر شہر اور قصبہ میں جلوس نکالے۔ [41]

21 رفروری کو سندھ مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کی سٹینڈنگ کمیٹی نے ایک قرارداد میں وزیر اعظم کھوڑو سے سفارش کی کہ وہ صوبائی کابینہ میں کوئی ردو بدل یا اضافہ کرنے سے پہلے اس سلسلے میں کمیٹی کی رائے معلوم کریں۔کمیٹی نے ایک قرارداد میں مزید سفارش کی کہ کراچی کو سندھ سے الگ کرنے کی تحریک کی ہر ممکن طریقے سے مخالفت کی جائے۔ [42] ان قراردادوں کا مطلب یہ تھا کہ مرکزی حکومت اور حکومت سندھ کے درمیان محاذ آرائی شدید سے شدید تر ہو رہی تھی اور کھوڑو اپنی کابینہ میں سے پیر الٰہی بخش جیسے وزیروں کو نکالنا چاہتا تھا جو اس محاذ آرائی میں پس پردہ کھلم کھلا مرکزی حکومت کا ساتھ دے رہے تھے۔دوسری طرف مرکزی حکومت کا پیمانۂ صبر بھی لبریز ہو رہا تھا اور اُس نے کھوڑو سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔چنانچہ 23 رفروری کو مرکزی وزیر بحالیات راجہ غضنفر علی خان نے وزیر اعلیٰ سندھ ایم۔اے۔کھوڑو کے اس بیان کو ''بے معنی'' قرار دیا کہ صوبہ سندھ میں مزید 2 لاکھ مہاجرین کو آباد نہیں کیا جا سکتا۔راجہ غضنفر علی

خان نے حکومت سندھ کی صوبہ پرستی کی مذمت کی جس کی وجہ سے اس (حکومت سندھ) نے مہاجرین کی بحالی کے کام میں مرکزی حکومت سے تعاون کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

یکم مارچ 1948ء کو مرکزی وزیر خزانہ غلام محمد نے پاکستان کا بجٹ پیش کیا تو سندھ کے رکن اسمبلی ہاشم گزدر نے اس پر سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے اسے سرمایہ داروں اور افسر شاہی کا بجٹ قرار دیا اور کہا کہ اس بجٹ میں صوبائی ٹیکسوں کو بھی غصب کر لیا گیا ہے۔ اس نے کہا کہ اگر کراچی کو پاکستان کا مستقل دارالحکومت بنا دیا جائے تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا بلکہ ہمیں اپنے ہاں مرکزی حکومت کو خوش آمدید کہنے میں مسرت ہوگی لیکن ہم یہ نہیں چاہتے کہ اس شہر کو صوبہ سندھ سے الگ کر دیا جائے کیونکہ اس طرح ہمارے صوبہ کی سالمیت برقرار نہیں رہے گی۔[43]

اس سے اگلے دن ایم۔اے کھوڑو نے اپنی تقریر میں شکایت کی کہ صوبوں کو مہاجرین کی آبادکاری کے لئے صرف ڈیڑھ کروڑ روپے دیئے گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مرکزی حکومت اپنی ذمہ داری صوبوں پر ڈال رہی ہے۔ سندھ میں اب تک تقریباً 10 لاکھ مہاجرین آ چکے ہیں۔ اس نے کہا کہ بجٹ میں صوبوں کے ذرائع آمدنی کو مرکز کی تحویل میں لینے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ مرکز نے سیلز ٹیکس کو مرکزی ٹیکس کے طور پر وصول کرنے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ واقعی صرف دو سال کے لئے ہوگا۔ کھوڑو نے مزید کہا ملک فیروز خان نون نے کل کراچی کے مستقبل کا ذکر کر کے جلتی پر تیل ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ سندھیوں نے کراچی شہر گزشتہ ایک سو سال میں تعمیر کیا ہے اور کوئی بھی سندھی اس شہر کی صوبہ سے علیحدگی کا خیر مقدم نہیں کرے گا۔[44]

وزیراعظم لیاقت علی خان نے ان شکایتوں کا جواب یہ دیا کہ صوبوں کی ترقی کے لئے مرکز کا استحکام ضروری ہے۔ ''ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ بنگالی، پنجابی یا سندھی یا پٹھان کے تصور کو ہی دفن کر دیا جائے۔ ''ہم سب پاکستانی ہیں۔ ہم پاکستان کے لئے زندہ رہیں گے اور پاکستان کے لئے ہی مریں گے۔ جو عناصر اس موقف کے حامی نہیں ہیں ان کی پوزیشن مختلف ہے اور ان کی جگہ کہیں اور ہے...... میں چاہتا ہوں کہ اس ایوان کے ارکان، صوبائی حکومتیں اور صوبائی عوام اس امر کا احساس کریں کہ اگر پاکستان مر گیا تو کوئی زندہ نہیں رہے گا اور اگر پاکستان زندہ رہا تو کوئی نہیں مرے گا۔[45]

مرکزی اسمبلی میں اس مباحثے کا ماحصل یہ تھا کہ ایک طرف تو صوبہ سندھ اور دوسرے صوبوں کے ارکان زیادہ سے زیادہ خودمختاری کا مطالبہ کرتے تھے اور اپنی جداگانہ سیاست،

معیشت، معاشرت، ثقافت اور تہذیب کا تحفظ کرنا چاہتے تھے لیکن دوسری طرف مرکزی ارباب اقتدار حب الوطنی کے نام پر سارے معاشرتی، لسانی، ثقافتی اور تہذیبی امتیازات کو ختم کرنے کے علمبردار تھے۔ سندھیوں کو لیاقت علی خان اور دوسرے مرکزی ارباب اقتدار کے اس موقف میں سے سامراجیت کی بو آتی تھی۔ ان کا تاثر یہ تھا کہ جس طرح کانگرس کی ہندو بورژوا قیادت ''انڈین نیشنلزم'' کے نام پر مسلم اقلیت کو ثابت ہی ہڑپ کرنے کے درپے تھی اسی طرح پاکستان میں پنجابی۔ مہاجر عناصر حب الوطنی، مسلم قومیت اور اسلامی اخوت کے نام پر نہ صرف سندھیوں کے وسیع مادی وسائل غصب کرنے کا عزم رکھتے ہیں بلکہ وہ سندھیوں کی جداگانہ ثقافتی اور تہذیبی ہستی کو ہی ختم کرنے کے خواہاں ہیں۔ ان عناصر کی پوزیشن اس عورت جیسی ہے جو آگ لینے آئی اور گھر کی مالکن بن بیٹھی۔ یہ یہودی ہیں اور سندھ میں اسرائیل کی طرز کی اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جی۔ ایم۔ سید کے بیان کے مطابق ''لیاقت علی خان'' سندھیوں کی ثقافت و تہذیب کے وجود کو ہی تسلیم نہیں کرتا تھا۔ وہ سندھیوں کو حقیر سمجھتا تھا اور کہتا تھا کہ ''سندھ کی ثقافت میں گدھا گاڑی اور اونٹ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ سندھی زبان ان پڑھ اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان ہے۔''[46]

مرکزی اسمبلی کے اس بجٹ سیشن میں صوبہ سرحد کے خان عبد الغفار خان نے پہلی مرتبہ حلف وفاداری اٹھایا اور اپنی تقریر میں اعلان کیا کہ اب وہ صوبہ سرحد کو پاکستان سے الگ کرنے کا متمنی نہیں ہے۔ ابھی یہ سیشن جاری تھا کہ 8/مارچ کو اس نے جی۔ ایم۔ سید، شیخ عبد المجید سندھی اور بعض دوسرے پاکستانی لیڈروں کے ساتھ مل کر ایک نئی جماعت ''پاکستان پیپلز پارٹی'' قائم کرنے کے ارادہ کا اعلان کیا۔ اس نے اپنی اس مجوزہ پارٹی کا جو منشور جاری کیا اس میں مرکزی نصب العین یہ تھا کہ پاکستان کو آزاد سوشلسٹ جمہوریتوں کی یونین بنایا جائے گا۔ یہ پارٹی غیر فرقہ وارانہ ہوگی۔ اس کی رکنیت کے دروازے ہر مذہب و ملت کے افراد کے لئے کھلے ہوں گے اور ''ثقافتی اور لسانی یونٹوں'' کو خود مختاری دی جائے گی۔''[47] عبد الغفار خان کے اس اعلان پر پنجابی ''محب الوطنوں'' اور مہاجر ''اسلام پسندوں'' نے بڑی برہمی کا اظہار کیا۔ انہیں سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ جماعت کے منشور میں ''زبان اور کلچر کی بنیاد پر صوبوں کی خود مختاری'' کو نمایاں جگہ دی گئی ہے۔ بمبئی، کلکتہ اور چنیوٹ وغیرہ کے سرمایہ دار ''مہاجرین'' کے نمائندہ یوسف ہارون نے ایک بیان میں اس پارٹی کی تشکیل پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ ''اس پارٹی کے محرکین

ایسے اشخاص ہیں جن کے ماضی سے مسلمانان پاکستان بخوبی واقف ہیں......وہ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار و افتراق پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جبکہ اس وقت وحدت و استحکام کی اشد ضرورت ہے۔"[48] لاہور کے روزنامہ نوائے وقت کا اداریہ یہ تھا کہ "خان عبدالغفار خان کے علاوہ عبدالمجید سندھی اور مسٹر جی۔ایم۔سید نے اس منشور پر دستخط کئے ہیں۔ان دونوں اصحاب نے آخری چند سالوں میں پاکستان کی شدید مخالفت کی ہے اور آج کل سندھ میں غیر سندھی مسلمانوں کے خلاف منافرت کی تحریک کے علمبردار یہی دو اصحاب ہیں......زمانہ بڑی تیزی سے آگے نکل رہا ہے۔دنیا نیشنلزم تک سے بیزار ہو رہی ہے مگر خان عبدالغفار خان اور انکے ساتھی مسلمانان پاکستان کو پراونشلزم کی طرف بلا رہے ہیں۔خود پاکستان کے مسلمانوں میں اب یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ صوبائی حد بندیاں ختم کر کے پاکستان میں ایک ہی مرکزی حکومت قائم کر دی جائے۔آخر اس میں کیا راز ہے کہ خان عبدالغفار عین اس وقت جبکہ حکومت پاکستان اور مسلمانوں کے رہنما صوبائی تنگ نظری کے، خلاف جہاد کا اعلان کرتے ہیں یہ ایسی پارٹی قائم کر دیتے ہیں جس کا نصب العین ہی صوبہ پرستی ہے اور اس کے بانیوں میں سب وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جو 1940ء سے آج تک مسلسل پاکستان کے خلاف سرگرم عمل رہے ہیں۔"[49] یہ اداریہ اس بات کا ثبوت تھا کہ سندھیوں کے پنجابی۔مہاجر سامراجیت کے بارے میں خدشات بے جا نہیں تھے۔یہ عناصر واقعی اسلام اور حب الوطنی کے نام پر نہ صرف علاقائی تہذیب وثقافت کو ملیا میٹ کر دینا چاہتے تھے بلکہ وہ صوبائی حد بندیاں ختم کر کے وفاقی یونٹوں کی جداگانہ سیاسی ہستی کو بھی ختم کرنے کا عزم رکھتے تھے۔جب وہ سندھ کے وسیع وعریض مزروعہ علاقے پر نظر ڈالتے تھے تو ان کے منہ میں پانی آجاتا تھا اور پھر وہ یکا یک "مسلم قومیت" اسلامی اخوت اور حب الوطنی" کے حق میں اور "صوبہ پرستی اور صوبائی تنگ نظری" کے خلاف پر جوش نعرے لگانے شروع کر دیتے تھے اور ہر اس شخص کو صوبہ پرست اور غدار قرار دیتے تھے جو ان کے ان نعروں سے ذرا سا بھی اختلاف کرتا تھا۔

سندھ مسلم لیگ کے صدر یوسف ہارون کے برعکس صوبائی وزیر اعلیٰ کھوڑو نے پیپلز پارٹی کے قیام پر کوئی نکتہ چینی نہ کی جس سے بعض مبصرین نے یہ تاثر لیا کہ کھوڑو اور۔جی۔ایم۔سید میں صوبائی خودمختاری کے معاملے میں کوئی نہ کوئی مفاہمت ہو چکی ہے۔پیپلز پارٹی کے مینی فیسٹو

میں ''لسانی اور ثقافتی یونٹوں'' کی خودمختاری کا جو ذکر کیا گیا تھا وہ اس موقف کے عین مطابق تھا جو وزیر اعلیٰ کھوڑو نے 15 ؍اگست 1947ء کے بعد عملی طور پر اختیار کر رکھا تھا۔ 12 ؍مارچ کو کھوڑو نے کراچی میں سندھ مسلم کالج کے طلبا کو خطاب کیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ مرکز اور صوبوں کے درمیان ایک واضح خط امتیاز کھینچیں۔ اس نے اپنی تقریر میں صوبہ پرستی کی کوئی مذمت نہ کی البتہ یہ کہا کہ ''پروانشلزم خالصتاً صوبائی سرگرمیوں تک محدود ہونی چاہیے۔''[50]

15 ؍مارچ کو وزیر اعلیٰ سندھ ایم۔ اے کھوڑو اور وزیر مال قاضی فضل اللہ لاڑکانہ اور دادو کے دورہ پر روانہ ہوئے۔ پروگرام کے مطابق ہندوستانی ہائی کمشنر برائے پاکستان مسٹر سری پرکاش نے بھی ضلع دادو میں ان کے ساتھ شامل ہونا تھا لیکن دادو کے لئے روانگی سے قبل اس ہائی کمشنر نے 16 ؍مارچ کو کراچی میں اخباری نمائندوں کو بتایا کہ ''ماہ رواں کے اول نصف میں 40 ہزار سے زائد غیر مسلم شرنارتھی بحری جہازوں کے ذریعے ہندوستان چلے گئے ہیں۔ اب تک سندھ سے 3 لاکھ شرنارتھی کاٹھیاواڑ کی بندرگاہوں میں پہنچائے جا چکے ہیں۔'' اس نے مزید بتایا کہ ''ستمبر 47ء سے 8 لاکھ غیر مسلم سندھ سے جا چکے ہیں اور خیال ہے کہ مئی 1948ء تک مزید 3 لاکھ پناہ گزین ہندوستان چلے جائیں گے۔'' بالائی سندھ میں تقریباً 30 ہزار ہندو ہجرت کے منتظر ہیں۔ تاہم 17 ؍مارچ کو ہندوستانی ہائی کمشنر نے سکھر میں ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے ہندوؤں کو مشورہ دیا کہ ''وہ صوبہ سندھ کو چھوڑ کر نہ جائیں کیونکہ حکومت سندھ سنجیدگی سے ہندوؤں کو صوبہ سندھ میں رکھنے کی خواہاں ہے۔''

ہندوستانی ہائی کمشنر کی اس تقریر کے اگلے دن یعنی 18 ؍مارچ کو یہ خبر شائع ہوئی کہ کراچی میں ''مولانا شبیر احمد عثمانی کی زیر صدارت مسلم پناہ گزینوں کا ایک نمائندہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں حالیہ تشکیل یافتہ جمعیت المہاجرین پاکستان کے آئین کے مسودہ پر غور کیا گیا اور اسے منظور کر دیا گیا۔'' مولانا عثمانی نے مہاجرین کی یہ تنظیم قائم کرنے کا اعلان جنوری 1948ء کے اوائل میں عبدالحامد بدایونی کی جماعت کی تشکیل کے دو ایک دن بعد کیا تھا۔ بظاہر مولانا عثمانی کی جانب سے الگ جماعت کے قیام کی وجہ مذہبی فرقہ بندی تھی۔ بدایونی بریلوی فرقہ سے تعلق رکھتا تھا اور عثمانی کا تعلق دیوبندی فرقہ سے تھا۔ اب 17 ؍مارچ کو جمعیۃ المہاجرین کے دستور کے اعلان کا مطلب یہ تھا کہ سندھ کے وزیر اعلیٰ کھوڑو اور ہندوستانی ہائی کمشنر کی کوششوں کے باوجود ہندوؤں کو

سندھ میں نہیں رہنے دیا جائے گا۔ ''اسلام پسند'' مہاجرین کے نزدیک ان کی ''مسلم قومیت اور اسلامی اخوت'' کا تقاضا یہی تھا۔ ہندوؤں کے منقولہ وغیر منقولہ مال غنیمت میں بڑی دلکشی تھی۔

اسی دن یعنی 17 ر مارچ ہی کو سندھ مسلم لیگ کے صدر یوسف ہارون نے ایک بیان میں وزیر اعلیٰ کھوڑو کی تقریروں اور سرگرمیوں کو بالواسطہ طور پر ہدف تنقید بنایا اور اشارتاً یہ بتا دیا کہ اگر کھوڑو نے اپنا رویہ تبدیل نہ کیا تو اس کی حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے گا۔ چونکہ یوسف ہارون صوبائی گورنر غلام حسین ہدایت اللہ کا رشتہ دار اور مقامی سرمایہ داروں کا بااثر نمائندہ تھا اس لئے اس کے بیان سے پتہ چل گیا تھا کہ آئندہ سندھ کی سیاست کے دریا کا رخ کس طرف ہوگا۔ ہارون کا بیان تھا کہ ''سندھ میں مسلم لیگ اور قومی اتحاد و یکجہتی کو تسلیم کیا جائے۔ سندھ میں آباد شدہ مہاجر کسانوں، مزدوروں اور محنت کشوں کو چاہیے کہ وہ متحد ہو کر موجودہ حکومت کو چلائیں، اس کی اصلاح کریں، اس کی ہیئت کو بدلیں اور اگر ضروری ہو تو اسے بدل دیں۔ افراد کا کوئی گروہ خواہ وہ کتنا ہی طاقتور ہو، عوام الناس کی خواہش کی خلاف ورزی نہیں کر سکے گا۔ یہ دیکھ کر دکھ ہوا ہے کہ پاکستان میں لاکھوں عوام مصائب میں مبتلا ہیں، معاشی زندگی پارہ پارہ ہوگئی ہے، اقلیتوں کے پاؤں اکھڑ گئے ہیں، رشوت ستانی اور اقربا نوازی حکومت کی جڑوں کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں۔ مفاد پرست افراد اور پارٹیاں صوبہ پرستی اور مرکزی حکومت کے اجزائی یونٹوں کے درمیان اختلافات کی حوصلہ افزائی کر رہی ہیں۔ صوبائی مسلم لیگ کسی شخص یا پارٹی کو ملک کو تباہ کرنے یا ہمارے اسلامی نصب العین کو تبدیل کرنے کی اجازت نہیں دے گی۔''[51]

جب یوسف ہارون نے یہ بیان دیا تھا اس وقت تک کراچی کے مستقبل کے بارے میں صوبائی حکومت اور مرکزی حکومت کے درمیان مراسلت بے نتیجہ ثابت ہو چکی تھی اور اس تنازعہ کا تصفیہ کرنے کے لئے مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے جو مشترکہ پانچ رکنی کمیٹی قائم کی تھی اس کے ارکان میں بھی اتفاق رائے نہیں ہوا تھا اور 30 ر مارچ کی ایک رپورٹ کے مطابق اس سوال کا جواب نہیں ملتا تھا کہ یہ شہر صوبائی اور مرکزی حکومتوں کی دوعملی کے بوجھ کو کیسے برداشت کر سکے گا۔ حکومت سندھ نے اس تجویز سے تو اتفاق کر لیا تھا کہ کراچی کو پاکستان کا مستقل دارالحکومت بنا لیا جائے لیکن وہ اس شہر کو صوبہ سندھ سے الگ کرنے پر کسی صورت رضامند نہیں ہوتی تھی کیونکہ سندھی لیڈروں کا خیال یہ تھا کہ کراچی کے بغیر ان کا صوبہ ایک سر بریدہ لاش کی طرح ہوگا۔

صوبائی خودمختاری کے علمبردار وزیر اعلیٰ ایوب کھوڑو کی برطرفی

دریں اثنا کھوڑو کا تختہ الٹنے کے لئے پہلے سے تیار کردہ منصوبہ پر عمل درآمد شروع ہو چکا تھا۔ ایک طرف تو اس کی کابینہ کے دو ارکان پیر الٰہی بخش اور میر غلام علی تالپور نے صوبائی گورنر غلام حسین ہدایت اللہ کی تائید وحمایت سے بعض ارکان اسمبلی سے خفیہ ملاقاتیں شروع کر دیں تھیں اور دوسری طرف کھوڑو اس کوشش میں ہمہ تن مصروف ہو گیا تھا کہ اسے اسمبلی میں اکثریت کی حمایت حاصل رہے۔ اپریل کے دوسرے ہفتے میں کراچی کے اخبارات بھی صوبائی اقتدار کی اس رسہ کشی میں شریک ہو گئے۔ کھوڑو کے حامی اخبارات سندھ آبزرور اور الوحید، پیر الٰہی بخش اور غلام علی تالپور کو ہدف تنقید بناتے ہوئے ان کی محلاتی سازشوں کو بے نقاب کرنے لگے اور صوبائی گورنر اور مرکزی حکومت کے حامی اخبارات ''ڈان''، ''جنگ'' اور ''انجام'' وغیرہ نے کھوڑو کی مبینہ رشوت ستانی، اقربا نوازی اور دوسری بدعنوانیوں پر پے در پے حملے شروع کر دیئے۔

12 اور 14 راپریل کو کھوڑو کے مخالف ارکان اسمبلی کے خفیہ اجلاس ہوئے جن کے بعد پیر الٰہی بخش اور میر غلام علی تالپور نے ایک مشترکہ بیان میں بتایا کہ ''ہم پر شبہ کیا جا رہا ہے کہ ہم وزیر اعلیٰ کھوڑو کو قیادت سے ہٹانے کے لئے کنویسنگ کر رہے ہیں یہ بات قطعی طور پر غلط ہے۔ تاہم ہماری رائے یہ ہے کہ جو لیڈر اپنی پارٹی کے ارکان کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا اسے قائد بنے رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ ہم نے گزشتہ دو دنوں میں اپنے احباب کے ساتھ جو بات چیت کی ہے اس میں ان مسائل پر غور کیا گیا ہے کہ کس طرح وزیر اعلیٰ کھوڑو نے سارے اختیارات اپنی ذات میں مرتکز کر رکھے ہیں۔ صوبہ میں انتظامیہ کا زوال ہو رہا ہے۔ غیر قانونی احکامات جاری کئے جا رہے ہیں اور تمام سرکاری قواعد وضوابط کو قطعی طور پر نظر انداز کیا جا رہا ہے...... کھوڑو نے مختلف اضلاع کے ڈسٹرکٹ افسروں کو ٹیلیفون پر ہدایت کی ہے کہ وہ ارکان اسمبلی پر دباؤ ڈالیں تا کہ وہ اس کی حمایت سے دستبردار نہ ہوں۔ ہم نے صوبائی گورنر اور مرکزی حکومت کو اس امر کی اطلاع دے دی ہے۔''[52]

وزیر اعلیٰ کھوڑو نے اسی دن اپنے جوابی بیان میں کہا کہ ''جب کسی ملک میں سیاسی تنازعہ پیدا ہوتا ہے تو فریقین کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ اس بنیاد پر ہوتا ہے کہ کس کو عوامی حمایت

حاصل ہے۔عوامی حمایت کا تعین عام انتخابات یا اسمبلی میں ہوتا ہے۔ جہاں تک اسمبلی کا تعلق ہے یہ تقریباً ڈیڑھ دو ماہ قبل مجھ پر اعتماد کا اظہار کر چکی ہے جبکہ اس نے متفقہ طور پر بجٹ منظور کیا تھا...... میرے مخالفین میرے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں اگر وہ دیانت داری سے اسے صحیح سمجھتے ہیں تو انہیں پہلے میری ذات سے الگ ہونا چاہیے اور پھر بیان بازی کرنی چاہیے۔ اسمبلی پارٹی کا اجلاس 30 اپریل کو ہو رہا ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ اس اجلاس میں اس مسئلہ سے مناسب طریقے سے نبٹا جائے گا۔''[53] 16 اپریل کو پیرالٰہی بخش اور میر غلام علی تالپور کا جواب الجواب یہ تھا کہ اگر وزیراعلیٰ کھوڑو اپنی حمایت کا تعین کرنا چاہتا ہے تو اسے عہدہ سے استعفیٰ دے کر اس کی آزمائش کرنی چاہیے۔ ''اصول یہ ہے کہ جب کبھی کسی کابینہ کے وزیر کا وزیراعلیٰ سے اختلاف ہو جائے تو وزیراعلیٰ کو گورنر سے رجوع کرنا چاہیے مگر کھوڑو نے ایسا نہیں کیا کیونکہ اسے معلوم ہے کہ اگر اس نے استعفیٰ دے دیا تو کوئی ایک رکن اسمبلی بھی اس کا ساتھ نہیں دے گا...... کھوڑو جی۔ ایم۔ سید کو اپنے ہاں بلاتا رہا ہے اور خود بھی اس کے ہاں جا کر صلاح مشورہ کرتا رہا ہے۔''[54]

تاہم اس بیان بازی کے نتیجے میں نہ تو پیرالٰہی بخش اور میر غلام علی تالپور وزارت سے الگ ہوئے اور نہ ہی ایم۔ اے کھوڑو نے اپنی کابینہ کا استعفیٰ پیش کیا۔ البتہ صوبائی گورنر غلام حسین ہدایت اللہ نے ایک ایسا اقدام کیا جو پارلیمانی جمہوریت کی تاریخ میں بے مثال تھا اور جس کا مروجہ آئین سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نے 16 اپریل کی شام کو ایک حکم صادر کیا جس کے تحت صوبائی کابینہ کے چاروں وزراء کے محکموں میں از خود ہی ردوبدل کر دیا۔ 15 اگست 1947ء کو جب کھوڑو کی وزارت کی تشکیل ہوئی تھی تو اس وقت وزراء میں محکموں کی تقسیم حسب ذیل تھی۔

1۔	وزیراعلیٰ ایم۔اے۔کھوڑو	داخلہ، خزانہ، ترقیات اور تعمیرات عامہ۔
2۔	پیرالٰہی بخش	تعلیم، لوکل سیلف گورنمنٹ، میڈیکل، صحت عامہ اور رینٹ کنٹرول
3۔	میر غلام علی تالپور	خوراک، سول سپلائیز، زراعت، ماہی پروری، صنعت اور محنت۔
4۔	قاضی فضل اللہ	مال، جنگلات، آبکاری، اور قانون۔

لیکن اب 16 اپریل کو صوبائی گورنر غلام حسین ہدایت اللہ نے وزیراعلیٰ کھوڑو کو محکمہ

داخلہ اور محکمہ تعمیرات عامہ سے اور اس کے دست راست قاضی فضل اللہ کو محکمہ مال اور محکمہ قانون سے محروم کر دیا۔ میر غلام علی تالپور کو مال اور پی۔ڈبلیو۔ڈی اور پیر الٰہی بخش کو داخلہ، تعلیم، لوکل سیلف گورنمنٹ اور پبلک ہیلتھ کے محکمے دیئے گئے۔ کھوڑو کے پاس اب صرف فنانس، سروسز اور پولیٹکل محکمے رہ گئے اور قاضی فضل اللہ کو زراعت، صنعت، خوراک اور سول سپلائیز کے محکمے دیئے گئے۔[55]

صوبائی گورنر کی طرف سے غیر آئینی اور غیر جمہوری طور پر صوبائی وزراء کے محکموں میں اس ردوبدل کا مطلب یہ تھا کہ کھوڑو کے اقتدار سے بے دخلی کی گھنٹی بج گئی ہے۔ کھوڑو کو داخلہ اور تعمیرات عامہ کے محکموں سے اس لئے محروم کیا گیا تھا کہ وہ اسمبلی میں اپنی اکثریت کو قائم رکھنے کے لئے نہ تو محکمہ پولیس کا استعمال کر کے ارکان اسمبلی کو خوفزدہ کر سکے اور نہ ہی ٹھیکوں وغیرہ کے ذریعے انہیں کوئی لالچ دے سکے۔ قاضی فضل اللہ کو مال اور قانون کے محکموں سے الگ کر دینے کا مقصد یہ تھا کہ زمیندار ارکان اسمبلی پر کھوڑو کے حق میں محکمہ مال کے ذریعے کوئی دباؤ نہ ڈالا جا سکے اور زمینداروں کے مفادات کے خلاف کوئی قانون سازی نہ ہو سکے۔ قبل ازیں پیر الٰہی بخش اور میر غلام علی تالپور اپنے مشترکہ بیان میں یہ الزام عائد کر چکے تھے کہ کھوڑو اسمبلی میں اپنی اکثریت کو قائم رکھنے کے لئے ڈسٹرکٹ افسروں کے ذریعے دباؤ ڈلوا رہا ہے۔ محکموں کے اس ردوبدل سے سندھ کے جاگیرداروں کے دو دھڑوں کے درمیان سیاسی قوت کے توازن میں تبدیلی آ گئی۔ چونکہ مرکزی حکومت صوبائی گورنر کی وساطت سے اس دھڑے بندی میں ملوث تھی اس لئے گورنر کی اس غیر آئینی و غیر جمہوری کارروائی سے نہ صرف صوبہ کے ڈسٹرکٹ افسروں کو بلکہ موقع پرست ارکان اسمبلی کو بھی پتہ چل گیا کہ آئندہ سیاسی ہوا کا رخ کس طرف ہوگا۔

گورنر کی اس کارروائی سے ایک دن قبل پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے بحریہ کے افسروں اور جوانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''میں محسوس کرتا ہوں کہ صرف ایک ہی چیز پاکستان کو نقصان پہنچا سکتی ہے اور وہ صوبہ پرستی کا جذبہ ہے۔ کس کو بھی سندھی، پٹھان، بلوچ، پنجابی اور بنگالی کی حیثیت سے نہیں سوچنا چاہیے۔ اگر ہم میں صوبہ پرستی کا جذبہ کارفرما ہوا اور اگر ہم نے پاکستانی کی بجائے صوبائی نقطۂ نگاہ سے سوچا تو پاکستان کمزور ملک ہوگا۔ میری خواہش ہے کہ پاکستان کی بحریہ، بری فوج اور ہوائی فوج کو اس سلسلے میں ایک مثال قائم کرنی چاہیے اور یہ ثابت کرنا چاہیے کہ ہم سب پاکستانی ہیں۔ ہمیں صوبہ پرستی کو بھول جانا چاہیے۔''[56]

بظاہر لیاقت علی خان کے یہ الفاظ بڑے دلکش اور خوشنما تھے لیکن سب کو معلوم تھا کہ ان الفاظ کا رخ سندھ کے وزیر اعلیٰ کھوڑو کی طرف ہے لہٰذا اس کے اقتدار کا چراغ گل ہونے والا ہے۔ ان دنوں جو کوئی صوبائی لیڈر صوبائی خودمختاری، صوبائی حقوق اور صوبائی ثقافت کے تحفظ کی بات کرتا تھا اس پر صوبہ پرستی کا ٹھپہ لگا کر اسے مسلم قومیت، اسلامی اخوت اور پاکستان کا غدار قرار دیا جانے لگتا تھا۔ لیاقت علی خان بحری، بری اور ہوائی افواج کے افسروں اور جوانوں کو یہ مشورہ تو دیتا تھا، کہ وہ صوبہ پرستی سے بالاتر ہونے کی مثال قائم کریں لیکن وہ اس حقیقت کا اعتراف نہیں کرتا تھا کہ ان افواج میں سندھیوں، بنگالیوں، بلوچوں اور پٹھانوں کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے اور یہ بھی نہیں کہتا تھا کہ آئندہ ان پسماندہ صوبوں کے لوگوں کو ان افواج میں پوری نمائندگی دی جائے گی۔ ان دنوں پنجاب میں یہ الزام عائد ہونے لگا تھا کہ وہ اس صوبہ کی سیاست میں جاگیردارانہ دھڑے بندی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور یہ کہ وہ تنگ نظر صوبہ پرست ہونے کے باعث یو۔ پی کے ''نقلی مہاجرین'' کو بہت زیادہ نوازتا تھا۔ لیاقت علی خان کے قول وفعل میں تضاد کسی بھی سیاسی اہل نظر سے پوشیدہ نہیں تھا۔

17 ر اپریل کو کراچی کے روزنامہ ''انجام'' نے اپنے اداریے میں اس امر پر رنج والم کا اظہار کیا کہ ''سندھ میں مہاجرین کی حالت بڑی خراب ہے اور وہ صوبائی حکام کی تنگ نظری وصوبہ پرستی کا شکار ہورہے ہیں۔''[57] 19 ر اپریل کو کراچی میں کمیٹی برائے بحالیات مہاجر دستکاروں اور کاریگروں کا ایک اجلاس ڈاکٹر ڈی۔ ایم۔ ملک کی زیر صدارت منعقد ہوا جس میں یہ بتایا گیا کہ اس کمیٹی کی حیدرآباد شاخ کے سیکرٹری مولانا عبدالقیوم کانپوری کو گرفتار کرلیا گیا ہے کیونکہ وہ شہر میں پروپیگنڈا کرتا تھا کہ مہاجر دستکاروں اور کاریگروں کی فہرست بنائی جائے۔ چنانچہ یہ فیصلہ ہوا کہ مرکزی کمیٹی کے سرکردہ ارکان اس واقعہ کی تحقیقات کے لئے صوبائی وزراء پیر الٰہی بخش اور میر غلام علی تالپور کے ہمراہ حیدرآباد جائیں گے۔[58] کمیٹی کے اس فیصلے کا مطلب یہ تھا کہ پیر الٰہی بخش اور میر غلام علی تالپور کا ستارہ بڑی تیزی سے عروج پذیر ہورہا تھا اور انہوں نے وزیر اعلیٰ کھوڑو کی مرضی کے خلاف اپنے نئے محکموں کی ذمہ داریاں سنبھال لیں تھیں۔

اس صورت حال کے پیش نظر کھوڑو نے 22 ر اپریل کو اندرون سندھ کے دورے سے واپسی پر صوبائی گورنر سے درخواست کی کہ مئی کے پہلے ہفتے میں صوبائی اسمبلی کا مختصر اجلاس بلایا

جائے تا کہ وہ اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کر سکے۔ پھر 26 ر اپریل کو کھوڑو نے ایک بیان میں کہا کہ اگر پاکستان کے گورنر جنرل مجھ سے کہیں تو میں وزارت اعلیٰ سے مستعفی ہو جاؤں گا۔ اس سلسلے میں پہل میں نہیں کر سکتا۔ میں گورنر جنرل سے دو بار ملاقات کر چکا ہوں اور انہیں زبانی اور تحریری طور پر سندھ کے وزارتی تنازعے کی تفصیلات بتا چکا ہوں۔ میں نے 30 ر اپریل کو لیگ اسمبلی پارٹی کا اجلاس بلایا ہے۔ میں پارٹی کا قائد ہوں اور اسمبلی میں مجھے اکثریت کی حمایت حاصل ہے۔[59]

صوبائی گورنر نے کھوڑو کی 22 ر اپریل کی درخواست اور 26 ر اپریل کے بیان کو درخور اعتناء نہ سمجھا۔ البتہ اس نے اس دن یعنی 26 ر اپریل کو گورنر جنرل کی ہدایت کے مطابق گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (1935ء) کی ترمیم شدہ دفعہ 51 کے تحت وزیر اعلیٰ کھوڑو کو برطرف کر دیا۔ الزام یہ تھا کہ وہ بادی النظر اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران بدانتظامی، بدعنوانی اور رشوت ستانی کا مرتکب ہوا ہے۔ اس سلسلے میں جو سرکاری اعلان جاری کیا گیا اس میں بتایا گیا کہ ''ان الزام کی تحقیقات کے لئے فوری طور پر ایک عدالتی ٹربیونل مقرر کیا جائے گا اور کھوڑو کو اس ٹربیونل کے روبرو اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع ملے گا۔''[60]

سید نور احمد سندھ کی سیاست میں اس مد و جزر کے پس منظر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''اپریل 1948ء میں جب قائداعظم ابھی پشاور میں ہی تھے کہ سندھ کی کابینہ میں وزراء کے باہمی اختلافات نے ایک سکینڈل کی صورت اختیار کر لی۔ یہ وزیر صاحبان پبلک طور پر اخباری بیانات کے ذریعے ایک دوسرے کے خلاف الزام لگا رہے تھے۔ قائداعظم نے اس کا فوری نوٹس لیا۔ گورنر سے رپورٹ مانگی۔ یہ رپورٹ انہیں کراچی میں واپسی پر ملی۔ اس کا مطالعہ کرنے اور صوبائی وزیر اعلیٰ کھوڑو کا جواب سننے کے بعد آپ نے گورنر کو ہدایت بھیج دی کہ کھوڑو کو فوراً عہدے سے برطرف کر دیا جائے اور مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کو اپنا نیا لیڈر منتخب کرنے کا موقع دیا جائے۔''[61]

چودھری محمد علی لکھتا ہے کہ ''تقسیم سے قبل سیاسی ردوبدل کے لئے سندھ بہت بدنام تھا۔ جو مختلف گروہوں میں بدلتے ہوئے گٹھ جوڑ کا نتیجہ تھا۔ تقسیم کے وقت عنان اقتدار پوری مضبوطی سے محمد ایوب کھوڑو کی سربراہی میں ایک مسلم لیگی وزارت کے ہاتھ میں تھی لیکن گورنر غلام حسین ہدایت اللہ کے ساتھ وزیر اعلیٰ کھوڑو کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ اپریل 1948ء میں کھوڑو اور

ان کے دووزیروں پیرالٰہی بخش اور میر غلام علی تالپور کے درمیان کھلے بندوں نزاع کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اخبارات میں الزامات اور جوابی الزامات شائع ہوئے۔ گورنر نے اس خیال سے وزیروں کے محکمے تبدیل کردیئے کہ شاید اس طرح کابینہ زیادہ خوش اسلوبی سے کام کرسکے گی لیکن کھوڑو نے اسے گورنر کی بے جا مداخلت سمجھا۔ معاملہ قائداعظم تک پہنچا اور گورنر نے ان کے سامنے کھوڑو کی بدانتظامی اور رشوت ستانی کی شہادتیں پیش کردیں۔ قائداعظم پاکستان میں ایسی خرابیوں کو جڑ سے اکھاڑ دینے کا عزم صمیم رکھتے تھے چنانچہ انکی ہدایت پر 26 اپریل 1948ء کو گورنر نے وزیراعلیٰ کھوڑو کو برطرف کردیا حالانکہ انہیں سندھ اسمبلی میں اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔ یہ اقدام ترمیم شدہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کی دفعہ 51 کے تحت کیا گیا۔ اس دفعہ میں قرار دیا گیا تھا کہ گورنر کے وزراء ''اس کی خوشنودی تک ہی برسراقتدار رہیں گے'' اور گورنر اس دفعہ کے تحت اپنے فرائض ادا کرنے میں ''گورنر جنرل کے عام کنٹرول کے تابع ہوگا اور ان خاص ہدایات کی تعمیل کرے گا جو اسے وقتاً فوقتاً دی جائیں گی۔''[62]

دراصل سندھ کے وزیراعلیٰ کھوڑو کی غیر جمہوری برطرفی کا پس منظر ایسا سیدھا سادا اور معمولی نہیں جیسا کہ سید نور احمد اور چودھری محمد علی نے بیان کیا ہے۔ کھوڑو کی برطرفی اس لئے عمل میں نہیں آئی تھی کہ اس کے اپنی کابینہ کے دو ارکان سے یکا یک اختلافات پیدا ہوگئے تھے یا یہ کہ اس کے گورنر کے ساتھ اچھے تعلقات نہیں تھے یا یہ کہ وہ بدانتظامی، بدعنوانی اور رشوت ستانی کا مرتکب ہوا تھا۔ کھوڑو کی برطرفی کا اصلی پس منظر یہ تھا کہ وہ اس زمانے میں سندھ کے ان عناصر کی نمائندگی کرتا تھا جو اپنے صوبہ کے لئے زیادہ سے زیادہ خودمختاری کے طلب گار تھے تاکہ مقامی جاگیردار اور درمیانہ طبقے قیام پاکستان کے بعد سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی طور پر مستفید ہو سکیں۔ یہ عناصر نہیں چاہتے تھے کہ صوبائی زندگی کے ہر شعبہ پر مشرقی پنجاب اور یو۔ پی کے اصلی اور نقلی مہاجرین کا غلبہ ہوجائے اور سندھی عوام بدستور پسماندگی اور زبوں حالی ہی میں مبتلا رہیں۔ دوسری طرف مرکزی حکومت نہ صرف اس صوبہ میں زیادہ سے زیادہ مہاجرین کو آباد کرنے کی خواہاں تھی بلکہ وہ زیادہ سے زیادہ سیاسی، انتظامی اور معاشی اختیارات بھی اپنے ہاتھوں میں ہی مرتکز کرنا چاہتی تھی۔ حکومت سندھ اور مرکزی حکومت کے درمیان اس تضاد کا مظاہرہ نومبر۔ دسمبر 1947ء میں ہی ہوگیا تھا جب کہ صوبائی وزیراعلیٰ کھوڑو نے قائداعظم کی ہدایت کے باوجود ڈیڑھ

لاکھ سے زائد مہاجرین کو اپنے صوبے میں آباد کرنے سے انکار کردیا تھا۔ پھر جنوری 1948ء میں اس تضاد کی شدت میں اضافہ ہوا جبکہ مرکزی حکومت نے اپنے اس ارادہ کا اظہار کیا کہ کراچی شہر کو صوبہ سندھ سے الگ کردیا جائے گا۔ تقریباً 2 ماہ تک اس سلسلے میں دونوں حکومتوں کے درمیان مراسلت اور مذاکرات کا سلسلہ جاری رہا مگر اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ چنانچہ مرکزی حکومت کو یہ غیر جمہوری فیصلہ کرنا پڑا کہ کھوڑو کو برطرف کرکے اس کی جگہ کسی ایسے شخص کو صوبائی حکومت کا سربراہ بنایا جائے جو مرکز کے ہر حکم کی بلاچون وچرا تعمیل کرے۔ اس وقت تک مرکزی حکومت پاکستان صوبوں کے کئی ایک مالی اختیارات اپنی تحویل میں لے چکی تھی اور یہ بھی فیصلہ کر چکی تھی کہ آئندہ صنعتی شعبہ صوبائی حکومتوں کے ماتحت نہیں ہوگا بلکہ پورے ملک کی صنعتی ترقی کی نگرانی براہ راست مرکزی حکومت کرے گی۔

جہاں تک بدانتظامی، بدعنوانی اور رشوت کے الزامات کا تعلق تھا یہ الزامات صرف کھوڑو تک ہی محدود نہیں تھے۔ صوبہ سرحد میں عبدالقیوم خان کی بدعنوانی اور رشوت ستانی کا یہ عالم تھا کہ قائداعظم نے 20/اپریل کو پشاور کے جلسۂ عام میں اس کا نوٹس لیا تھا اور یہ کہا تھا کہ ''مجھے معلوم ہے کہ ہم میں ایسے اشخاص بھی ہیں جو بدعنوانی، رشوت ستانی اور اقربا نوازی کے مجرم ہیں......آپ کی حکومت، آپ کا صوبہ، آپ کی وزارت اور آپ کے سرکاری ملازمین ہماری نظر میں ہیں......ہم بہت جلد اس کا تجزیہ کرنے کے قابل ہوجائیں گے اور اپنے جسد سیاست سے زہر کو باہر نکال پھینکیں گے لیکن آپ کو صبر وتحمل سے کام لینا چاہیے اور ہمیں موقع اور معقول وقت دینا چاہیے۔''[63] پنجاب کے وزیر اعلیٰ نواب افتخار حسین آف ممدوٹ اور مشرقی بنگال کے وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کے خلاف بھی بدانتظامی، نااہلی، بدعنوانی اور اقربا نوازی کے الزامات عائد کئے جاتے تھے۔ ''کھوڑو کی برطرفی سے ایک دن قبل یعنی 25/اپریل کو قائداعظم نے پنجاب کے تین وزراء نواب ممدوٹ، ممتاز دولتانہ اور سردار شوکت حیات خان سے ملاقات کی تھی جس میں صوبائی کابینہ میں توسیع کے بارے میں پیدا شدہ مشکلات کے علاوہ یہ مسئلہ بھی زیر بحث آیا تھا کہ ''حکومت پنجاب'' مرکزی حکومت کی جانب سے مقرر کردہ سپیشل پولیس فورس کے ان افسروں سے تعاون نہیں کرتی تھی جو صوبہ میں رشوت ستانی کے انسداد کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔''[64] بایں ہمہ ان سب کے برعکس کھوڑو کے معاملے میں ''موقع اور معقول وقت'' کے انتظار

کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ خدشہ تھا کہ اگر اسے فوراً برطرف نہ کیا گیا تو وہ سندھی شاونزم کی بنیاد پر کراچی کو صوبہ سے الگ کرنے کی تحریک کے خلاف زبردست ایجی ٹیشن کرا دے گا۔ اس نے 24ر فروری 1948ء کو ہی سندھ مسلم لیگ کی پارلیمانی کمیٹی کی سٹینڈنگ کمیٹی سے یہ قرارداد منظور کرالی تھی کہ کراچی کو سندھ سے الگ کرنے کی تحریک کی ہر ممکن طریقے سے مخالفت کی جائے گی۔ 8ر مارچ 1948ء کو خان عبدالغفار خان اور جی۔ ایم۔ سید کی پیپلز پارٹی کے منشور کے اعلان کے بعد مرکزی حکومت کے اس خدشہ میں زبردست اضافہ ہو گیا تھا کیونکہ کھوڑو نے اس پارٹی کے قیام پر کوئی نکتہ چینی نہیں کی تھی بلکہ اس مضمون کی خبریں شائع ہوئی تھیں کہ وہ قائداعظم کے معتوب اور سندھی شاونزم کے عظیم ترین علمبردار جی۔ ایم۔ سید سے صلاح مشورہ کرتا ہے۔ کھوڑو کا پروگرام یہ تھا کہ وہ 30ر اپریل 1948ء کو صوبائی اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کے بعد پیر الٰہی بخش اور میر غلام علی تالپور کو کابینہ سے نکال دے گا مگر چار دن قبل اس کی برطرفی کے باعث اس کا یہ پروگرام زیر عمل نہ آسکا۔ اسے دراصل 24ر فروری کو سندھ لیگ پارلیمانی پارٹی کی سٹینڈنگ کمیٹی کی قرارداد کے فوراً ہی بعد ان دونوں باغی وزراء کو سبکدوش کر دینا چاہیے تھا۔ اس نے اس معاملے میں تقریباً دو ماہ تک پس و پیش کیا جس کے نتیجے میں اسے خود 26ر اپریل کو صوبہ کی وزارت عظمیٰ سے الگ ہونا پڑا۔

باب: 8

الٰہی بخش وزارت اور
کراچی کی سندھ سے علیحدگی

جمعہ کے خطبہ میں قائداعظم کا نام پڑھنے والے
پیر الٰہی بخش کی وزارت کا قیام اور کھوڑو کے خلاف مقدمہ

27 ؍اپریل 1948ء کو کراچی میں میر غلام علی تالپور کے مکان پر صوبائی لیگ اسمبلی پارٹی کے صرف 19 ارکان کا ایک اجتماع ہوا جس میں پیر الٰہی بخش کو پارٹی کا قائد اور میر غلام علی تالپور کو نائب قائد منتخب کیا گیا لیکن اگلے دن پیر الٰہی بخش کی نئی کابینہ حلف نہ اٹھا سکی کیونکہ بعض ارکان اسمبلی کی طرف سے یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ 27 ؍اپریل کا لیگ پارٹی کا اجلاس غیر آئینی تھا کیونکہ اس کے لئے تین دن کا نوٹس نہیں دیا گیا تھا۔ چنانچہ پارٹی کا ایک اور اجلاس 3 ؍مئی کو ہوا جس میں 27 ؍اپریل کے انتخاب کی توثیق کر دی گئی اور کھوڑو کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ ارکان اسمبلی جو چند دن قبل تک قسمیں کھا کر اسے اپنی وفاداری کا یقین دلاتے تھے اب یکا یک پیر الٰہی بخش کے عقیدت مند بن گئے تھے۔ سندھ میں اس قسم کی سیاسی قلابازیوں کی روایت کوئی نئی نہیں تھی تاہم اس موقع پر متعدد ارکان اسمبلی کی جانب سے کھوڑو سے بے تعلقی کے اظہار کی ایک وجہ غالباً یہ تھی کہ حکومت سندھ نے 30 ؍اپریل کو کھوڑو کے حامی اخبار ''سندھ آبزرور'' کی اشاعت پر ایک ماہ کے لئے پابندی عائد کر کے یہ حقیقت بالکل ہی واضح کر دی تھی کہ آئندہ صوبہ میں کھوڑو

سیاسی قوت کا حامل نہیں ہوگا۔ اس اخبار پر الزام یہ تھا کہ اس نے ''مرکز اور بلوچستان میں سندھ کا بٹوارہ'' کے زیر عنوان ایک مضمون شائع کیا تھا جس کا ''ایک ایک لفظ شرارت سے بھرا ہوا تھا۔'' اور اس سے ''حکومت سندھ اور حکومت پاکستان کے خلاف بدظنی پھیلنے، پاکستانی عوام کے باہمی تعلقات کے خراب ہونے اور امن وعامہ میں خلل پڑنے کا اندیشہ تھا۔''

3رمئی کو پیرالٰہی بخش کی کابینہ نے حلف اٹھایا۔ یہ کابینہ الٰہی بخش کے علاوہ میر غلام علی تالپور، میراں محمد شاہ اور محمد اعظم پر مشتمل تھی۔ یہ پیرالٰہی بخش وہی تھا جس نے کھوڑو حکومت میں وزیر تعلیم کی حیثیت سے 26راگست 1947ء کو یہ تجویز پیش کی تھی کہ پاکستان کے طول وعرض میں جمعہ کے خطبہ میں قائداعظم محمد علی جناح کا نام لیا جانا چاہیے۔ لاہور کے اخبار نوائے وقت میں اس کی اس تجویز کے بارے میں جو خبر شائع ہوئی تھی اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ ''پاکستان کالونی مسجد میں نماز جمعہ کے خطبہ میں حضرت قائداعظم محمد علی جناح گورنر جنرل پاکستان کا اسم گرامی پڑھا گیا۔ امامت کے فرائض حاجی پیرالٰہی بخش وزیر معارف حکومت سندھ نے سرانجام دیئے۔ ایک بیان میں حاجی پیرالٰہی بخش نے فرمایا کہ مسلمانوں میں یہ رسم چلی آرہی ہے کہ اگر مسلم ملک میں کوئی خلیفہ یا بادشاہ ہوتو اس کا نام خطبہ میں لیا جائے۔ چونکہ پاکستان ایک آزاد وخودمختار ملک بن چکا ہے اور قائداعظم رئیس الحکومت ہیں اس لئے ان کا اسم گرامی خطبہ میں شامل کرنا لازمی ہے اور پاکستان کے طول وعرض میں جمعہ کی نماز کے خطبہ میں ان کا نام لیا جانا چاہیے۔ پاکستان کالونی مسجد نے پہل کی اور خطبہ میں قائداعظم کا نام اس طرح پڑھا گیا ''امیر ملت قائداعظم محمد علی جناح۔'' 3رمئی 1948ء کو اسی پیرالٰہی بخش نے سندھ کی وزارت اعلیٰ کے عہدہ کا حلف اٹھایا تو 4رمئی کو مرکزی وزیر بحالیات راجہ غضنفر علی خان نے حکومت پاکستان اور حکومت سندھ کی مشترکہ ریفیوجی کونسل کی تشکیل کا اعلان کیا جو وزیراعظم لیاقت علی خان، صوبائی گورنر شیخ غلام حسین ہدایت اللہ، مرکزی وزیر بحالیات راجہ غضنفر علی خان اور سندھ کے نئے اسلام پسند وزیراعلیٰ پیرالٰہی بخش پر مشتمل تھی۔[1]

5رمئی کو نہایت ہی پاکیزہ فضا میں سندھ کے وزیراعظم پیرالٰہی بخش نے اپنے تینوں رفقاء کے ہمراہ وزارت کا چارج لینے سے پہلے حضرت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کے سامنے صحیح راستہ پر چلنے اور اپنی ذمہ داری کا پورا احساس رکھنے کا عہد کیا۔ یکے بعد دیگرے قرآن حکیم ہاتھ

میں لے کر ایک ایک وزیر نے نرم آواز میں عہد کیا کہ وہ اس عزم پر قائم رہیں گے۔ پراسرار خاموشی نے موقع کو بہت زیادہ سنجیدہ بنا دیا تھا۔ شیخ الاسلام درمیان میں بارعب اور پروقار انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب شیخ الاسلام نے ان کو دعائیں دیں اور خدا تعالیٰ سے دعا فرمائی کہ الٰہی ان لوگوں کو یقین محکم، دوراندیشی اور عزم عطا کرتا کہ یہ ضرورت منداور لاچار لوگوں کا سہارا بنیں اور اسلام کے بتائے ہوئے راستہ پر یقین اور ایمان کے ساتھ گامزن ہوں تو وزیروں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔''[2]

کراچی کی ''نہایت ہی پاکیزہ فضا'' میں اس مقدس تقریب حلف برداری کا مطلب یہ تھا کہ پیرالٰہی بخش کی حکومت مہاجرین کے بارے میں وہ رویہ اختیار نہیں کرے گی جو کھوڑو نے اختیار کئے رکھا تھا بلکہ یہ ضرورت منداور لاچار لوگوں کا سہارا بنے گی اور اسلام کے بتائے ہوئے راستے پر یقین و ایمان کے ساتھ گامزن ہو گی۔ آئندہ اصلی اور نقلی دونوں ہی قسم کے مہاجرین کو ہندوؤں کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیدادوں پر قبضہ کرنے کی کھلی چھٹی ہو گی۔ ان کے لئے صوبائی حکومت میں سرکاری ملازمتوں کے سارے دروازے کھلے ہوں گے۔ انہیں تجارت اور صنعت کے شعبوں میں خصوصی مراعات دی جائیں گی۔ صوبائی حکومت کو کراچی کی سندھ سے علیحدگی پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور وہ اپنا دارالحکومت حیدرآباد میں منتقل کرنے پر آمادہ ہو گی۔ دراصل صوبائی حکومت کی پالیسی میں اس قسم کی تبدیلی کا اشارہ لاہور کے اخبار پاکستان ٹائمز کی اسی دن کی رپورٹ سے مل گیا تھا جس دن کھوڑو کو برطرف کیا گیا تھا۔ اس اخبار کی 27 راپریل کی ایک رپورٹ کے مطابق مہاجرین کا مسئلہ صوبائی وزراء میں باہمی اختلافات کا باعث بنا تھا۔ وزیراعلیٰ کھوڑو صوبہ میں صرف اتنے ہی مہاجرین کو قبول کرنے پر آمادہ تھا جن سے صوبہ کے معاشی نظام میں ذرہ برابر بھی تبدیلی کی ضرورت نہ پڑے جبکہ پیرالٰہی بخش اس سلسلے میں فراخدلانہ پالیسی کا حامی تھا۔ وزراء کا باہمی اختلاف اس وقت نظر آیا تھا جبکہ وزیراعلیٰ کھوڑو نے رینٹ کنٹرول کا محکمہ پیرالٰہی بخش سے لے کر اپنے معتمد دوست قاضی فضل اللہ کو دے دیا تھا۔

9 رمئی کو حکومت سندھ کے محکمہ داخلہ نے سابق وزیراعلیٰ کھوڑو کے خلاف بدعنوانی کے الزامات کی ابتدائی تفتیش شروع کر دی۔ اس کام پر خفیہ پولیس کے ایک ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ کو مامور کیا گیا۔ جس نے 1946ء میں اللہ بخش قتل کیس میں کھوڑو کے خلاف تفتیش کی تھی اور جسے

کھوڑو نے 15 راگست 1947ء کو برسراقتدار آنے کے بعد ریٹائر کر دیا تھا۔"[3]

اسی دن یعنی 9 رمئی کو خان عبدالغفار خان کی پیپلز پارٹی کی سب جیکٹس کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں پیپلز پارٹی کا نام بدل کر پیپلز آرگنائزیشن رکھنے کا فیصلہ کیا گیا اور اس مسئلہ پر غور کیا گیا کہ ان جماعتوں کو پیپلز آرگنائزیشن میں مدغم کر دیا جائے جن کے اغراض و مقاصد وہی ہیں جو اس جماعت کے ہیں اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایسی جماعتوں کے ممبر پیپلز آرگنائزیشن کے عہد نامہ پر دستخط کر کے اس جماعت کے ممبر بن سکتے ہیں اور اپنی جماعت کے ممبر بھی رہ سکتے ہیں۔[4] اس فیصلہ سے ظاہر تھا کہ خان عبدالغفار خان اور جی۔ ایم۔ سید ''لسانی اور ثقافتی یونٹوں کی خود مختاری'' کے مطالبہ کی بنیاد پر برسراقتدار مسلم لیگ کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کے خواہاں تھے لیکن مسلم لیگ کی مرکزی حکومت عملی طور پر وفاقی نہیں تھی بلکہ یہ وحدانی تھی جس کے تحت صوبوں کی حیثیت روز بروز کم ہو رہی تھی۔ غالباً جی۔ ایم۔ سید کا خیال تھا کہ سندھ میں کھوڑو کا گروپ اس عوامی تنظیم میں شامل ہو جائے گا کیونکہ کھوڑو اور جی۔ ایم۔ سید کے سیاسی مقاصد میں کوئی فرق نہیں تھا اور دونوں ایک دوسرے سے صلاح مشورہ بھی کرتے رہے تھے۔ پارٹی کے تین روزہ کنونشن کے بعد 10 رمئی کو عوامی تنظیم کی تشکیل کا اعلان کیا گیا۔ خان عبدالغفار خان اس کا عارضی صدر تھا اور جی۔ ایم۔ سید کا انتخاب بطور عارضی سیکرٹری ہوا تھا۔ اس اعلان کے دو دن بعد کراچی کے ایک ہفت روزہ ''نیو سندھ'' کی اشاعت چھ ماہ کے لئے بند کر دی گئی۔ الزام یہ تھا کہ یہ جریدہ گزشتہ دو ماہ سے پاکستان اور سندھ کے بعض وزراء کو ناجائز طور پر ہدف تنقید بنا رہا تھا۔

20 رمئی کو مرکزی وزیر خزانہ غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی میں کراچی میں مہاجرین کے لئے مکانوں اور دکانوں کی تعمیر کے بارے میں ہاشم گزدر کی ایک قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ خوش قسمتی سے کھوڑو کے اقتدار کا بھیانک دور ختم ہو گیا ہے۔ اس کی وزارت سندھ میں سندھیوں اور غیر سندھیوں کے درمیان نفرت کا بیج بونے کی ذمہ دار ہے۔ وزیر مہاجرین راجہ غضنفر علی خان نے کہا کہ کھوڑو کی حکومت نے مہاجرین کے بارے میں بے رخی سے کام لے کر اپنے نام کو بٹہ لگا دیا ہے۔ اس نے یقین دلایا کہ اب سندھ میں مہاجرین کی بحالی کا جو نیا محکمہ کھلا ہے اس کی وجہ سے یہ مسئلہ تسلی بخش طور پر حل ہو جائے گا۔ کھوڑو نے جوابی تقریر میں ان الزامات کی تردید کی اور کہا کہ اس کی حکومت نے صوبے کی مالی حیثیت کے مطابق مہاجرین کے لئے سب کچھ کیا تھا مگر

اس معاملے میں خود حکومت پاکستان کا رویہ اچھا نہیں تھا۔[5]

جب دستور ساز اسمبلی میں یہ مباحثہ ہو رہا تھا تو کراچی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے روبرو لائنوٹائپ مشین کیس کی ابتدائی سماعت ہو رہی تھی جس کے دوران عدالت نے ایوب کھوڑو کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ ایک لاکھ روپے کی ضمانت پیش کرے۔ کھوڑو اس موقع پر عدالت میں حاضر نہیں تھا کیونکہ ایک دن قبل اسے حاضری سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا تھا۔ البتہ اس کا وکیل اے۔ کے۔ بروہی موجود تھا۔ اس فوجداری مقدمہ کی نوعیت یہ تھی کہ یہ مشین دراصل سندھ گورنمنٹ پریس کی ملکیت تھی لیکن یہ کھوڑو کے حامی اخبار ''سندھ آبزرور'' کے پریس میں لگی ہوئی تھی۔ پاکستان سپیشل پولیس نے چند دن قبل اس مسروقہ مشین کو برآمد کر کے جن افراد کا چالان کیا تھا ان میں ایوب کھوڑو بھی شامل تھا کیونکہ وہ سندھ آبزرور کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کا چیئرمین تھا۔[6]

22 رمئی کو وزیر بحالیات راجہ غضنفر علی خان نے دستور ساز اسمبلی میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (1935ء) کی دفعہ 102 میں ترمیم کرنے کی غرض سے ایک بل پیش کیا جس میں یہ قرار دیا گیا تھا کہ اگر ملک کی معاشی زندگی کو خطرہ لاحق ہوا تو حکومت پاکستان ہنگامی حالات کا اعلان کر سکے گی اور اس دوران ایسے امور کے بارے میں قانون سازی کر سکے گی کہ جو عام حالات میں صوبائی حکومتوں کے احاطۂ اختیار میں ہوتے ہیں۔ سندھ کے سابق وزیر اعلیٰ ایم۔ اے کھوڑو نے اس بل کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ اگر مرکزی حکومت نے ہنگامی حالات کا اعلان کر کے صوبوں کے اختیارات کو سلب کرنے کی روایت ڈال دی تو یہ بہت خطرناک بات ہو گی اور اس کا ردعمل بہت برا ہوگا۔[7] مشرقی بنگال کے نور احمد، خواجہ ناظم الدین اور حسین شہید سہروردی کے علاوہ پنجاب کے افتخار الدین نے بھی اس بل کی مخالفت کی مگر یہ اسی دن کثرت رائے سے منظور کر لیا گیا۔

کراچی کو مرکزی دارالحکومت بنانے اور سندھ سے علیحدگی کے فیصلے پر سندھ کے لیگی و غیر لیگی رہنماؤں کا شدید ردعمل

22 رمئی کو وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین نے بھی دستور ساز اسمبلی میں ایک قرارداد

پیش کی جس کا مدعا یہ تھا کہ کراچی پاکستان کا دارالحکومت ہوگا۔ اس شہر کا انتظام مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہوگا اور مرکزی حکومت مناسب اور ضروری سمجھے گی تو کراچی کے نواحی علاقوں کو بھی اپنے زیرانتظام لا سکے گی۔ سندھ کے رکن اسمبلی ہاشم گزدر نے اس قرارداد کی سخت مخالفت کی۔ اس نے اس مسئلہ پر اپنی تقریر میں بڑے تلخ الفاظ استعمال کئے۔ اس کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ کراچی کے مستقبل کا فیصلہ سندھی عوام کی رائے معلوم کئے بغیر نہ کیا جائے۔ ہمیں سندھ کے رائے دہندگان سے پوچھنا چاہیے کہ حکومت پاکستان نے کراچی کو سندھ سے محروم کر دینے کی جو تحریک کی ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ اس نے کہا ہم نے 1940ء میں قرارداد لاہور کی تائید وحمایت محض اس لئے کی تھی کہ اس میں یقین دلایا گیا تھا کہ پاکستان ''آزاد ریاستوں'' پر مشتمل ہوگا اور ان آزاد ریاستوں کے صوبے خودمختار اور مقتدر اعلیٰ ہوں گے مگر اب اس قرارداد کو نظرانداز کر کے کراچی شہر کو صوبہ سندھ سے الگ کیا جا رہا ہے۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ قیام پاکستان کے بعد سندھ کو کراچی سے محروم کر دیا جائے گا تو ہم قرارداد لاہور کی تائید کرنے سے پہلے ایک سو مرتبہ سوچتے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ہمارے ساتھ یہ سلوک ہوگا اور ہمارے صوبہ کو موعودہ خودمختاری اور اقتدار اعلیٰ سے محروم کر دیا جائے گا۔ سندھ کی اسمبلی 2رفروری 1948ء کو متفقہ طور پر اس تحریک کی مخالفت کر چکی ہے اور سندھ مسلم لیگ کی کونسل بھی یہ قرارداد منظور کر چکی ہے کہ کراچی کی سندھ سے علیحدگی کی تحریک کی ہر ممکن طریقے سے مخالفت کی جائے گی لیکن اب قرارداد پاکستان، سندھ اسمبلی کی قرارداد اور سندھ مسلم لیگ کونسل کی قرارداد کو نظرانداز کر کے اور سندھی عوام کی رائے معلوم کئے بغیر صوبہ سندھ کا سر قلم کیا جا رہا ہے۔ کراچی کے بغیر سندھ کی حیثیت ایک سر بریدہ لاش کی ہوگی۔ ایسا لگتا ہے کہ سندھ کی روح کو کچلا جا رہا ہے۔ اگر مرکزی ارباب اقتدار جمہوریت کو ایک ڈھونگ بنانا نہیں چاہتے اور اگر وہ مطلق العنان آمریت کی راہ اختیار کرنا نہیں چاہتے تو انہیں سندھ کے عوام کے احساسات کا احترام کرنا چاہیے۔ اگر آپ استبدادی حکمران بننے کے متمنی ہیں اور عوام کی رائے معلوم کئے بغیر ہر چیز ان پر ٹھونسنا چاہتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ میرا حکم ہے اس کی تعمیل کرو تو پھر خدا ہی ہمیں بچا سکے گا۔ سندھ کے عوام کراچی کو نہیں چھوڑنا چاہتے۔ ان کے لئے یہ تحریک ایک بم کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہیں اس شہر کی علیحدگی سے سالانہ تقریباً ایک کروڑ روپے کا نقصان ہوگا۔ اگر حکومت پاکستان اس قرارداد کو منظور کرنے پر مصر ہے تو سندھی عوام کو اس قرارداد کا پہلا حصہ منظور ہے جس

میں کراچی کو پاکستان کا مستقل دارالحکومت بنانے کی سفارش کی گئی ہے لیکن قرارداد کے دوسرے حصے پر غور وخوض کا سلسلہ معرض التوا میں ڈال دیا جائے۔[8] سندھ کے سابق وزیر اعلیٰ ایم۔اے کھوڑو نے بھی اپنی تقریر میں اس قرارداد کی بہت سخت مخالفت کی اور کہا کہ غالباً اس ایوان میں یہ میری آخری تقریر ہے۔ مجھے کراچی کے بارے میں اس ایوان کے اکثر ارکان کے رویے کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم اس قرارداد کے ذریعے کراچی شہر کی نماز جنازہ پڑھ رہے ہیں۔[9]

وزیر اعظم لیاقت علی خان نے اپنی تقریر میں ہاشم گزدر اور کھوڑو کی برہمی کو بے جا قرار دیا اور کہا کہ ہاشم گزدر اور ایم۔اے۔کھوڑو نے خود ہی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کو دعوت دی تھی کہ کراچی کو پاکستان کا دارالحکومت بنایا جائے اور یہ بھی کہا کہ اگر کراچی میں رہائش کی کمی ہوئی تو وہ اپنا دارالحکومت حیدر آباد میں منتقل کرلیں گے۔ ہم ان کی اس مہمان نوازی کے شکر گزار ہیں اور اسی لئے ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کراچی پاکستان کا مستقل دارالحکومت ہوگا اور اس حیثیت سے اس شہر کا انتظام مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہوگا۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ حکومت سندھ کو کراچی کی علیحدگی کے باعث جو مالی نقصان ہوگا اس کی پوری طرح تلافی کی جائے گی۔ اس بنا پر سندھ کو ایک پائی کا بھی نقصان نہیں اٹھانا پڑے گا[10] لیکن اس بحث کے دوران ہاشم گزدر اور کھوڑو کی تقریروں پر سب سے زیادہ برہمی کا اظہار پنجاب کے ملک فیروز خان نون نے کیا۔ اس کا الزام یہ تھا کہ سندھی لیڈروں نے کراچی کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا ہے اس کی بنیاد صوبہ پرستی ہے۔ اس نے کہا کہ ''بعض ارکان کی غیر معقولیت اور تنگ دلی کے باعث یہ صوبہ پرستی فی الحقیقت ڈکٹیٹر شپ پر منتج ہو گی اور میں کہتا ہوں کہ آج کل پاکستان کے لئے ڈکٹیٹر شپ کوئی بری چیز نہیں ہے۔ صوبہ سندھ میں جس قسم کی نا اہل اور بدعنوان جمہوریت رہی ہے میں اس پر ایک فیاضانہ ڈکٹیٹر شپ کو ترجیح دونگا۔''[11] ایوان کے متعدد ارکان نے پرزور تالیوں سے ملک فیروز خان نون کی اس تقریر کی تائید کی۔ بعد میں جب لیاقت علی خان تقریر کر چکا تو یہ قرارداد کثرت رائے سے منظور کر لی گئی اور اس طرح یہ تاثر دیا گیا کہ پاکستان کے چھوٹے اور پسماندہ صوبوں کے لوگوں کو پنجابی۔ مہاجر غلبہ کا جو خطرہ لاحق تھا وہ بے بنیاد نہیں تھا۔ پنجابی جاگیردار، سرمایہ دار اور درمیانہ طبقوں کے بااثر عناصر وفاقی یونٹوں کو موعودہ خودمختاری اور اقتدار اعلیٰ سے محروم کر کے نوزائیدہ مملکت پاکستان میں فی الحقیقت اپنی آمریت قائم کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ جب فیروز خان نون نے یہ تقریر کی تھی اس وقت پنجاب

کے جاگیرداروں کے مختلف دھڑوں کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی جاری تھی۔ قائداعظم کی صحت بڑی تیزی سے خراب ہو رہی تھی اور نواب زادہ لیاقت علی خان پنجاب میں دولتانہ دھڑے سے گٹھ جوڑ کرنے میں مصروف تھا۔ وہ صوبہ سرحد میں عبدالقیوم خان سے پہلے ہی اس قسم کا گٹھ جوڑ کر چکا تھا۔

دستور ساز اسمبلی کی جانب سے اس قرارداد کی منظوری پر صوبہ سندھ کے سارے حلقوں میں اتنا سخت ردعمل ہوا کہ صوبہ کے نئے وزیر اعلیٰ پیر الٰہی بخش کو بھی 25 رمئی کو یہ بیان دینا پڑا کہ اس کی حکومت صوبائی اسمبلی کی 9 رفروری کی قرارداد کی پابند ہے۔ ''ہم پاکستان کے ارباب اقتدار کی توجہ مسلسل اس حقیقت کی طرف مبذول کراتے رہے ہیں کہ سندھی عوام کراچی کو اپنے صوبہ کے جز و لاینفک کے طور پر قائم رکھنے کے زبردست خواہاں ہیں اور ہم ہر ممکن یہ کوشش کرتے رہے ہیں کہ اس سلسلے میں سندھی عوام کے جائز جذبات کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ ہمارا رویہ اس وقت بالکل واضح ہو گیا تھا جبکہ وزیر اعظم لیاقت علی خان نے دستور ساز اسمبلی میں یہ اعلان کیا تھا کہ چونکہ کراچی کے بارے میں حکومت سندھ اور حکومت پاکستان کے درمیان کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا اس لئے دستور ساز اسمبلی میں یہ قرارداد پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ میں نے اس مسئلہ پر اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کے لئے صوبائی اسمبلی کا اجلاس بلانے کا فیصلہ کیا ہے۔''[12] پیر الٰہی بخش کا یہ بیان منافقانہ تھا۔ اس نے یہ بیان کھوڑو گروپ کے اس پروپیگنڈا کے پیش نظر دیا تھا کہ وہ ذاتی مفاد کی خاطر پورے سندھ کے مفادات کو فروخت کر رہا ہے۔ وہ اپنے اس بیان کے ذریعے سندھی عوام کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ اس نے تو کراچی کو سندھ میں شامل کرنے کی بہت کوشش کی مگر پاکستان کے ارباب اقتدار نہیں مانے اس لئے وہ بے بس ہے۔ سندھیوں کو اس فیصلے کو قبول کرنا ہی پڑے گا۔ سندھ مسلم لیگ کے صدر یوسف ہارون نے اس مسئلہ پر کوئی تبصرہ نہ کیا کیونکہ جس سرمایہ دار طبقے کی وہ نمائندگی کرتا تھا وہ کراچی کو سندھ سے الگ کرنے کے حق میں تھا۔ تاہم سندھ لیگ کے جنرل سیکرٹری آغا غلام نبی پٹھان نے پیر الٰہی بخش کے 25 رمئی کے بیان کو پیش نظر رکھ کر ایک بیان میں حکومت پاکستان کے فیصلے کے خلاف سخت احتجاج کیا اور کہا کہ سندھ میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جو اس فیصلے سے مطمئن ہوگا۔ عام خیال یہ ہے کہ دستور ساز اسمبلی میں سندھیوں کی نمائندگی اڑھائی فیصد ہے لہٰذا یہ اسمبلی کوئی ایسا فیصلہ کرنے کی مجاز نہیں جس کا سندھ پر اس قدر زیادہ اثر پڑتا ہے۔ حکومت سندھ، سندھ اسمبلی، سندھ مسلم لیگ اور سندھی عوام اس مسئلہ پر اپنی غیر مشروط

مخالفت کا اظہار کر چکے ہیں۔[13] چنانچہ 27 رمئی کو اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ سندھ کے سیاسی حلقوں میں یہ تجویز گردش کر رہی ہے کہ دستور ساز اسمبلی نے کراچی کو سندھ سے الگ کرنے کا جو فیصلہ کیا ہے اس پر غور کرنے کے لئے ایک آل پارٹیز کنونشن بلایا جائے۔ یہ تجویز صوبائی لیگ، پاکستان پیپلز آرگنائزیشن (سندھ) اور صوبائی ہاری کمیٹی کے بعض لیڈروں کی طرف سے پیش کی گئی ہے۔ یہ مجوزہ کنونشن کب اور کہاں منعقد ہوگا اس کے بارے میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔[14] یہ خبر حکومت پاکستان کے لئے بڑی تشویش ناک تھی۔ اولاً اس لئے کہ اس سے وسط اپریل میں شائع شدہ ان خبروں کی تصدیق ہوتی تھی کہ ایم۔اے۔کھوڑو اپنے دور اقتدار میں جی۔ایم۔سید سے صلاح مشورہ کرتا رہا تھا اور ثانیاً اس لئے کہ 10 رمئی کو پاکستان پیپلز آرگنائزیشن کے نام پر حکومت پاکستان کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کی جو تجویز پیش کی گئی تھی وہ عملی صورت اختیار کر رہی تھی۔

یکم جون کو ایک نیم سرکاری خبر میں بتایا گیا تھا کہ ایم۔اے۔کھوڑو کے خلاف الزامات کی سماعت کرنے والے خصوصی ٹربیونل کے ارکان کراچی پہنچ گئے ہیں اور اس مقدمہ کی سماعت بہت جلد شروع ہوجائے گی۔ یہ ٹربیونل پنجابی چیف جسٹس سر عبدالرشید اور مدراس کے مہاجر جج شہاب الدین پر مشتمل تھا۔ 3 رجون کو کھوڑو اپنے شہر لاڑکانہ سے کراچی پہنچا تو اس پر عدالتی سمن کی تعمیل کر دی گئی اور 4 رجون کو سندھ چیف کورٹ کی عمارت میں اس کے خلاف مقدمہ کی سماعت شروع ہوگئی۔ پہلی پیشی کے دوران اسے 62 الزامات کی فہرست مہیا کی گئی اور بتایا گیا کہ ان الزامات کی باقاعدہ سماعت 14 رجون کو شروع ہوگی۔ الزامات کی نوعیت کچھ اس قسم کی تھی کہ ملزم نے اپنے دور اقتدار میں گورنر کی منظوری حاصل کئے بغیر 10 عدالتی تقرریاں کیں اور بعض افراد کو سرکاری ملازمتیں دینے کے لئے پبلک سروس کمیشن پر ناجائز دباؤ ڈالا۔ اس نے ایک ایڈیشنل اسسٹنٹ سیکرٹری کا تقرر کر کے اقربا نوازی کا ارتکاب کیا تھا اور ان پولیس افسروں کے خلاف انتقامی کارروائی کی جنہوں نے خان بہادر اللہ بخش کے مقدمہ قتل میں کھوڑو کے خلاف تفتیش میں حصہ لیا تھا۔ اس نے اپنے لئے کئی کاریں اور جیپیں بھی ناجائز طور پر خریدی تھیں۔ مزید برآں اس نے کشمیر فنڈ میں سے تقریباً 33 ہزار روپے کا غلط استعمال کیا تھا۔ اس نے اپنے سرکاری مکان کی آرائش پر تقریباً ایک لاکھ روپے خرچ کئے تھے اور ساڑھے سولہ سال کی ایک لڑکی کو 100 روپے ماہوار پر بطور پرسنل اسسٹنٹ ملازم رکھا تھا حالانکہ نہ تو اس قسم کے تقرر کی کوئی ضرورت تھی

اور نہ ہی اس لڑکی میں اس قسم کا کام کرنے کی اہلیت تھی۔ 26 اپریل کو جب کھوڑو کو برطرف کیا گیا تو وہ بھی اس ملازمت سے مستعفی ہوگئی تھی۔[15]

حکومت پاکستان کی جانب سے اس عدالتی کاروائی کا سیاسی مقصد یہ تھا کہ کھوڑو کو اس طویل مقدمے میں الجھا دیا جائے گا تاکہ وہ کراچی کی سندھ سے علیحدگی کے خلاف کوئی ایجی ٹیشن شروع نہ کرا سکے مگر یہ حربہ فوری طور پر مؤثر ثابت نہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایم۔ اے۔ کھوڑو اپنی جاگیرداریت، رجعت پسندی اور عوام دشمنی کے باوجود اس وقت تک سندھی شاونسٹوں کا ہیرو بن چکا تھا۔ اس نے اپنے عہد اقتدار میں صوبہ سندھ کو غیر سندھی مہاجرین کے غلبہ سے محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی اور کراچی کی علیحدگی کے مسئلہ پر اتنا سخت موقف اختیار کیا تھا کہ صوبائی گورنر کو گورنر جنرل کی ہدایت کے مطابق اسے برطرف کرنا پڑا تھا۔ لہٰذا جب 11 رجون کو سندھ مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا تو معلوم ہوا کہ کھوڑو کی برطرفی اور اس کے خلاف مقدمہ کی بنا پر اس کے سیاسی وقار میں کوئی کمی ہونے کی بجائے بہت اضافہ ہوا ہے۔ کونسل نے اس اجلاس میں اس ''سنگین صورتحال'' پر غور کیا جو دستور ساز اسمبلی نے کراچی شہر کو سندھ سے علیحدہ کرنے کی قرارداد منظور کر کے پیدا کر دی تھی۔ بہت سے کونسلروں نے اپنی تقریروں میں حکومت پاکستان کی بڑے سخت الفاظ میں مذمت کی اور یہ رائے ظاہر کی کہ اس نے صوبہ سندھ کو کراچی سے محروم کر کے سارے سندھی عوام کو اپنے خلاف کر لیا ہے۔ تقریروں کے بعد 2 ہزار الفاظ پر مشتمل ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں صوبائی وزارت کو ہدایت کی گئی کہ وہ کراچی کے بارے میں اپنے اختیارات سے دستبردار نہ ہو۔ صوبائی گورنر اور وزراء کو دستور ساز اسمبلی کے خلاف احتجاج کے طور پر اپنے عہدوں سے مستعفی ہو کر از سر نو انتخاب لڑنا چاہیے۔ اس قرارداد کے ذریعے ایک مجلس عمل بھی مقرر کی گئی جسے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ''قومی ماتم'' کا دن منانے کے لئے مناسب تاریخ مقرر کرے۔[16]

اگلے دن یعنی 12 رجون کو سید علی اکبر شاہ کی زیر صدارت مجلس عمل کا اجلاس ہوا جس میں ساڑھے پانچ گھنٹے کی بحث و تمحیص کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ اگر حکومت پاکستان نے کراچی کے بارے میں حکومت سندھ سے مناسب تصفیہ نہ کیا تو ''راست اقدام'' کیا جائے گا۔ مجلس عمل نے اس سلسلے میں ابتدائی اقدام کے طور پر 2 رجولائی کو ''یوم کراچی'' منانے کا فیصلہ کیا اور اعلان کیا کہ اس دن پورے سندھ میں عام ہڑتال ہوگی۔ احتجاجی جلسے ہونگے اور مظاہرے کئے جائیں

گے [17] لیکن جب 14 رجون کو پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خان نے پیرالٰہی بخش کے مکان پر لیگ اسمبلی پارٹی کو خطاب کیا تو اس کے بعد اس مسئلہ پر پارٹی میں پھوٹ پڑ گئی۔ لیاقت علی خان نے اپنی تقریر میں یقین دلایا تھا کہ کراچی کی علیحدگی کی وجہ سے صوبہ سندھ کو جو مالی نقصان ہو گا مرکزی حکومت اسے پورا کرے گی۔ اس پر بعض ارکان اسمبلی ''مطمئن'' ہو گئے اور ان کی رائے یہ تھی کہ حکومت سندھ کو مرکزی حکومت کی یہ پیش کش قبول کر لینی چاہیے۔ [18] 17 رجون کو وزیرداخلہ خواجہ شہاب الدین کا ایک بیان شائع ہوا جس میں یہ اطلاع دی گئی تھی کہ ''میں نے مجلس عمل کے صدر سید علی اکبر شاہ سے بات چیت کی ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ اس کی وزیراعظم سے ملاقات کے بعد مجلس عمل نے اپنے 14 رجون کے اجلاس میں ''یوم کراچی'' کو ملتوی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ مجلس عمل نے قائداعظم سے بذریعہ تار انٹرویو کی درخواست کی ہے۔'' [19] 19 رجون کو جی۔ ایم۔ سید کو نظر بند کر دیا گیا۔ اسکی بظاہر وجہ یہ تھی کہ اس نے پیرالٰہی بخش اور سید علی اکبر شاہ کی سودا بازی قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ سابقہ پروگرام کے مطابق ایجی ٹیشن یا ''راست اقدام'' کے حق میں تھا۔

تاہم صوبائی گورنر شیخ غلام حسین ہدایت اللہ نے 23 رجون کو کراچی کے خالق دینا ہال میں سندھ سیکرٹریت کے ملازمین کو خطاب کرتے ہوئے سندھی عوام کو تلقین کی کہ وہ مہاجرین کے بارے میں وسیع القلبی کا مظاہرہ کریں۔ اس نے کہا کہ بدقسمتی سے چند سندھی ایسے بھی ہیں جو مہاجرین کو محض اجنبی شکاری سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ رویہ غلط ہے۔ غیر مسلم یہاں ہزاروں سرکاری اسامیاں خالی چھوڑ کر گئے ہیں۔ ہمیں یہ خلا بہر صورت پر کرنا ہے۔ مہاجرین کو متروکہ جائیدادوں اور خالی اسامیوں میں سے ان کے جائز حصہ سے محروم رکھنا ناجائز ہے۔ زیادہ تر اسامیاں ناگزیر طور پر سندھیوں کو ملیں گی لیکن انہیں اپنے مفلوک الحال مہاجرین بھائیوں کے بارے میں ذرا فراخدلی کا ثبوت دینا چاہیے۔ [20] صوبائی گورنر کی اس تقریر کے موقع پر سارے صوبائی وزراء کے علاوہ مسلم لیگ کا صدر یوسف ہارون بھی وہاں موجود تھا۔ اس لئے اس تقریر کا صاف طور پر یہ مطلب سمجھا گیا کہ آئندہ مہاجرین کو نہ صرف متروکہ جائیدادیں آسانی سے ملیں گی بلکہ ان کے لئے سرکاری ملازمتوں کے دروازے بھی کھلے ہوں گے۔

قائداعظم کی یقین دہانی پر سندھی رہنماؤں نے کراچی کی علیحدگی اور اس کا دارالحکومت بننا منظور کرلیا

جون کے اواخر میں سندھ مسلم لیگ کے ایک 5 رکنی وفد نے کوئٹہ کے نزدیک ''زیارت'' میں قائداعظم سے ملاقات کی جس کے دوران بابائے قوم نے سندھی لیڈروں کو یقین دلایا کہ کراچی کو پاکستان کا مستقل دارالحکومت بنانے سے سندھی عوام کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا بلکہ انہیں فائدہ ہوگا۔ سندھ کی حکومت کو فوری طور پر اس شہر سے نہیں نکلنا پڑے گا۔ مرکزی حکومت آہستہ آہستہ اپنے دفاتر یہاں بنائے گی اور سندھ کی صوبائی حکومت آہستہ آہستہ کسی اور شہر میں منتقل ہوگی۔ اس عمل کی تکمیل میں کئی سال لگ جائیں گے۔ کوئی فوری دقت پیدا نہ ہوگی۔ صوبائی حکومت کی جو عمارتیں یا املاک مرکزی حکومت لے گی ان کا پورا معاوضہ ادا کیا جائے گا۔ کراچی میں جو تعمیری کام ہوگا اور نئی سہولتیں میسر آئیں گی ان کا سب سے زیادہ فائدہ سندھ کے لوگوں کو ہی پہنچے گا۔[21] سندھ میں اشیائے صرف کی درآمد اور زرعی اجناس کی برآمد کا کاروبار سندھیوں کے ہاتھوں میں ہی رہے گا۔ اس مقصد کے لئے پرمٹ حکومت سندھ کی سفارش پر جاری کئے جائیں گے۔ سندھ میں اتنے ہی مہاجرین کو آباد کیا جائے گا جن کے لئے غیر مسلموں کے جانے کی وجہ سے گنجائش ہوگی۔ غیر مسلم زمینداروں کی زمینوں پر کام کرنے والے سندھی ہاریوں کو بے دخل نہیں کیا جائے گا اور سندھ کے مسلم زمینداروں اور جاگیرداروں کے ''حقوق'' کا تحفظ کیا جائے گا۔ مہاجر کسانوں کو ہندو ہاریوں کی جگہ انہی شرائط پر کام مہیا کیا جائے گا جن شرائط پر ہندو کام کیا کرتے تھے۔ متروکہ جائیدادوں کی خریداری کے معاملے میں سندھی سرمایہ داروں سے مہاجر سرمایہ داروں کے برابر سلوک کیا جائے گا۔ سندھی سرمایہ دار کسٹوڈین سے کوئی بھی جائیداد خریدنے کے حقدار ہوں گے اور کراچی سے سندھیوں کو متروکہ مکانوں اور دکانوں میں سے کسی صورت میں بھی بے دخل نہیں کیا جائے گا۔[22]

قائداعظم کی اس یقین دہانی کے پیش نظر 6 رجولائی کو سندھ لیگ اسمبلی پارٹی کا اجلاس ہوا جس میں یہ قرارداد منظور کی گئی کہ چونکہ پاکستان کو اندرونی اور بیرونی مشکلات درپیش ہیں، چونکہ حکومت پاکستان نے دستور ساز اسمبلی کی 22 رمئی کی قرارداد کو عملی جامہ پہنانے کا تہیہ کیا ہوا

ہے اور چونکہ مرکزی حکومت کی جانب سے کراچی کا انتظام سنبھالنے کے خلاف جدوجہد سے پاکستان اور سندھ دونوں ہی کو نقصان پہنچے گا اس لئے ہمارے واسطے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم اس سلسلے میں قائداعظم کے مشورے کو قبول کرلیں۔ ایم۔اے۔کھوڑو اور آغا غلام نبی پٹھان نے اس قرارداد میں ترامیم پیش کرنے کی کوشش کی مگر انہیں کامیابی نہ ہوئی اور قرارداد 6 کے مقابلے میں 25 ووٹوں کی اکثریت سے منظور ہوگئی۔ لاہور کے اخبار پاکستان ٹائمز کی 9رجولائی کی ایک رپورٹ کے مطابق لیگ اسمبلی پارٹی کی اس قرارداد کی منظوری کے بعد کراچی کے سندھی اور غیر سندھی حلقوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کراچی کے بارے میں یہ سمجھوتہ کرانے اور سندھی لیڈروں کو قائداعظم کا مشورہ قبول کرنے پر آمادہ کرنے میں مرکزی وزیر خوراک پیرزادہ عبدالستار کا بہت ہاتھ تھا۔ پیرزادہ نے فرداً فرداً سندھ اسمبلی کے ارکان کے پاس جا کر انہیں یہ تنازعہ ختم کرنے کی ترغیب دی تھی۔ تاہم سندھ کے سابق وزیراعلیٰ ایم۔اے۔کھوڑو نے 10رجولائی کو ایک بیان میں لیگ اسمبلی پارٹی کی 6رجولائی کی قرارداد کو ایک ''فراڈ'' قرار دیا اور کہا کہ ''میں نے اسی لئے اس قرارداد کی مخالفت کی تھی۔''

22رجولائی کو گورنر جنرل کی جانب سے وفاقی دارالحکومت سے متعلقہ آرڈیننس جاری کردیا گیا اور 23رجولائی کو کراچی شہر قانونی طور پر پاکستان کا مستقل دارالحکومت بن گیا جس کے پہلے ایڈمنسٹریٹر کے عہدہ پر ایک مہاجر سول آفیسر سید ہاشم رضا کا تقرر ہوا۔ اس دارالحکومت کا علاقہ 566.8 مربع میل تھا اور اس میں کراچی چھاؤنی، منوڑہ، بھٹ، بارا، بنکور، شادس پیر کے جزیروں کے علاوہ گردونواح کے 54 دیہات شامل تھے۔

سندھ میں مزید مہاجروں کی آمد اور سندھی۔ مہاجر تضاد میں شدت

جولائی 1948ء میں حکومت ہند نے یکطرفہ طور پر حکم جاری کردیا کہ آئندہ مغربی پاکستان سے کوئی شخص انڈین ہائی کمیشن سے پرمٹ لئے بغیر ہندوستان میں داخل نہیں ہوسکے گا۔ حکومت ہند کو اس حکم کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی تھی کہ بہت سے مسلم مہاجرین نے یہ تصور کر رکھا تھا کہ تبادلۂ آبادی عارضی ہے لہٰذا ان میں سے خاصی تعداد نے مغربی پاکستان کے مختلف علاقوں میں دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد ہندوستان واپس جانا شروع کردیا تھا اور اس بنا پر

مشرقی پنجاب میں سکھ شرنارتھی بہت پریشان ہو گئے تھے۔ چند دن کے بعد حکومت پاکستان نے بھی ہندوستان سے مغربی پاکستان آنے والوں پر اسی قسم کی پابندی عائد کر دی اور اس طرح عملاً یہ طے ہو گیا کہ اکالی دل کے منصوبے کے مطابق دونوں ملکوں کے درمیان تبادلہ آبادی مستقل ہے اور اب مہاجروں اور شرنارتھیوں کو اپنے نئے وطنوں میں ہی مستقل طور پر آباد ہونا پڑے گا۔

سندھ کے ہندو دونوں ملکوں کے درمیان آمد و رفت پر عائد شدہ اس پابندی سے بہت پریشان ہوئے۔ ان کے سرکردہ نمائندوں نے 29 رجولائی کو لاڑکانہ میں ایک آل سندھ ہندو کانفرنس منعقد کی جس میں اس پابندی کو منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ کانفرنس کی مزید قراردادیں یہ تھیں کہ ان زمینوں کو پٹہ پر نہ دیا جائے جو ہندو زمیندار عارضی طور پر اپنے ایجنٹوں کی نگرانی میں چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے ہیں۔ جو ہندو واپس آنا چاہتے ہیں انہیں ان کی زمینیں اور فیکٹریاں دے دی جائیں۔ جو مکانات اور دکانیں زبردستی دوسروں کے نام الاٹ کر دی گئی ہیں انہیں ان کے اصل مالکوں کو واپس کر دیا جائے اور سرکاری طور پر ان افراد کی تبدیلیٔ مذہب کو تسلیم نہ کیا جائے جو حالیہ فسادات کے دوران عمل میں آئی ہے۔ کانفرنس میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ سندھ سے مزید ہندوؤں کے ترک وطن کے سلسلہ کو بند کرانے کی کوشش کی جائے گی اور جو ہندو یہاں سے جا چکے ہیں انہیں واپس آنے کی ترغیب دی جائے گی[23] لیکن سندھی ہندوؤں کے ان مطالبات کے باوجود دونوں ملکوں کے درمیان آمد و رفت پر پابندی قائم رہی جس کی عملی صورت یہ تھی کہ جو ہندو مغربی پاکستان چھوڑ کر ہندوستان جانا چاہتے تھے انہیں بآسانی پرمٹ مل جاتا تھا لیکن کسی مسلمان مہاجر کو واپس ہندوستان جانے کے لئے پرمٹ نہیں دیا جاتا تھا۔ اسی طرح حکومت پاکستان بھی ہندوستانی مسلمانوں کو مغربی پاکستان آنے کی اجازت دے دیتی تھی لیکن کسی ہندو کو یہاں آنے کے لئے مطلوبہ پرمٹ نہیں دیتی تھی۔ گویا اس طرح جو ہندو یہاں سے چلا گیا سو چلا گیا جو مسلمان یہاں آ گیا سو آ گیا جبکہ سندھ اور سرحد کی حکومتیں نہ صرف مغربی پنجاب سے فالتو مہاجرین کو اپنے ہاں بسانے پر آمادہ نہیں ہوتی تھیں بلکہ وہ یو۔ پی، حیدرآباد (دکن) وغیرہ کے ان ''اہل زبان'' مہاجرین کی آباد کاری کی راہ میں بھی حائل ہوتی تھیں جو اسلامی مملکت پاکستان میں محض اپنے معاشی مستقبل کو سنوارنے کے لئے ہوائی جہازوں اور بحری جہازوں کے ذریعے دھڑا دھڑ چلے آ رہے تھے۔

حکومت پاکستان نے اس صورتحال کے پیش نظر 27 راگست 1948ء کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کی ترمیم شدہ دفعہ 102 کے تحت ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ ہندوستانیوں کی وسیع پیمانے پر آمد کے باعث ملک کی معاشی زندگی کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے، اس کا مقصد یہ تھا کہ صوبائی حکومتوں کو زیادہ سے زیادہ مہاجرین کو بسانے پر آمادہ کیا جائے۔ چنانچہ اگلے دن 28 راگست کو یہ فیصلہ کیا گیا کہ مغربی پنجاب میں جو مہاجرین ابھی تک ریفیوجی کیمپوں میں پڑے ہوئے ہیں ان میں سے صوبہ سندھ میں مزید دو لاکھ، صوبہ سرحد میں ایک لاکھ، بہاولپور، خیر پور اور بلوچستان ایجنسی میں ایک لاکھ مہاجرین آباد کئے جائیں گے اور مغربی پنجاب کی حکومت یہ کوشش کرے گی کہ وہ کہیں نہ کہیں مزید ایک لاکھ مہاجرین کے لئے جگہ پیدا کرے۔ اس فیصلہ کے مطابق وسط ستمبر میں مغربی پنجاب سے سندھ کے لئے مہاجرین کی روانگی شروع ہو گئی جہاں انہیں 8 ایکڑ سے لے کر 20 ایکڑ تک متروکہ اراضی پٹہ پر دی جاتی تھی۔ قبل ازیں 16 رجولائی 1948ء کو گورنر جنرل کی جانب سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء میں ایک نئی دفعہ 92 الف کا اضافہ کر دیا گیا تھا جس کے تحت صوبائی گورنروں کو یہ اختیار مل گیا تھا کہ اگر کسی صوبہ میں ہنگامی صورت حال پیدا ہو جائے اور قانون کے مطابق حکومت نہ چل سکتی ہو تو وہاں کی آئینی مشینری کو معطل کر کے گورنر راج نافذ کیا جا سکتا ہے۔ آزادی سے قبل گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں اس مضمون کی دفعہ 93 موجود تھی جس کو دوسری جنگ عظیم کے دوران وسیع پیمانے پر استعمال کیا گیا تھا اور ہندوستانی سیاسی حلقے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا کرتے تھے لیکن آزادی کے بعد پاکستان میں اس نئی دفعہ 92 الف کو صوبائی حکومتوں پر ایک تلوار کے طور پر لٹکا دیا گیا تا کہ صوبائی حکومت مرکز کی حکم عدولی کرنے کی جرأت نہ کرے۔

تاہم 28 راگست کے فیصلے کے مطابق آباد کاری کے باعث مہاجرین اور سندھیوں کے درمیان تضاد میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ جن مسلم سندھی زمینداروں اور ہاریوں نے غیر مسلموں کی متروکہ زمینوں پر قبضہ کر لیا تھا وہ اپنی مقبوضہ زمین مہاجرین کو دینے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ شہروں میں درمیانہ طبقہ کے جن سندھیوں نے متروکہ مکانوں اور دکانوں پر قبضہ کیا ہوا تھا وہ کسی صورت اس قبضہ سے دستبردار ہونے پر تیار نہیں ہوتے تھے اور حکومت سندھ بھی انہیں زبردستی بے دخل کرنے کے حق میں نہیں تھی کیونکہ وزیر اعلیٰ پیر الٰہی

بخش مہاجروں کے بارے میں اپنی نرم پالیسی کے باوجود سندھی شاونسٹوں کی مخالفت کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ دیہی علاقوں میں مہاجروں کی زیادہ تر تعداد پنجابیوں پر مشتمل تھی لیکن شہروں میں جو مہاجرین متروکہ مکانوں اور دکانوں پر قبضہ کرنا چاہتے تھے ان میں سے زیادہ تر بمبئی، کاٹھیاواڑ، یو۔ پی اور حیدرآباد (دکن) سے تعلق رکھتے تھے۔ ان شہری مہاجرین کی آبادکاری کی راہ میں پیش آمدہ مشکلات کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ مرکزی وزیر بحالیات خواجہ شہاب الدین نے 2 ر اکتوبر کو سندھ کے ڈسٹرکٹ کلکٹروں کی ایک کانفرنس میں یہ حکم دیا تھا کہ ان مقامی مسلمانوں کو زبردستی بے دخل کر دیا جائے جنھوں نے متروکہ مکانوں پر ناجائز طور پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اس کے اس حکم کا اتنا سخت ردعمل ہوا کہ دوسرے ہی دن اسے ایک بیان میں کہنا پڑا کہ میں نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا تھا۔ میں نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا تھا اس کی حیثیت محض ایک رائے یا مشورے کی تھی۔ خواجہ شہاب الدین کی اس قلابازی کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ قبل ازیں حکومت سندھ کلکٹروں کو تحریری طور پر یہ ہدایت کر چکی تھی کہ وہ متروکہ مکانوں میں سے مقامی مسلمانوں کو بے دخل نہ کریں کیونکہ یہ نہ صرف غیر ضروری ہے بلکہ اس طرح ان سندھی مسلمانوں کے لئے مشکلات درپیش ہونگی جو گزشتہ آٹھ ماہ سے ان مکانوں میں رہائش پذیر ہیں۔

غلام حسین ہدایت اللہ کے انتقال کے بعد
ایک پنجابی شیخ دین محمد کا بطور گورنر سندھ تقرر

5 ر اکتوبر کو صوبائی گورنر شیخ غلام حسین ہدایت اللہ کا انتقال ہو گیا۔ وہ 18 ر جنوری 1879ء کو شکار پور کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے ابتدائی تعلیم شکار پور ہائی سکول اور ڈی۔ جے۔ سندھ کالج میں پائی تھی اور پھر قانون کی تعلیم اس نے بمبئی میں حاصل کی تھی۔ اس نے 1904ء میں سیاسیات میں حصہ لینا شروع کیا تھا جبکہ حکومت برطانیہ نے ہندوؤں کے بورژوا طبقہ کی انڈین نیشنل کانگرس کے مقابلے میں مسلم تعلقہ داروں، جاگیرداروں اور زمینداروں کی تنظیم کی حوصلہ افزائی کرنے کی پالیسی اختیار کی تھی۔ 1912ء میں شیخ غلام حسین ہدایت اللہ بمبئی لیجسلیٹو کونسل کا رکن منتخب ہوا اور وہ 1925ء تک مسلسل کونسل کا غیر سرکاری رکن رہا تھا۔ 1921ء میں وہ بمبئی کی صوبائی حکومت میں وزیر نامزد ہوا تھا اور 1928ء تک اس عہدے پر

فائز رہا تھا۔ 1928ء سے 1934ء تک وہ تین مرتبہ گورنر بمبئی کی ایگزیکٹوکونسل کا رکن منتخب ہوا تھا اور اس دوران صوبائی لیجسلیٹوکونسل کا صدر اور گورنر کی ایگزیکٹوکونسل کا نائب صدر بھی رہا تھا۔ اس نے دو مرتبہ گول میز کانفرنس میں سندھی مسلمانوں کی نمائندگی کی تھی اور پھر وہ کونسل آف سٹیٹ کا رکن بھی رہا تھا۔ جب اپریل 1936ء میں سندھ کی صوبہ بمبئی سے علیحدگی کا اعلان ہوا تھا تو اسے سندھ کی مشاورتی کونسل کا صدر نامزد کیا گیا تھا۔ 1946ء میں جب مسلم لیگ نے سرکاری خطابات ترک کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو اس نے بھی سر (Sir) کا خطاب واپس کر دیا تھا۔ 1942ء کے بعد وہ سندھ کے وزیر اعلیٰ کے عہدہ پر فائز ہوا تھا اور اگست 1947ء میں قیام پاکستان کے موقع پر اسے اس صوبہ کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ جب 5/اکتوبر 1948ء کو اس کا انتقال ہوا تو پنجاب ہائی کورٹ کے ایک سابق جج شیخ دین محمد کو اس کی جگہ سندھ کا گورنر نامزد کر دیا گیا۔ شیخ دین محمد 1947ء میں پنجاب کے سرحدی کمیشن کا مسلم لیگ کی طرف سے نامزد کردہ سینئر رکن رہا تھا اور پنجابی مسلمانوں کے ''حقوق ومفادات'' کا علمبردار سمجھا جاتا تھا۔

الٰہی بخش پر ہندونوازی اور بدعنوانی کے الزامات اور حیدر آباد کو سندھ کا صوبائی دارالحکومت بنانے کا فیصلہ

نئے گورنر کے تقرر کے تقریباً دو ہفتے بعد کراچی کے اخبارات نے پیر الٰہی بخش کے خلاف ویسی ہی تنقیدی مہم شروع کر دی جیسی کہ انہوں نے 26/اپریل 1948ء سے قبل کھوڑو کے خلاف کامیابی سے چلائی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پیر الٰہی بخش ان توقعات پر پورا نہیں اترا تھا جو آبادکاری کے سلسلے میں اس سے وابستہ کی گئی تھیں۔ وہ سندھ کے شہروں میں مقامی سندھیوں کو متروکہ مکانوں اور دکانوں سے بے دخل نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ سندھی شاونزم زوروں پر تھا اور اس کی نحیف ونزار وزارت اس کا دباؤ برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ مزید برآں جو ہندو سرمایہ دار، زمیندار اور سرکاری ملازمین ابھی تک سندھ میں رہ گئے تھے وہ اس کی حکومت کی پالیسی پر اثر انداز ہوتے تھے۔

20/اکتوبر کو کراچی کے روزنامہ ''ڈان'' نے اپنے ایک مضمون میں پیر الٰہی بخش پر زبردست حملہ کیا اور اس پر ہندونوازی کا الزام عائد کیا۔ الزام کی بنیاد یہ تھی کہ اس نے سانگھڑ،

تھرپارکر اور ٹھٹھ کے اضلاع میں تین پبلک پراسیکیوٹروں کا تقرر کیا تھا جن میں سے ایک ہندو تھا اور یہ بات نہ صرف ''ڈان'' کے لئے بلکہ کراچی کے وکلاء کے لئے بھی نا قابل برداشت تھی۔ 24 اکتوبر کو کراچی ڈسٹرکٹ بار ایسوی ایشن نے اس واقعہ پر ایک قرار داد کے ذریعے سخت صدمے اور حیرت کا اظہار کیا۔ 26 اکتوبر کو کراچی کے پانچ ایڈیٹروں نے ایک مشترکہ بیان میں پیر الٰہی بخش پر ہندو نوازی، رشوت ستانی، اقربا پروری، سمگلروں کی پشت پناہی اور دوسری بدعنوانیوں کے الزام عائد کر کے مطالبہ کیا کہ اسے سندھ کی وزارت اعلیٰ سے برطرف کر دیا جائے۔ 27 اکتوبر کو پیر الٰہی بخش نے ایک انٹرویو میں کہا کہ وہ اپنے عہدہ سے ہرگز مستعفی نہیں ہوگا کیونکہ اسے اسمبلی میں اکثریت کی تائید وحمایت حاصل ہے۔ تاہم کراچی کے اخباروں کا معاندانہ پروپیگنڈا جاری رہا اور اس کی تلخی وتندی میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ جبکہ پاکستان مسلم لیگ کے آرگنائزر اور بعض مرکزی ارباب اقتدار کی طرف سے ان اخبارات کی حوصلہ افزائی ہوتی رہی۔

6 نومبر کو مرکزی وزیر بحالیات خواجہ شہاب الدین نے ان اخبارات کی بالواسطہ طور پر حمایت کی جبکہ اس نے حکومت سندھ کی مہاجرین کے بارے میں کارکردگی پر نکتہ چینی کی۔ اس نے سکھر میں ایک جلسۂ عام کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ مہاجرین کی آبادکاری کی راہ میں کسی بھی رکاوٹ کو برداشت نہیں کرے گا اور ہر اس شخص کے خلاف بلا لحاظ عہدہ اور درجہ سخت اقدام کرے گا جو اس کام میں رکاوٹ ڈالتے ہوئے پایا گیا۔ 11 نومبر کو نئے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کی زیر صدارت ایک اعلیٰ سطح کی میٹنگ ہوئی جس میں وزیر اعظم لیاقت علی خان، صوبائی گورنر شیخ دین محمد اور حکومت پاکستان کے سیکرٹری جنرل چودھری محمد علی نے شرکت کی۔ اس میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا کہ صوبائی گورنر پیر الٰہی بخش کے خلاف عائد کردہ الزامات کی تحقیقات کرے گا۔ اس پر سنگین ترین الزام یہ تھا کہ اس کے ایک ہندو معتمد نائب کو عین اس وقت گرفتار کیا گیا تھا جب وہ مبینہ طور پر سرکاری دستاویزات لے کر ہندوستان بھاگ جانے والا تھا۔

16 نومبر کو پیر الٰہی بخش حیدرآباد میں لیگ اسمبلی کے ارکان پر دباؤ ڈال کر یہ تجویز منظور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ حیدرآباد کو سندھ کا مستقل دارالحکومت بنایا جائے گا۔ پارٹی کے ارکان کی تعداد 37 تھی لیکن جس اجلاس میں یہ تجویز منظور کی گئی اس میں 26 ارکان حاضر تھے۔ غیر حاضر ممبروں میں کھوڑو، آغا غلام نبی پٹھان اور قاضی فضل اللہ شامل تھے۔ قاضی مجتبیٰ نے پارٹی

کے اس اجلاس میں اس تجویز کی سخت مخالفت کی اور ہاشم گزدر نے اس کی حمایت میں بڑی زوردار تقریر کی۔ قاضی مجتبیٰ نے اپنی تقریر میں سندھ کی وزارتی بدعنوانیوں پر کڑی نکتہ چینی کی۔ اس پر پیر الٰہی بخش اور اس کے ساتھی بڑے بے چین اور بدحواس ہو گئے لیکن قاضی محمد اکبر اس کی مدد کو آیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ممبروں میں سخت کلامی کی نوبت پہنچ گئی۔ ادھر اجلاس کے دوران پیر الٰہی بخش کے آدمی برابر اپنے کام میں لگے ہوئے تھے چنانچہ جونہی اجلاس ختم ہوا اور ممبر باہر نکلے تو ان سب کو موٹروں میں بٹھا کر سرکٹ ہاؤس لے جایا گیا جہاں گورنر دین محمد ٹھہرا ہوا تھا۔ اس طرح پیر الٰہی بخش گورنر کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ ممبروں کی اکثریت اس کے ساتھ ہے دوسری طرف ممبروں سے یہ کہا گیا تھا کہ سرکٹ ہاؤس میں ٹی پارٹی ہے۔ تاہم اس موقع پر گورنر دین محمد نے یہ وعدہ کیا کہ وہ صوبائی حکومت کے ہیڈ کوارٹر کی تعمیر کے لئے مرکزی حکومت سے پانچ کروڑ روپے کی امداد دلوانے کی کوشش کرے گا۔ [24] اس ساری کاروائی کا مطلب یہ تھا کہ آئندہ پیر الٰہی بخش مہاجرین کی آباد کاری اور دارالحکومت کی منتقلی کے سلسلے میں مرکزی حکومت کے ہر حکم کی تعمیل کرے گا اس لئے اس کے خلاف 11 رنومبر کے فیصلے پر عمل نہ کیا جائے۔ بظاہر گورنر دین محمد لیگ اسمبلی پارٹی سے یہی فیصلہ کروانے کیلئے حیدرآباد آیا تھا۔ جب یہ کام ہو چکا تو اس نے اس شہر میں تقریباً ایک ہفتہ قیام کے دوران مقامی سندھیوں اور مہاجروں کو تلقین کی کہ وہ اسلام کے راستے پر چل کر اپنی ساری برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔

18 رنومبر کو سندھ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کا اجلاس ہوا جس میں ایک قرارداد کے ذریعے کراچی کے اخبارات کی مذمت کی گئی اور یہ رائے ظاہر کی گئی کہ ان اخبارات نے سندھ وزارت کے خلاف جو معاندانہ پروپیگنڈا مہم چلائی ہوئی ہے اس سے صوبہ کے عوام کے مختلف حلقوں کے درمیان نفرت پیدا ہو گئی ہے، انتظامی مشینری کو نقصان پہنچا ہے، سرکاری اہلکاروں کے حوصلے بہت پست ہوئے ہیں، نظم و نسق پر برا اثر پڑا ہے اور پاکستان کے وقار کو صدمہ پہنچا ہے۔ ان اخبارات کا رویہ حب الوطنی اور اسلام کے جذبے کے منافی ہے۔ پارٹی نے ایک اور قرارداد میں حکومت پاکستان سے درخواست کی کہ قیام پاکستان کے بعد ہندو شرنارتھیوں اور مسلمانوں کے درمیان جائیدادوں کے جو سودے ہوئے ہیں انہیں غیر قانونی قرار نہ دیا جائے۔ 27 رنومبر کو حکومت سندھ نے پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت کراچی کے پانچ اخباروں کا صوبہ سندھ میں چھ ماہ کے لئے داخلہ

بند کر دیا۔ ان اخبارات میں ڈان کے علاوہ ''جنگ'' اور ''انجام'' بھی شامل تھے۔ ان اخبارات کے ایڈیٹروں نے اکتوبر میں ایک مشترکہ بیان میں وزیر اعلیٰ پیر الٰہی بخش پر سنگین بدعنوانیوں کے الزامات عائد کر کے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ اپنے عہدہ سے دستبردار ہو جائے اور بے لوث و بے غرض افراد خدمت کے لئے آگے آئیں۔ پھر پیر الٰہی بخش کے ہندو معتمد نائب کی گرفتاری کے بعد چند ''غیر مستحق'' ہندوؤں کی حمایت پر بھی ان اخبارات نے شور مچایا تھا اور گورنر سندھ اور مرکزی حکومت سے ان الزامات کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کا مطالبہ کیا تھا۔ پاکستان مسلم لیگ کے چیف آرگنائزر چودھری خلیق الزماں نے اسی دن ایک بیان میں ان اخبارات کے خلاف حکومت سندھ کی آمرانہ کاروائی کی مذمت کی اور امید ظاہر کی کہ صوبائی گورنر اس معاملے میں فوری مداخلت کرے گا۔

کھوڑو کا بطور صدر صوبہ لیگ انتخاب اور الٰہی بخش وزارت کو خطرہ

دریں اثنا پاکستان مسلم لیگ کے فروری 1948ء کے فیصلے کے مطابق سندھ میں مسلم لیگ کی نئی رکن سازی کے بعد نئی صوبائی کونسل کی تشکیل عمل میں آ چکی تھی۔ اس نئی کونسل کا اجلاس 5/دسمبر 1948ء کو منعقد ہوا جس میں سندھ کے سابق وزیر اعلیٰ ایم۔ اے۔ کھوڑو کو بھاری اکثریت سے صوبائی لیگ کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ اس نے 72 ووٹ حاصل کئے جبکہ وزارتی گروپ کے امیدواروں غلام اکبر اور سید رفیق نے علی الترتیب 32 اور 20 ووٹ حاصل کئے۔ قبل ازیں نومبر 1948ء میں اسی طرح ممتاز دولتانہ پنجاب مسلم لیگ کا صدر منتخب ہو گیا تھا اور وزیر اعلیٰ پنجاب نواب ممدوٹ کے گروپ کا امیدوار علاؤالدین صدیقی 18 ووٹوں سے شکست کھا گیا تھا۔ کھوڑو کی یہ کامیابی اس حقیقت کے باوجود ہوئی تھی کہ ان دنوں اس کے خلاف خصوصی ٹربیونل اور ایک مجسٹریٹ کے روبرو دو مقدمے چل رہے تھے جن میں اس پر چوری، رشوت ستانی، اقربا نوازی، سرکاری رقوم کے بے جا تصرف اور دوسرے بہت سے بدعنوانیوں کے الزامات عائد تھے۔ عام طور پر اس کی کامیابی کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس نے فروری 1948ء کے بعد مسلم لیگ کی رکن سازی میں بہت جعلسازی کی تھی اور اس طرح اس نے اپنی مرضی کے کونسلروں کو منتخب کروالیا تھا۔ یہ بیان جزوی طور پر صحیح ہے۔ کلی طور پر صحیح نہیں ہے۔ کھوڑو کی کامیابی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اسے سندھ کے ان جاگیرداروں اور درمیانہ طبقوں کے عناصر کی زبردست

حمایت حاصل تھی جو سندھی عوام پر غیر سندھیوں کے سیاسی و معاشی غلبہ کے خلاف تھے، جو 1940ء کی قرارداد لاہور کے مطابق اپنے صوبہ کے لئے خودمختاری اور اقتدار اعلیٰ کا مطالبہ کرتے تھے، جو مسلم قومیت کے نعرے کو پنجابی۔مہاجر سامراجیت کا ایک سیاسی ہتھکنڈا تصور کرتے تھے اور جو سندھ کی پانچ ہزار سالہ تہذیب و ثقافت کا تحفظ کرنا چاہتے تھے۔ان عناصر کی جانب سے کھوڑو کی پر زور حمایت کا مظاہرہ ہوگیا تھا جبکہ انتخابی ہال میں اس کے انتخاب کا کئی منٹ تک پرجوش تالیوں سے خیر مقدم کیا گیا تھا اور ''قائداعظم زندہ باد'' کے نعرے لگائے گئے تھے۔کھوڑو اپنی جاگیرداریت کے باوجود سندھ کے درمیانہ طبقہ کی سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور تہذیبی امنگوں کا ترجمان بن گیا تھا۔اس طبقہ کو یقین تھا کہ کھوڑو کو 26/اپریل 1948ء کو وزارت اعلیٰ سے محض اس لئے برطرف کیا گیا تھا کہ وہ سندھ کے ''حقوق و مفادات'' کے تحفظ کے حق میں تھا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ سندھ پر پنجابیوں اور مہاجروں کا سیاسی و معاشی غلبہ قائم ہو اور وہ کراچی شہر کی سندھ سے علیحدگی پر کسی صورت آمادہ نہیں ہوتا تھا۔

کھوڑو کے اس رویے کا مظاہرہ 6/دسمبر کو بھی ہوا جبکہ اس کی زیر صدارت نئی لیگ کونسل کے اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے حکومت سندھ سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ سندھ کے دارالحکومت کو کراچی سے منتقل نہ کرے اور صوبائی لیگ کے سیکرٹری آغا غلام نبی پٹھان اور کراچی سٹی مسلم لیگ کے صدر مسٹر قریشی کے سندھ میں داخلہ پر عائد کردہ پابندی منسوخ کردے۔صوبائی کونسل کے اس اجلاس میں پاکستان مسلم لیگ کونسل کے لئے 50 ارکان نامزد کئے گئے جن میں چودھری خلیق الزماں، یوسف ہارون، قاضی فضل اللہ، بیگم لیاقت علی خان، پیر الٰہی بخش اور یو۔پی کے لیگی لیڈر رضوان اللہ کے نام بھی شامل تھے۔اسی دن چار رکنی پارلیمانی بورڈ کا بھی انتخاب کیا گیا جو قاضی فضل اللہ، آغا غلام نبی پٹھان، اے۔ایم۔قریشی اور صالح محمد شاہ پر مشتمل تھا۔مسلم لیگ کے آئین کے تحت خود کھوڑو صوبہ لیگ کے صدر کی حیثیت سے پارلیمانی بورڈ کا رکن بھی تھا اور صدر بھی۔[25] قبل ازیں 5/دسمبر کو کھوڑو نے اپنے انتخاب کے فوراً بعد بیگم لیاقت علی خان، مس فاطمہ جناح، بیگم خلیق الزماں، بیگم این۔اے۔ہارون، بیگم وسیم، چودھری خلیق الزماں، ایم۔ایس۔رضوان اللہ، جی۔الانہ، سیٹھ فخر الدین، اے۔اے خان، خواجہ عبدالقیوم، سید صدیق علی شاہ اور مولانا عبدالغفور سنائی کو صوبائی لیگ کونسل کے ارکان نامزد کیا تھا۔[26] ان نامزدگیوں کا

مطلب یہ تھا کہ جہاں تک صوبائی مسلم لیگ کا تعلق تھا وہ کراچی کی سندھ سے علیحدگی کے فیصلے کو تسلیم نہیں کرتی تھی اور وہ اس شہر کو بدستور صوبہ سندھ کا ایک حصہ ہی تصور کرتی تھی۔ غالباً اسی لئے مس فاطمہ جناح نے کھوڑو کی اس نامزدگی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ [27] اس سے چار دن پہلے کراچی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ یہ قرارداد منظور کر چکی تھی کہ جس طرح کراچی شہر کی انتظامیہ کو سندھ سے علیحدہ کر دیا گیا ہے اسی طرح سٹی مسلم لیگ کو بھی علیحدہ کیا جائے اور اس کا درجہ بڑھا کر صوبائی مسلم لیگ کے برابر کر دیا جائے۔ [28]

8 دسمبر کی صبح کو کھوڑو نے اپنی مجلس عاملہ کے 14 ارکان کی نامزدگی کا اعلان کیا۔ ان ارکان کی بھاری اکثریت سندھ کے دقیانوسی جاگیرداروں اور رئیسوں کی تھی اور پھر اسی دن شام کو اس نے صوبائی مسلم لیگ کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس نے اپنے اس ڈرامائی اقدام کی وجہ یہ بتائی کہ چونکہ میرے خلاف خصوصی ٹربیونل کے روبرو تحقیقات ہو رہی ہے۔ اس لئے میں اس وقت تک اس عہدہ پر فائز رہنا اخلاقی طور پر مناسب نہیں سمجھتا جب تک میں اپنے خلاف عائد کردہ الزامات سے بری قرار نہیں دے دیا جاتا۔ تاہم صوبائی مسلم لیگ نے اس کا یہ استعفیٰ منظور نہ کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ جب تک کھوڑو اپنے خلاف الزامات سے بری نہیں ہوتا اس وقت تک اس کا معتمد نائب صدر حاجی علی اکبر شاہ قائم مقام صدر کے فرائض سرانجام دیتا رہے گا۔ پاکستان ٹائمز کی 9 دسمبر کی رپورٹ کے مطابق کھوڑو جب 5 دسمبر کو صوبہ لیگ کا صدر منتخب ہوا تھا تو کراچی کے سیاسی حلقوں کو سخت صدمہ پہنچا تھا لیکن تین دن کے بعد اس کے استعفیٰ نے سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اب بہت سے لوگ اس کی تعریف کرنے لگے۔ یہ باور کیا جاتا تھا کہ کھوڑو نے پہلے اپنے آپ کو صدر منتخب کرانے اور پھر صدارت کے عہدہ سے مستعفی ہونے کی جو کاروائی کی تھی اس سے وہ محض یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اس کے خلاف اب تک جو کچھ بھی کیا گیا ہے اس کے باوجود اسے سندھی مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہے۔ [29]

چونکہ مسلم لیگ میں کھوڑو کی اس سنسنی خیز فتح سے پیر الٰہی بخش وزارت کو سخت خطرہ لاحق ہو گیا تھا اس لئے 11 دسمبر کو اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ''سندھ کے گورنر نے پیر الٰہی بخش کی اس تجویز کی تائید کر دی ہے کہ مسلم مہاجرین کے نمائندوں کو صوبائی اسمبلی کی ان 14 نشستوں کے لئے امیدوار نامزد کرنے کی اجازت دی جائے جو ہندو ارکان اسمبلی کے ترک وطن کی وجہ سے خالی

پڑی ہیں۔ اب یہ تجویز گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کو بھیج دی گئی ہے اور امید کی جاتی ہے کہ اس سلسلے میں عنقریب ایک آرڈیننس جاری ہو جائے گا۔[30]

17 دسمبر کو سندھ مسلم کالج کے بارہ سو طلبا نے کالج کے پرنسپل خان بہادر اے۔ ایم مولوی کو پرنسپل شپ سے علیحدہ کئے جانے کے خلاف ہڑتال کر دی۔ سندھ مدرسہ بورڈ نے دو دن قبل خان بہادر اے۔ ایم مولوی کی برطرفی کا فیصلہ کیا تھا۔ ہڑتالی طلبا نے سندھ کے وزیر اعلیٰ پیر الٰہی بخش کے دفتر کے سامنے مظاہرہ کیا۔ وزیر اعلیٰ نے طلبا کے ایک وفد سے ملاقات کی اور وعدہ کیا کہ تین دن کے اندر بورڈ کا اجلاس بلا کر مناسب فیصلہ کیا جائے گا۔ اس نے طلبا سے ہڑتال ختم کر دینے کی درخواست کی لیکن انہوں نے اسے جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ دو تین دن کے بعد بعض طلبا نے اپنے اس مطالبہ کی تکمیل کے لئے بھوک ہڑتال بھی شروع کر دی جو تین چار دن تک جاری رہی۔

قومی اسمبلی میں مہاجرین کے لئے مخصوص نشستوں کا کوٹہ اور پروڈا کی منظوری

3 جنوری 1949ء کو پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے دستور ساز اسمبلی میں ایک بل پیش کیا جس کے تحت پنجاب اور سندھ آباد شدہ مہاجرین کے لئے قومی اسمبلی میں نشستیں میں الاٹ کی گئی تھیں۔ پنجاب کے لئے نشستوں کی تعداد میں پانچ اور سندھ کی نشستوں میں تین کا اضافہ کیا گیا تھا۔ سندھ کے سابق وزیر اعلیٰ ایم۔ اے۔ کھوڑو نے اس بل کی اس دلیل کے ساتھ مخالفت کی کہ اسمبلی کے قواعد کے مطابق یہ بل پیش کرنے سے پہلے 15 دن کا نوٹس نہیں دیا گیا۔ اس بل کا نوٹس آج صبح دس بجے دیا گیا ہے اور یہ بات خلاف قاعدہ ہے مگر اسمبلی کے صدر مولوی تمیز الدین نے کھوڑو کا یہ اعتراض مسترد کر دیا اور بل اسی دن کثرت رائے سے منظور کر لیا گیا۔ اس کے بعد لیاقت علی خان نے پبلک اور نمائندہ مناصب پر نااہلیت کا بل (Public and Representation Office Disqualification Act) جو بعد میں پروڈا (PRODA) کے نام سے مشہور ہوا، پیش کیا۔ اس بل میں قرار دیا گیا تھا کہ ایسے افراد کو گورنر جنرل کے حکم کے تحت دس سال تک کسی پبلک عہدہ کے لئے نااہل قرار دیا جا سکتا ہے جو بحیثیت مرکزی یا صوبائی وزیر، نائب وزیر، پارلیمانی سیکرٹری یا رکن مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز بداعمالی کے مجرم قرار دیئے جائیں گے۔ بداعمالی میں رشوت ستانی، اقربا پروری، دانستہ بدانتظامی

اور اسی قسم کے دوسرے جرائم شامل تھے۔ اس بل میں مزید کہا گیا تھا کہ ''مقدمات کی سماعت کرنے والے ٹریبونل ہائی کورٹ کے دو یا زائد ججوں پر مشتمل ہوں گے اور گورنر جنرل کا فیصلہ کابینہ کے فیصلوں پر مبنی ہونے کی بجائے اس کی اپنی صوابدید پر منحصر ہوگا۔''

4 رجنوری کو سندھ کے گورنر شیخ دین محمد نے یہ فیصلہ کیا کہ ''سندھ کے سابق وزیر اعلیٰ ایم۔اے۔کھوڑو کے خلاف بدانتظامی، بداعمالی، اور رشوت ستانی کے سلسلے میں تحقیقاتی رپورٹ کو شائع کر دیا جائے گا۔[31] گورنر کے اس فیصلہ کا مطلب یہ تھا کہ ٹریبونل کی رپورٹ اس وقت تک اسے مل چکی تھی اور وہ اس پر کارروائی کرنے کے لئے ''پروڈا'' کی منظوری کا منتظر تھا کیونکہ مجوزہ قانون مؤثر بہ ماضی تھا اور اس کا اطلاق 15 راگست 1947ء کے بعد کی بداعمالی پر ہوسکتا تھا۔ 6 رجنوری کو دستور ساز اسمبلی میں ''پروڈا'' بل پر بحث ہوئی تو کھوڑو نے اس کی سخت مخالفت کی اور اس میں 16 ترامیم پیش کیں جو نامنظور کر دی گئیں۔ ہاشم گزدر نے اس بل کی تائید کی اور کہا کہ صوبائی اور مرکزی وزراء پر وقتاً فوقتاً الزامات عائد کئے گئے ہیں۔ اس صورتحال کے ازالہ کیلئے یہی ایک صورت ہے کہ عوام کو الزامات ثابت کرنے کا موقع دیا جائے۔ قومی زندگی کے ناسور ختم کرنے کے لئے گورنر جنرل کو بجا طور پر وسیع اختیارات دیئے گئے ہیں۔ گزدر نے کہا کہ بعض نقادوں کی رائے میں یہ قانون نازیوں کے قوانین سے مشابہ ہے تاہم اس نے استدعا کی کہ اس مجوزہ قانون کا اطلاق سرکاری ملازمین پر بھی کیا جائے۔ آخر میں لیاقت علی خان نے جوابی تقریر کی اور پھر فوراً ہی یہ بل کثرت رائے سے منظور کر لیا گیا۔[32]

الٰہی بخش وزارت کا خاتمہ، کھوڑو گروپ کی فتح

''پروڈا'' کی منظوری کے چند دن بعد اس قانون کا اطلاق نہ صرف ایم۔اے۔کھوڑو کے خلاف تحقیقاتی رپورٹ پر کر دیا گیا بلکہ اس کے تحت سندھ کے موجودہ وزیر اعلیٰ پیر الٰہی بخش کے خلاف بھی انکوائری شروع ہوگئی۔ اس انکوائری کا فیصلہ کراچی کے اخبارات کے مطالبہ کے پیش نظر 11 رنومبر 1948ء کو اعلیٰ سطح کی میٹنگ میں ہوا تھا۔ مزید برآں پیر الٰہی بخش کے خلاف جنوری کے تیسرے ہفتے میں بعض افراد نے کراچی کی پیر الٰہی بخش کالونی کے آرگنائزروں اور بانیوں کے خلاف ایک مقدمہ دائر کر دیا تھا۔ الزام یہ تھا کہ ''پیر الٰہی بخش اپنے آپ کو اس کالونی کا

پروپرائیٹر سمجھتا ہے اور محمود الحسن جو اس کالونی کا آرگنائزر رہے اپنے آپ کو اسٹیٹ منیجر بتاتا ہے۔ اگرچہ کالونی کا حساب بنک میں کھول دیا گیا ہے مگر اس کی کوئی جانچ پڑتال نہیں کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ کالونی کو ابھی تک رجسٹرڈ بھی نہیں کرایا گیا ہے"[33] مگر اس مقدمہ کی باقاعدہ سماعت شروع ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی بنا پر فروری کے اوائل میں پیر الٰہی بخش کی وزارت کا تختہ الٹ گیا۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ تھی کہ دسمبر 1946ء میں سندھ اسمبلی کے جو عام انتخابات ہوئے تھے ان کے بعد جی۔ ایم۔ سید نے ایک کامیاب مسلم لیگی قاضی محمد اکبر کے خلاف انتخابی عذرداری دائر کی تھی۔ اس عذرداری کی تقریباً دو سال تک وقتاً فوقتاً سماعت ہوتی رہی۔ یہ سماعت جنوری 1949ء میں ختم ہوئی۔ انتخابی ٹربیونل نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ قاضی اکبر کا انتخاب ناجائز تھا اور وہ اسمبلی کا رکن نہیں رہ سکتا۔ اس فیصلہ کا اثر قاضی اکبر کے تین ایجنٹوں پیر الٰہی بخش، سید میر محمد شاہ اور سید گل محمد شاہ پر بھی پڑا کیونکہ ٹربیونل کا مزید فیصلہ یہ تھا کہ یہ تینوں افراد بھی انتخابی بدعنوانیوں کے مرتکب ہوئے تھے اس لئے قاضی اکبر کی طرح یہ تینوں بھی چھ سال کے لئے اسمبلی کے ممبر نہیں بن سکتے۔

23/جنوری کو کراچی کے ایڈمنسٹریٹر سید ہاشم رضا نے ایک مقامی انگریزی ہفت روزہ "فیرلیس" (Fearless) کی اشاعت پر 3 ماہ کے لئے پابندی عائد کر دی اور ایک اور انگریزی ہفت روزہ "فریڈم" (Freedom) اور اردو روز نامہ "مسلمان" کے حکومت اور حکومت کے ملازمین سے متعلقہ اداریوں پر سنسر شپ عائد کر دی۔ سنسر شپ کے حکم کا نفاذ تین ماہ کے لئے تھا۔

30/جنوری کو صوبہ کی نئی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا پہلا اجلاس ہوا جس میں ایک قرارداد کے ذریعے پیر الٰہی بخش کی وزارت پر عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے ارکان کو ہدایت کی گئی کہ وہ فوراً اس وزارت کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں۔ قرارداد میں پیر الٰہی بخش کو بھی یہ ہدایت کی گئی کہ وہ وجہ بیان کرے کہ اس کے خلاف "مسلم لیگ کے فیصلے کی خلاف ورزی کرنے" اور بطور وزیر اعلیٰ مختلف بدعنوانیاں کرنے کی بنا پر انضباتی کاروائی کیوں نہ کی جائے اور اسے چھ سال کے لئے مسلم لیگ کی رکنیت کا نااہل کیوں نہ قرار دے دیا جائے۔ مجلس عاملہ کی رائے یہ تھی کہ پیر الٰہی بخش کی وزارت نے رشوت ستانی، اقربا پروری اور بدانتظامی کے

باعث صوبہ سندھ کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ اس نے اپنے مخالفین کے خلاف انتقامی کاروائی کی ہے مثلاً صوبہ لیگ کے جنرل سیکرٹری آغا غلام نبی پٹھان اور کراچی سٹی مسلم لیگ کے صدر اے۔ ایم۔ قریشی کا صوبہ سندھ میں داخلہ بند کر دیا گیا ہے۔ مجلس عاملہ نے صوبہ لیگ کی صدارت سے ایوب کھوڑو کا استعفیٰ منظور کرنے سے معذوری ظاہر کی اور یہ معاملہ برائے فیصلہ مسلم لیگ کونسل کے سپرد کر دیا۔ اسی دن صوبہ لیگ کے پارلیمانی بورڈ کا بھی اجلاس ہوا جس میں اسی مضمون کی قرارداد منظور کی گئی۔

وزیر اعلیٰ پیر الٰہی بخش نے 31 رجنوری کو اپنے ایک بیان میں اس قرارداد پر نکتہ چینی کی اور اس امر پر حیرت کا اظہار کیا کہ اگر چہ ایوب کھوڑو نے 8 ردسمبر 1948ء کو صوبہ لیگ کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے پارلیمانی بورڈ کے اجلاس میں شرکت کر کے اس کے خلاف قرارداد منظور کرائی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اپنے استعفیٰ کا اعلان محض رائے عامہ کو دھوکا دینے کے لئے کیا تھا۔[34] کھوڑو کی مسلم لیگ اور وزیر اعلیٰ پیر الٰہی بخش کے درمیان اس بیان بازی کا مطلب یہ تھا کہ چودھری خلیق الزماں اور ایوب کھوڑو کے 21 رجنوری کے دورۂ لاہور کے دوران پیر الٰہی بخش کا تختہ الٹنے کا فیصلہ ہو گیا تھا اور اس وقت تک انتخابی ٹربیونل قاضی اکبر اور پیر الٰہی بخش کے خلاف اپنی رپورٹ مرکزی حکومت کو پیش کر چکا تھا۔

یکم فروری کو وزیر اعظم لیاقت علی خان مغربی پنجاب کے بارہ روزہ دورہ کے بعد کراچی واپس پہنچا۔ اس کے اس دورہ کے دوران 26 رجنوری کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کی نئی دفعہ 92 الف کے تحت پنجاب میں گورنری راج نافذ کر دیا گیا تھا۔ یہ کاروائی ممتاز دولتانہ اور وزیر اعلیٰ نواب ممدوٹ کے دھڑوں کے درمیان تقریباً ایک سال تک اقتدار کی رسہ کشی کے بعد عمل میں آئی تھی اور نواب ممدوٹ کے حامیوں کا الزام یہ تھا کہ پنجاب کی سیاست میں یہ انتشار نواب زادہ لیاقت علی خان اور اس کے منظور نظر گورنر سر فرانسس موڈی کی سازشوں کا نتیجہ تھا۔ جس روز لیاقت علی خان پنجاب میں یہ ''کارنامہ'' سرانجام دینے کے بعد واپس کراچی پہنچا۔ اسی دن گورنر سندھ شیخ دین محمد اندرون سندھ کا دورہ کرنے کے بعد مرکزی دارالحکومت میں واپس آ گیا اور اسی دن سندھ کے وزیر اعلیٰ پیر الٰہی بخش نے ایک بیان میں صوبہ کے سابق وزیر اعلیٰ ایم۔ اے کھوڑو اور اس کے حاشیہ برداروں پر الزام عائد کیا کہ وہ پنجاب کی طرح سندھ میں بھی

گورنر راج کے نفاذ کے لئے رائے عامہ ہموار کر رہے ہیں۔ اس نے مزید کہا کہ ''اگر ہمارے قائدین یہ خیال کرتے ہیں کہ سندھ میں صوبائی خودمختاری کو ختم کر دینا چاہیے تو سندھی عوام آغا غلام نبی پٹھان اور ایم۔اے۔کھوڑو کے گروپوں پر لعنت بھیجا کریں گے اور وہ اس دن پر بھی لعنت بھیجیں گے جس دن انہوں نے ان کا اسمبلی کے لئے انتخاب کیا تھا۔'' پیر الٰہی بخش کے اس الزام کی بظاہر بنیاد یہ تھی کہ لیاقت علی خان کے قیام لاہور کے دوران 21 رجنوری کو پاکستان مسلم لیگ کا چیف آرگنائزر چودھری خلیق الزماں اور سندھ کا سابق وزیراعلیٰ ایم۔اے۔کھوڑو بھی لاہور پہنچے تھے اور وہاں کوئی تانا بانا بنا گیا تھا۔

4 رفروری کو پیر الٰہی بخش نے اپنے خلاف انتخابی ٹربیونل کے متذکرہ فیصلہ کے پیش نظر وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کی حکومت 9 ماہ تک قائم رہی تھی۔ اس نے اس سلسلے میں گورنر دین محمد کے نام خط لکھا تھا کہ میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کی دفعہ 5 کی ذیلی دفعہ 2 کے تحت اسمبلی کی رکنیت کے بغیر بھی دس ماہ تک وزیراعلیٰ رہ سکتا ہوں۔ چونکہ میں ایسا نہیں کرنا چاہتا اس لئے میں مستعفی ہو رہا ہوں۔ گورنر دین محمد کو جب یہ خط ملا تو وہ فوراً وزیراعظم لیاقت علی خان کے مکان پر گیا اور وہاں اس نے تقریباً نصف گھنٹہ تک اس سلسلے میں بات چیت کی۔ وہاں سے واپسی پر اس نے پیر الٰہی بخش کا استعفیٰ منظور کر لیا اور اس کی جگہ وزیر مال میر غلام علی تالپور کی سربراہی میں عبوری وزارت سے حلف لیا اور لیگ اسمبلی پارٹی کے نئے قائد کے انتخاب کے لئے 16 رفروری کی تاریخ مقرر کی گئی۔ [35]

5 رفروری کو کراچی کے روز نامہ ''ڈان'' نے اپنے اداریہ میں اس واقعہ پر بے انتہا خوشی کا اظہار کیا۔ اس اخبار کی زیر قیادت ہی کراچی کے اخبارات نے اکتوبر 1948ء میں پیر الٰہی بخش کے بارے میں معاندانہ پروپیگنڈا کی مہم شروع کی تھی اور مطالبہ کیا تھا کہ اسے وزیراعلیٰ کے عہدہ سے برطرف کر دیا جائے۔ حکومت پاکستان نے اس اخباری مطالبہ کے پیش نظر 11 رنومبر کو یہ فیصلہ کیا تھا کہ گورنر دین محمد وزیراعلیٰ پیر الٰہی بخش کے خلاف رشوت ستانی، اقربا پروری، ہندونوازی اور دوسری بدعنوانیوں کے الزامات کی تحقیقات کرے۔ ڈان کے اداریہ میں رائے ظاہر کی گئی تھی کہ ''اللہ تعالیٰ نے گزشتہ ایک سال کے دوران پاکستان کے ان ارباب اقتدار کو تین مرتبہ متنبہ کیا ہے جن کے صدق و خلوص پر اتنے زیادہ لوگوں کی بھلائی کا انحصار ہے۔ پہلا انتباہ

کھوڑو کی برطرفی سے ملا تھا۔ دوسرا چند دن ہوئے نا قابل اصلاح ممدوٹ وزارت کی برطرفی کی صورت میں آیا تھا اور اب تیسرے انتباہ کے طور پر نا عاقبت اندیش اور نا قابل اصلاح پیر الٰہی بخش کے سیاسی وجود کا ہی خاتمہ کر دیا گیا ہے۔[36] گویا ''ڈان'' کی رائے میں سندھ اور پنجاب کے اس سیاسی ہیجان کے پس پردہ صرف اللہ تعالیٰ کے غیبی ہاتھ کی کارفرمائی تھی اور اس میں وزیر اعظم لیاقت علی خان کے جاگیردارانہ سیاسی منصوبے کا کوئی دخل نہیں تھا اور نہ یہ صوبوں اور مرکز کے درمیان اختیارات کی تقسیم، مہاجرین کی آبادکاری اور کراچی کی سندھ سے علیحدگی کے مسائل کی بنا پر پیدا شدہ کشیدگی کا نتیجہ تھا۔

باب: 9

قومیتی اور طبقاتی تضادات میں شدت

اور ہارون وزارت

یوسف ہارون وزارت کی تشکیل اور لیاقت، کھوڑو، خلیق الزماں اور دولتانہ کے مختلف مفادات

پیر الٰہی بخش کے استعفیٰ کے چند دن بعد سندھ میں نئی وزارت کی تشکیل کے لئے زبردست بھاگ دوڑ ہوئی جس کے دوران پہلے تو اس مضمون کی خبریں شائع ہوئیں کہ ''اگر 16 رفروری کو وزارت اعلیٰ کے کسی امیدوار کو پارٹی کی واضح اکثریت کی حمایت حاصل نہ ہوئی تو پنجاب کی طرح سندھ میں بھی گورنر راج نافذ کر دیا جائے گا۔'' پھر یہ خبر آئی کہ ''مقابلہ یوسف ہارون اور میر غلام علی تالپور کے درمیان ہوگا۔''[1] یوسف ہارون کراچی کی سندھ سے علیحدگی کے باعث صوبائی اسمبلی کا رکن نہیں رہا تھا لیکن اسے کراچی کے اخبارات کے علاوہ سندھ کے سابق وزیر اعلیٰ ایم۔اے۔کھوڑو اور پاکستان مسلم لیگ کے چیف آرگنائزر چودھری خلیق الزماں کی تائید وحمایت حاصل تھی۔ چودھری خلیق الزماں کا بیان یہ تھا کہ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے لیڈر کے انتخاب کے لئے کسی شخص کا اسمبلی کا رکن ہونا ضروری نہیں ہے البتہ اگر کوئی غیر رکن اسمبلی پارٹی کا قائد منتخب ہو جائے تو اس کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ وہ چھ ماہ تک کے اندر اندر اسمبلی کا ممبر منتخب ہو جائے۔ اس کا مزید بیان یہ تھا کہ 16 رفروری کو سندھ لیگ اسمبلی پارٹی کا جو اجلاس ہوگا اس کی صدارت پنجاب مسلم لیگ کا صدر ممتاز دولتانہ کرے گا۔

16 رفروری کو حیدرآباد میں پارٹی کا اجلاس ہوا تو پیر الٰہی بخش نے صدر دولتانہ سے درخواست کی کہ اسے اور قاضی محمد اکبر کو اس اجلاس کی رائے شماری میں حصہ لینے کی اجازت دی جائے کیونکہ ان کی نا اہلی کے بارے میں ابھی تک سرکاری گزٹ میں اعلان نہیں ہوا۔ مگر دولتانہ نے یہ درخواست مسترد کر دی اور اس کے بعد یہ اعتراض بھی مسترد کر دیا کہ چونکہ یوسف ہارون اسمبلی کا رکن نہیں ہے اس لئے وہ پارٹی کے قائد کے انتخاب میں حصہ نہیں لے سکتا۔ تقریباً ساڑھے تین گھنٹے کی بحث و تمحیص کے بعد جب خفیہ رائے شماری ہوئی تو یوسف ہارون اپنے حریف میر غلام علی تالپور کے مقابلے میں تین ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہو گیا۔ یوسف ہارون کو 18 ووٹ ملے جبکہ میر غلام علی تالپور کے حق میں 15 ووٹ ڈالے گئے۔ کھوڑو کا ووٹ یوسف ہارون کے حق میں تھا۔ اسی دن شام کو یوسف ہارون نے گورنر دین محمد سے دو مرتبہ ملاقات کی۔ اس کے پاس 22 ارکان اسمبلی کے ناموں کی فہرست تھی جنہوں نے اسے اپنے دستخطوں کے ساتھ اپنی حمایت کا یقین دلایا ہوا تھا۔ اس فہرست میں 4 ایسے ارکان کے دستخط بھی تھے جنہوں نے رائے شماری میں میر غلام علی تالپور کو ووٹ دیئے تھے۔ گویا انہوں نے کامیاب امیدوار کے حق میں سیاسی قلابازی کھانے میں چند منٹ بھی تامل نہیں کیا تھا۔ ان کی یہ حرکت اقتدار پرستی اور سیاسی بے شرمی کی بدترین مثال تھی۔ غلام علی گروپ کی جس چوکڑی نے اب یوسف ہارون کی حمایت میں دستخط کئے تھے وہ عبوری حکومت کے وزیر میران محمد شاہ، محمد ہاشم گزدر، انور حسین ہدایت اللہ اور میر بندے علی تالپور پر مشتمل تھی۔

18 رفروری کو حیدرآباد میں یوسف ہارون کی سربراہی میں سندھ کی نئی کابینہ نے حلف اٹھایا۔ محکموں کی تقسیم یوں تھی:۔

1۔	وزیر اعلیٰ یوسف ہارون	خزانہ، پولیٹیکل سروس اور جنرل ایڈمنسٹریشن
2۔	قاضی فضل اللہ	داخلہ، قانون، تعلیم اور لوکل سیلف گورنمنٹ
3۔	سید میران محمد شاہ	مال، مہاجرین اور بحالیات
4۔	میر بندے علی تالپور	صحت عامہ
5۔	نور محمد شاہ	خوراک، سول سپلائز، صنعت اور محنت

سندھ کی اس نئی وزارت کی تشکیل کا پس منظر یہ تھا کہ سابق وزیر اعلیٰ ایوب کھوڑو نے

یوسف ہارون کی حمایت محض اس لئے کی تھی کہ صوبہ مسلم لیگ کی طرح یوسف ہارون کی وزارت بھی اس کی تابع فرمان رہے گی۔ یوسف ہارون کراچی کی سرمایہ دار میمن برادری سے تعلق رکھتا تھا اور اس بنا پر اس کا اندرون سندھ کے جاگیرداروں سے بہت کم رابطہ تھا۔ اس کا ان جاگیرداروں کی حمایت کے لئے ایوب کھوڑو پر انحصار کرنا ناگزیر تھا۔ مزید برآں اس وزارت کا سب سے سینئر وزیر فضل اللہ ایوب کھوڑو کا معتمد خاص تھا اور وہ سب اہم محکموں کا انچارج تھا اس لئے یہ تاثر بے بنیاد نہیں تھا کہ یوسف ہارون کی وزارت دراصل ایوب کھوڑو کی کٹھ پتلی وزارت تھی۔ بالفاظ دیگر کھوڑو اپریل 1948ء میں اپنی برطرفی اور مختلف مقدمات میں ملوث ہونے کے باوجود سندھ کا بے تاج بادشاہ تھا۔ وزیراعظم لیاقت علی خان کی جانب سے اس صورتحال کو قبول کرنے کی ایک وجہ تو اس کی اس امید میں مضمر تھی کہ یوسف ہارون کی وزارت کراچی کی سندھ سے علیحدگی کے خلاف ایجی ٹیشن کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گی اور مہاجرین کی آبادکاری کے کام میں بھی روڑے نہیں اٹکائے گی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس نے پنجاب میں گورنری راج نافذ کر کے اپنے خلاف پنجابی شاونسٹوں کو محاذ آرائی کا موقع مہیا کر دیا تھا لہٰذا وہ اپنے خلاف صوبہ سندھ میں دوسری محاذ آرائی نہیں چاہتا تھا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ یوسف ہارون اور ایوب کھوڑو کے درمیان تعاون اور اشتراک عمل سے کھوڑو گروپ کی ہوس اقتدار کی کسی حد تک تسکین ہو جائے گی اور اس طرح اس کے خلاف سندھی شاونزم کی حوصلہ افزائی نہیں ہوگی۔ بظاہر اس کے اس خیال کی بنیاد چودھری خلیق الزماں اور ممتاز دولتانہ کی اس یقین دہانی پر تھی کہ اگر کھوڑو کو صوبہ کی مسند اقتدار کے ساتھ کسی نہ کسی حد تک باندھ لیا جائے گا تو وہ مرکزی حکومت کے لئے کوئی خاص سیاسی مشکلات پیدا نہیں کرے گا۔ چودھری خلیق الزماں کو اس انتظام سے یہ امید تھی کہ اس طرح وہ بآسانی پاکستان مسلم لیگ کا صدر منتخب ہو جائے گا اور ممتاز دولتانہ کا اندازہ یہ تھا کہ اس طرح پنجاب میں اس کی سیاسی حیثیت کو تقویت ملے گی اور نواب ممدوٹ وغیرہ اس کے وزیراعلیٰ بننے کے راستے میں حائل نہیں ہو سکیں گے۔

لیکن جاگیردارانہ سازشی سیاست کی بنیاد پر تعمیر کردہ یہ امیدیں بہت جلد چادر ہوا ثابت ہوئیں۔ 20رفروری کو چودھری خلیق الزماں کے پاکستان مسلم لیگ کے صدر کے انتخاب کے بعد جب اس جماعت کے دوسرے عہدیداروں کا انتخاب ہوا تو ان عہدیداروں میں پنجاب کا کوئی عہدیدار شامل نہیں تھا۔ چنانچہ اس واقعہ سے پنجاب کے درمیانہ طبقہ میں بڑا سخت ردِعمل

ہوا۔ اس سے نہ صرف ممتاز دولتانہ اور چودھری خلیق الزماں کے خلاف بلکہ لیاقت علی خان کے خلاف بھی محاذ آرائی میں اضافہ ہوگیا اور صوبہ سرحد میں عوامی لحاظ سے نہایت بااثر پیر مانکی گروپ نے یہ تاثر لیا کہ اس صوبہ میں عبدالقیوم خان کی زیادتیوں کے خلاف مرکزی لیگ اور مرکزی حکومت سے اپیل کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی کیونکہ لیگ کے عہدیداروں کے انتخاب میں قیوم خان کے ایک نامزد امیدوار یوسف خٹک کا بطور جنرل سیکرٹری انتخاب کیا گیا تھا۔ اس انتخاب کے چار دن بعد 24 رفروری کو جب کراچی کے ایک سپیشل جج سید محمد باقر نے لائنوٹائپ مشین کیس کا فیصلہ سناتے ہوئے ایوب کھوڑو کو دو سال قید محض اور ایک ہزار روپے جرمانہ کی سزا کا حکم سنایا تو سندھ کی سیاسی فضا پھر خاصی مکدر ہوگئی۔ کھوڑو نے اسی روز سندھ چیف کورٹ میں اپیل کر کے سپیشل جج کے اس فیصلے کے خلاف حکم امتناعی تو حاصل کر لیا لیکن اس سے یہ تاثر دور نہ ہوا کہ کھوڑو اور اس کا گروپ بدستور مرکزی حکومت کے زیر عتاب ہے۔

مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو ملا کر ون یونٹ بنانے کی تجویز اور سندھ مسلم لیگ کا شدید ردعمل

2 رمارچ کو صوبہ سندھ کی سیاسی فضا اور بھی خراب ہوگئی جب پنجاب کے ایک جاگیردار ملک فیروز خان نون نے پاکستان کے سالانہ بجٹ پر تقریر کرتے ہوئے مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو مدغم کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس نے اپنی تقریر میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ ''دستور سازی کے کام میں بڑی تاخیر ہو رہی ہے۔ عوام الناس نے جس پاکستان کے لئے جدوجہد کی تھی وہ اب محض ایک خواب ثابت ہو رہا ہے۔ اس ایوان میں غیر سرکاری ارکان کی تعداد صرف 25 ہے جو عوام کی تقدیر کی فیصلہ کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ نیا دستور چار پانچ سال سے پہلے نہیں بن سکے گا۔ کیا ہم ان 25 ارکان کے ذریعے چار پانچ سال تک حکومت کرتے رہیں گے۔'' اس نے کہا کہ ''انتظامیہ کو خوش اسلوبی سے چلانے کے لئے مغربی پنجاب اور سندھ کو اور صوبہ سرحد اور بلوچستان کو مدغم کر دیا جائے یا چاروں صوبوں کا ایک یونٹ بنا دیا جائے۔ بصورت دیگر ان چھوٹے صوبوں میں اچھی انتظامیہ وجود میں نہیں لائی جاسکتی۔ مجھے امید ہے کہ حکومت صوبوں کے مسائل پر اور میں نے ان مسائل کا جو حل پیش کیا ہے اس پر بلاتاخیر غور کرے گی۔''[2]

3 / مارچ کو صوبہ سندھ کی سیاسی فضا اور بھی خراب ہو گئی جب مرکزی اسمبلی میں سالانہ بجٹ پر بحث کے دوران پنجاب کے جاگیردار خاندان کی خاتون رکن بیگم شاہنواز نے اپنی تقریر میں اس تجویز کا اعادہ کیا۔ اس نے کہا کہ مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو یکجا کر کے ان کا ایک صوبہ بنا دیا جائے کیونکہ اس طرح انتظامیہ کے اخراجات میں بہت کمی ہو گی۔ بیگم شاہنواز کے الفاظ یہ تھے کہ اگر مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو ایک انتظامیہ میں مدغم کر دیا جائے تو انتظامیہ میں بہتری پیدا ہو گی۔ اس نئے صوبے کے صرف 34 اضلاع ہونگے جن کا نظم و نسق بآسانی اور خوش اسلوبی سے چلایا جا سکتا ہے۔

ایم۔ ایچ۔ گزدر: ۔"بیوروکریٹک افسروں کے ذریعے۔"

بیگم شاہنواز: ۔ میں یہ بات نہیں مانتی کہ صوبوں میں با صلاحیت لوگ نہیں ہیں۔ صوبوں میں با صلاحیت عناصر خراب ہو رہے ہیں۔

بیگم شاہنواز نے مزید کہا کہ مجوزہ صوبجات متحدہ کے دو قانون ساز ادارے ہو سکتے ہیں ایک ایوان زیریں اور دوسرا ایوان بالا۔ ایوان زیریں کا انتخاب آبادی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے اور ایوان بالا میں طاقت کا ایسا توازن پیدا کیا جا سکتا ہے کہ پنجابیوں کی اکثریت کا خطرہ نہ رہے۔"[3]

بیگم شاہنواز کی یہ تجویز جس کی ملک فیروز خان نون نے پر زور تائید کی، کوئی نئی تجویز نہیں تھی۔ دسمبر 1930ء میں علامہ اقبال نے الٰہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں جو صدارتی تقریر کی تھی اس کا مرکزی تصور یہی تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ "پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنا دی جائے۔" علامہ کے بیان کے مطابق یہ تجویز نہرو کمیٹی کے سامنے بھی پیش کی گئی تھی مگر اس کمیٹی نے اس اسے بنا پر مسترد کر دیا تھا کہ اگر اس قسم کی ریاست قائم ہوئی تو اس کا رقبہ اتنا وسیع ہو گا کہ اس کا انتظام کرنا دشوار ہو جائے گا۔ پھر جولائی 1939ء میں پنجاب کے جاگیرداروں کے سرغنہ سکندر حیات خان نے ہندوستان کے آئینی مستقبل کے بارے میں اپنی جو سکیم پیش کی تھی اس میں ان چاروں صوبوں پر مشتمل ایک زونل فیڈریشن کی تجویز موجود تھی۔ مارچ 1942ء کے کرپس پلان میں بھی یہ کہا گیا تھا کہ اگر کوئی صوبہ چاہے تو وہ انڈین یونین سے الگ رہ سکے گا اور اگر انڈین یونین سے الگ رہنے والے صوبے اپنی الگ یونین قائم کرنا چاہیں گے تو وہ ایسا کر سکیں گے۔ بالفاظ دیگر اس پلان میں شمال مغربی

ہندوستان میں مسلم اکثریت کے صوبوں کو اپنی الگ یونین بنانے کا حق دیا گیا تھا۔ مئی 1946ء میں وزارتی مشن نے ہندوستان کے تین علاقوں پر مشتمل کنفیڈریشن کا جو منصوبہ پیش کیا تھا اس میں بھی گروپ ب میں پنجاب، سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد کو شامل کیا گیا تھا اور ان صوبوں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ یکجا ہو کر اپنی علاقائی حکومت قائم کر سکیں گے۔ پھر اگست 1947ء میں قیام پاکستان کے بعد پنجاب کے جاگیرداروں کے علاوہ یہاں کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں نے بھی مغربی پاکستان میں صوبائی حد بندیاں ختم کرنے کی تجویزیں پیش کر دی تھیں جبکہ چھوٹے صوبوں کے لیڈر 1940ء کی قرارداد کے مطابق زیادہ سے زیادہ صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کرتے تھے۔

8/مارچ 1948ء کو جب صوبہ سرحد کے خان عبدالغفار خان اور سندھ کے جی۔ایم۔ سید نے اپنی مجوزہ پاکستان پیپلز پارٹی کے منشور میں یہ مطالبہ کیا تھا کہ پاکستان کے وفاق میں سارے ''لسانی اور ثقافتی یونٹوں کو خودمختاری'' حاصل ہونی چاہیے تو پنجاب کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کے ترجمان اخبار نوائے وقت نے 11/مارچ کو ان ''دشمنان پاکستان'' کی صوبہ پرستی پر سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''زمانہ بڑی تیزی سے آگے نکل رہا ہے۔ دنیا نیشنلزم تک سے بیزار ہو رہی ہے مگر خان عبدالغفار خان اور ان کے ساتھی مسلمانان پاکستان کو پراونشلزم کی طرف بلا رہے ہیں۔ خود پاکستان کے مسلمانوں میں اب یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ صوبائی حد بندیاں ختم کر کے پاکستان میں ایک ہی مرکزی حکومت قائم کر دی جائے۔'' 2/مارچ 1949ء کو نوائے وقت نے لیاقت علی خان کے ہاتھوں ''پنجاب کی تذلیل'' پر تبصرہ کرتے ہوئے پھر لکھا کہ ''ہم نے سب سے پہلے ان کالموں میں یہ آواز بلند کی تھی کہ صوبوں کو توڑ کر پاکستان میں ایک مرکزی حکومت قائم کی جائے ہم نے اس تجویز کے حق میں لکھا ہے اور آج بھی ہماری رائے یہی ہے کہ پاکستان کی موجودہ صوبائی حد بندیاں غیر ضروری، نقصان دہ اور اسراف زر کا موجب ہیں، اس لئے انہیں ختم کر دینا چاہیے۔''

سول اینڈ ملٹری گزٹ نے اپنی 5/مارچ کو اشاعت میں بیگم شاہنواز کی اس تجویز پر فاضلانہ تبصرہ کیا۔ اخبار کی ادارتی رائے تھی کہ ''یہ تجویز قبل از وقت ہے۔ اس تجویز کے حق میں جو یہ دلیل دی گئی ہے کہ اس طرح انتظامیہ کی کارکردگی بہتر ہو گی اور اخراجات کی بچت ہو گی تو اس کا جواب اس حقیقت سے دیا جا سکتا ہے کہ اس طرح اتحاد کے نام پر تنگ نظر صوبہ پرستی کو فروغ

حاصل ہوگا۔ مغربی پنجاب کو اپنی آبادی کی وجہ سے متحدہ علاقوں کے قانون ساز اداروں میں غلبہ حاصل ہوگا۔ آج کل سرحد اور سندھ کی اسمبلیوں میں حزب اختلاف کے رکن کی آواز سنی جا سکتی ہے اور وہ اپنے وجود کو بھی محسوس کرا سکتا ہے لیکن اسے ایک ایسے ایوان میں نظر انداز کر دیا جائے گا جس کی اکثریت کو اس مسئلے کا کوئی علم نہیں ہوگا اور نہ ہی اسے اس مسئلے سے کوئی دلچسپی ہوگی جسے وہ اٹھانا چاہے گا۔ اس طرح جو مایوسی پیدا ہوگی اس سے حسد اور بے اطمینانی کو جنم ملے گا اور آخر الذکر صورتحال اول الذکر صورتحال سے بدتر ہوگی۔ ریاست کے اندر ہم آہنگی ہونی چاہیے لیکن اگر اس کا وجود نہیں ہے تو یہ فرض کر لینا بے سود ہوگا کہ یہ موجود ہے اور ہم آہنگی کی عدم موجودگی میں اس کے وجود کے مفروضے سے ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے کہ جن سے اس کی نشوونما ممکن نہیں ہوگی۔ پاکستانی غیر ملکیوں کے خلاف پہلے پاکستانی ہیں اور پھر کچھ اور ہیں لیکن جہاں تک انکے آپس کے تعلقات ہیں ان کے اندر وہ پہلے پنجابی، بنگالی، پٹھان اور بلوچی ہیں اور اس کے بعد ہم وطن ہیں''، لیکن 6 ؍مارچ 1949ء کے نوائے وقت میں دستور ساز اسمبلی میں بیگم شاہنواز کی تجویز کی پرزور تائید کی گئی اور یہ لکھا گیا کہ ''ہم اس وقت دستور ساز اسمبلی کے ارکان سے بالعموم اور ارباب حکومت سے بالخصوص صرف یہ عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ یہی وقت اس فیصلے کے لئے موزوں ہے۔ نیا آئین بن رہا ہے۔ اگر اس میں ان چار صوبوں کو توڑ کر ایک صوبہ بنا دیا جائے تو عوام اس کا خیر مقدم کریں گے لیکن اگر اس وقت یہ ضروری قدم نہ اٹھایا گیا تو پھر شاید پچاس برس بعد بھی ایسا کرنا آسان نہ ہو۔ اس تجویز کے فوائد سب پر عیاں ہیں۔ اس کے خلاف دو ہی دلیلیں دی جاتی ہیں ایک یہ کہ شاید ان صوبوں کے لوگ اس کی مخالفت کریں اور دوسرے یہ کہ انتظامی لحاظ سے اتنے بڑے صوبے کا انتظام آسان نہ ہوگا۔ جہاں تک ان صوبوں کے لوگوں کا تعلق ہے ایک بڑے محدود طبقے کو چھوڑ کر جس کے پیش نظر وزارتیں اور ممبریاں ہیں عام لوگ اس اقدام کا صدق دل سے خیر مقدم کریں گے۔''

7 ؍مارچ کو پاکستان مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری یوسف خٹک نے پشاور میں اخبار نویسوں سے باتیں کرتے ہوئے مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو مدغم کر کے ایک صوبہ بنانے کی تجویز کی پرزور تائید کی اور یہ رائے ظاہر کی کہ یہ اقدام پاکستان کی حکومت اور عوام کے لئے مسرت و انبساط کا پیغام ہوگا۔ اس نے کہا کہ 'آج کل تنگ نظر صوبہ پرستی قوم کو بری طرح متاثر کر

رہی ہے۔ جب مغربی پاکستان میں ایک صوبہ بنا دیا جائے گا تو صوبہ پرستی کی بیخ کنی ہو جائے گی اور اس کی جگہ ایک متحدہ پاکستانی قومیت کی تشکیل ہوگی۔ انتظامیہ کا غیر ضروری خرچ کم ہوگا اور اس طرح پاکستان میں معاشی استحکام پیدا ہوگا۔ صوبوں کی حد بندیاں ختم ہونے سے پورے مغربی پاکستان میں تجارت کو فروغ حاصل ہوگا اور ایک ہی غذائی اور تعلیمی پالیسی پر عمل ہوگا۔ مختصر یہ کہ اس طرح سارے صوبے اپنی سیاسی، معاشی اور معاشرتی صلاحیتوں کو مجتمع کر کے پاکستان کے لئے فی الحقیقت ایک مستحکم حکومت کے قیام کا باعث بنیں گے۔'' یوسف خٹک نے مزید کہا کہ ''مغربی پاکستان میں صوبوں کے ادغام کے بعد نئے صوبے کو مختلف ڈویژنوں میں منقسم کر کے انتظامیہ کی ازسرِ نو اس طرح تشکیل کی جا سکتی ہے کہ علاقائی کمانڈر براہ راست حکومت پاکستان کے وزیر داخلہ کے براہ راست کنٹرول میں ہوں۔ اس طرح گورنروں، صوبائی ہوم سیکرٹریوں اور دوسرے اعلیٰ حکام کی ضرورت نہیں ہوگی اور جو سرمایہ بچے گا اسے تعمیری کاموں پر خرچ کیا جائے گا۔'' اسی دن مرکزی مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ کے رکن خان محمد ابراہیم خان جھگڑا نے بھی ایک انٹرویو میں اس تجویز کی حمایت کی اور کہا کہ ''میں دستور ساز اسمبلی میں ملک فیروز خان نون کی اس رائے سے اتفاق کرتا ہوں کہ جو چیز بھی پاکستانی قوم میں ڈسپلن اور اتحاد پیدا کر سکتی ہو، حکومت پاکستان کے لئے انتظامی سہولت کا باعث بن سکتی ہو اور ملک کے لئے معاشی طور پر فائدہ مند ہو سکتی ہو قوم کو اس کی حمایت کرنی چاہیے اور حکومت پاکستان کو اس پر عمل کرنا چاہیے۔ جتنی جلدی ایسا کیا جائے گا اتنا ہی حکومت اور عوام کے لئے بہتر ہوگا۔''[4]

یوسف خٹک اور ابراہیم جھگڑا کے ان بیانات میں جو کچھ کہا گیا تھا وہ صوبائی خودمختاری کے علمبرداروں کے لئے بیگم شاہنواز کی تجویز سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ وہ مجوزہ زونل فیڈریشن سے بھی آگے بڑھ کر پورے مغربی پاکستان کی انتظامیہ کو مرکزی حکومت کے کنٹرول میں دینا چاہتے تھے۔ بالفاظ دیگر وہ پاکستان میں وحدانی نظام حکومت کے حق میں تھے۔ ان کے ان بیانات کے پس منظر میں کسی جذبۂ حب الوطنی یا پاکستان میں اتحاد و یکجہتی کی کسی خواہش کی کارفرمائی نہیں تھی۔ ان بیانات کا پس منظر یہ تھا کہ خان عبدالغفار خان نے 8 / مارچ 1948ء کو اپنی پیپلز پارٹی کے جس منشور کا اعلان کیا تھا اس میں ''آزاد سوشلسٹ ریاستوں'' کے قیام اور ''لسانی اور ثقافتی یونٹوں'' کی خودمختاری کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ یہ دونوں مسلم لیگی زعما ان دنوں عبدالقیوم خان کے

''چمچے'' تھے۔ چونکہ عبدالقیوم خان نے پیر مانکی گروپ کے خلاف لیاقت علی خان سے گٹھ جوڑ کیا ہوا تھا اس لئے اس کا خیال یہ تھا کہ وہ یوسف خٹک وغیرہ کے ذریعے پاکستان کے اتحاد و یکجہتی کا نعرہ لگا کر اپنے سارے سیاسی حریفوں کے خلاف من مانی کاروائی کر سکے گا اور اس کاروائی میں اسے پنجابی شاونسٹوں کی تائید وحمایت حاصل ہوگی۔ قبل ازیں جون 1948ء میں خان عبدالغفار خان کی گرفتاری اور پھر بھابھڑا کی فائرنگ کے بعد لاہور کا روزنامہ نوائے وقت اسے ''مردآہن'' اور ایک ''مثالی حکمران'' کے خطابات دے چکا تھا۔

تاہم صوبہ سندھ میں ''وحدانی نظام حکومت'' کے نظریے کے خلاف بہت برہمی کا اظہار کیا گیا۔ 17 ر مارچ کو صوبہ کے ایک مسلم لیگی لیڈر ہاشم گزدر نے، جو ان دنوں یوسف ہارون کی حکومت کا حامی تھا، ایک بیان میں صوبوں کو مدغم کرنے کی تجویز پر سخت نکتہ چینی کی۔ اس نے کہا کہ اگر اس تجویز پر عمل ہوا تو ایسے مسائل پر توجہ نہیں دی جا سکے گی جو واضح نسلی اختلافات، مخصوص ثقافت، رسم ورواج، روایات، طرز زندگی اور مقامی ضروریات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس نے کہا کہ اگر ادغام کی تجویز اس بنا پر پیش کی جارہی ہے کہ ہم سب مسلمان ہیں تو پھر مجوزہ وحدانی حکومت میں دنیا کی ساری مسلم حکومتوں کو شامل کیوں نہیں کیا جاتا اور ان سارے علاقوں کا نظم ونسق چلانے کے لئے صرف ایک بادشاہ کا تقرر کیوں نہیں کیا جاتا؟ اس نے پاکستان میں وحدانی نظام حکومت نافذ کرنے کی تجویز کو غیر جمہوری قرار دیا اور یورپ اور امریکہ کے دستوروں کے حوالے دے کر یہ ثابت کیا کہ اختیارات کی لامرکزیت جمہوریت کی نشوونما کے لئے سودمند اور ممد ومعاون ہوتی ہے۔ اس نے کہا کہ جمہوری ممالک میں چھوٹے بڑے سارے یونٹوں کے عوام کو اپنے مسائل خود حل کرنے کے لئے مکمل اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو جمہوریت ایک ڈھونگ بن کر رہ جاتی ہے۔ کوئی مرکزی حکومت مقامی مسائل پر توجہ نہیں دے سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوری ممالک میں نہ صرف صوبوں کو بلکہ قصبوں کو بھی پوری آزادی دی جاتی ہے کہ وہ اپنے مسائل خود حل کریں۔ [5]

24 ر مارچ کو سول اینڈ ملٹری گزٹ میں کراچی کے سیاسی مبصر مشتاق احمد کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں ان وجوہ کا تجزیہ کیا گیا تھا جو پاکستان میں دستور سازی کے کام کی تکمیل میں تاخیر پیدا کر رہی تھیں۔ اس مضمون میں وحدانی نظام حکومت کی حمایت کرتے ہوئے یہ رائے

ظاہر کی گئی تھی کہ اگر ملک کے موجودہ وفاقی ڈھانچے کو قائم رکھا گیا تو آئندہ مرکزی قانون ساز اسمبلی میں مشرقی بنگال کو قطعی اکثریت حاصل ہو جائے گی۔ لہٰذا صرف ایک یونٹ کے دوسرے سارے یونٹوں پر غلبہ کے خطرہ کے سد باب کے لئے کوئی اور تدبیر تلاش کرنا پڑے گی۔ موجودہ وفاقی ڈھانچے کے تحت صوبہ سرحد اور بلوچستان کو مرکزی کنٹرول سے اتنی آزادی نہیں ملے گی جتنی کہ مشرقی بنگال کو حاصل ہوگی۔ کراچی مغربی پاکستان کا اعصابی مرکز ہے اور غالباً ہمیشہ رہے گا لیکن مشرقی پاکستان کے بارے میں بڑے بڑے فیصلے ڈھاکہ میں ہوں گے۔ آج کل جو رعایت دینے کا جذبہ پایا جاتا ہے اس سے آئندہ کے لئے رہنمائی حاصل نہیں کرنی چاہیے۔ اگر ملک کے دستور کو آزادانہ جمہوری عمل کے تحت چلانا ہے تو سیاسی دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ابھی سے جذبات سے بالاتر ہو کر کوئی معقول تصفیہ کر لیا جائے۔ مغربی پاکستان کے اشتمال سے اس قسم کے تصفیے میں آسانی پیدا ہوگی۔ اس قسم کی تحریک سے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان سیاسی قوتوں کا توازن بحال ہو جائے گا۔ اس طرح ابتداً ملک بن دو اقتدار اعلیٰ کی حامل ریاستوں کی ایک ایسی یونین بنایا جائے گا جس میں دفاع، امور خارجہ، تجارت اور کرنسی وغیرہ جیسے مشترکہ امور کا انتظام کیا جائے گا۔ قرارداد لاہور میں بھی ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی زونوں میں دو خود مختار اور اقتدار اعلیٰ کی حامل ریاستوں کے قیام کا تصور پیش کیا گیا تھا، ہماری ریاست کے اتحاد اور اس کی خوشحالی کے لئے ضروری ہے کہ پورے مغربی پاکستان کو ایک مرکزی انتظامیہ کے ماتحت کر دیا جائے۔ صوبائی حد بندیاں اور مقامی اسمبلیاں ختم کر دینی چاہئیں۔ صوبوں کی موجودہ شکل وصورت کو بدلنے کے حق میں بڑے زوردار اور ناقابل تردید دلائل دیئے جا سکتے ہیں۔ ہمارے معاملے میں لسانی یا ثقافتی غلبہ کا مسئلہ پیدا نہیں ہو سکتا کیونکہ مطالبہ پاکستان ہماری اس تہذیب اور ثقافت کا آئینہ دار تھا جس پر ہمیں بجا طور پر فخر ہے اور اب جبکہ ہم نے اپنا وطن حاصل کر لیا ہے جس کے اندر ہماری ثقافت اور زبان اجنبی اثرات سے بے نیاز ہو کر فروغ پا سکتی ہیں تو پاکستان کے شہریوں کو نجی طور پر صرف اس بات میں دلچسپی ہے کہ یہاں ایک جمہوری، خوش اسلوبی سے کام کرنے والی اور سستی انتظامیہ ہو۔ انتظامی اداروں کی اتنی بڑی تعداد ہمارے وسائل پر بوجھ بنی ہوئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر مغربی پاکستان کو متحد کیا گیا تو بعض حلقوں کی طرف سے اس کی مخالفت کی جائے گی۔ لیکن جو لوگ مرکز کے خلاف صوبائی حقوق کا تحفظ کریں گے وہ ایسے

مفاد پرست ہوں گے جنہیں صوبائی اسمبلیوں میں سیاسی ہیر پھیر اور سازشوں کے مواقع ملتے ہیں۔ اگر اب ہم نے مغربی پاکستان کو متحد نہ کیا تو آئندہ ہم تصادموں اور علیحدگی کے خطرات کا سد باب نہیں کر سکیں گے۔[6] اسی دن پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے بہاولپور میں ایک جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے صوبہ پرستی کی مذمت کی اور متنبہ کیا کہ جب تک آٹھ کروڑ مسلمان اپنی ہستی کو یکجا نہیں کریں گے اس وقت تک پاکستان کی ترقی کی راہ میں بہت رکاوٹ حائل رہے گی۔

سندھ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے 26/مارچ کو اس قسم کے پروپیگنڈا کے خلاف سخت تشویش کا اظہار کیا۔ مجلس عاملہ نے اس سلسلے میں جو قرارداد منظور کی اس میں کہا گیا تھا کہ اگر مغربی پاکستان کے صوبوں کے ادغام کی تجویز پر عمل کیا گیا تو عوام الناس اپنے مسائل خود حل کرنے کے حق سے محروم ہو جائیں گے اور نتیجتاً کلی طور پر افسر شاہی کا راج نافذ ہو جائے گا اور اس طرح مقامی ضروریات، مقامی انداز فکر و نظر اور مقامی اہلیت کے مطابق مقامی ترقی کی راہ میں مزید رکاوٹیں حائل ہوں گی۔ مسلمہ جمہوری اصولوں کے تحت وفاقی یونٹوں کو مکمل اختیارات دیئے جاتے ہیں کہ وہ قومی مسائل سے الگ اپنے مقامی مسائل خود حل کریں۔ مختلف یونٹوں کے درمیان زبان، رسم و رواج روایات اور مسائل کے اختلافات اس قدر وسیع ہیں کہ اگر ان یونٹوں کو مدغم کر دیا گیا تو انتظامی اخراجات میں بچت تو بہت کم ہو گی لیکن قومی مفادات کو بہت زیادہ نقصان پہنچے گا۔ سارے جمہوری ممالک میں یونٹوں کو مقامی معاملات میں کلی اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور جو جمہوری ممالک مخلصانہ طور پر جمہوری نظریات کے حامل ہیں ان میں ہمیشہ یونٹوں کو وسیع تر اور مکمل اختیارات دینے کی وکالت کی جاتی ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر مجلس عاملہ، مغربی پاکستان میں صوبوں کے ادغام کی تجویز کی سخت مخالفت کرتی ہے اور امید کرتی ہے کہ بعض کوتاہ اندیش مفاد پرستوں کی طرف سے اس مقصد کے لئے جو تحریک کی گئی ہے اس پر ملک کے ذمہ دار حلقوں میں سنجیدگی سے غور و فکر نہیں کیا جائے گا۔[7]

ہاشم گزدر کے بیان اور سندھ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی اس قرارداد کی تعبیر یہ تھی کہ صوبہ سندھ میں وزیر اعلیٰ یوسف ہارون کی سیاسی پوزیشن کمزور تھی اور سابق وزیر اعلیٰ ایوب کھوڑو کے گروپ کا غلبہ تھا حالانکہ چار دن قبل یعنی 22/مارچ کو گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کی جانب سے خصوصی ٹربیونل کی رپورٹ کے پیش نظر کھوڑو کو تین سال کے لئے ہر پبلک عہدہ کے لئے نااہل قرار

دیا جا چکا تھا۔ ٹربیونل کی جانب سے 26 دسمبر 1948ء کو پیش کردہ 200 صفحوں کی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ کھوڑو کے خلاف رشوت ستانی کا تو کوئی الزام ثابت نہیں ہوا البتہ بدانتظامیوں کے بہت سے الزامات مبنی برصداقت ہیں۔ مجلس عاملہ کی اس قرارداد کی ایک اور تعبیر یہ تھی کہ وزیراعلیٰ یوسف ہارون اور کھوڑو گروپ کے درمیان تعاون اور اشتراک عمل کی فضا زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی اور کھوڑو اور مرکزی حکومت کے درمیان سیاسی محاذ آرائی میں پھر شدت پیدا ہو جائے گی۔

بظاہر پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں کی تعبیر بھی یہی تھی۔ چنانچہ اس نے 31 مارچ کو صوبوں کے ادغام کے بارے میں جو بیان دیا اس میں اس کا "نقش قدم یوں بھی تھا اور یوں بھی۔" اس کے بیان کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلم لیگ ہائی کمان کے دو ممتاز ارکان نے صوبوں کے ادغام کے بارے میں جو بیانات دیئے ہیں ان میں انہوں نے اپنے ذاتی نظریات کا اظہار کیا ہے۔ مسلم لیگ نے ابھی تک اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ میری رائے میں مغربی پاکستان کے صوبوں کے ادغام کے لئے یہ ضروری ہے کہ مختلف صوبوں کے نمائندے اپنی رضا و رغبت سے اس قسم کے اقدام پر متفق ہوں۔ یہ مسئلہ پاکستان کے لئے بہت اہم ہے لہٰذا اس کے حسن و قبح پر آزادانہ بحث کا خیر مقدم کرنا چاہیے تا کہ رائے عامہ اس مسئلہ پر مرتکز ہو سکے اور حکومت پاکستان اس بارے میں کسی فیصلہ پر پہنچنے کے قابل ہو سکے۔ جب کبھی مجھے محسوس ہوا کہ عوام الناس میں اس نظریے کے حق میں زبردست جذبہ پایا جاتا ہے تو میرا یہ فرض ہوگا کہ اس مسئلہ کو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے روبرو پیش کروں۔[8] تاہم اسی دن مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری یوسف خٹک نے ایک بیان میں کہا کہ پاکستان کے چھوٹے بڑے یونٹوں کے حقوق کے تحفظ کے مسئلہ کو مسلم لیگ کے دستور میں کامیابی سے حل کر دیا گیا ہے۔ اس دستور کے تحت لیگ کے مرکزی اداروں میں مختلف صوبوں کو اس طرح نمائندگی دی گئی ہے کہ کوئی ایک صوبہ دوسرے صوبوں پر اپنا غلبہ قائم نہیں کر سکتا۔ مغربی پاکستان کے صوبوں کے ادغام کی صورت میں مختلف صوبوں کو نمائندگی دینے کے لئے بھی اسی اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔[9] یوسف خٹک کے اس بیان کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح فروری 1948ء میں منظور شدہ مسلم لیگ کے دستور میں مشرقی پاکستان اور پنجاب کو مسلم لیگ پر غلبہ سے محروم رکھا گیا اسی طرح پنجاب کو مغربی پاکستان کے صوبجات متحدہ میں اتنی نمائندگی دی جا سکتی ہے کہ اس کا چھوٹے صوبوں پر غلبہ قائم نہ ہو۔ تاہم اس کا یہ بیان اس کی سیاسی کم علمی،

بے عقلی اور موقع پرستی پر مبنی تھا۔ کسی بھی نظام حکومت میں کسی علاقہ کا غلبہ اس کے قانون ساز اسمبلی میں ارکان کی تعداد سے یا سیاسی جماعت کے کونسلروں کی تعداد سے قائم نہیں ہوتا بلکہ غلبہ کا سارا انحصار سول انتظامیہ اور مسلح افواج میں اس کے ارکان کی تعداد پر ہوتا ہے۔ مسلم لیگ کے فروری 1948ء کے دستور کے تحت کل 450 مرکزی لیگ کونسلروں میں سے مشرقی پاکستان کے کونسلروں کی تعداد صرف 180 تھی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اس زمانے میں مشرقی پاکستان کے عوام کی مسلم لیگ کے ساتھ وابستگی مغربی پاکستان کے مسلم عوام سے کم تھی بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ پاکستان کے سارے قومی شعبوں میں مغربی پاکستانیوں کا بالعموم اور پنجابیوں و مہاجروں کا بالخصوص غلبہ تھا اسے لئے ناگزیر طور پر ان کا مسلم لیگ پر غلبہ قائم ہوا۔ فروری 1949ء میں مسلم لیگ کے عہدیداروں کے انتخاب میں پنجاب کو نمائندگی محض اس لئے نہیں ملی تھی کہ چودھری خلیق الزماں اور لیاقت علی خان کی اشیر باد سے صوبہ سرحد، سندھ اور مشرقی بنگال اور یو۔ پی کے مہاجر کونسلروں نے پنجاب کے خلاف گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔ فروری 1948ء کے دستور کے تحت مسلم لیگ کا تنظیمی ڈھانچہ وفاقی تھا لیکن اب بیگم شاہنواز اور یوسف خٹک وغیرہ کی تجویز یہ تھی کہ ملک کا سیاسی ڈھانچہ وحدانی ہونا چاہیے۔ کوئٹہ کے ایک پٹھان لیگی لیڈر قاضی محمد عیسیٰ نے بھی 31/مارچ کو ایک بیان میں اس تجویز کی حمایت کی تھی۔ اس کی لیڈری کا انحصار بلوچستان کے عوام کی تائید و حمایت پر نہیں تھا بلکہ اس حقیقت پر تھا کہ اسے مرکزی قیادت کے اشارے پر ناچنے کا فن آتا تھا۔ نوائے وقت نے کچھ عرصہ قبل اس کی لیڈری کو محض ایک غبارے سے تشبیہ دی تھی جو اسی جانب اڑتا تھا جس جانب ہوا کا رخ ہوتا تھا۔

12/اپریل کو کسی شخص نے ''مفکر'' کے نام سے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں ایک اسلامی ریاست کے طور پر افغانستان اور پاکستان کی فیڈریشن پر مشتمل سلطنت کے قیام کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ اس مضمون میں لکھا تھا کہ میں نے مغربی پاکستان کے سارے صوبوں کے ون یونٹ میں ادغام اور رفتہ رفتہ ساری افرادی قوت و معاشی ذرائع کو جبراً سرکاری تحویل میں لینے اور لاہور۔ ہرات روڈ کھولنے کی وکالت کی۔ پاکستان اور افغانستان کی بطور اسلامی ریاست کے قیام کا فارمولا کیا ہوگا؟ ہمیں ایک آئینی بادشاہ کی ضرورت ہے اور افغانوں کو جمہوری اداروں کی ضرورت ہے تاکہ لوگ اپنے وزراء کا انتخاب کر سکیں۔[10]

غالباً اسی مضمون کے جواب میں 18راپریل کو پاکستان ٹائمز میں ہاشم گزدر کا ایک مضمون شائع ہوا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ پورے پاکستان یا مغربی پاکستان میں وحدانی نظام حکومت کی تجویز سراسر غیر جمہوری ہے اور یہ ان وعدوں کے بھی منافی ہے جو 1940ء کی قرارداد پاکستان اور 1949ء کی قرارداد مقاصد میں کئے گئے ہیں۔ ان قراردادوں میں غیر مبہم الفاظ میں یہ وعدہ موجود ہے کہ پاکستان میں اقتدار اعلیٰ کی حامل آزاد ریاستوں پر مشتمل وفاقی نظام حکومت قائم ہو گا لیکن اگر بنگال اور پنجاب نے محض اپنی اکثریت کے بل بوتے پر چھوٹے صوبوں کے عوام کے جذبات و احساسات کو نظر انداز کر کے اس وعدے کی خلاف ورزی کی تو یہ انتہائی غیر منصفانہ اقدام ہوگا۔ ممکن ہے کہ انہیں وقتی طور پر کامیابی ہو جائے لیکن یہ آمرانہ رویہ بالآخر اپنے مقصد میں ناکام ہوگا اور اس امر کا امکان ہے کہ اس طرح قومی ریاست کا ڈھانچہ کمزور ہو جائے گا کیونکہ اس قسم کے نظام حکومت کے نفاذ کا مطلب یہ ہوگا کہ چھوٹے صوبوں کے عوام کو بزور قوت غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھا جائے گا۔ آئین کی تاریخ اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ 1940ء کی قرارداد لاہور کا احترام کیا جائے۔ ملک کے چھوٹے یونٹوں کی آزادی کو بزور قوت سلب نہیں کرنا چاہیے۔ اگر یونٹوں کی آزادی میں کوئی کمی ضروری ہو تو وہ ان یونٹوں کی آزادانہ رضا و رغبت سے ہونی چاہیے۔ اگر مرکز کی وحدانی حکومت سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ مختلف صوبوں کے مقامی معاملات سے محض اس لئے نبٹ سکے گی کہ ہم سب مسلمان ہیں تو دنیا کے سارے مسلم ممالک کی ایک وحدانی حکومت قائم کیوں نہیں کی جاتی اور ایک ایسے بادشاہ کا تقرر کیوں نہیں کیا جاتا جو سارے مسلم علاقوں کا نظم ونسق چلائے۔ اگر ہمیں واپس غیر جمہوری طرز حکومت کی طرف ہی جانا ہے تو پھر مغربی پاکستان یا پورے پاکستان میں ''بادشاہی'' طرز کی حکومت کیوں نہیں قائم کی جاتی اور پارلیمنٹ اور وزراء وغیرہ کو ختم کیوں نہیں کر دیا جاتا؟ لیکن مجھے یقین ہے کہ جس کسی کو بھی آزادی عزیز ہے وہ کبھی اس قسم کی پوزیشن کو قبول نہیں کرے گا کیونکہ اس کا مطلب مکمل طور پر افسر شاہی کی حکومت ہوگا۔ اگر سوئٹزرلینڈ، آسٹریلیا، کینیڈا اور دنیا کے دوسرے ممالک میں چھوٹے یونٹوں کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ دلیل بالکل کھوکھلی معلوم ہوتی ہے کہ چھوٹے یونٹوں کی وجہ سے انتظامیہ کے اخراجات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان ممالک کی مرکزی حکومتیں صوبائی حکومتوں کے اخراجات محض اس لئے پورے کرتی ہیں کہ ہر علاقے کے لوگوں کو اپنے مسائل خود حل کرنے کی

مکمل آزادی حاصل ہو۔[11]

19 اپریل کو دستور ساز اسمبلی کے رکن چودھری نذیر احمد خان کا سول اینڈ ملٹری گزٹ میں ایک انٹرویو شائع ہوا جس میں کچھ بے سرو پا باتیں کہی گئی تھیں جن کا مفہوم کچھ اس طرح تھا کہ اگر ہم متوازن طریقے سے صنعت اور قومی ذرائع کی ترقی چاہتے ہیں تو مغربی پاکستان میں ایک مرکزی حکومت کی انتظامیہ ضروری ہے۔ ہم پنجابیوں، سندھیوں، بلوچیوں اور پشاوریوں کا ذکر فطری انداز میں کرتے ہیں۔ یہ بظاہر فطری امتیازات فی الحقیقت بالکل مصنوعی ہیں جن کی ایک اسلامی ریاست میں کوئی بنیاد نہیں ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس صوبہ پرستی کے مسئلہ کی تحقیقات کے لئے ذمہ دار رائے عامہ پیدا کی جائے۔ اگر ہم ہمہ گیر معیشت کا اس طرح اطلاق کر سکتے ہیں کہ حکومت کی کارگردگی پر اثر نہ پڑے تو مغربی پاکستان کے ادغام کے حق میں بڑی زوردار وجوہ موجود ہیں۔[12] اسی دن یعنی 19 اپریل کو ہی سندھ مسلم لیگ کونسل کا ایک اجلاس لاڑکانہ میں ہوا جس میں سید علی اکبر شاہ کی زیر صدارت ایک قرارداد کے ذریعے مغربی پاکستان کے صوبوں کو ایک واحد یونٹ میں مدغم کرنے کی تجویز کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ قرارداد میں یہ رائے ظاہر کی گئی کہ یہ تجویز غیر جمہوری ہے۔ اس پر عمل کرنے سے مطلق العنان حکومت اور آمریت قائم ہو جائے گی اور تصادم ہونے کا بھی امکان ہے۔ 1940ء کی قرارداد لاہور میں یونٹوں کو مکمل خودمختاری اور حق خوداختیاری کا یقین دلایا گیا تھا لیکن اب صوبوں کے ادغام کی تجویز پیش کر کے اس یقین دہانی کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی جارہی ہے۔[13]

پنجابی اخبارات میں پنجابی اور مہاجر اسلام فروشوں کی اس پروپیگنڈا مہم، ہاشم گزدر کے متذکرہ مضمون اور لیگ کونسل کی اس قرارداد سے صاف ظاہر ہے کہ سندھ کے جاگیردار اور درمیانہ طبقہ کو قیام پاکستان کے بعد پنجابیوں اور مہاجروں کے غلبہ کا جو خطرہ لاحق ہو گیا تھا وہ اب ان کے خیال میں صحیح ثابت ہو رہا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ نواب زادہ لیاقت علی خان وحدانی نظام حکومت قائم کر کے ایک ایسی ''مہاجر ایمپائر'' قائم کرنے کا خواب دیکھ رہا ہے جس میں یو۔ پی اور حیدرآباد (دکن) کے جاگیرداروں اور تعلقہ داروں کی بدبودار تہذیب وثقافت کا بول بالا ہوگا۔ ان کے لئے یہ حقیقت اہمیت سے خالی نہیں تھی کہ کسی مرکزی وزیر نے صوبوں کی حدبندیاں ختم کرنے کی غیر جمہوری تجویز پر لب کشائی نہیں کی تھی۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ اب پنجاب کے حکمران طبقوں

اور درمیانہ طبقہ کے شاونسٹوں کے بھی اپنے سامراجی عزائم ہیں۔ چونکہ سول انتظامیہ اور مسلح افواج میں انکی اکثریت ہے اس لئے وہ بزورقوت اپنی ایک ''پنجابی سلطنت'' قائم کرنے کے متمنی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ لاڑکانہ میں سندھ مسلم لیگ کی دوروزہ کانفرنس میں ایک قرارداد کے ذریعے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ سندھیوں کو ڈپلومیٹک اور مرکزی سروسز کے علاوہ مسلح افواج میں بھی نمائندگی دی جائے کیونکہ ان میں فوجی خدمات سرانجام دینے کی ساری صلاحیتیں موجود ہیں۔ کانفرنس کی صدارت مرکزی وزیر مواصلات سردار عبدالرب نشتر نے کی تھی اور مرکزی وزیرداخلہ خواجہ شہاب الدین کے علاوہ پاکستان مسلم لیگ کا صدر چودھری خلیق الزماں بھی وہاں موجود تھا۔ [14]

ون یونٹ کی تجویز کے بعد سندھی۔مہاجر تضادات میں مزید شدت

مغربی پاکستان میں صوبوں کی حدبندیاں ختم کر کے ون یونٹ قائم کرنے کی تجویز کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت پاکستان نے اگست 1948ء میں ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کر کے سندھ میں مشرقی پنجاب کے مزید دولاکھ مہاجروں کو آباد کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا اس میں عمل درآمد کی راہ میں بڑی مشکلات پیش آنے لگیں۔ سندھیوں اور غیر سندھیوں کے درمیان تضاد کی شدت میں اس قدر اضافہ ہو گیا کہ بعض سندھیوں نے دوایک مہاجر کیمپوں پر حملے کر کے خون خرابہ بھی کیا۔ اس صورتحال کے پیش نظر جمعیت المہاجرین والانصار کے زیر اہتمام 30 اپریل 1949ء کو حیدرآباد میں ایک مہاجر کنونشن منعقد ہوا جس میں مشرقی پنجاب کے بعض مہاجر لیڈروں کے علاوہ حسین شہید سہروردی نے بھی شرکت کی۔ یہ تنظیم 20 اگست 1948ء کو کراچی میں مہاجرین و انصار کے مفادات کے تحفظ کے لئے وجود میں آئی تھی۔ یہ مولوی بدایونی اور مولوی عثمانی کی جماعتوں سے الگ تھی۔ اس کے کار پرداز ان میں بوہرہ، میمن اور خوجہ فرقوں کے بعض سرمایہ داروں کے علاوہ مولوی اسماعیل ذبیح اور قاضی محمد اکبر جیسے مہاجرین اور انصار بھی شامل تھے۔ سہروردی ان دنوں کلکتہ کے محکمہ انکم ٹیکس کی مسلسل چیر پھاڑ سے تنگ آ کر پاکستان میں مستقل طور پر آ گیا تھا اور وہ یہاں لیاقت علی خان کے مقابلے میں اپنی سیاست کی دکان چمکانے کے لئے کسی دلکش پلیٹ فارم کی تلاش میں تھا۔ قبل ازیں 11 اپریل 1949ء کو حیدرآباد مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری قاضی فیض محمد نے ایک بیان میں مولانا عبدالقیوم کانپوری کی طرف سے بلائے

جانے والے اس کنونشن کی مخالفت کی تھی اور یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ''اس طرح مہاجرین اور انصار کے درمیان غیر دوستانہ اور ناخوشگوار جذبات پیدا ہو جائیں گے اور وہ صحت مند فضا مکدر ہو جائے گی جو مسلم لیگ نے شب و روز کی محنت سے پیدا کی ہے۔''[15] تاہم حسین شہید سہروردی نے یکم مئی کو اس کنونشن میں مہاجرین کی آبادکاری کے سلسلے میں حکومت پاکستان، حکومت سندھ اور مسلم لیگ کی پالیسی پر سخت نکتہ چینی کی۔ اس نے کہا کہ مسلم لیگ جمہوری تنظیم نہیں ہے۔ یہ عوام کی نمائندگی نہیں کرتی۔ اگر اس جماعت کی از سر نو تنظیم نہ کی گئی تو عوامی بے اطمینانی کی آگ پورے ملک میں پھیل جائے گی۔ اس نے کہا کہ بعض افراد سندھی اور غیر سندھی کے گمراہ کن نعرے لگا کر کنونشن کو ناکام کرنے کی مذموم کوشش کرتے رہے ہیں۔ حالانکہ مہاجرین پاکستان کے معمار ہیں اور انہوں نے اس مملکت کے قیام کے لئے بڑی قربانیاں دی ہیں۔

اس کنونشن کے تین دن بعد 4 رمئی کو اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ سندھ سے چھ ہزار مہاجرین واپس مغربی پنجاب کے لئے روانہ ہو گئے ہیں۔ جب سہروردی نے یہ خبر پڑھی تو اس نے 6 رمئی کو حیدرآباد میں مہاجرین کنونشن کے ''قانونی مشیر'' کی حیثیت سے ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ سندھ میں مہاجرین کی آبادکاری کے سلسلے میں صوبائی حکومت کی ناکامی کی وجوہ کی تحقیقات کی جائے۔ اس نے کہا کہ مہاجرین مقامی باشندوں کے معمولات زندگی میں مداخلت نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہی وہ ان کے حقوق چھیننا چاہتے ہیں۔ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ متروکہ جائیداد میں ان کے حق کے بارے میں کوئی تنازعہ پیدا نہ کیا جائے۔ اس نے کہا کہ سندھی عوام مہاجرین کے خلاف نہیں ہیں البتہ چند بااثر افراد ایسے ہیں جنہوں نے بہت سی متروکہ جائیدادوں پر قبضہ رکھا ہے اور اس بنا پر وہ مہاجرین کی آبادکاری کی مخالفت کر رہے ہیں۔ وہ سندھیوں اور ناجائز سندھیوں کے درمیان اختلافات سے سیاسی مفادات حاصل کرنے کی بھی کوشش کر رہے ہیں۔ چنانچہ ان کے مذموم رویے کی بنا پر سندھیوں اور غیر سندھیوں کے درمیان تلخی میں اتنا زیادہ اضافہ ہو گیا ہے کہ حال ہی میں دو مہاجر کیمپوں پر حملہ کیا گیا ہے مگر سہروردی کا یہ سیاسی واویلا بے اثر ثابت ہوا۔ سندھیوں اور مہاجرین کے درمیان اختلافات کی شدت میں اضافہ ہوتا ہی چلا گیا اور صوبہ سندھ میں محض مہاجرین کے سہارے سہروردی کے قدم نہ جم سکے اور اسے جلد ہی اس مقصد کے لئے پنجاب کا رخ کرنا پڑا۔

سہروردی کے اس بیان میں اس قدر صداقت ضرور تھی کہ صوبہ میں ہندوؤں کے 1345000 ایکڑ متروکہ رقبہ اراضی سے 800000 ایکڑ رقبہ پر مقامی مسلم زمینداروں نے قبضہ کرلیا ہوا تھا اور وہ اپنے اس قبضہ کو برقرار رکھنے کے لئے سندھیوں اور غیر سندھیوں کے تضاد میں شدت پیدا کرتے رہتے تھے مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ ایکڑ متروکہ رقبہ جو مہاجرین کے لئے دستیاب تھا اس میں سے بیشتر رقبہ یو۔پی، حیدرآباد (دکن) اور ہندوستان کے بعض دوسرے علاقوں کے ''مہاجر زمینداروں'' کو الاٹ کر دیا گیا تھا۔ حکومت پاکستان کی آباد کاری کی سکیم کے تحت ہر ''مہاجر زمیندار'' کو 250 ایکڑ تک رقبہ الاٹ ہوا تھا جبکہ مقامی تقریباً 20 لاکھ بے زمین، سندھی ہاری اور تقریباً دو لاکھ خانماں برباد غریب مہاجرین در بدر کی ٹھوکریں کھاتے تھے۔

ان دنوں سندھیوں اور غیر سندھیوں کے درمیان تضاد کی شدت کا اندازہ اس حقیقت سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مہاجر کنونشن کے تقریباً تین ہفتے بعد 26 رمئی کو حیدرآباد میں اخبار نویسوں کی انجمن میں بھی اس بنا پر پھوٹ پڑگئی۔ سندھی اخبار نویسوں نے ایک الگ ایسوسی ایشن قائم کر لی جس کا صدر سندھی زبان کے روزنامہ ''ہلال پاکستان'' کے ادارتی عملہ کا ایک رکن عبدالشکور منشی تھا۔ اس منشی گروپ کو ایوب کھوڑو کی حمایت حاصل تھی اور اس کی طرف سے اعلان کیا گیا تھا کہ اس گروپ کی ایسوسی ایشن کا افتتاح 29 رمئی کو کھوڑو کا رفیق خاص فضل اللہ کرے گا جو ہارون وزارت میں وزیر داخلہ تھا۔ اس اعلان میں مزید کہا گیا تھا کہ سندھی اخبار نویسوں کی اس افتتاحی کانفرنس میں اخبارات کی پالیسی اور اخبارات کے بارے میں حکومت سندھ کی پالیسی پر غور کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں منشی گروپ کی تجویز یہ تھی کہ سندھ کے اخبارات کے مفادات کے تحفظ کے لئے ایک سندھ پریس ایڈوائزری کمیٹی کی تشکیل کی جائے۔ اس گروپ کے مقابلے میں مہاجر اخبار نویسوں کی انجمن کا سربراہ ''ترجمان'' کا ایڈیٹر مولانا اسماعیل ذبیح تھا جس نے مہاجر کنونشن کے انعقاد کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس مہاجر گروپ نے اعلان کیا تھا کہ اسکی سندھ نیوز پیپرز ایسوسی ایشن کا افتتاحی اجلاس سندھی صحافیوں کی افتتاحی کانفرنس سے ایک دن قبل 28 رمئی کو ہوگا۔ اس گروپ کو سندھ کی سابقہ حکومت کی پشت پناہی حاصل رہی تھی۔ [16]

کھوڑو کی زیر قیادت جاگیرداروں کا سرمایہ دار یوسف ہارون کے خلاف تضاد اور ہاری رپورٹ میں ایم۔مسعود کا اختلافی نوٹ

دریں اثنا سندھ کے وزیر اعلیٰ یوسف ہارون اور جاگیرداروں کے درمیان طبقاتی تضاد شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا۔فروری 1949ء میں جب ایوب کھوڑو اور بعض دوسرے بڑے جاگیرداروں نے وزارت اعلیٰ کے عہدہ کے لئے میر غلام علی تالپور کے مقابلے میں یوسف ہارون کی حمایت کی تھی تو انہیں یہ امید تھی کہ چونکہ کراچی کا یہ سرمایہ دار میمن جاگیردار طبقہ سے تعلق نہیں رکھتا اس لئے اس کی حیثیت محض ایک نمائشی وزیر اعلیٰ کی رہے گی اور اصل اقتدار عملاً کھوڑو گروپ کے ہاتھ میں ہی رہے گا مگر چار وجوہ کی بنا پر ان کی یہ امید پوری نہ ہوئی۔اول یہ کہ یوسف ہارون کو لیاقت علی خان کی مرکزی حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی۔دوئم یہ کہ کراچی کا طاقتور پریس اس کا حامی تھا اور سوئم یہ کہ اس زمانے میں سندھ ہاری کمیٹی نے بے زمین ہاریوں کے حقوق کے لئے زبردست ایجی ٹیشن شروع کر رکھی تھی۔جگہ جگہ ہاری کانفرنسیں ہوتی تھیں جن میں دقیانوسی زمینداری نظام کے خاتمہ کا مطالبہ کیا جاتا تھا اور چہارم یہ کہ سندھ ہاری کمیٹی رپورٹ میں ایک سی۔ایس۔پی افسر ایم۔مسعود کے اختلافی نوٹ نے بڑی شہرت اختیار کر لی تھی اور کراچی کے علاوہ پورے ملک کے اخبارات میں آئے دن یہ مطالبہ ہوتا رہتا تھا کہ اس اختلافی نوٹ کو شائع کیا جائے۔یوسف ہارون نے فروری 1949ء میں برسر اقتدار آنے کے فوراً بعد صدیوں پرانے جاگیرداری نظام کے خلاف دیہاتی اور شہری عوام کی بیداری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔اس نے مارچ 1949ء میں سندھ اسمبلی کے بجٹ سیشن کے دوران ''سندھ مزارعت بل'' پیش کیا۔اگرچہ یہ بل سر راجر ٹامس کی ہاری کمیٹی کی رپورٹ کی بنیاد پر مرتب کیا گیا تھا اور اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ بے زمین ہاریوں کی قدرے اشک شوئی کر کے صوبہ میں جاگیرداری نظام کو جوں کا توں برقرار رکھا جائے لیکن بیشتر زمیندار مظلوم ہاریوں کو اس بل میں تجویز کردہ تھوڑی رعایت دینے پر بھی آمادہ نہیں تھے۔انہیں اس بل کی اس قسم کی شقیں پسند نہیں تھیں کہ مزارعوں سے بیگار اور نذرانے لینے کی ممانعت ہوگی، جو مزارع کم از کم تین سال تک ایک ہی مالک کے چار ایکڑ رقبہ پر کاشت کرے گا اس کے مستقل حقوق مزارعت تسلیم کر لئے جائیں گے۔جب یہ بل اس سیشن میں

منظوری کے مراحل طے نہ کر سکا تو ایک طرف تو 90 فیصد قابل کاشت رقبہ کے مالک جاگیرداروں نے اپنے ''حقوق'' کے تحفظ کے لئے اپنے آپ کو منظم کرنا شروع کر دیا اور دوسری طرف بے زمین ہاریوں نے سندھ ہاری کمیٹی اور سندھ ہاری فیڈریشن کی قیادت میں اپنے حقوق کے لئے ایجی ٹیشن شروع کر دی۔ کراچی اور دوسرے شہروں کے درمیانہ طبقہ کی ہمدردیاں ہاریوں کے ساتھ تھیں۔ اخبارات بھی بالعموم ہاریوں کی حمایت میں لکھتے تھے اور سرمایہ دار طبقہ کی بھی خواہش تھی کہ جاگیرداروں پر ہاریوں کی ایجی ٹیشن کا دباؤ پڑتا رہے۔

بظاہر ایسی ہی صورتحال کی پیش بینی کر کے سندھ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے یوسف ہارون کے برسر اقتدار آنے کے تقریباً تین ہفتے بعد 11 ر مارچ 1949ء کو ایک اجلاس میں مسلم لیگ اور وزیر اعلیٰ کے درمیان تعلقات کے مسئلے پر غور کیا تھا۔ اس اجلاس میں یوسف ہارون کا ایک خط پڑھ کر سنایا گیا تھا جس میں اس نے یقین دلایا تھا کہ حکومت سندھ مسلم لیگ کے مرتب کردہ پروگرام پر عمل کرے گی۔ چنانچہ مجلس عاملہ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ جب تک یوسف ہارون کی وزارت مسلم لیگ کی ہدایت پر عمل کرے گی اس وقت تک اس کو لیگ کی طرف سے غیر محدود مدد ملے گی۔ [17]

17 ر مارچ کو صوبائی اسمبلی میں بجٹ پر بحث کے دوران وزیر اعلیٰ یوسف ہارون نے ایوب کھوڑو کے خلاف تحقیقاتی عدالت کے اخراجات کی بڑی مشکل سے منظوری حاصل کی۔ کیونکہ کھوڑو گروپ کے ارکان کا اعتراض یہ تھا کہ چونکہ یہ تحقیقاتی عدالت مسلم لیگ اسمبلی پارٹی، صوبائی اسمبلی اور صوبائی وزارت کی منظوری حاصل کئے بغیر مقرر کی گئی تھی اس لئے اس عدالت کے اخراجات کی ادائیگی کا کوئی جواز نہیں۔ آغا غلام نبی پٹھان نے اس مسئلہ پر اپنی تقریر میں وزیر اعلیٰ کو متنبہ کیا تھا کہ وہ اس مطالبہ زر کی منظوری حاصل کرنے میں عجلت نہ کرے کیونکہ اس طرح اس کی اپنی پوزیشن متاثر ہوگی۔ میر غلام علی تالپور نے جو پیر الٰہی بخش کی کابینہ میں وزیر تھا اور جس کے عہد اقتدار میں یہ تحقیقاتی عدالت قائم کی گئی تھی کہا کہ اس عدالت کا تقرر قائد اعظم کے حکم کے تحت ہوا تھا۔ اس سلسلے میں صوبائی کابینہ سے کوئی صلاح مشورہ نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی ذمہ داری صرف صوبائی گورنر شیخ غلام حسین ہدایت اللہ پر تھی۔ وزیر اعلیٰ یوسف ہارون نے اس بحث کے جواب میں کہا کہ ''پیر الٰہی بخش کی حکومت میں جو برائیاں ہوئی تھیں انکی جواب دہی آئینی طور پر مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ اگر اب یہ مطالبہ زر منظور نہ کیا گیا تو اس امر کا امکان ہے کہ صوبہ میں گورنری راج

نافذ کر دیا جائے گا۔'' وزیر اعلیٰ کی اس تقریر کے بعد اسمبلی نے طوعاً و کرھاً یہ مطالبہ زرمنظور کر دیا[18] لیکن اس واقعہ سے یہ واضح ہو گیا کہ یوسف ہارون اور کھوڑو گروپ کے درمیان تعاون دیرپا نہیں ہوگا۔ 27 ر مارچ کو کراچی کے ڈپٹی ایڈمنسٹریٹر ایم۔مسعود نے اپنے خلاف اُس نکتہ چینی کا جواب دیا جو''اشتراکیت اور زراعتی مساوات'' کے زیر عنوان ایک کتابچہ میں کی گئی تھی۔ یہ کتابچہ مولوی عبدالحامد بدایونی اور متعدد دوسرے مولویوں کے دستخطوں سے شائع ہوا تھا اور اس میں ہاری کمیٹی کی رپورٹ میں ایم۔مسعود کے اختلافی نوٹ کے بعض اقتباسات کے حوالے دے کر یہ فتویٰ صادر کیا گیا تھا کہ ایم۔مسعود کا اختلافی نوٹ غیر اسلامی ہے کیونکہ اس میں اس نے قرآن وحدیث کے حوالے دے کر کمیونزم کو جائز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔[19]

ایم۔مسعود کے اختلافی نوٹ کے بارے میں اس تنازعہ کا پس منظر یہ تھا کہ 1946ء میں سندھ میں شیخ غلام حسین ہدایت اللہ کی مسلم لیگی حکومت نے انتخابی سٹنٹ کے طور پر ایک انگریز زمیندار سر راجر ٹامس کی سربراہی میں ایک ہاری کمیٹی مقرر کی تھی جس کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ صوبہ میں بے زمین ہاریوں کی زبوں حالی کا جائزہ لے کر یہ تجاویز پیش کرے کہ کس طرح ان مظلوموں کی حالت کو بہتر کیا جا سکتا ہے۔ ان دنوں ایم۔مسعود ضلع نواب شاہ کا کلکٹر تھا اور وہ ہاریوں کے ہمدرد کے طور پر مشہور تھا۔ چنانچہ اسے ہاریوں کے نمائندہ کی حیثیت سے کمیٹی کا رکن مقرر کیا گیا تھا۔ اس کمیٹی نے فروری 1948ء میں اپنی رپورٹ پیش کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ سندھ کے ہاری کو اگر کوئی تکلیف ہے تو اس کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ مالکان اراضی تو اس کے دوست ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہاری ''ناشکرا'' ہے اور زمیندار کے احسانات کو تسلیم نہیں کرتا۔ کمیٹی نے ہاریوں کو مستقل حقوق کاشت دینے پر اعتراض کیا تاہم ارکان کی اکثریت نے یہ تجویز پیش کی کہ صوبائی حکومت بٹائی کو باقاعدہ بنانے پر ہاریوں کو حقوق دینے کے لئے مزارعوں کے حقوق کا قانون منظور کرے۔ جب یہ رپورٹ پیش کی گئی اس وقت ایوب کھوڑو صوبائی حکومت کا سربراہ تھا۔ اس نے اس پر دووجوہ کی بنا پر کوئی کارروائی نہ کی۔ اول یہ کہ نہ صرف وہ خود نہایت دقیانوسی جاگیردار تھا بلکہ وہ ایسے ظالم جاگیرداروں اور زمینداروں کی نمائندگی کرتا تھا جو ہاریوں کو اپنی غلامی کے پنجے میں جکڑے رکھنا چاہتے تھے اور انہیں کوئی بھی رعایت دینے کے حق میں نہیں تھے۔ دوئم یہ کہ کھوڑو ان دنوں ''سندھی حقوق ومفادات'' کا بھی علمبردار تھا اور اس بنا پر اس کی مرکزی حکومت کے ساتھ

سیاسی محاذ آرائی جاری تھی۔

جنوری 1949ء میں پیر الٰہی بخش کی حکومت نے اخبارات اور مختلف سیاسی عناصر کے مسلسل مطالبہ کے پیش نظر کمیٹی کی اکثریتی رپورٹ شائع کر دی لیکن اس کے ساتھ ہی اس فیصلے کا بھی اعلان کیا کہ ایم۔مسعود کا اختلافی نوٹ شائع نہیں کیا جائے گا۔اس پر جب اخبارات، طلبا اور کسانوں کی مختلف تنظیموں کی طرف سے زبردست احتجاج کا سلسلہ شروع ہو گیا تو مارچ 1949ء میں مولوی عبدالحامد بدایونی اور دوسرے 15 ملاؤں نے ایک پمفلٹ میں یہ فتویٰ صادر کر دیا کہ ایم۔مسعود کا اختلافی نوٹ غیر اسلامی ہے اور یہ کہ ایم۔مسعود کا رجحان اشتراکی ہے۔ اس پر ایم۔مسعود بہت سٹپٹایا۔تاہم اسے ایک اعلیٰ افسر کی وجہ سے اس امر کی ٹھوس شہادت مل گئی کہ الٰہی بخش وزارت کے ایک جاگیردار وزیر نے اس کے اختلافی نوٹ کی نقل ملاؤں کو مہیا کی تھی اور ان سے وعدہ کیا تھا کہ اگر انہوں نے اس کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کر دیا تو انہیں معقول انعام دیا جائے گا۔کراچی کے ملا نئے فوراً رضامند ہو گئے۔اس کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ انہیں سندھ کے جاگیرداروں سے انعام و اکرام کی امید تھی بلکہ یہ وجہ بھی تھی کہ جو "مہاجر زمیندار" نواب زادہ لیاقت علی خان کی نظر عنایت کے باعث سندھ اور پنجاب میں اپنے اور اپنے رشتہ داروں کے نام پر 250 ایکڑ فی کس کے حساب سے متروکہ اراضی الاٹ کرا رہے تھے انکا مفاد بھی اسی میں تھا کہ بے زمین ہاریوں کے حق میں کوئی آواز اٹھنے نہ پائے۔ جب ملاؤں کا یہ فتویٰ پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوا تھا اس وقت سرمایہ دار یوسف ہارون کی وزارت بن چکی تھی اور اس کی وجہ سے "مقامی" اور "مہاجر" زمینداروں کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ اگر مسعود کے اختلافی نوٹ کی بنیاد پر ہاریوں کے حق میں پروپیگنڈا مہم شروع ہو گئی تو زمینداروں کے "حقوق" کو نقصان پہنچے گا۔ ملاؤں کا یہ فتویٰ ظالم و جابر جاگیرداروں کے مفاد میں مذہب کے ناجائز استعمال کی بدترین مثال تھا۔قبل ازیں 1948ء میں مسلم لیگ کی زرعی کمیٹی اپنی رپورٹ میں اس حقیقت کی نشاندہی کر چکی تھی کہ بڑے بڑے زمینداروں کے حقوق ملکیت کا جائزہ لیا جائے تو شاید کوئی بھی اپنا دعویٰ 1857ء کی جنگ سے پہلے کی تاریخ کا ثابت نہ کر سکے۔زیادہ تر زمیندار ایسے ہیں جو انگریز کے "لطفِ توجہ" کی پیداوار ہیں۔

ایم۔مسعود نے 5 رمئی 1949ء کو حکومت سندھ کو ہتک عزت کا نوٹس دے دیا جس

میں لکھا تھا کہ میرا اختلافی نوٹ خفیہ طور پر اور بد دیانتی سے ملاؤں کے ایک ٹولے کو مہیا کیا گیا ہے۔ چونکہ ملاؤں کے فتوے سے میری شہرت کو نقصان پہنچا ہے اس لئے مجھے پانچ لاکھ روپے کا ہرجانہ دیا جائے۔ اس نوٹس کی خبر 6/مئی کے اخبارات میں شائع ہوئی تو اس کے آٹھ دن بعد 14/مئی کو حکومت سندھ نے ایک پریس نوٹ میں صوبہ کے زمینداروں کو متنبہ کیا کہ وہ اپنی اراضی سے ہاریوں کی بے دخلی کا سلسلہ بند کردیں۔ پریس نوٹ میں کہا گیا تھا کہ صوبائی اسمبلی کے گزشتہ سیشن میں جو مزارعت بل پیش کیا گیا تھا اس کے پیش نظر بعض زمینداروں نے ہاریوں کی بے دخلیاں شروع کر دی ہیں تاکہ اس مجوزہ قانون کے تحت ہاریوں کو کوئی حقوق کاشت کاری نہ مل سکیں۔ ان زمینداروں کی یہ کاروائی بے سود ہے کیونکہ بل میں کہا گیا ہے کہ جن مزارعوں کو یکم اپریل 1948ء کے بعد بے دخل کیا جائے گا انہیں حقوق مزارعت سے محروم نہیں کیا جاسکے گا۔ لہٰذا زمینداروں سے گزارش کی جاتی ہے کہ وہ بیدخلیاں بند کردیں کیونکہ اس طرح ان کے مطلوبہ مقصد کی تکمیل نہیں ہوگی اور خواہ مخواہ زمینداروں اور مزارعوں کے طبقوں کے درمیان منافرت پھیلے گی جو صوبہ سندھ کے علاوہ پاکستان کی معاشی حالت بھی کمزور کرے گی [20] لیکن زمینداروں پر اس پریس نوٹ کا کوئی اثر نہ ہوا اور انہوں نے اس کی اشاعت کے اگلے دن 16/مئی کو میر غلام علی تالپور کی دعوت پر حیدرآباد میں جلسہ کر کے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے ''مفادات کے تحفظ'' کے لئے ایک ایسوسی ایشن کی صورت میں اپنے آپ کو منظم کریں گے۔ اس جلسہ میں یوسف ہارون کی کابینہ کے ایک وزیر میر بندے علی تالپور کو جاگیرداروں کی اس تنظیم کا پہلا صدر منتخب کیا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ جاگیرداروں کے موقف کے پرچار کے لئے انگریزی، اردو اور سندھی زبان میں تین اخبارات شائع کئے جائیں گے۔ اس مقصد کے لئے ایک لاکھ روپے موقع پر ہی جمع ہو گئے۔ جو سندھی جاگیردار کسی وجہ سے اس جلسہ میں شریک نہیں ہوئے تھے ان میں سے تقریباً 50 جاگیرداروں نے یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ اس تنظیم کی پوری حمایت کریں گے۔ [21]

سندھ کے جاگیرداروں نے جب یہ جلسہ کیا گیا تھا کہ تو انہیں اپنے صوبہ کے وزیر اعلیٰ کی سیاسی کمزوری کا اچھی طرح علم تھا۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ یوسف ہارون جولائی 1948ء میں کراچی کی سندھ سے علیحدگی کے بعد نہ صرف صوبائی اسمبلی کا رکن نہیں رہا تھا بلکہ وہ اسمبلی کا ممبر بن بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس کا نام اسمبلی کے ووٹروں کی فہرست میں شامل ہی نہیں تھا اور یہ کہ اگر وہ

جنوری 1950ء تک اسمبلی کا ممبر نہ بنا تو وہ وزارت اعلیٰ کے عہدے پر قائم نہیں رہ سکے گا۔ یوسف ہارون نے فروری 1949ء میں وزیر اعلیٰ بننے کے بعد کچھ عرصہ بعد سے حیدر آباد کے ایک سب جج کی عدالت میں درخواست دے رکھی تھی کہ اسے اپنا نام حیدر آباد کے حلقۂ انتخاب کے ووٹروں کی فہرست میں درج کرانے کی اجازت دی جائے لیکن 24 رمئی کو اس نے اپنی یہ درخواست واپس لے لی کیونکہ حیدر آباد کے ایک ووٹر نے اعتراض کیا تھا کہ چونکہ درخواست دہندہ گزشتہ چھ ماہ سے حیدر آباد کا باشندہ نہیں ہے اس لئے وہ یہاں سے ووٹر نہیں بن سکتا۔ 27 رمئی کو کراچی کے روزنامہ ڈان نے یہ خبر شائع کی کہ وزیر اعلیٰ یوسف ہارون کو اسمبلی کا ووٹر بننے کی ضرورت نہیں کیونکہ 1945ء میں صوبائی اسمبلی کے ووٹروں کی جو فہرست مرتب ہوئی تھی اس میں اس کا نام بھی موجود ہے۔ ڈان کی اس خبر کا مطلب یہ تھا کہ سندھی جاگیرداروں کی مخالفت کے باوجود یوسف ہارون اسمبلی کا ممبر بن جائے گا اور اس کی وزارت اعلیٰ کی گدی بھی قائم رہے گی۔ 26 رمئی کو یوسف ہارون نے اس موقف کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی جبکہ اس نے حیدر آباد میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ''میں ایک سال کے اندر صوبہ سندھ میں جاگیرداری نظام کو ختم کر دوں گا۔''[22] جاگیرداروں نے یوسف کے اس اعلان کا جواب 2 رجون کو اس خبر کے ذریعے دیا کہ سندھ مسلم لیگ کا قائم مقام صدر حاجی علی اکبر شاہ اور جنرل سیکرٹری محمد شفیع سندھی، سندھ پروانشل سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ایک وفد کے ہمراہ صوبہ سندھ کا دس دن تک دورہ کریں گے۔ اس دورے کا پروگرام یہ تھا کہ وہ حیدر آباد، میر پور خاص، نواب شاہ، سکھر، جیکب آباد، شکار پور، لاڑکانہ اور دادو جائیں گے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ ان شہروں میں سٹوڈنٹس فیڈریشن کی از سر نو تنظیم کی جائے گی۔[23]

پھر جب 4 رجون کو یہ خبر شائع ہوئی کہ ''حیدر آباد میں بے شمار بے زمین ہاریوں کا اجتماع ہوا جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ جاگیرداری نظام کو فوراً ختم کر دیا جائے اور زمین ان میں تقسیم کر دی جائے۔ اس اجتماع میں میر غلام علی تالپور کی ان کوششوں کی مخالفت کی گئی جو وہ ہاریوں کے خلاف جاگیرداروں کا متحدہ محاذ بنانے کے لئے کر رہا تھا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہاریوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے اگست میں ایک کنونشن منعقد کیا جائے گا۔''[24] 10 رجون کو سول اینڈ ملٹری گزٹ کے کراچی ایڈیشن میں ایک نیم سرکاری مبصر مشتاق احمد کے ایک مضمون میں سندھ کے

صدیوں پرانے جاگیرداری نظام کو فی الفور ختم کر کے زمین ہاریوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی گئی تو جاگیرداروں کی طرف سے دوسرا جواب 12 رجون کو دیا گیا جبکہ آل سندھ کنونشن کی آرگنائزنگ کمیٹی نے حیدرآباد میں اپنے دوروزہ اجلاس میں یہ فیصلہ کیا کہ یہ دوروزہ کنونشن 20 راگست کو ہوگا۔ اس آرگنائزنگ کمیٹی کا قیام اپریل کے اواخر میں دوروزہ مہاجر کنونشن کے انعقاد کے تقریباً ایک ماہ بعد 29 رمئی کو عمل میں آیا تھا اور مجوزہ آل سندھ کنونشن کا مقصد یہ تھا کہ پاکستان کے آئندہ کے آئینی ڈھانچے میں صوبوں کے لئے مکمل خودمختاری حاصل کی جائے گی اور موجودہ حالات میں سندھیوں کے سیاسی حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔[25] آرگنائزنگ کمیٹی کے پہلے روز کے سیشن (11 رجون) کی تین گھنٹے کی بحث و تمحیص کے دوران ممتاز لیڈروں نے اپنی تقریروں میں اس امر پر زور دیا کہ سندھی سچے پاکستانی ہیں لیکن وہ چاہتے ہیں کہ صوبہ سندھ پاکستان کے اندر رہتے ہوئے اپنی جداگانہ ہستی سے محروم نہ ہونے پائے اور نہ ہی اس صوبہ کے سندھی اور مہاجر عوام جمہوری اور انتظامی حقوق سے محروم ہوں۔ سندھی عوام کی سیاسی اور انتظامی شعبوں میں اپنے جائز حقوق کے خواہاں ہیں اور وہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ضرورت ہوئی تو تکالیف اٹھانے پر بھی آمادہ ہوں گے۔[26]

وزیراعلیٰ یوسف ہارون کو اور غالباً مرکزی ارباب اقتدار کو بھی سندھ کنونشن کے انعقاد کے بارے میں اس اعلان سے پریشانی ہوئی کیونکہ اس بوتل میں سندھی شاونزم کا خوفناک بھوت بند تھا۔ چنانچہ 16 رجون کو یوسف ہارون اور اس کے ایک وزیر میران محمد شاہ نے کراچی میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے مہاجرین کو متنبہ کیا کہ وہ اپنی الگ تنظیمیں بنا کر انتشار نہ پھیلائیں۔ اگر انہیں کوئی شکایتیں ہوں تو وہ مسلم لیگ کی وساطت سے حکومت کو مطلع کریں۔ وزراء نے کہا کہ اگر مہاجرین نے اپنی الگ تنظیمیں قائم کرنے پر اصرار کیا تو پھر حکومت سندھ کو اس صورتحال سے نبٹنے کے لئے مناسب اقدامات پر غور کرنا پڑے گا۔[27] اگرچہ اس پریس کانفرنس میں سرکاری انتباہ کا رخ مہاجرین کی طرف تھا لیکن دراصل اس سے سندھ کنونشن کے منتظمین کو یہ بتانا مقصود تھا کہ انہیں مسلم لیگ سے الگ صوبائی شاونزم کی بنیاد پر کوئی تنظیم قائم کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس پریس کانفرنس سے ایک دن قبل 15 رجون کو کراچی کی بار ایسوسی ایشن، ایک قرارداد میں سندھ کے چیف جج پر صوبہ پرستی کا الزام عائد کر چکی تھی۔ قرارداد میں کہا گیا تھا

کہ چیف جج بار ایسوسی ایشن کے ارکان سے بالعموم اور مہاجر وکلا سے بالخصوص مسلسل حقارت آمیز سلوک کرتا ہے۔ نتیجتاً وکلا مناسب طریقے سے اور بلا خوف وخطر اپنے مؤکلوں کا موقف پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ قرارداد میں متنبہ کیا گیا تھا کہ اگر چیف جج نے اپنے اس رویے کو نہ بدلا تو ایسوسی ایشن ایسے اقدامات کرنے پر مجبور ہو جائے گی جن سے وہ گریز کرنے کی خواہاں ہے۔[28] یہ قرارداد اس حقیقت کی آئینہ دار تھی کہ یوسف ہارون کے عہد اقتدار میں سندھیوں اور مہاجروں کے درمیان تضاد اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ پریس کانفرنس کے تین چار دن بعد کراچی کے روزنامہ جنگ نے وزیر اعلیٰ یوسف ہارون پر صوبہ پرستی کا الزام لگایا کیونکہ اس نے نہ صرف مہاجرین کو اپنی الگ تنظیمیں قائم کرنے کی ممانعت کی تھی بلکہ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ مہاجرین خود اپنی آبادکاری کی راہ میں رکاوٹ حائل کرتے ہیں۔ ''جنگ'' کے اداریہ نویس کی رائے یہ تھی کہ ''اس بیان سے صوبہ پرستی کی بو آتی ہے اور اس میں حقائق کی گمراہ کن تعبیر کی گئی ہے۔ کیا کھوڑو اور جی۔ ایم۔ سید نے جو سندھی کنونشن طلب کیا ہے وہ صوبہ پرستی کی بدترین مثال نہیں ہے۔ موجودہ حکومت سندھ صوبہ پرستی کے مہلک کیڑے کا انسداد کرنے میں بری طرح ناکام رہی ہے۔ یوسف ہارون نے مہاجروں کو بہت متنبہ کیا ہے لیکن کیا وہ ان افسروں کے خلاف انضباطی کارروائی کرنے کو تیار ہے جو ہندوؤں سے محبت اور جانبداری کے باعث مہاجرین سے سنگین بے انصافی کے جرم کا ارتکاب کرتے رہے ہیں۔ مسٹر ہارون یہ تسلیم کیوں نہیں کرتے کہ ان کی وزارت کی زندگی کا انحصار ان افراد پر ہے جو سراسر رجعت پسند اور صوبہ پرست ہیں...... اب تک حکومت سندھ دانستہ یا نادانستہ طور پر کسی نہ کسی شکل میں صوبہ پرستی کی حوصلہ افزائی کرتی رہی ہے اور اگر وہ اسی راستے پر گامزن رہی تو اس کے سنگین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔''[29]

تاہم حکومت سندھ نے کھوڑو گروپ کے جاگیرداروں کو اس سلسلے میں مزید متنبہ کرنے کے لئے 20 رجون کو ایم۔ مسعود کا اختلافی نوٹ شائع کر دیا۔ اس کی اشاعت وزیر اعظم لیاقت علی خان کی خواہش پر ہوئی تھی جس نے ایم۔ مسعود کو ہدایت کی تھی کہ وہ حکومت سندھ کے نام ارسال کردہ ہرجانہ کا نوٹس واپس لے لے کیونکہ اس کے اختلافی نوٹ کا مکمل متن شائع کر دیا جائے گا۔ اس اختلافی نوٹ میں سندھ کے تقریباً 20 لاکھ ہاریوں کی زبوں حالی اور تقریباً سات ہزار بڑے زمینداروں کی بدکرداری کا لرزہ خیز نقشہ کھینچ کر یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ سندھ کا موجودہ زمینداری

نظام پاکستان کے لئے عظیم ترین لعنت کی حیثیت رکھتا ہے۔'' ہاریوں کی زندگی منظم نہیں ہے اور نہ ہی ان میں منظم طریقے سے رہنے کا شعور پیدا ہوا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی گھاس پھونس کی جھونپڑیوں میں الگ الگ رہتے ہیں۔ بہت سے ہاری اپنی جھونپڑیوں میں مویشی بھی رکھتے ہیں۔ ان کے گھر کا اثاثہ دو ایک چار پایوں، چند مٹی اور دھات کے برتنوں، کچھ بوسیدہ کپڑوں اور ایک لکڑی کے صندوق پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہاری کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جس قطعۂ زمین پر وہ کئی نسلوں سے کام کر رہا ہے وہاں سے اسے کس وقت بے دخل کر دیا جائے گا۔ وہ ہر لمحہ خوفزدہ رہتا ہے۔ اس پر قید کا خوف طاری رہتا ہے اور یہ بھی ڈر لگا رہتا ہے کہ اس سے کسی وقت بھی زمین، بیوی یا زندگی چھین لی جائے گی۔ اسے نیم پکی فصل چھوڑنی پڑے گی۔ اس کے مویشی چھین لئے جائیں گے۔ اسے مار پیٹ کر گاؤں سے نکال دیا جائے گا یا پولیس اسے چوری، ڈاکے اور قتل کے الزام میں گرفتار کر لے گی۔ زمیندار اپنے سرکاری دوستوں کی مدد سے اسے کسی بھی وقت گرفتار کرا سکتا ہے۔ وہ دوزخ کے عذاب سے زیادہ زمیندار کی سزا سے ڈرتا ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی آنکھوں سے کئی بدنصیب ہاریوں کو زمیندار کی بہیمانہ سزا کے باعث راہیٔ ملکِ عدم ہوتے دیکھا ہوتا ہے۔ ہاری سے کسی وقت بھی زمیندار کی زمین پر یا اس کے گھر میں بیگار لی جا سکتی ہے۔ وہ زمیندار کے کسی حکم کی تعمیل میں پس و پیش نہیں کر سکتا۔ اگر ہاری کی بیوی خوش شکل ہو تو وہ اس کے لئے خطرے کا باعث ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنی خوشی سے بیوی کو زمیندار کے حوالے نہ کرے تو اسے فوجداری الزام میں گرفتار کر لیا جاتا ہے اور پھر اس کی بیوی کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ اگر زمیندار کو ان حربوں سے ہاری کی بیوی حاصل کرنے کی امید نہ ہو تو وہ اسے قتل کروا دیتا ہے۔ عام انتخابات میں کوئی ہاری اپنی مرضی سے اپنا حق رائے دہی استعمال نہیں کرتا۔ وہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر زمیندار کو یقین دلاتا ہے کہ وہ اسی کو ووٹ دے گا اور اگر وہ زمیندار انتخابی معرکے میں ہار جائے تو پھر بے چارے ہاری کی جان عذاب میں آ جاتی ہے کیونکہ زمیندار فرض کر لیتا ہے کہ اس کے ہاری نے اسے ووٹ نہیں دیا تھا۔ وہ اپنے زمیندار کے سامنے ایک بے یار و مددگار غلام کی طرح رہتا ہے۔ دیہاتی علاقوں میں یہ دلخراش منظر ہر جگہ نظر آتا ہے کہ ہاری اپنے زمیندار کے پاؤں کو چھوتا ہے۔ جب کبھی زمیندار اپنی زمین پر آتا ہے تو ہاری اور اس کے بیوی بچے پہلے اپنے مالک کے پاؤں کو ہاتھ لگاتے ہیں اور پھر اس کے ہاتھ چھوتے ہیں۔ کوئی ہاری سیدھا کھڑا ہو کر زمیندار کو سلام نہیں کرتا بلکہ اسے اس مقصد

کے لئے بہت جھکنا پڑتا ہے۔کوئی ہاری زمیندار کے برابر یا چار پائی پر نہیں بیٹھ سکتا۔ وہ کسی اونچی جگہ پر بیٹھنے کی جرأت بھی نہیں کرسکتا بلکہ اسے نشیبی جگہ پر دوزانو ہوکر بیٹھنا پڑتا ہے۔ پیراور مولوی زمینداروں کے حلیف ہوتے ہیں اور وہ ہر وقت ہاری کو اپنی تقدیر پر شاکر رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ چونکہ وہ کئی نسلوں سے ظلم وستم کا شکار ہوتا ہے اس لئے وہ سمجھتا ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ نے اسکی تقدیر ہی ایسی بنائی ہے جس میں واویلا کرنے سے کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ اگرچہ رواجی قانون یہ ہے کہ فصل میں زمیندار اور ہاری کا حصہ برابر ہوتا ہے لیکن عملی طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ زمیندار ہاری سے کئی قسم کے غیر قانونی ٹیکس اور ابواب وصول کرتا ہے۔کوئی ہاری ابواب کی ادائیگی سے انکار نہیں کرسکتا اور پھر اسے پیروں اور مولویوں کو بھی حصہ دینا پڑتا ہے اور اس طرح جو تھوڑی سی فصل باقی بچ جاتی ہے وہ اس کے گزارہ کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہ ساہوکار سے قرضہ لیتا ہے جس کی مع سود ادائیگی نسل درنسل جاری رہتی ہے۔اس کے مقابلہ میں زمیندار کی زندگی شاہانہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی دولت اور شان وشوکت کی نمائش کے لئے لمبی لمبی کاریں رکھتا ہے اور خوراک، لباس اور جنسی سرگرمیوں پر بے پناہ خرچ کرتا ہے۔اس کی تین یا چار بیویاں ہوتی ہیں اور ان کے علاوہ وہ ہاریوں کی خوش شکل عورتوں کو داشتاؤں کے طور پر رکھتا ہے۔ وہ ہر قسم کی منشیات کا عادی ہوتا ہے۔ وہ بالخصوص بھنگ اور گانجا کو پسند کرتا ہے اور حکیموں سے بھی مقوی دوائیں لیتا رہتا ہے۔ اسے طوائفوں کے مجرے کرانے کا بہت شوق ہوتا ہے اور اس تفریح پر وہ بے پناہ خرچ کرتا ہے۔ وہ چوروں، ڈاکوؤں، رسہ گیروں اور قاتلوں کی سر پرستی کرتا ہے اور اس طرح پورے علاقے میں اپنا دبدبہ پھیلاتا ہے۔ چونکہ وہ سیاسی طور پر بااثر ہوتا ہے اس لئے سرکاری ملازمین بھی اس سے ڈرتے ہیں اور کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف نہیں کرتے۔ زمیندار اپنی زمین کی پیداوار میں اضافہ کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ اسے اپنی عیاشی سے ہی فرصت نہیں ملتی اور ہاری کو پیداوار بڑھانے میں اس لئے دلچسپی نہیں ہوتی کہ اسے اس سے کوئی فائدہ پہنچنے کی امید نہیں ہوتی۔'' ایم۔مسعود نے اپنے اس اختلافی نوٹ میں قرآن وحدیث کے متعدد حوالے دے کر یہ ثابت کیا تھا کہ یہ زمینداری نظام غیر اسلامی ہے۔اسے فی الفور ختم کردینا چاہیے۔ بصورت دیگر کمیونسٹ اس صورتحال سے فائدہ اٹھائیں گے اور پھر پرتشدد انقلاب آجائے گا۔

تعلیمی میدان میں سندھی ۔ مہاجر تضاد کا مظاہرہ

قدرتی طور پر سندھ کے جاگیرداروں اور زمینداروں کے لئے ایم ۔ مسعود کے اس اختلافی نوٹ کی اشاعت پسندیدہ نہیں ہوسکتی تھی ۔ مگر انہی دنوں سندھ کے درمیانہ طبقہ کے تعلیم یافتہ عناصر کی جانب سے بعض ایسے اقدامات اٹھائے گئے جو یوسف ہارون کی صوبائی حکومت اور لیاقت علی خان کی مرکزی حکومت کے خلاف جاتے تھے اور ان سے بالواسطہ طور پر سندھ کے جاگیرداروں کی یوسف ہارون کے خلاف مہم کو تقویت حاصل ہوتی تھی جو ایم ۔ مسعود کے متذکرہ اختلافی نوٹ کی اشاعت کے بعد یوسف ہارون کے خلاف سرگرم ہو گئے تھے ۔ چنانچہ 24 / جون کو سندھ یونیورسٹی کی سینیٹ نے یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ یونیورسٹی کے کالجوں میں مذہبی تعلیم نہیں ہو گی اور نہ ہی یونیورسٹی دینیات کے امتحان کا بندوبست کرے گی ۔ [30] جب سینیٹ کے اجلاس میں اس تجویز پر غور ہو رہا تھا تو تقریباً ایک ہزار مہاجر طلبا اس کے خلاف مظاہرے کر رہے تھے ۔ مظاہرین نے اشتہارات بھی تقسیم کئے تھے جس میں سینیٹ کے ارکان سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ صوبائی رجحان کی بجائے قومی رجحان کا مظاہرہ کر کے یونیورسٹی کے 4500 طلبا میں سے ان 4000 طلبا کی ضروریات کا خیال رکھیں جو کراچی کے رہنے والے ہیں ۔ اشتہارات میں مزید کہا گیا تھا کہ یونیورسٹی کے ساتھ جن 13 کالجوں کا الحاق ہے ان میں سے 9 کراچی میں ہیں اور صرف چار سندھ میں ہیں ۔ [31] یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر یوسف ہارون کی زیر صدارت سینیٹ کے اس اجلاس میں جو سالانہ بجٹ منظور کیا گیا اس میں 93792 روپے کا خسارہ دکھایا گیا تھا کیونکہ حکومت سندھ نے گرانٹ سکیم ملتوی کر رکھی تھی اور سالانہ رپورٹ منظور کی گئی اس میں کراچی کی سندھ سے علیحدگی کی بنا پر یونیورسٹی کے اختیارات اور جائے مقام جیسے پیدا شدہ مسائل کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ مرکزی حکومت کی ایجوکیشن ڈویژن نے یونیورسٹی کو ایک مراسلے میں لکھا ہے کہ چونکہ اب کراچی صوبہ سندھ کا حصہ نہیں ہے اس لئے شہر کے کالجوں اور اسکولوں میں سندھی زبان کو لازمی مضمون قرار دینا مناسب نہیں اور یہ کہ سنڈیکیٹ نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ لازمی مضامین کی جس تجویز پر سینیٹ میں غور ہو رہا ہے، اس میں ترمیم کی جائے ۔ [32] سینٹ کے اس اجلاس کے اگلے دن یہ خبر شائع ہوئی کہ 20 / اگست کو آل سندھ کنونشن کے انعقاد کی تیاریاں زور شور سے جاری ہیں ۔

اس کنونشن میں اس مسئلے پر غور کیا جائے گا کہ حکومت پاکستان نے ابھی تک سندھ سے کراچی کی علیحدگی کا معاوضہ نہیں دیا جس کا تخمینہ 100 کروڑ روپے ہے۔ علاوہ بریں مرکزی ملازمتوں میں سندھیوں کی نمائندگی اور آئندہ کے لئے صوبائی دارالحکومت کی تعمیر کے مسائل بھی زیر بحث آئیں گے۔

10 رجولائی کو روزنامہ امروز کے کراچی ایڈیشن کے ایک اداریہ میں حکومت سندھ کے محکمہ تعلیم کی اس پالیسی پر نکتہ چینی کی گئی جس کے تحت تعلیمی اداروں میں سندھیوں اور غیر سندھیوں کے درمیان امتیاز کیا جا رہا تھا۔ اداریہ میں اس امر کی نشاندہی کی گئی تھی کہ ''تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے والے سندھی طالب علموں کو انجینئرنگ کالج میں داخلہ دیا گیا ہے جبکہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہونے والے مہاجر طالب علموں کی درخواستیں مسترد کر دی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس پالیسی کے تعلیمی معیار پر برے اثرات مرتب ہونگے۔'' اداریہ میں مزید بتایا گیا تھا کہ ''حکومت سندھ نے حال ہی میں ایک سرکلر کے ذریعے ہدایت کی ہے کہ ہوسٹلوں میں داخلہ کے سلسلے میں سندھی طالب علموں کو ترجیح دی جائے۔ یعنی سب سے پہلے سندھی طلبا کو جگہ دی جائے۔ اس کے بعد پاکستان کے دوسرے صوبوں کے طلبا کو رکھا جائے اور اگر ان کے بعد رہائش کی کوئی جگہ ہو تو وہ مہاجر طلبا کو دی جائے۔ ڈاؤ میڈیکل کالج کے پرنسپل، جو خود غیر سندھی ہیں، صوبائیت کے پرچار میں سندھیوں سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئے ہیں اور انہوں نے ہوسٹلوں میں داخلہ کے لئے اصلی ''سندھی'' کی شرط عائد کر دی ہے۔ اب تک ''اصلی سندھی'' کی اصطلاح بھینسوں کی پہچان کے لئے استعمال ہوتی تھی لیکن اب محکمہ تعلیم نے بڑھا کر اسے انسانوں کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔''[33] روزنامہ امروز کے اس مہاجر اداریہ نویس کو سندھیوں کی تعلیمی پسماندگی سے زیادہ اس امر پر تشویش تھی کہ حکومت سندھ کا محکمہ تعلیم سندھیوں اور غیر سندھیوں میں امتیاز کر رہا ہے، اس بنا پر صوبہ پرستی کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے اور تعلیمی معیار پر برے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

بالکل یہی تشویش 1921ء کے بعد پنجاب کے غیر مسلم اخبارات اور غیر مسلم سیاسی نمائندوں کو لاحق ہوئی تھی جبکہ وزیر تعلیم سر فضل حسین نے صوبہ کے میڈیکل کالج، انجینئرنگ کالج اور دوسرے تعلیمی اداروں میں مسلم طلبا کے لئے 40 فیصد نشستیں مخصوص کر دی تھیں۔ ہندوؤں اور سکھوں کے اخبارات اور سیاسی لیڈروں نے سر فضل حسین کی اس ''فرقہ وارانہ'' پالیسی پر بے پناہ

احتجاج کیا تھا اور یہ رائے ظاہر کی تھی کہ سر فضل حسین کی اس پالیسی سے ''فرقہ پرستی'' کی حوصلہ افزائی ہوگی اور تعلیمی معیار پر برے اثرات مرتب ہونگے۔ غیر مسلم اخبارات اور سیاسی لیڈر انڈین نیشنلزم اور سیکولرازم کے نام پر پنجابیوں کے مختلف فرقوں کے درمیان ہر قسم کے امتیازات کے خلاف تھے اور وہ سر فضل حسین کی جانب سے پسماندہ مسلمانوں کو کسی قسم کی رعایت دینے کی پالیسی کو برداشت کرنے آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ 1923ء میں راجہ نریندر ناتھ نے اسی بنا پر صوبائی اسمبلی میں سر فضل حسین کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی تھی اور پھر 1924ء میں لالہ لاجپت رائے نے روزنامہ ٹربیون میں ایک سلسلۂ مضامین کے ذریعے یہ سکیم پیش کی تھی کہ برصغیر کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم کرکے ہندوؤں اور مسلمانوں کی آزاد و خود مختار سلطنتیں قائم کردی جائیں☆۔ جب اگست 1947ء میں لالہ لاجپت رائے کی سکیم کے عین مطابق برصغیر کی تقسیم ہوئی تو خداداد مملکت پاکستان میں پنجابی اور مہاجر عناصر کا ملک کے پسماندہ ترین علاقوں کے عوام کے بارے میں وہی رویہ تھا جو 1947ء سے قبل ہندوؤں کا پسماندہ مسلمانوں، اچھوتوں اور دوسری اقلیتوں کے بارے میں تھا، فرق صرف یہ تھا کہ ہندوؤں کے استحصالی عناصر متحدہ ہندوستان میں انڈین نیشنلزم اور سیکولرازم کے نام پر پسماندہ اقلیتوں کا استحصال کرنے کے درپے تھے اور پاکستان میں پنجابیوں اور مہاجروں کے استحصالی عناصر یہ کام مسلم قومیت اور اسلامی اخوت کے نام پر کرنا چاہتے تھے لیکن یہ سیاست کی ستم ظریفی تھی کہ ان دونوں استحصالی عناصر کے دلائل نہ صرف مضمون کے لحاظ سے بلکہ الفاظ کے لحاظ سے بھی یکساں تھے۔

مہاجر کنونشن کے مقابلے میں آل سندھ کنونشن کے انعقاد پر مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبائی رہنماؤں کے مابین محاذ آرائی

14 رجولائی کو سندھ ہاری کمیٹی کی آرگنائزنگ کمیٹی نے حیدرآباد میں عبدالقادر کی زیر صدارت یہ فیصلہ کیا کہ کمیٹی آئندہ ماہ منعقد ہونے والے سندھ کنونشن میں شرکت کرے گی تاکہ مرکز سے صوبہ کی مکمل خود مختاری حاصل کی جائے۔ کمیٹی نے یہ فیصلہ دو دن کے غور و خوض کے بعد کیا تھا اور اس سلسلے میں جو قرارداد منظور کی گئی تھی اس میں کہا گیا تھا کہ کنونشن کی کامیابی کا انحصار اس

☆ تفصیل کے لیے دیکھئے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ جلد 5 مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء باب: 4

بات پر ہو گا کہ زمیندار اور سرمایہ دار سیاسی لیڈروں کی بجائے بے زمین ہاری اس میں دلچسپی لیں۔[34] ہاری کمیٹی کے اس فیصلے کا مطلب یہ تھا کہ پنجابی۔مہاجر مفاد پرستوں کے گٹھ جوڑ کے خلاف سندھیوں کی سیاسی محاذ آرائی صرف جاگیردار اور درمیانہ طبقوں تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ اس میں سندھی عوام کے سارے طبقے شامل تھے۔ ہاری کمیٹی فی الحقیقت بے زمین ہاریوں کی نمائندگی کرتی تھی۔ وہ ہاری فیڈریشن کی طرح حکومت کی پٹھو تنظیم نہیں تھی۔ اس لئے کمیٹی نے اپنے اس دوروزہ اجلاس میں اس امر پر تشویش کا اظہار کیا تھا کہ ہندوؤں کی جن متروکہ زمینوں پر مسلم سندھی زمینداروں نے ناجائز طور پر قبضہ کر رکھا ہے وہاں سے ہاریوں کو بے دخل کیا جا رہا ہے۔ حکومت کو اس دھاندلی کی تحقیقات کرنے کے لئے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرنی چاہیے اور متروکہ زمین مستحق لوگوں کو الاٹ کر کے ان افسروں کو سزا دینی چاہیے جو اس جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اجلاس میں ایک اور قرارداد کے ذریعے حکومت سندھ سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ ہندوؤں کی متروکہ اراضی بے زمین سندھی اور مہاجر کسانوں میں تقسیم کرنی چاہیے۔ اس قرارداد میں سندھی اور غیر سندھی کسانوں کے درمیان کوئی امتیاز روا نہیں رکھا گیا تھا۔

ہاری کمیٹی کا یہ فیصلہ مرکزی ارباب اقتدار کے لئے بہت تشویش ناک تھا کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ صوبہ سندھ کے لئے خودمختاری کی تحریک ایک عوامی تحریک کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ ایوب کھوڑو نے اپنی جاگیردارانہ مفاد پرستی اور موقع پرستی کے باوجود سندھ کے مفادات اور حقوق کے تحفظ کا جو نعرہ لگایا تھا اس میں سندھی عوام کے سارے طبقوں کے لئے دلکشی تھی۔ کھوڑو ان دنوں سندھ کا سر فضل حسین بن چکا تھا۔ چنانچہ کراچی کے 17/جولائی کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ”اگست کے دوسرے ہفتے میں پاکستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا جو اجلاس ہو گا اس میں مسلم لیگ کے ان ارکان کے بارے میں پالیسی وضع کی جائے گی جنہوں نے مہاجر کنونشن کے انعقاد میں کوئی کردار ادا کیا تھا اور اس طرح مہاجر عناصر کے پاکستان کی معاشی اور ثقافتی زندگی میں ہم آہنگی کے ساتھ انضمام کی بیخ کنی کی تھی۔ مجلس عاملہ کے اس اجلاس میں یہ مسئلہ اس لئے زیر غور آئے گا کہ ہاشم گزدر نے سندھ پروانشل مسلم لیگ کی مجلس عاملہ میں ایک قرارداد پیش کرنے کا نوٹس دیا ہے جس میں آل سندھ کنونشن کے لئے صوبہ لیگ کی تائید و حمایت کی درخواست کی گئی ہے۔ یہ کنونشن اس لئے منعقد کیا جا رہا ہے کہ پاکستان کے آئندہ آئین

میں صوبہ سندھ کے لئے ایک وفاقی یونٹ کی حیثیت سے خودمختار پوزیشن حاصل کی جائے اور جب تک نیا آئین مرتب نہیں ہوتا اس وقت تک حکومت میں سندھ اور سندھیوں کے حقوق ومفادات کا تحفظ کیا جائے۔ صوبہ لیگ کے جنرل سیکرٹری آغا غلام نبی پٹھان نے پاکستان مسلم لیگ کے صدر سے رولنگ طلب کی ہے کہ صوبہ لیگ ہاشم گزدر کی یہ قرارداد آئینی طور پر منظور کرسکتی ہے یا نہیں اور مسلم لیگ کا کوئی رکن سندھ کنونشن میں شریک ہوسکتا ہے یا نہیں۔ مسلم لیگ کے صدر نے آغا غلام نبی پٹھان کے نام ایک خط میں اس استفسار کا یہ جواب دیا ہے کہ سندھ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں یا صوبہ لیگ کی کسی اور برانچ کی مجلس عاملہ میں گزدر کی یہ قرارداد پیش نہیں ہوسکتی اور اسے خلاف قائدہ قرار دے دینا چاہیے۔ صدر مسلم لیگ کی مزید رائے یہ ہے کہ ہاشم گزدر اس قرارداد کے ذریعے سندھ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ یہ سے کہلوانا چاہتا ہے کہ مسلم لیگ سندھ اور سندھیوں کے حقوق ومفادات کا تحفظ نہیں کرسکتی اور پاکستان کے آئندہ کے آئین میں صوبہ سندھ کے لئے خودمختار پوزیشن حاصل کرنے کے لئے لیگ سے بالاتر ایک اور تنظیم کی ضرورت ہے۔ مسلم لیگ اس قسم کی توہین وذلت برداشت نہیں کرسکتی۔ میں ہمیشہ مہاجر کمیٹیوں کی تشکیل اور مہاجر کنونشنوں کے انعقاد کے خلاف رہا ہوں لیکن مقام افسوس ہوتا ہے کہ مہاجروں میں ابھی تک یہ رجحان پایا جاتا ہے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ گزدر نے بعض مہاجر گروپوں کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر آل سندھ کنونشن طلب کیا ہے۔ میں یہ مسئلہ مسلم لیگ کے آئندہ اجلاس میں پیش کروں گا تاکہ ایسے کنونشنوں کی تائید وحمایت کرنے والے مسلم لیگیوں کے بارے میں پالیسی طے کی جائے کیونکہ اس طرح بالآخر نہ صرف مسلم لیگ میں انتشار پیدا ہوگا بلکہ مہاجر عناصر کے صوبہ کی معاشی زندگی میں ہم آہنگی کے ساتھ انضمام پر ضرب کاری لگے گی۔"[35]

اس خبر کی تعبیر کے لئے کوئی زیادہ غوروفکر کی ضرورت نہیں تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ جب تک مولوی شبیر احمد عثمانی اور مولانا عبد الحامد بدایونی کی زیر قیادت مہاجروں کی تنظیموں کی سرگرمیاں جاری رہیں اس وقت تک لیاقت علی خان اور چودھری خلیق الزماں وغیرہ منقار زیر پر رہے لیکن جب اپریل 1949ء میں حسین شہید سہروردی نے مہاجر کنونشن میں شرکت کرکے اس سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور پھر سندھ کے کھوڑو گروپ نے جواباً سندھ کنونشن طلب کیا تو کراچی کے ایوان اقتدار میں ہلچل مچ گئی اور ہاری کمیٹی کے 14/ جولائی کے فیصلے کے بعد تو اس

ہلچل نے افراتفری کی صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ پہلے تو کسی نہ کسی طرح آغا غلام نبی پٹھان کے ذریعے سندھ لیگ میں پھوٹ ڈلوائی گئی اور پھر یہ دھمکی دی گئی کہ سندھ مسلم لیگ کے جو لیڈر مجوزہ سندھ کنونشن میں شرکت کریں گے انہیں مسلم لیگ سے خارج کر دیا جائے گا اور پھر اس کے ساتھ ہی 19 جولائی کو پاکستان مسلم لیگ کی کمیٹی برائے زرعی اصلاحات کی رپورٹ کے ذریعے سندھی جاگیرداروں کو متنبہ کیا گیا کہ اگر انہوں نے مرکزی قیادت کے خلاف اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں تو ان کی جاگیریں بلا معاوضہ ضبط کر لی جائیں گی۔ یہ کمیٹی خان عبدالقیوم خان، قاضی محمد عیسیٰ، بیگم شاہ نواز اور سید علی اکبر شاہ پر مشتمل تھی۔ 20 جولائی کو اخبارات میں شائع شدہ اس کمیٹی کی رپورٹ میں سفارش کی گئی تھی کہ ساری جاگیریں اور ''انعامات'' فی الفور بلا معاوضہ منسوخ کر دیئے جائیں۔ موروثی مزارعوں کو مکمل مالکانہ حقوق دیئے جائیں اور اس طرح زمینداروں سے جو زمین لی جائے اور اس کے سالانہ مالیہ کی چار گنا رقم بطور قیمت ادا کی جائے۔ جن مزارعین کو کاشتکاری کے حقوق حاصل نہیں انہیں کم از کم 15 سال کے لئے یہ حقوق دیئے جائیں اور زمینداروں کے استحصال سے بچانے کے لئے بہت سے قانونی تحفظات دیئے جائیں۔ ہر زمیندار کے لئے خود کاشت رقبہ کی حد 25 ایکڑ مقرر کی جائے اور بڑی زمینداریاں ختم کرنے کے لئے نہری اراضی کی ملکیت کی حد 150 ایکڑ اور بارانی اراضی کی ملکیت کی حد 450 ایکڑ مقرر کی جائے۔[36] اگرچہ اس رپورٹ کا اصلی مقصد یہ تھا کہ بے زمین مزارعین کو کچھ کاغذی رعایتیں دے کر زمینداری نظام کو جوں کا توں رکھا جائے لیکن سندھ کے جاگیرداروں کے لئے یہ بات بھی قابل قبول نہیں تھی۔ وہ بطور جاگیردار اپنے مخصوص علاقہ کے مالکان زمین سے مالیہ کی جو رقم وصول کرتے تھے وہ اس سے بھی دستبردار نہیں ہونا چاہتے تھے۔ زمین کی غیر محدود ملکیت کا تو محکمہ مال کے کاغذات میں ردوبدل کروا کر تحفظ کیا جا سکتا تھا لیکن ''جاگیری انعامات'' کا تحفظ ممکن نہیں تھا۔ اگرچہ ان ''انعامات'' کی رقم کوئی زیادہ نہیں تھی تاہم ان کی جانب سے ان کی وصولی ان کے دبدبہ کی علامت تھی اور وہ اس علامت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں نے 17 جولائی کو مجوزہ سندھ کنونشن کے خلاف جو خبر چھپوائی تھی اس کے ساتھ ہی ہاشم گزدر کا وہ ''خفیہ اور ذاتی'' خط بھی شائع کر دیا تھا جو اس نے اپنے مجوزہ کنونشن کے بارے میں لکھا تھا۔ گزدر کو صدر لیگ کے اس رویے پر بہت

غصہ آیا اوراس نے 20 ر جولائی کو ایک بیان میں پہلے تو یہ بتایا کہ اس کے مجوزہ کنونشن کی حیثیت مسلم لیگ سے الگ سیاسی جماعت کی نہیں ہوگی اور پھر اس نے کہا کہ انسانی اخوت پر بہت زیادہ بوجھ ڈالنا اور یونٹوں کی وفاداری اور خلوص سے بہت زیادہ فائدہ اٹھانا عقل ودانش کے منافی ہے۔ اس رجحان نے دوسرے صوبوں میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا کی ہیں۔ لہٰذا بہتر ہوگا کہ سندھ کے مزاج کو خراب نہ کیا جائے۔ گزدر نے اپنے اس زوردار بیان میں بتایا کہ اس کے مجوزہ کنونشن میں یہ مسائل زیر غور آئیں گے۔

(1) آئندہ پاکستان میں آئین کس قسم کا ہوگا اور اس میں سندھ کو کیا مقام حاصل ہوگا۔ (2) مرکز کی جانب سے کراچی کی سندھ سے علیحدگی کے معاوضہ کی ادائیگی کب ہوگی۔ (3) دستور ساز اسمبلی میں سندھ کی نمائندگی۔ (4) دستور ساز اسمبلی نے دستوری امور کے بارے میں جو مختلف کمیٹیاں تشکیل کی ہیں ان میں سندھ کی نمائندگی۔ (5) سندھ کے داخلی مسائل مثلاً جرائم، تعلیم، طبی سہولتیں اور گھریلو دستکاری کا احیاء وغیرہ (6) کراچی میں سندھی اداروں، بشمول کراچی یونیورسٹی کا تحفظ۔ (7) سندھ کی زبان، ثقافت اور تاریخ کا تحفظ وغیرہ۔ (8) زمینداروں اور ہاریوں کے درمیان تنازعات کا تصفیہ۔ (9) مرکزی ملازمتوں میں سندھیوں کی نمائندگی۔ (10) غیر ملکی وظائف، بیرونی تجارت اور محکمہ خارجہ کی ملازمتوں میں سندھ کا حصہ۔ گزدر نے مزید کہا کہ میرے خیال میں جو صوبہ اپنے ان مسائل پر غور کرتا ہے وہ مسلم لیگ یا پاکستان کے خلاف کسی جرم کا ارتکاب نہیں کرتا۔ نازیوں کے مظالم کے بدترین دور میں بھی لوگوں کو ان مسائل پر بحث کرنے اور خیالات کا اظہار کرنے کی آزادی تھی۔ اگر صدر پاکستان مسلم لیگ اس امر کی ضمانت دے دے کہ وہ سندھیوں کے ان مسائل کو حل کر دے گا تو پھر کنونشن کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ [37]

گزدر کے اس بیان سے چند دن قبل شکار پور سب ڈویژن اور بعض دوسرے علاقوں میں زرعی اراضی کی الاٹمنٹ کے مسئلہ پر مہاجروں اور ہاریوں میں کئی تصادم ہو چکے تھے اور حکومت سندھ نے نہ صرف اردو اور سندھی اخبارات سے سندھیوں اور مہاجروں کے درمیان بہتر تعلقات کا ماحول پیدا کرنے کی اپیل کی تھی بلکہ اس مقصد کے لئے تعلقہ کمیٹیاں بھی مقرر کی تھیں۔ مگر ان اقدامات کا مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ مہاجروں اور سندھیوں میں کشیدگی بڑھتی چلی گئی حتیٰ کہ 3 ر اگست کو ان کے درمیان سکھر میں ایک دکان پر قبضہ کے تنازعہ کی وجہ سے زبردست تصادم ہوا

جس میں 9 افراد ہلاک اور 28 زخمی ہوئے اور مقامی حکام کو صورت حال پر قابو پانے کے لئے کرفیو لگانا پڑا۔ یہ فساد اس حقیقت کے باوجود ہوا کہ پاکستان مسلم لیگ کا صدر چودھری خلیق الزماں سندھ کنونشن کے منتظمین میں پھوٹ ڈلوانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور صوبہ لیگ کے جنرل سیکرٹری آغا غلام نبی پٹھان اور کنونشن کی آرگنائزنگ کمیٹی کے صدر ہاشم گزدر کے درمیان بیان بازی ہو رہی تھی۔

لاہور کے روزنامہ زمیندار نے اس بیان بازی کی ذمہ داری پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں پر عائد کی جو لیگ میں دھڑے بندی کو ہوا دے کر اپنی پوزیشن کو محفوظ کر رہا تھا۔ اخبار نے ہاشم گزدر کی جانب سے پیش کردہ صوبائی خودمختاری کے مطالبہ کو دیوانے کا خواب قرار دیا اور کہا کہ کوئی سیاسی لیڈر اس کی تائید نہیں کر سکتا۔ مغربی پاکستان کے سارے صوبے مختلف اشیاء کی سپلائی اور دفاع کے لئے ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں اس لئے نیم اقتدار اعلیٰ کے حامل اور آزاد یونٹ کے وجود کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پاکستان کی بنیاد وحدت اور یکجہتی کے تصور پر رکھی گئی تھی اس لئے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان، جو جغرافیائی لحاظ سے دو الگ الگ یونٹ ہیں، کی کسی حالت میں بھی ایک دوسرے سے علیحدگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور مغربی پاکستان میں تو مختلف صوبوں کی مکمل خودمختاری کا خیال کرنا، اس سے بھی زیادہ حماقت ہو گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ گزدر صوبہ سرحد کے خان عبدالغفار خان کے نقش قدم پر چل رہا ہے جس نے پختونستان کے نام کے تحت ایک نیم آزاد صوبہ قائم کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ [38] زمیندار کے اس اداریے کا مطلب دراصل وہی تھا جس کا اظہار مارچ۔ اپریل 1949ء میں بیگم شاہنواز، ملک فیروز خان نون اور دوسرے پنجابی لیڈر اور اخبارات کر چکے تھے۔ یعنی یہ کہ پورے مغربی پاکستان پر وحدت و یکجہتی کے نام پر پنجابیوں کا غلبہ ہو گا اور چھوٹے صوبوں کو خودمختاری کا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔

تاہم کراچی کے سندھی اخبار ''الوحید'' کا سندھ کنونشن کے بارے میں چودھری خلیق الزماں کے رویے پر تبصرہ لاہور کے ''زمیندار'' سے مختلف تھا کہ آل سندھ کنونشن بلانے کا خیال کوئی انوکھا نہیں۔ پہلے حیدر آباد میں مہاجرین کا کنونشن منعقد ہوا تھا اور پھر لاہور میں آل پاکستان مہاجر کنونشن کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ ان واقعات کے بعد سندھی لیڈروں نے اپنے صوبہ کے مخصوص مسائل کے پیش نظر، سندھ کنونشن منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ چودھری خلیق الزماں کی اس کنونشن کے

بارے میں پریشانی کی وجہ صرف یہ ہے کہ سندھی عوام نے اس میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ قابل غور سوال یہ ہے کہ چودھری صاحب کو حیدرآباد اور لاہور کے مہاجر کنونشنوں سے خطرہ محسوس کیوں نہیں ہوا تھا اور اب اسے سندھی کنونشن سے اتنا خطرہ کیوں محسوس ہو رہا ہے۔ وہ اسے مسلم لیگ کے وقار پر ضرب کاری تصور کیوں کرتے ہیں اور اپنے عہدے سے ناجائز فائدہ اٹھا کر سندھ مسلم لیگ کو کیوں مجبور کرتے ہیں کہ وہ گزدر کی قرارداد کو مسترد کرے۔ مہاجر کنونشن کے مقابلے میں سندھ کنونشن میں زیادہ صبر وتحمل کا مظاہرہ ہوگا کیونکہ اس میں عوام الناس کے مسائل اور ان کے حقوق کے تحفظ کے طریقوں پر غور ہوگا۔ لہٰذا کسی شخص کو سندھ کنونشن کے بنیادی احوال سے اختلاف نہیں ہوسکتا اور جو شخص اس کنونشن کے راستے میں رکاوٹیں حائل کرے گا اسے سندھ کا بدخواہ تصور کیا جائے گا۔ [39]

''زمیندار'' اور ''الوحید'' کے نظریات کا تصادم درحقیقت پنجاب کی غالب اور سندھ کی مغلوب قومیت کے مابین تضاد کا آئینہ دار تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید گہرا ہوتا چلا گیا، اس کی کمی کے لئے جس وسیع القلبی اور دوراندیشی کی ضرورت تھی وہ نو دولتیے پنجابی شاونسٹوں کے ہاں ناپید تھی۔

باب: 10

کھوڑو کی محاذ آرائی اور سودا بازی کی سیاست

ہارون وزارت کا خاتمہ

مقدمہ سے بری ہونے کے بعد کھوڑو بطور صدر صوبہ لیگ، ہارون وزارت کے خلاف سرگرم ہو گیا

8/اگست کو سندھ کی سیاست میں یکا یک ایک نمایاں تبدیلی آ گئی جبکہ سندھ چیف کورٹ نے لائنو ٹائپ کیس میں سابق وزیر اعلیٰ ایوب کھوڑو کی اپیل منظور کر کے اسے بری کر دیا۔ جس جج نے یہ اپیل منظور کی تھی وہ وہی تھا جس کے خلاف کراچی کی بار ایسوسی ایشن نے 15/جون 1949ء کو صوبہ پرستی کا الزام عائد کیا تھا۔ ایوب کھوڑو کو کراچی کے ایک مہاجر سپیشل جج سید محمد باقر نے 24/فروری 1949ء کو یہ مسروقہ سرکاری مشین روزنامہ سندھ آبزرور کے پریس میں ناجائز طور پر استعمال کرنے کے الزام میں دو سال قید محض اور ایک ہزار روپے جرمانہ کی سزا دی تھی۔

10/اگست کو وزیر اعلیٰ یوسف ہارون نے ایک بیان میں اپیل کی کہ صوبہ میں یک طرفہ کنونشن منعقد نہ کئے جائیں کیونکہ اس طرح ملک کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔ جو نئے لوگ سندھ میں آ کر آباد ہوئے ہیں وہ ہمارے بھائی ہیں۔ انہوں نے بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کا خیر مقدم کر کے آباد کاری کے کام میں ممد و معاون ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ حیدر آباد میں مہاجروں کا ممبر کنونشن ہوا تھا اس کے بعد دوسرے فریق کو بھی اسی قسم کا کنونشن منعقد کرنے کا بہانہ مل گیا۔

وزیر اعلیٰ کی اس اپیل کے پیش نظر 16 اگست کو سندھ کنونشن کی آرگنائزنگ کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ اب اس کا مجوزہ کنونشن 20 اگست کی بجائے تقریباً دو ماہ بعد نومبر میں ہوگا اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مسلم لیگ کے بعض عہدیداروں نے اب اس سلسلے میں مخالفانہ رویہ اختیار کر لیا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس اجتماع کے لئے مطلوبہ انتظامات مکمل نہیں ہو سکے۔

18 اگست کو ایوب کھوڑو نے حکومت پاکستان کو نوٹس دیا کہ وہ دو ماہ کے اندر اندر اپنا 22 مارچ 1949ء کا حکم واپس لے لے جس کے تحت نوٹس دہندہ کو تین سال کے لئے کسی پبلک عہدہ پر فائز ہونے کے لئے نااہل قرار دیا گیا ہے۔ نوٹس میں کہا گیا تھا کہ چونکہ گورنر جنرل کا یہ حکم غیر آئینی تھا اس لئے وہ غیر مؤثر ہے اور نوٹس دہندہ اب بھی مرکزی اور صوبائی اسمبلی کا رکن ہے۔ جب کھوڑو کا یہ نوٹس اخبارات میں چھپا تو سندھی شاونزم کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی کیونکہ سندھ میں ایوب کھوڑو کی پوزیشن تقریباً ویسی ہی تھی جیسی کہ نواب ممدوٹ کی پنجاب میں تھی۔ دونوں ہی اپنے صوبوں میں دقیانوسی جاگیرداریت کے علاوہ درمیانہ طبقہ کی علاقائی عصبیت کی بھی نمائندگی کرتے تھے۔ ان دونوں میں فرق صرف یہ تھا کہ ایوب کھوڑو کو درمیانہ طبقہ کے علاوہ سندھی جاگیرداروں کے ایک طاقتور گروپ کی حمایت حاصل تھی اور اس بنا پر اس کا صوبہ لیگ پر غلبہ قائم تھا جبکہ نواب ممدوٹ کو زیادہ تر درمیانہ طبقہ کی تائید وحمایت حاصل تھی اور وہ جاگیرداروں کے طاقتور دھڑے کی حمایت کی عدم موجودگی میں صوبہ لیگ پر اپنی گرفت قائم نہیں رکھ سکا تھا۔ کھوڑو کی صوبہ میں سیاسی قوت برقرار رہنے کی دو تین اور بھی وجوہ تھیں۔ اول یہ کہ وہ سندھی زمینداروں کے اس گروہ کی پس پردہ حمایت اور حوصلہ افزائی کرتا تھا جنھوں نے ہندوؤں کی لاکھوں ایکڑ متروکہ اراضی پر ناجائز قبضہ کر لیا ہوا تھا۔ دوئم یہ کہ وہ سندھی زمینداروں کے اس گروہ کی بھی حمایت کرتا تھا جو اپنی اراضی سے ہاریوں کو بے دخل کرتے تھے تاکہ اسمبلی کے آئندہ سیشن میں منظور ہونے والے قانون مزارعت کے تحت ان کے کسی ہاری کو مستقل حقوق کاشت کاری حاصل نہ ہونے پائیں۔ یہ زمیندار ہاریوں کو جھوٹے فوجداری مقدمات میں ملوث کرتے تھے اور انہیں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتاری کی بھی دھمکی دیتے تھے۔ سوئم یہ کہ وزیر اعلیٰ یوسف ہارون کراچی کا بورژوا میمن تھا اور بیشتر سندھی جاگیردار اس کے مقابلے میں اپنے طبقاتی بھائی ایوب کھوڑو کو ترجیح دیتے تھے۔ ان کے نزدیک طبقاتی اخوت اسلامی اخوت سے بالاتر تھی۔ ان کے برعکس کراچی میں مہاجرین کا

ترجمان اخبار ''جنگ'' سندھ کے زمانہ قبل از اسلام کی زبان، ثقافت اور تاریخ کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا تھا اور اس کا موقف یہ تھا کہ ''اگر سندھ کے مسلم عہد کی تاریخ کو تباہ کیا گیا تو پاکستان تباہ ہو جائے گا۔ ہاشم گزدر کو معلوم ہونا چاہیے کہ جب وہ سندھ میں ہندوؤں کی تاریخ کو اپنے نصب العین کے طور پر زندہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پاکستان کی بیخ کنی کرتے ہیں۔ اگر ماضی کی تاریخ کو صوبوں کی بنیاد پر زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو پھر پاکستان کا مطالبہ کیوں کیا گیا۔ گزدر کے نصب العین کی تکمیل غیر منقسم ہندوستان میں بہتر طریقے سے ہوسکتی تھی۔''[1]

21 راگست کو سندھ پروانشل سٹوڈنٹس فیڈریشن کی مجلس عاملہ نے فیصلہ کیا کہ 24 ستمبر کو آل سندھ ایجوکیشن اینڈ لٹریری کانفرنس منعقد کی جائے گی جس میں سوویت یونین کے تجارتی وفد کو بھی دعوت دی جائے گی۔ اس کانفرنس کے انعقاد کے انتظامات کرنے کے لئے ایک چھ رکنی کمیٹی بنائی گئی اور یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ ایک آل پاکستان سٹوڈنٹس فیڈریشن کی تشکیل کی جائے گی جس کی بنیاد اس اصول پر ہوگی کہ سارے صوبوں کو مساوی نمائندگی ملے گی اور پاکستان کی ساری قومیتوں کو حق خود اختیاری دیا جائے گا۔[2] سندھی طلباء کے اس فیصلے کا مطلب یہ تھا کہ اس صوبہ کے جاگیردار اور درمیانہ طبقے مارچ۔ اپریل میں پنجابیوں کی طرف سے ون یونٹ کے حق میں پروپیگنڈا مہم سے بہت زیادہ خوفزدہ ہو گئے تھے اور انہیں پنجابی۔ مہاجر غلبہ کے تحت اپنا جداگانہ معاشی، لسانی، ثقافتی، معاشرتی اور سیاسی وجود فی الحقیقت خطرے میں نظر آتا تھا۔ چونکہ یہ صورتحال کھوڑو کے لئے سازگار تھی اس لئے 25 راگست کو میر غلام علی تالپور نے اعلان کیا کہ اس کی سابق وزیراعلیٰ ایوب کھوڑو کے ساتھ صلح ہوگئی ہے اور اب انکے درمیان کوئی اختلافات باقی نہیں رہے۔ تاہم اس نے ان اخباری رپورٹوں کی تردید کی کہ اس نے ایک خفیہ میٹنگ میں وزیراعلیٰ یوسف ہارون کے خلاف ایوب کھوڑو کے ساتھ کوئی معاہدہ کرلیا ہے۔[3]

انہی دنوں کھوڑو کے حامی اخبار سندھ آبزرور نے وزیراعلیٰ یوسف ہارون پر یہ الزام عائد کیا تھا کہ اس نے اپنے اثر ورسوخ کو بروئے کار لا کر سرکاری بسوں کی دیکھ بھال اور حفاظت کا کام اپنی فرم کراچی آٹوز کو مہنگے نرخوں پر دلوا دیا ہے حالانکہ ایک فرم پہلے ہی یہ کام سستے نرخوں پر کررہی تھی اور بعض دوسری فرموں نے بھی اس کے کام کے لئے جو ٹینڈر دیئے تھے ان میں جن نرخوں کی پیش کش کی گئی تھی وہ کراچی آٹوز سے کم تھے۔ یوسف ہارون نے اس الزام کی اشاعت

سے جائز طور پر یہ تاثر لیا کہ اس کے خلاف کھوڑو نے محاذ آرائی شروع کر دی ہے۔ کھوڑو کا ایک ''آدمی'' اے۔ ایم۔ قریشی بھی بسوں کا ہی کاروبار ہی کرتا تھا اور وہ یہ ٹھیکہ حاصل کرنے کا خواہاں تھا مگر جب اسکی یہ خواہش پوری نہ ہوئی اور ٹھیکہ کراچی آٹوز کو مل گیا تو کھوڑو گروپ کو یوسف ہارون کے خلاف مہم کے لئے ایک اور مؤثر ہتھیار مہیا ہو گیا۔ یوسف ہارون نے اس مہم کے پیش نظر گورنر دین محمد سے درخواست کی کہ وہ ''پروڈا'' کے تحت اس کے خلاف عائد کردہ الزام کی تحقیقات کرائے مگر گورنر نے یہ درخواست مسترد کر دی اور ایک سرکاری پریس نوٹ میں بتایا گیا کہ کراچی آٹوز کے علاوہ جن دوسری فرموں نے یہ ٹھیکہ حاصل کرنے لئے ٹینڈر دیئے تھے چونکہ ان کے پاس یہ کام کرنے کے لئے معقول انتظامات نہیں تھے اس لئے صوبائی ٹرانسپورٹ اتھارٹی نے انہیں یہ ٹھیکہ دینا مناسب نہ سمجھا اور یہ کام جائز طور پر کراچی آٹوز کے سپرد کر دیا گیا۔

ایوب کھوڑو نے بھی اسی دن سندھ مسلم لیگ کے معتبر حلقوں کے حوالے سے شائع شدہ اس خبر کی تردید کی کہ ہارون وزارت ایک ایسے بحران میں مبتلا ہے جس سے وہ جانبر نہیں ہو سکے گی اور یہ کہ یہ بیان کھوڑو۔ تالپور ''خفیہ معاہدے'' کی بنا پر پیدا ہوا ہے۔ تاہم کھوڑو نے اپنے بیان میں اس اخباری اطلاع کی تصدیق کی کہ اس نے بذریعہ خط وزیر اعلیٰ یوسف ہارون کو ہدایت کی ہے کہ وہ اپنی وزارت کی ششماہی کارگزاری کی رپورٹ صوبہ لیگ کے سامنے پیش کریں۔ اس نے کہا کہ اس کی اس ہدایت پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا کیونکہ سندھ کی موجودہ وزارت، صوبائی مسلم لیگ اور میری مدد سے ہی بنی تھی۔ ابھی تک نہ تو مسلم لیگ نے اور نہ ہی میں نے اپنا تعاون واپس لیا ہے اس لئے وزارت کا تختہ الٹنے کی سازش کے لئے خفیہ میٹنگ کے انعقاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لاہور کے روزنامہ نوائے وقت کے نامہ نگار نے کھوڑو کے اس تردیدی بیان کو مبہم قرار دیا اور لکھا کہ ''اس بیان کے باوجود ہارون کی وزارت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ گزشتہ ہفتے کے خفیہ اجتماعات میں کھوڑو نے شرکت کی تھی۔ سندھ لیگ کونسل میں جو قراردادیں پیش کی جارہی ہیں ان میں سیفٹی ایکٹ کی تنسیخ اور ٹرانسپورٹ پالیسی کی ترمیم کا مطالبہ، حکومت پاکستان سے کراچی کا معاوضہ لینے میں تاخیر پر احتجاج اور بعض میونسپل کمیٹیوں کو معطل کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ سب سے اہم قرارداد جس پر کھوڑو اور یوسف ہارون میں اختلاف پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے کھوڑو سے اس پابندی کو ہٹانے سے متعلق ہے جس کے مطابق پبلک زندگی میں 3 سال تک

اس کے داخلہ پر پابندی عائد کی جا چکی ہے۔''[4]

27 راگست کو کراچی کارپوریشن ہال میں سندھ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے دو اجلاس ہوئے۔ جب پہلا اجلاس ہوا تو سب سے پہلے یہ کارروائی ہوئی کہ کھوڑو نے اپنا وہ استعفیٰ واپس لے لیا جو اس نے 8 ردسمبر 1948ء کو صوبہ لیگ کی صدارت کے عہدے سے دیا تھا اور پھر اس نے مجلس عاملہ کے دونوں اجلاسوں کی صدارت کی۔ کھوڑو نے صوبہ لیگ کے صدر کی حیثیت سے میر رئیس ماڑی مرحوم اور قاسم ہوتی کی جگہ یوسف ہارون اور میر غلام علی تالپور کو عاملہ کا رکن نامزد کیا اور بعدازاں 21 رکنی عاملہ سے یہ قرارداد منظور کروائی کہ ایوب کھوڑو کو گورنر جنرل کے اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا جائے جس کے تحت اسے کوئی پبلک عہدہ قبول کرنے کے حق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ عاملہ نے اس مسئلہ پر بھی بحث کی کہ ہاشم گزدر کے مجوزہ سندھ کنونشن کے بارے میں صوبہ لیگ کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے اور مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ سے درخواست کی کہ دستور ساز اسمبلی میں سندھ سے احمد جعفر کو امیدوار کھڑا کرنے کے فیصلہ پر نظر ثانی کی جائے اور اس کے بجائے اے۔ کے۔ بروہی کو لیگ ٹکٹ دیا جائے۔

28 راگست کی صبح کو چودھری خلیق الزماں کی زیر صدارت پاکستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا جس میں مہاجروں اور غیر مہاجروں کے کنونشنوں کے انعقاد پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا اور مرکزی لیگ کے اس موقف کا اعادہ کیا گیا کہ صوبہ مسلم لیگ کا فرض ہے کہ وہ دھیان رکھے کہ صوبہ میں مہاجروں سمیت ہر ایک سے انصاف ہوتا ہے۔ مرکزی عاملہ کے اس اجلاس میں وزیر اعظم لیاقت علی خان، نورالامین، یوسف ہارون، خان عبدالقیوم خان، یوسف خٹک، مولانا اکرم خان، غیاث الدین پٹھان، میر نبی بخش، اے۔ ایم۔ قریشی، یوسف علی چانڈیو، سید علی اکبر شاہ اور ایم۔ اے۔ کھوڑو نے شرکت کی۔ عاملہ کے اجلاس میں سندھ میں مجوزہ زرعی اصلاحات کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔ کھوڑو کی خواہش تھی کہ صوبائی لیگ کی اس سلسلے میں رائے معلوم ہونے تک کوئی فیصلہ نہ کیا جائے مگر اُس کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی اور عاملہ نے اسے متنبہ کیا کہ وہ جاگیرداری ختم کرنے کی راہ میں رکاوٹ حائل نہ کرے۔ 29 راگست کو مجلس عاملہ کا دوسرا اجلاس ہوا تو اس میں زرعی کمیٹی کی رپورٹ پر غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ (1) موروثی جاگیروں کو فی الفور بلامعاوضہ ختم کر دیا جائے گا۔ (2) موروثی مزارعوں کو حقوق ملکیت دیئے

جائیں گے۔(3) غیر موروثی مزارعوں کو حقوق کاشت کاری دیئے جائیں گے۔اور(4) بٹائی کی بجائے نقد لگان کا سسٹم رائج کیا جائے گا۔مجلس عاملہ نے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو ہدایت کی کہ وہ ان فیصلوں پر فوراً عمل درآمد کریں تا کہ کاشت کاروں کو کچھ سہولت مہیا ہو سکے۔مجلس عاملہ نے بڑی زمینداریاں ختم کرنے کی سفارش بھی اصولی طور پر منظور کر لی اور مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو ہدایت کی کہ وہ اس مقصد کے لئے مناسب اقدامات کریں۔[5] مجلس عاملہ کے اس فیصلے میں ملک کے دقیانوسی زرعی نظام میں بنیادی تبدیلی کرنے کے ارادے کی کوئی علامت موجود نہیں تھی۔حتیٰ کہ زرعی کمیٹی نے ملکیت کی حد مقرر کرنے کی جو سفارش کی تھی وہ بھی محض اصولی طور پر منظور کی گئی تھی اور اس پر عمل کرنا ضروری نہیں تھا۔مجلس عاملہ کے اس فیصلہ کا بظاہر مقصد محض یہ تھا کہ سندھی جاگیرداروں پر دباؤ ڈال کر انہیں مجبور کیا جائے کہ وہ کھوڑو۔سید گروپ کے مجوزہ سندھ کنونشن میں شرکت نہ کریں اور نہ ہی کسی اور طرح صوبائی شاونزم کو ہوا دے کر مہاجرین کی آباد کاری کی راہ میں رکاوٹ حائل کریں۔

کھوڑو گروپ نے ''سندھ کے ساتھ زیادتیوں'' کو یوسف ہارون کے خلاف استعمال کیا

کھوڑو گروپ پر متذکرہ انتباہ کا کوئی اثر نہ ہوا۔چنانچہ 27، 28 اور 29 راگست کو سندھ مسلم لیگ کونسل کے سہ روزہ اجلاس میں 750 الفاظ پر مشتمل ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ صوبہ سندھ کو اس کا جائز مقام دے اور اسے محض ایک راکھ کا ڈھیر تصور نہ کرے۔سندھ کو مرکزی اسمبلی اور مرکزی حکومت میں دوسرے یونٹوں کے برابر حصہ ملنا چاہیے۔یہ قرارداد فتح میمن نے پیش کی اور اس نے اس کی وضاحت میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اگر صوبائی لیگ نے یہ قرارداد منظور کر لی تو سندھ کنونشن کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی اور اگر اس نے اس قرارداد کے ذریعے سندھی عوام کے جذبات کی ترجمانی نہ کی تو سندھ میں مسلم لیگ کی مقبولیت بہت جلد ختم ہو جائے گی۔کراچی کے روزنامہ ڈان کی رپورٹ کے مطابق سندھ لیگ کونسل کے اس سہ روزہ اجلاس میں وزیراعلیٰ یوسف ہارون کا ستارہ چمکتا رہا۔چنانچہ جب اس نے اپنی حکومت کی ششماہی کامیابیوں کی روئیداد پیش کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اس کی حکومت

نے صوبہ سندھ میں جاگیرداری ختم کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے تو کونسل کے ارکان نے پر جوش تالیوں سے اس کی تائید کی اور صدر صوبہ لیگ ایوب کھوڑو نے اعتراف کیا کہ ''ہارون وزارت نے تھوڑے ہی عرصہ میں عظیم کامیابی حاصل کی ہے''[6] مگر لاہور کے روزنامہ نوائے وقت کی رپورٹ یہ تھی کہ پراونشل لیگ کونسل کے ان جلسوں میں ''جس پست قسم کی صوبائی ذہنیت کا اظہار کیا گیا اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ مرکزی حکومت کے خلاف آواز بلند کرنے کے علاوہ بعض ممبران نے، جن میں ہاشم گزدر کا نام قابل ذکر ہے، قائداعظم پر الزام لگایا کہ انہوں نے مسٹر کھوڑو پر بے بنیاد الزام لگائے تھے اور انہوں نے جمہوریت کا خاتمہ کرنے کے لئے سندھ کے ہیرو پر مقدمات چلائے تھے...... مسٹر گزدر نے کہا کہ کھوڑو سندھ کا بہترین مدبر ہے۔ کونسل کے ارکان نے اپنی تقریروں میں حکومت پاکستان پر الزام لگایا کہ اس نے ''سندھ کے محبوب راہنما'' مسٹر کھوڑو کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا اور اس کے علاوہ صوبہ سندھ کو ایک خودمختار صوبہ بننے میں بڑی رکاوٹ ڈالی ہے۔ مسٹر کھوڑو کونسل کے جلسوں میں سب سے اہم شخصیت کا پارٹ ادا کر رہے تھے۔ زراعتی اصلاحات کی سب کمیٹی کی جب تشکیل ہو رہی تھی تو اس وقت مسٹر یوسف ہارون نے اصرار کیا کہ حکومت کی طرف سے کمیٹی کے دوسرے ممبروں کو صحیح حالات سے باخبر رکھنے کے لئے ایک وزیر اور خاص کر ریوینو منسٹر میراں محمد شاہ کو سب کمیٹی میں شامل کر لیا جائے...... مزید اصرار پر کھوڑو نے نہایت تحکمانہ انداز میں سندھ کے وزیر اعلیٰ کو حکم دیا کہ وہ فوراً بیٹھ جائیں اور دھمکیوں سے ہم کو مرعوب نہ کریں...... گزدر نے اپنی تجویز میں حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا کہ وہ مسٹر کھوڑو پر 3 سال کے لئے عائد کردہ پابندی ختم کر دے۔ تجویز میں صدر پاکستان مسلم لیگ سے اس معاملے میں مداخلت کرنے کی درخواست کی گئی اور کہا گیا کہ وہ وزیر اعظم اور گورنر جنرل سے مل کر اس پابندی کو دور کرانے کی کوشش کریں۔ صوبہ سندھ میں 16 ماہ کے عرصہ میں جو سیاسی حالات پیش آئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ کھوڑو کو جان بوجھ کر ''ملزم'' بنایا گیا اور ان قوانین کا نشانہ بنایا گیا جن میں ذرہ برابر بھی جمہوریت کا نام ونشان نہیں...... تجویز کو ایوان کے سامنے پیش کرتے ہوئے مسٹر کھوڑو نے کہا کہ اس ریاست میں جو کہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست کہی جاتی ہے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہاں جمہوریت کے اصولوں پر حکومت کی جاتی ہے لیکن شروع میں ہی ''جمہوریت'' کو یہاں ضرب کاری لگی ہے۔ ہاشم گزدر نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ

جمہوری ملکوں میں اس قسم کی کوئی مثال موجود نہیں ہے جہاں ایک منتخب شدہ لیڈر کو ایک باہر کی ایجنسی نے برطرف کر دیا ہو۔ مسٹر گز در نے کہا کہ جس روز مسٹر کھوڑو کو ان کے عہدے سے برطرف کیا گیا تھا اسی دن ہم نے سمجھ لیا تھا کہ پاکستان سے جمہوریت کا خاتمہ ہو گیا۔ مسٹر گز در نے یہ بھی کہا کہ پورے پاکستان میں مسٹر کھوڑو جیسا مدبر اور منتظم کوئی دوسرا شخص نہیں ہے۔ آپس کے اختلافات کی بنا پر انہیں تباہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے......صوبہ سندھ سے کراچی کی علیحدگی کے متعلق مسٹر گز در نے کہا کہ ایسے چھوٹے صوبے سے اتنے بڑے ملک کے دارالحکومت کا مطالبہ خود اپنی جگہ غیر مناسب تھا۔ جب یہ لوگ آئے تو انکے پاس کچھ نہیں تھا۔ سندھ نے ہر چیز ان کے لئے مہیا کی۔ سندھ نے 3 ماہ تک مرکزی حکومت کے عملہ کو تنخواہ دی اور تقریباً ایک کروڑ روپے کی لاگت سے ان کے عملہ کے کوارٹرز کی تعمیر کی مگر ان باتوں کے باوجود سندھ سے کراچی کی علیحدگی پر صوبہ سندھ کو مرکزی حکومت نے کوئی مالی امداد نہیں دی۔ انہوں نے ہم سے دارالحکومت لیا ہے اور اب ان کا فرض ہے کہ وہ ہم کو ایک دارالحکومت دیں۔ اس قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے مسٹر گز در نے قائداعظم کے خلاف دریدہ ذہنی سے کام لیا اور کہا کہ قائداعظم نے مسٹر کھوڑو کو برطرف کر کے پاکستان میں جمہوریت کا جنازہ نکال دیا۔ چنانچہ ہم نے اس روز جمہوریت پر فاتحہ پڑھی۔ مسٹر گز در کی ان باتوں سے کونسل کے صرف چند ممبران میں اشتعال پیدا ہوا اور انہوں نے مسٹر گز در سے مطالبہ کیا کہ وہ قائداعظم کے خلاف اتنی جسارت اور بے باکی سے کلام نہ کریں اور مزید نکتہ چینی نہ کریں۔ اس پر مسٹر گز در نے کہا کہ قائداعظم کا وہ بھی احترام کرتے ہیں لیکن انہیں ان کی غلطیوں پر نکتہ چینی کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم ان کو رسول یا پیغمبر نہیں مان سکتے۔ ان کے الفاظ کو احکام الٰہی سے تعبیر نہیں کر سکتے......کونسل کی دوسری نشست میں ایک قرارداد کے ذریعے حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ سندھیوں کے متعلق اپنی پالیسی واضح کرے۔ قرارداد میں شکایت کی گئی کہ دوسرے صوبوں کے مقابلے میں سندھیوں کے حقوق کو بری طرح پائمال کیا جا رہا ہے۔ کراچی مرکز نے لے لیا تھا ابھی تک اس کا معاوضہ نہیں دیا۔ سندھی زبان کو کچلا جا رہا ہے اور پاکستان کی تعمیری سکیموں میں سندھ کو کوئی جگہ حاصل نہیں...... کونسل نے آخر میں زرعی اصلاحات اور زمینداری کے خاتمہ کے متعلق مسودۂ قانون اور سب کمیٹی کی تجاویز پر فی الحال بحث نہ کرنے کا فیصلہ کیا بلکہ سندھ کے حالات کے پیش نظر اس مسئلہ پر غور کرنے

کے لئے مسٹر کھوڑو، تالپور، غلام نبی پٹھان، ابوالفتح میمن اور گزدر پر مشتمل ایک سب کمیٹی بنادی جومہینہ بھر میں اپنی رپورٹ پیش کرے گی...... یوسف ہارون نے اس مرحلہ پر صدر سے درخواست کی کہ وہ اس کمیٹی میں سندھ کا ایک وزیر شامل کریں۔ کھوڑو نے جواب دیا کہ ہم کوئی دھمکی نہیں سننا چاہتے۔ کونسل ان کو شامل کرنا نہیں چاہتی۔ یوسف ہارون نے کہا کہ ہماری وزارت نے جاگیرداری اور زمینداری ختم کرنے کے لئے جو بل منظور کیا ہے وہ لاڑکانہ میں مسلم لیگ کی قرارداد کے مطابق ہے......اس لئے میں صدر سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ جو کونسل کے ممبران حکومت سندھ کے اس اقدام کے خلاف خفیہ میٹنگ کرتے ہیں یا دوسرے طریقوں سے زمینداری کے خاتمہ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں ان کے خلاف کیا کاروائی کی جائے گی۔ اس پر مسٹر کھوڑو، جو سندھ زمیندار ایسوسی ایشن کے صدر بھی ہیں اور سندھ میں زمینداروں کے حقوق کی بھی نگہداشت کرتے ہیں، گھبرائے۔"[7]

نوائے وقت کی ایک اور رپورٹ کے مطابق سندھ مسلم لیگ کونسل کے اس سہ روزہ اجلاس میں قاضی مجتبیٰ نے ایک قرارداد میں یہ مطالبہ کیا کہ سندھ میں مہاجرین کی آبادکاری کا کام حکومت سندھ کے سپرد کیا جائے۔ غلام نبی پٹھان نے اس قرارداد کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ سندھ میں مہاجرین اور سندھیوں کے تعلقات خراب ہونے کی وجہ مرکز کی غلط پالیسی ہے۔ حکومت نے جن افسروں کو مقرر کیا ہے وہ ہر ممکن طریقے سے سندھیوں کو پریشان کرتے ہیں۔ آپ نے کہا کہ حکومت سندھ کی یہ پالیسی تھی کہ ہندوؤں کی متروکہ زمینوں میں پچاس فیصد مہاجر کاشت کاروں اور پچاس فیصد سندھیوں کو دی جائے۔ مگر یہ دیکھتا ہوں کہ اس پالیسی پر عمل نہیں ہو رہا اور مہاجرین کو زیادہ زمین دی جارہی ہے اور مقامی سندھیوں پر ظلم ہو رہا ہے اور ان کو کم زمین ملتی ہے اس لئے مقامی کاشت کاروں کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان کو کم حصہ ملتا ہے اور اس طرح مہاجرین وانصار میں کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس تجویز کی مخالفت میں ایک سندھی ممبر نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ جھگڑا اصل میں یہ ہے کہ مفاد پرست مرکز سے آبادکاری کا کام لے کر اس لئے صوبہ کی حکومت کے سپرد کرنا چاہتے ہیں تا کہ وہ اپنے لئے خوب زمینیں الاٹ کراسکیں۔ وزیر اعلیٰ نے مقرر کو ٹوکتے ہوئے کہا کہ ہم زمینیں الاٹ نہیں کریں گے۔ اس پر مقرر نے جواب دیا کہ اگر آپ زمینیں الاٹ نہیں کریں گے تو آئندہ الیکشن میں ووٹ نہیں ملیں گے۔ ایک مہاجر رکن کونسل نے کہا کہ سندھ میں مہاجر وانصار ایک ہیں، دراصل اس تجویز کے پس منظر میں تحریک یہ ہے کہ سندھ میں

زمینوں کی الاٹمنٹ کا کاروبار صرف ان کے ہاتھ میں آجائے جو اس کے اہل نہیں ہیں۔ آپ نے کہا کہ مرکز کو تو آبادکاری کا کام لئے ہوئے صرف 8 ماہ ہوئے ہیں اس سے قبل سندھ میں آبادکاری کا کام مکمل طور پر حکومت سندھ کے پاس تھا جس میں وہ ناکام رہی۔[8] لاہور کے روزنامہ امروز کی ایک رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ سندھ کے سابق وزیر اعلیٰ مسٹر ایم۔اے۔کھوڑو کی زیر صدارت سندھ صوبائی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے اپنی تجویز میں صوبائی حکومت پر زور دیا ہے کہ ''وہ اپنی زمینوں کی واپسی کے بل پر جو مارچ 46-1945ء میں منظور ہو چکا ہے گورنر جنرل کی منظوری حاصل کرنے کی کوشش کرے تا کہ متروکہ جائیداد کے زیر تجویز حسابات کے سلسلہ میں حکومت ہند کو معاوضہ کی ادائیگی کے متعلق مرکزی حکومت کو کروڑوں روپے کا نقصان برداشت نہ کرنا پڑے۔ مجلس عاملہ کی تجویز میں کہا گیا ہے کہ سندھ میں ہندوؤں نے جو زرعی زمینیں چھوڑی ہیں ان میں سے زیادہ تر وہ زمینیں ہیں جو انہوں نے سادہ لوح اور جاہل مسلمانوں سے ناجائز اور غیر معقول طریقوں سے حاصل کی تھیں۔ اس تجویز میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ قائداعظم کی نگرانی میں سندھ اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی نے اس بل کو منظور کر لیا تھا تا کہ ایسی زمینوں کو ان کے حقیقی مالکوں کو واپس دلانے کے لئے خصوصی اقدامات کئے جاسکیں۔ بہر حال یہ بل محض گورنر جنرل کی منظوری حاصل نہ ہونے کی بدولت اب تک کتاب قانون میں شامل نہیں ہوا ہے۔ مجلس عاملہ کا کہنا ہے کہ اگر گورنر جنرل اس بل پر اپنی منظوری اب دے دیں تو سندھ کے مسلمان کاشت کاروں کی حقیقی شکایات کا ازالہ ہو جائے گا اور حکومت پاکستان بھی جائیداد متروکہ کے متعلق غیر ضروری اور ناجائز معاوضہ کی ادائیگی سے بچ جائے گی۔''[9]

کھوڑو۔ہارون تضاد کے محرکات

سندھ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ اور کونسل کے ہنگامہ خیز جلسوں کی ان رپورٹوں سے جو حقائق منظر عام پر آئے وہ یہ تھے کہ ایوب کھوڑو کا سیاسی آفتاب صرف چند ماہ تک قدرے گرہن میں رہنے کے بعد اب پھر پوری آب و تاب کے ساتھ درخشاں تھا۔ وزیر اعلیٰ یوسف ہارون محض نمائشی وزیر اعلیٰ تھا۔ اصل اقتدار کھوڑو کے ہاتھ میں تھا اور ہارون وزارت کو اس کے حکم کی تعمیل میں پس و پیش کی جرأت نہیں تھی۔ اگر چہ ایوب کھوڑو نے 25راگست کو میر غلام علی تالپور کے مکان پر

متعدد جاگیرداروں کے ساتھ خفیہ میٹنگ کے بعد اپنے ''تردیدی بیان'' میں کہا تھا کہ ہارون وزارت کسی بحران میں مبتلا نہیں اور وہ خود اور اس کی مسلم لیگ وزارت کی حمایت کرتے رہیں گے لیکن عملاً کھوڑو اس وزارت کا تختہ الٹنے کے درپے تھا۔ اس کی کئی وجوہ تھیں۔ ایک یہ کہ یوسف ہارون اپنے چھ ماہ کے عہد اقتدار میں سندھ کے جاگیرداروں کا اعتماد حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔ سندھی جاگیردار کراچی کے بورژوا میمن کو اپنا قائد تسلیم کرنے پر کسی صورت آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ دوسری یہ کہ یوسف ہارون اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے پاکستان مسلم لیگ اور پاکستان کی مرکزی حکومت کی پشت پناہی پر انحصار کرتا تھا اور سندھی جاگیردار اور درمیانہ طبقوں کو اس کا یہ رویہ قابل قبول نہیں تھا۔ تیسری یہ کہ سندھ کے جاگیردار اور درمیانہ طبقوں کی لیاقت علی خان کی مرکزی حکومت کے ساتھ محاذ آرائی جاری تھی کیونکہ اگست 1948ء میں ہنگامی حالات کے اعلان کے بعد مرکزی حکومت نے مہاجرین کی آبادکاری کے سلسلے میں جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی وہ سندھ کے سارے طبقوں کے مفادات کے منافی تھی۔ چوتھی یہ کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان نے 22 رمئی 1948ء کو دستور ساز اسمبلی میں کراچی کی سندھ سے علیحدگی کا پورا معاوضہ دینے کا جو اعلان کیا تھا اس کی تکمیل نہیں ہوئی تھی۔ پانچویں یہ کہ مارچ۔ اپریل 1949ء میں پنجاب کے جاگیردار اور درمیانہ طبقہ کے بعض عناصر اور اخبارات نے مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو ون یونٹ کی صورت میں مدغم کرنے کی جو پروپیگنڈا مہم چلائی تھی اس کی مرکزی حکومت کے کسی رکن نے مخالفت نہیں کی تھی اور اس طرح یہ تاثر ملتا تھا کہ یہ مہم وزیر اعظم لیاقت علی خان کی تائید وحمایت سے چلائی گئی تھی اور اس کا مقصد سندھ اور دوسرے چھوٹے صوبوں کی جداگانہ لسانی، ثقافتی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی ہستی کو ختم کر کے پورے مغربی پاکستان پر پنجابی۔ مہاجر غلبہ قائم کرنا تھا۔ چھٹی یہ کہ وزیر اعلیٰ یوسف ہارون پاکستان مسلم لیگ اور مرکزی حکومت کی تائید سے جو قانون مزارعت منظور کروانا چاہتا تھا اس سے جاگیرداروں کے مفاد پر زد پڑتی تھی لہٰذا وہ اپنے ''حقوق'' کے تحفظ کے لئے متحد ہو گئے تھے۔ ایوب کھوڑو اور میر غلام علی تالپور میں اب کوئی اختلاف نہیں رہا تھا۔ ساتویں یہ کہ ایوب کھوڑو سندھی شاونزم کے سہارے پھر برسر اقتدار آنا چاہتا تھا اور وہ اپریل 1948ء میں اپنی برطرفی کے لئے گورنر جنرل قائد اعظم محمد علی جناح کو موردالزام ٹھہراتا تھا۔ اسے اپنی زبردست سیاسی قوت کا احساس تھا اور اس بنا پر اسے یقین تھا کہ مرکزی حکومت اس کے

اقتدار کی راہ میں زیادہ دیر تک حائل نہیں ہو سکے گی۔ اگرچہ وہ نہایت دقیانوسی اور عوام دشمن جاگیردار تھا اور اسے اپنے طبقہ کا مفاد ہر چیز سے زیادہ عزیز تھا تاہم حالات نے اسے وقتی طور پر صوبہ کے سارے طبقوں کا ہیرو بنا دیا تھا۔ سندھ کا درمیانہ طبقہ اس کی اس طرح تائید وحمایت کرتا تھا جس طرح کہ اس صدی کے دوسرے عشرے میں پنجاب کا درمیانہ طبقہ پنجابی جاگیرداروں کے سرغنہ سر فضل حسین کی پشت پناہی کرتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ پنجاب کے مسلم درمیانہ طبقہ کو 1920-30ء میں غیر مسلم اقلیت کے سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی غلبہ کا مسئلہ درپیش تھا اور سر فضل حسین نے جاگیرداروں کے تعاون سے اس مسئلہ کو کسی حد تک حل کرنے کی کوشش کی تھی اور سندھ کے مسلم درمیانہ طبقہ کو اگست 1947ء کے بعد پنجابی۔مہاجر اقلیت کے سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی غلبہ کا خطرہ لاحق تھا اور ایوب کھوڑو سندھی جاگیرداروں کی امداد سے اس خطرے کا سدباب کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس عرصے میں سندھ کے مسلم درمیانہ طبقہ کے جاگیردار طبقہ کے ساتھ تضاد نے ثانوی حیثیت اختیار کررکھی تھی۔ اس کا سب سے بڑا تضاد پنجابی۔مہاجر عناصر کے ساتھ تھا جو مسلم قومیت اور اسلامی اخوت کے نعرے لگا کر صوبہ سندھ کو ہڑپ کرنے کے درپے تھے۔

لیاقت مخالف کھوڑو کی حمایت مگر پنجابی مخالف کھوڑو کی مخالفت......

پنجابی شاونسٹوں کا دوغلہ پن

پنجاب کا درمیانہ طبقہ سندھ کی اس صورتحال سے عجیب وغریب مخمصے میں مبتلا تھا۔ اس طبقہ کو ایک طرف تو یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوتی تھی کہ سندھ میں ایک طاقتور سیاسی گروہ ایوب کھوڑو کی زیر قیادت اس لیاقت علی خان کی حکومت کے خلاف برسرپیکار تھا جس نے پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے خلاف یونینسٹ جاگیرداروں سے گٹھ جوڑ کرلیا ہوا تھا لیکن دوسری طرف وہ اس اطلاع سے ناخوش ہوتا تھا کہ کھوڑو گروپ لیاقت علی خان کے منظورِ نظر ''تلیئروں'' کے علاوہ پنجابیوں کے خلاف بھی زہر افشانی کرتا تھا اور اس بنا پر پنجابی آبادکاروں اور سندھیوں کے درمیان فساد تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ مزید برآں یہ گروپ پنجابیوں کے ون یونٹ کے منصوبے کا بھی سخت مخالف تھا اور اس سامراجی منصوبے کو ناکام کرنے کے لئے ہر کاروائی کرنے پر آمادہ تھا۔ پنجاب کے درمیانہ طبقہ کو اس اطلاع پر بھی خوشی نہیں ہوئی تھی کہ کھوڑو گروپ قائداعظم محمد علی جناح پر بھی سخت

نکتہ چینی کرتا ہے جن کے نام پر پنجاب میں وزیراعظم لیاقت علی خان کی مؤثر مخالفت ہوتی تھی۔
یہی وجہ تھی کہ پنجابی شاؤنسٹوں کے ترجمان اخبار نوائے وقت نے سندھ مسلم لیگ کے چار روزہ جلسوں کی ہنگامہ خیز اور طویل کاروائی پر بہت مختصر تبصرہ کیا۔ اس کے ادارتی نوٹ میں اعتراض صرف اس بات پر تھا کہ "ہاشم گزدر نے قائداعظم علیہ الرحمتہ کے متعلق بدزبانی کی ہے۔ اس سے سب پاکستانیوں کے جذبات بے حد مجروح ہوئے ہیں۔ افسوس ہے کہ مرکزی پاکستان مسلم لیگ کے صدر محترم اس معاملہ میں بالکل خاموش ہیں اور انہوں نے گزدر صاحب اور ان کے ساتھیوں کی اس دریدہ دہنی کی مذمت میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ ہم سردست اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھنا چاہتے کہ عام مسلمانوں کو اس سے بڑا صدمہ ہوا ہے۔"[10] گویا نوائے وقت کو اس بات پر اعتراض نہیں تھا کہ سندھ مسلم لیگ کے جلسوں میں لیاقت علی خان کی مرکزی حکومت کو ہدف تنقید بنایا گیا تھا۔ اسے اعتراض تھا تو صرف یہ کہ "قائداعظم علیہ الرحمتہ کے خلاف بدزبانی کی گئی تھی" لیکن اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ہاشم گزدر کی اس بدزبانی میں کونسی بات مبنی برصداقت نہیں تھی۔
30 راگست کو کراچی کی آل پاکستان اردو مجلس نے بھی اپنے ہفت روزہ اجلاس میں سندھ پراونشل مسلم لیگ کونسل کے سیشن میں قائداعظم پر ہاشم گزدر کے بزدلانہ حملوں پر نفرت کا اظہار کیا اور یہ رائے ظاہر کی کہ بابائے قوم پر گزدر کے یہ حملے نامعقول اور گمراہ کن تھے۔ مزید برآں مجلس نے "انسانیت اور پاکستان کے خلاف جاگیرداروں کے ناپاک گٹھ جوڑ پر شک وشبہ کا اظہار کیا"[11] لیکن اس مجلس نے بھی نوائے وقت کی طرح یہ نہ بتایا کہ ہاشم گزدر نے قائداعظم کے خلاف "بدزبانی" کرتے ہوئے جو کچھ کہا تھا اس میں کونسی بات واقعاتی لحاظ سے صحیح نہیں تھی۔

ہارون اور مرکزی حکومت نے جاگیرداروں کے خلاف زرعی اصلاحات کو جاگیرداروں کے سرغنہ کھوڑو کے خلاف استعمال کیا

سندھ مسلم لیگ کے اس اجلاس کے اگلے دن یہ خبر شائع ہوئی کہ صوبہ لیگ کا صدر ایوب کھوڑو 7 رستمبر سے صوبہ کے مختلف اضلاع کے دورے پر جا رہا ہے۔ سب سے پہلے وہ حیدر آباد جائے گا۔ وہاں سے وہ 9 رستمبر کو روہڑی سے ہوتے ہوئے لاڑکانہ جائے گا جہاں وہ 12 رستمبر تک ٹھہرے گا۔ 13 رستمبر کو شکارپور جائے گا۔ وہاں سے اسی رات جیکب آباد پہنچے گا اور 14 رستمبر کو

پھر لاڑکانہ سے ہوتے ہوئے 15 ستمبر کو خیر پور پہنچے گا۔ 16 ستمبر کو نواب شاہ میں رہے گا اور 18 ستمبر کو وہاں سے کراچی آجائے گا۔" کراچی کے سیاسی حلقوں کا خیال ہے کہ ایوب کھوڑو اپنے دورے میں زمینداروں کی تنظیم پر خاص توجہ کرے گا۔ چیف کورٹ سے لائنو ٹائپ مشین کیس میں بری ہو جانے کے بعد کھوڑو نے اپنے خلاف حکومت پاکستان کے عائد کردہ تین سال کے امتناع کو برخاست کرانے کے لئے زمینداروں کی تائید کے حصول کی ایک مہم شروع کر رکھی ہے۔"[12] تاہم جب کھوڑو اس پروگرام کے مطابق دورہ کر رہا تھا تو 14 ستمبر کو روزنامہ "ڈان" میں سندھ کے ریونیو کمشنر ایس۔ رڈلے (S.Ridely) کے حوالے سے یہ خبر شائع ہوئی کہ "سندھ کے زمینداروں نے مزارعت بل کی تمام شقوں کو منظور کر لیا ہے۔ اس بل میں تجویز کیا گیا ہے کہ جن مزارعین نے کسی زمیندار کے لئے تین سال سے زیادہ عرصے تک کام کیا ہے انہیں مستقل حقوق مزارعت دے دیئے جائیں گے۔ پیداوار میں مزارع کا حصہ پچاس فیصد ہو گا اور زمینداروں کو ساری غیر قانونی وصولیوں کی ممانعت ہو گی۔ زمینداروں اور ہاریوں کے نمائندوں پر مشتمل ٹربیونلوں کی تشکیل ہو گی جو مزارعت سے متعلقہ تنازعات کا تصفیہ کریں گے۔" اور پھر 17 ستمبر کو یہ بتایا گیا کہ سندھ اسمبلی کی سلیکٹ کمیٹی مزارعت بل پر اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں غور کرے گی اور دسمبر کے پہلے ہفتے میں یہ بل اسمبلی کے سیشن میں پیش کر دیا جائے گا۔

20 ستمبر کو یعنی کھوڑو کے دورۂ سندھ سے واپسی کے دو دن بعد سندھ کی کابینہ کا اجلاس ہوا جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ انگریزوں نے تقریباً ایک سو سال قبل صوبہ میں جو جاگیرداری نظام قائم کیا تھا اسے منسوخ کر دیا جائے گا۔ ریونیو سیکرٹری کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اس مقصد کے لئے ایک بل کا مسودہ تیار کرے جو اسمبلی کے آئندہ سیشن میں پیش کیا جائے گا۔ حکومت سندھ کو جاگیرداری نظام کے خاتمہ سے سالانہ تقریباً 20 لاکھ روپے مالیہ کی آمدنی ہو گی جو اب تک مختلف جاگیردار وصول کرتے رہے ہیں۔ جاگیرداروں کے قبضے میں جو غیر مزروعہ اراضی ہے اسے زیر کاشت لایا جائے گا اور س طرح صوبائی حکومت کو سالانہ مزید پانچ لاکھ روپے وصول ہوں گے۔ اس غیر مزروعہ اراضی کا رقبہ تقریباً 11 لاکھ ایکڑ ہے۔ 1843ء کے بعد انگریزوں کے نافذ کردہ جاگیرداری نظام کے تحت سندھ میں جاگیرداروں کے دو طبقے ہیں۔ ایک طبقہ کے جاگیرداروں کو مخدمی حقوق حاصل ہیں اور دوسرے طبقے کے جاگیرداروں کو مخدمی حقوق کے علاوہ زمینداری

حقوق بھی حاصل ہیں۔جن جا گیرداروں کومخدومی حقوق حاصل ہیں وہ ان زمینداروں سے مالیہ وصول کرتے ہیں جنہیں وہ اراضی برائے کاشت دیتے ہیں۔جن جا گیرداروں کومخدومی اور زمینداری دونوں ہی قسم کے حقوق حاصل ہیں ان کی حیثیت اب زمینداروں کی ہوگی۔انہیں آئندہ مخدومی حقوق حاصل نہیں ہونگے اورانہیں ان حقوق کا معاوضہ دیا جائے گا۔ڈسٹرکٹ کلکٹر ان کے الاؤنسوں کاتعین کریں گے اوراس مقصد کے لئے ان کے خاندان کے افراد کی تعداد کوپیش نظر رکھا جائے گا تاہم صوبہ میں ابھی زمینداری نظام کوختم نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس طرح بہت سی مشکلات پیدا ہوں گی۔[13]

ہارون کے انتخاب کی راہ میں کھوڑو کی جانب سے رکاوٹیں،مہاجروں اور مرکز کی جانب سے تعاون

یہ خبریں اس حقیقت کی مظہر تھیں کہ کھوڑو کی زیر قیادت سندھی جا گیرداروں اور لیاقت علی خان کی زیر قیادت مرکزی ارباب اقتدار میں سیاسی کشمکش کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا۔نومبر میں صوبائی اسمبلی کے چھ حلقوں میں ضمنی انتخابات ہونے والے تھے۔وزیراعلیٰ یوسف ہارون سکھر کے حلقے سے انتخاب لڑنے کا ارادہ رکھتا تھا۔یہ حلقہ مرکزی وزیرخوراک پیرعبدالستار کا تھا اوراب مرکزی کابینہ کے فیصلے کے مطابق اس کے لئے لازمی ہوگیا تھا کہ وہ صوبائی اسمبلی کی رکنیت سے مستعفی ہوجائے۔یوسف ہارون نے قبل ازیں کئی حلقوں سے انتخاب لڑنے کی کوشش کی تھی مگر کھوڑوگروپ نے اس کی ہرکوشش کوناکام بنادیا تھااوروہ اب تک صوبائی اسمبلی کارکن بنے بغیرہی وزیراعلیٰ بنا ہوا تھا۔شہداد پور کی نشست رئیس علی محمد مری کی وفات کی وجہ سے خالی پڑی تھی۔ لاڑکانہ کی نشست ایوب کھوڑوکو''پروڈا'' کے تحت نااہل قرار دیئے جانے کی وجہ سے خالی پڑی تھی اورنواب شاہ کی نشست محمداعظم کی موت نے خالی کردی تھی۔ضلع دادو کی دونوں نشستیں پیرالٰہی بخش اور قاضی محمداکبر کے نااہل قرار دیئے جانے کی وجہ سے خالی پڑی تھیں۔[14] اس وقت تک مہاجرین کوان حلقوں میں رائے دہندگی کاحق حاصل نہیں ہوا تھا حالانکہ تقریباً سات لاکھ مہاجرین سندھ کے مختلف اضلاع میں آباد ہوچکے تھے۔تین لاکھ مہاجرین حیدرآباد میں،ایک لاکھ سکھر میں، ایک لاکھ تھرپارکر میں اورایک لاکھ،نواب شاہ میں آباد ہوئے تھے۔باقی ایک لاکھ مہاجرین دادو،

ٹھٹھہ لاڑکانہ اور بالائی سندھ کے سرحدی علاقوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ کراچی شہر میں مہاجرین کی تعداد تقریباً 8 لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ [15]

اکتوبر کے اوائل میں وزیراعلیٰ یوسف ہارون سندھ کے انتخابی دورے پر روانہ ہوا جس کے دوران اس نے سندھی عوام کو تلقین کی کہ وہ مسلم لیگ کا دامن نہ چھوڑیں کیونکہ یہی جماعت ہے جس کی قیادت میں پاکستان قائم ہوا اور سندھی مسلمانوں کو ہندوؤں کے استحصال سے نجات ملی۔ آج کل جو لوگ مسلم لیگ پر نکتہ چینی کرتے ہیں وہ وہی ہیں جنہوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ یہ اب بھی پاکستان کے مخالف ہیں اسی لئے انہوں نے الگ تنظیمیں قائم کر لی ہیں اور تخریبی سرگرمیوں سے پاکستان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ غالباً یہ اسی انتخابی مہم کا ہی نتیجہ تھا کہ 6 / اکتوبر کو کھوڑو کے حامی اخبار سندھ آبزرور کے ہندو جنرل مینجر تاہل رامانی اور ادارتی سٹاف کے درمیان جھگڑا ہوا جس میں پولیس کو مداخلت کرنا پڑی اور اخبار میں ہڑتال ہوگئی۔ کھوڑو ان دنوں حج پر گیا ہوا تھا۔ 10 / اکتوبر کو ڈان میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ہندوستان کے ہائی کمشنر سری پرکاش نے سندھ آبزرور کے جنرل مینجر تاہل رامانی کو یو۔ پی میں متروکہ جائیدادوں کے ڈپٹی کسٹوڈین کے عہدہ کی پیش کش کی ہے لہٰذا تاہل رامانی نے سندھ آبزرور کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے چیئرمین ایوب کھوڑو کو اپنا استعفیٰ دے دیا ہے اور وہ حج سے واپسی پر اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کرے گا۔ 11 / اکتوبر کو کراچی میں ایک جلسۂ عام ہوا جس میں مطالبہ کیا گیا کہ تاہل رامانی کے خلاف پاکستان دشمن سرگرمیوں کی بنا پر قانونی کارروائی کی جائے۔ دراصل سندھ آبزرور کا تنازعہ اور تاہل رامانی کے حلاف یہ الزام یوسف ہارون کی متذکرہ انتخابی مہم کا ہی ایک حصہ تھا جس کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ ایوب کھوڑو ہندوؤں کی سرپرستی کرتا ہے اور اس کے گروپ کی سرگرمیاں پاکستان کے مفاد کے منافی ہیں۔

28 / اکتوبر کو نواب شاہ کے مسلم مشرقی حلقہ سے مسلم لیگی امیدوار سید فقیر شاہ کو بلا مقابلہ منتخب قرار دیا گیا کیونکہ اس کے مخالف امیدوار حیدر بخش کے کاغذات نامزدگی اس بنا پر مسترد کر دیئے گئے تھے کہ اس کے تجویز کنندہ اور تائید کنندہ کا تعلق اس حلقہ سے نہیں تھا۔ سندھ میں مسلم لیگ کی یہ پہلی انتخابی دھاندلی تھی۔ حیدر بخش ہاریوں کا امیدوار تھا۔ اگر اسے انتخاب لڑنے کا موقع دیا جاتا تو شاید مسلم لیگی امیدوار کی کامیابی میں بڑی مشکل پیش آتی۔

30 راکتوبر کو ایوب کھوڑو کی زیر صدارت سندھ پراونشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کا اجلاس ہوا جس میں شہداد پور کے ضمنی انتخاب کے لئے رئیس غلام حسین المعروف جان محمد خان مری کو لیگ کا ٹکٹ دیا گیا۔ اس حلقہ میں لیگ ٹکٹ کے لئے وزیر اعلیٰ یوسف ہارون بھی امیدوار تھا لیکن اس نے اپنا نام واپس لے لیا کیونکہ وہ مسلم لیگ کی صفوں میں یکجہتی کو برقرار رکھنا چاہتا تھا اور اس نے فیصلہ کیا تھا۔ کہ اب وہ دادو[16] جوہی کے حلقے سے ضمنی انتخاب لڑے گا۔ ہارون پارلیمنٹری بورڈ کی میٹنگ سے باہر آیا تو بعض اخبار نویسوں نے اس سے پوچھا کہ کیا لیگ کے اس فیصلے کے پیش نظر صوبہ میں آئین کی دفعہ 92۔الف کے تحت گورنر راج نافذ کر دیا جائے گا؟ اس کا یہ جواب تھا کہ ''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آئین کے تحت صرف صوبائی گورنر ہی مرکزی حکومت کی ہدایت پر دفعہ 92۔الف نافذ کرنے کا مجاز ہے۔''[17]

جب 31 راکتوبر کو بورڈ کی میٹنگ کی رپورٹ چھپی اور اس کے ساتھ ہی ''ڈان'' میں یہ خبر بھی شائع ہوئی کہ اب وزیر اعلیٰ یوسف ہارون دادو۔ جوہی کے حلقہ سے ضمنی انتخاب لڑے گا تو کھوڑو کے دست راست اور سندھ آبزرور کے ایڈیٹر پیر علی محمد راشدی نے یہ اعلان کر دیا کہ ''سندھ اسمبلی کے دادو۔ جوہی کے حلقہ سے میں بھی امیدوار ہوں گا۔ اس حلقہ میں ضمنی انتخاب کے لئے کاغذات نامزدگی داخل کروانے کی آخری تاریخ 7 رنومبر ہے اور صوبہ لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ نے لیگ ٹکٹ کے لئے 4 رنومبر تک درخواستیں طلب کی ہیں۔''[18] پیر علی محمد راشدی کے اس اعلان سے صاف ظاہر تھا کہ یوسف ہارون کو دادو۔ جوہی کے حلقے کے ضمنی انتخاب کے لئے بھی لیگ ٹکٹ نہیں ملے گا۔ کیونکہ اس نے اپنی چند روزہ انتخابی مہم کے دوران کھوڑو گروپ پر پاکستان دشمنی اور ہندو نوازی کے الزامات عائد کر کے اور جاگیرداری نظام کے خاتمہ کے عزم کا اعلان کر کے سندھ کے ''مرد آہن'' کو بہت ناراض کر لیا ہوا تھا۔ مزید برآں اس نے سندھ آبزرور میں ہڑتال کروانے کے بعد اخبار کے ہندو جنرل منیجر تاہل رامانی کے خلاف پبلک جلسہ میں جو قرارداد منظور کرائی تھی اس سے کھوڑو بہت برافروختہ ہوا تھا۔ تاہل رامانی اس کا معتمد خاص تھا اور اسے بھی لائنو ٹائپ مشین کیس میں قید و جرمانہ کی سزا ہوئی تھی۔ یوسف ہارون اس صورت حال کے پیش نظر سندھ کے ''بے تاج بادشاہ'' سے باغی ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کی آئین کے تحت یوسف ہارون صوبائی اسمبلی کا رکن بنے بغیر دس ماہ سے زیادہ عرصہ تک وزارت اعلیٰ کے عہدہ پر فائز نہیں رہ سکتا تھا

اور دس ماہ کی یہ معیاد چند ہفتوں میں ختم ہونے والی تھی۔ اس کی آخری امید یہ تھی کہ وہ 7 نومبر کو دادو۔ جوہی کی نشست پر بلا مقابلہ منتخب ہوجائے گا مگر جب یہ امید بھی پیر علی محمد راشدی کے اعلان سے ختم ہوگئی تو اس کی سفارش پر صوبائی گورنر شیخ دین محمد نے دادو۔ جوہی حلقہ میں ضمنی انتخاب کرانے کا سرکاری پروگرام منسوخ کر دیا۔ وجہ یہ بتائی گی کہ چونکہ اس حلقہ کے سابق رکن پیر الٰہی بخش نے اپنی نااہلی سے متعلقہ انتخابی ٹربیونل کے فیصلہ کے خلاف چیف کورٹ میں اپیل دائر کر رکھی ہے اس لئے جب تک اپیل کا فیصلہ نہیں ہوتا اس وقت تک اس حلقہ میں ضمنی انتخاب نہیں ہوگا۔[19]

6 نومبر کو کراچی میں ایک ''غیر سیاسی پارٹی'' بنام ادارۂ تعمیر ملت پاکستان کی تشکیل کا اعلان کیا گیا تھا۔ جس کا کاغذی مقصد یہ تھا کہ وہ سندھ کے ہاریوں کی مختلف تنظیموں کے درمیان اشتراک عمل پیدا کرے گی۔ ہاریوں کو حقوق مزارعت دلوائے گی اور ان میں کوآپریٹو فارمنگ (Cooperative Farming) کے نظریے کی تبلیغ کرے گی۔ اس پارٹی کے بانیوں میں یو۔ پی مسلم لیگ کے سابق جنرل سیکرٹری شمس الحسن اور یو۔ پی مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ کے سابق سیکرٹری عبدالحئی عباسی شامل تھے۔ پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں نے مسلم لیگ سے الگ اس تنظیم کی تشکیل پر کوئی ایسا اعتراض نہ کیا جیسا کہ وہ ہاشم گزدر کے سندھ کنونشن پر کر چکا تھا۔ اس کے اس سلسلے میں مہر بہ لب رہنے کی وجہ یہ تھی کہ اس نئی جماعت کا اصل مقصد ہاریوں کے نام پر کھوڑو گروپ پر دباؤ ڈالنا تھا اور یوسف ہارون کو سیاسی تقویت پہنچانا تھا۔ 7 نومبر کو اس جماعت کا 16 رکنی وفد روہڑی سے کراچی پہنچا اور اس نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ سندھ میں 7 لاکھ مہاجرین سمیت 30 لاکھ ہاری 7 ہزار زمینداروں کے مظالم کا شکار ہیں اور تقریباً 4 ہزار سندھی، جن میں ہاری بھی شامل ہیں، سندھ فرنٹیر کرائمز ریگولیشنز (Sindh Frontier Crimes Regulations) اور پبلک سیفٹی ایکٹ (Public Safety Act) کے تحت صوبہ کی مختلف جیلوں میں مقید ہیں۔

ہارون نے کھوڑو گروپ کو منفی کر کے نئی وزارت تشکیل دے دی اور اپنے انتخاب کی مدت میں توسیع حاصل کر لی

یوسف ہارون اور یو۔ پی کے مہاجر لیڈروں کے ان اقدامات سے بالکل واضح تھا کہ اسے مرکزی ارباب اقتدار کی پشت پناہی حاصل ہے اور اب وہ ایوب کھوڑو کی مزید فرمانبرداری

نہیں کرے گا۔ چنانچہ 7/نومبر کو ساڑھے گیارہ بجے قبل دوپہر وہ کھوڑو کے سیاسی چنگل سے یکا یک باہر نکل گیا جبکہ اس نے گورنر دین محمد کو اپنی وزارت کا استعفیٰ پیش کر دیا اور اس کے نصف گھنٹہ بعد اس نے نئی 5 رکنی کابینہ کی تشکیل کا اعلان کر کے اپنے نئے وزراء سے حلف بھی اٹھوالیا۔ اس کی نئی کابینہ میں کھوڑو گروپ کے تین ارکان قاضی فضل اللہ، میر بندے علی تالپور اور سید نور محمد شاہ شامل نہیں تھے اور ان کی جگہ میر غلام علی تالپور، حاجی مولا بخش سومرو اور رحیم بخش سومرو کا تقرر ہوا تھا۔نئی کابینہ میں محکموں کی تقسیم اس طرح تھی:

1۔یوسف ہارون	=	سیاسی امور، سروسز اینڈ جنرل ڈیپارٹمنٹ محکمہ داخلہ اور محکمہ قانون۔
2۔میر غلام علی تالپور	=	محکمہ مال
3۔سید میران محمد شاہ	=	محکمہ تعمیرات عامہ، محکمہ مہاجرین اور بحالیات۔
4۔میر رحیم بخش سومرو	=	لوکل سیلف گورنمنٹ، محکمہ صحت اور محکمہ زراعت۔
5۔حاجی مولا بخش سومرو	=	محکمہ تعلیم، محکمہ خوراک، سول سپلائیز، محکمہ محنت وصنعت۔

مولا بخش سومرو، خان بہادر اللہ بخش، کا بھائی تھا جو 42-1938ء میں کانگرس کی حمایت سے سندھ کا وزیر اعلیٰ رہا تھا اور جس کے قتل کے مقدمے میں خان بہادر محمد ایوب کھوڑو کو بھی ملوث کیا گیا تھا، رحیم بخش سومرو، خان بہادر اللہ بخش کا بیٹا تھا۔ گویا نئی کابینہ میں ان دونوں چچا بھتیجے کی کھوڑو سے خاندانی عداوت تھی۔ میر غلام علی تالپور کو ایوب کھوڑو سے شکایت تھی کہ اگرچہ اس نے 25/اگست کو کھوڑو سے صلح کر لی تھی لیکن جب 29/اگست کو صوبہ لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ کا انتخاب ہوا تھا تو اس نے تالپور کو منتخب نہیں کروایا تھا۔ اس انتخاب میں ایوب کھوڑو کے ''جی حضوری غلام نبی پٹھان، قاضی فضل اللہ، اے۔ایم۔قریشی، حاجی علی اکبر شاہ، فقیر محمد، نعمت اللہ قریشی، عبدالشکور منشی اور ہاشم گزدر کامیاب ہوئے تھے اور میر غلام علی تالپور 69 میں سے صرف 23 ووٹ حاصل کر سکا تھا۔''[20]

یوسف ہارون کے اخبار روزنامہ ''ڈان'' نے صوبائی کابینہ میں اس ردوبدل پر خوشی کا

اظہار کیا اور لکھا کہ اس طرح وزیر اعلیٰ کو ان ساتھیوں سے نجات مل گئی ہے جن کے ساتھ اس کی ان بن رہتی تھی۔ اب وہ پر اعتماد ہے کیونکہ اس نے غیبی شکنجوں سے گلوخلاصی کرا لی ہے۔ وہ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے قائد کی حیثیت سے اپنی کابینہ میں ردوبدل کرنے کا مجاز تھا اور اسے بھروسہ ہے کہ اس کی نئی کابینہ کو اسمبلی میں اکثریت کی حمایت حاصل ہوگی[21] لیکن ''ڈان'' نے یہ نہیں بتایا تھا کہ یہ ساری کاروائی آئینی ہیر پھیر کے ذریعے یوسف ہارون کی وزارت میں مزید دس ماہ کی توسیع کے لئے کی گئی تھی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو چند ہفتوں کے بعد اس کی وزارت قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے ایسا کر کے آئین کی سپرٹ کو مجروح کیا تھا اور اس کے اس آئینی جرم میں وزیر اعظم لیاقت علی خان اور گورنر دین محمد بھی ملوث تھے۔ ڈان نے یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ آئین کی وہ کونسی دفعہ تھی جس کے تحت 1948ء کے اوائل میں صوبائی گورنر شیخ غلام حسین ہدایت اللہ نے کھوڑو کابینہ کے ارکان کے محکموں میں از خود ردوبدل کر دیا تھا اور پھر اپریل 1948ء میں کون سے آئینی اور جمہوری اصول کے تحت کھوڑو وزارت کی برطرفی عمل میں آئی تھی جبکہ اسے اسمبلی میں اکثریت کی حمایت حاصل تھی اور اس نے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کے لئے اسمبلی کا خصوصی اجلاس بھی طلب کر لیا ہوا تھا۔ یوسف ہارون نے 5 رنومبر کو دادو۔ جوہی کے حلقہ میں ضمنی انتخاب کے بارے میں سرکاری پروگرام کو اس عذر کے تحت منسوخ کرا دیا تھا کہ پیر الٰہی بخش نے انتخابی ٹربیونل کے فیصلے کے خلاف چیف کورٹ میں اپیل دائر کر رکھی تھی مگر اس کے دو دن بعد 7 رنومبر کو جب ہارون نے استعفیٰ دے کر نئی کابینہ کی تشکیل کا اعلان کیا تو اسی دن سندھ چیف کورٹ کا سندھی جسٹس ویلانی پیر الٰہی بخش کی درخواست برائے حکم امتناعی مع خرچہ مسترد کر چکا تھا[22] اور 5 رنومبر کے ماقبل کے سرکاری اعلان کے مطابق دادو۔ جوہی کے حلقہ میں ضمنی انتخاب ہو سکتا تھا۔

لاہور کے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ کا سندھ کی کابینہ میں اس ڈرامائی ردوبدل پر تبصرہ یہ تھا کہ یوسف ہارون نے یہ ساری کاروائی محض اس لئے کی ہے کہ وہ صوبہ لیگ کے صدر ایوب کھوڑو کی مخالفت کے باعث گزشتہ نو ماہ میں اسمبلی کا رکن نہیں بن سکا تھا۔ اب صوبائی اسمبلی کے آئندہ بجٹ سیشن یا لیگ اسمبلی پارٹی کے آئندہ اجلاس میں پتہ چلے گا کہ یوسف ہارون اپنی مخالفت کے طوفان کا سدباب کر کے اپنی قیادت برقرار رکھ سکے گا یا نہیں۔ فی الحال اس کی اس کاروائی نے ان کوششوں کو ناکام کر دیا ہے جو کھوڑو اس کی وزارت اعلیٰ کی بیخ کنی کے لئے کر رہا

تھا۔ تاہم سندھ کی سیاست میں کھوڑو کی قوت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بعض مبصرین کا خیال یہ ہے کہ سندھ کی سیاست میں اس تازہ واقعہ سے وفاقی آئین کی سپرٹ مجروح ہوئی ہے لیکن بعض دوسرے مبصروں کا موقف یہ ہے کہ صوبہ کو دفعہ 92۔ الف کے شکنجے سے بچانے کا یہی طریقہ تھا[23] اور نوائے وقت کی رپورٹ یہ تھی کہ "ایوب کھوڑو سندھ مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں ہارون وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک منظور کرائے گا۔"[24]

پاکستان ٹائمز کا تبصرہ یہ تھا کہ تقریباً 9 ماہ قبل سندھ میں ایک عجیب و غریب مثال قائم کی گئی تھی جبکہ یوسف ہارون کو وزیر اعلیٰ بنایا گیا تھا حالانکہ وہ صوبائی اسمبلی کا رکن بھی نہیں تھا۔ اس عرصے میں وہ اپنی سرکاری پوزیشن اور مرکز کی پوری حمایت کے باوجود اپنے آپ کو منتخب نہیں کرا سکا۔ اب جبکہ یہ پتہ چل گیا کہ مسٹر ہارون قانونی طور پر مزید چند ہفتوں سے زیادہ عرصے تک وزیر اعلیٰ نہیں رہ سکتا تو سندھ گورنمنٹ ہاؤس میں ایک ایسا ڈرامہ کھیلا گیا جسے ایک وکیل کی چالبازی ہی کہا جا سکتا ہے۔ مقصد محض یہ ہے کہ آئین کی اس دفعہ سے بچا جائے جس کے تحت یہ قرار دیا گیا ہوا ہے کہ اگر کوئی وزیر مسلسل دس ماہ تک اسمبلی کا ممبر نہ بنے تو وہ وزارت کے عہدے پر قائم نہیں رہ سکتا...... سندھ کی اسمبلی پر جاگیرداروں کا غلبہ ہے اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ یہ صوبہ کی آبادی کے بہت ہی معمولی حصے کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہی اسمبلی کھوڑو کی حمایت کرتی رہی تھی تا آنکہ قائداعظم نے اسے برطرف کر دیا تھا۔ اسی طرح اس نے پیر الٰہی بخش کی حمایت کی تھی تا آنکہ عدالت نے اسے صوبہ کے نام کو مزید داغدار کرنے سے پہلے نااہل قرار دیا تھا۔ آئندہ چند ماہ میں اس امر کا امکان ہے کہ یوسف ہارون ضمنی انتخاب کے لئے کھوڑو سے لیگ ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ریٹرننگ آفیسر یا انتخابی ٹربیونل کو قائل کر لے کہ وہ ایک ایسا ووٹر ہے جو انتخاب میں حصہ لے سکتا ہے اور پھر وہ انتخاب میں کامیابی بھی حاصل کر سکتا ہے اور اگر ان میں سے کوئی بات نہ ہو سکی ہو تو پھر وہ نو ماہ انتیس دن کے بعد پھر ایسا ہی ڈرامہ کھیل سکتا ہے جیسا کہ اس نے اب کھیلا ہے بشرطیکہ اس پر مرکز کی نظر عنایت بدستور رہے...... مولا بخش سومرو، اللہ بخش مرحوم کا بھائی ہے اور رحیم بخش سومرو اس کا بیٹا ہے۔ سندھ میں اللہ بخش کی سیاست ویسی ہی تھی جیسی کہ پنجاب میں ملک خضر حیات ٹوانہ کی تھی۔"[25]

8 نومبر کو سندھ مسلم لیگ کے صدر ایوب کھوڑو نے ایک انٹرویو میں اس امر پر حیرت

اور صدمہ کا اظہار کیا کہ ''صوبائی کابینہ میں مسلم لیگ یا اس کے صدر کی پیشگی منظوری حاصل کئے بغیر ردوبدل کیا گیا۔ 1937ء کے بعد صوبہ کی تاریخ میں پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ تاہم اس نے یہ بتانے سے انکار کر دیا کہ وہ ''جوابی حملہ'' کے طور پر کیا کاروائی کرے گا۔'' 10 رنومبر کو سول اینڈ ملٹری گزٹ نے کھوڑو کے اس انٹرویو پر تبصرہ کرتے ہوئے پیش گوئی کی کہ ''صوبہ سندھ میں بہت بڑا سیاسی طوفان آنے والا ہے۔ اگر صدر صوبہ لیگ اور وزیر اعلیٰ کے درمیان اسمبلی کے آئندہ بجٹ سیشن سے پہلے کوئی تصفیہ نہ ہوا تو ایوان میں صوبہ کی سیاسی قیادت کے لئے زبردست لڑائی ہوگی اور اگر اس لڑائی میں یوسف ہارون کو شکست ہوگئی تو پنجاب کے بعد سندھ میں بھی گورنر راج نافذ ہو جائے گا لیکن اس سے پہلے بہت آتش بیانی ہوگی۔'' لیکن روزنامہ ڈان اس واقعہ کے بعد تیسرے دن بھی بدستور جشن منا رہا تھا۔ اس کی حیدرآباد سے رپورٹ یہ تھی کہ ''جب اس شہر میں کابینہ کے ردوبدل کی خبر پہنچی تو لوگوں نے پرجوش تالیوں سے اس کا خیر مقدم کیا اور امید ظاہر کی کہ موجودہ وزارت، سندھ کی سب سے زیادہ طاقتور اور مستحکم وزارت ثابت ہوگی اور ایک پولیس اہلکار کا خیال تھا کہ اب جرائم بہت کم ہو جائیں گے اور شرپسندوں کا وجود ختم ہو جائے گا۔''[26] حیدرآباد میں اس وقت تک تقریباً 3 لاکھ ''اہل زبان'' مہاجرین آباد ہو چکے تھے اور شہر کی سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی زندگی پر ان کا غلبہ قائم ہو چکا تھا۔ اس لئے ڈان کی یہ رپورٹ غلط نہیں تھی۔ ان مہاجروں نے یقیناً پرجوش تالیوں سے اس خبر کا خیر مقدم کر کے سندھیوں اور غیر سندھیوں کے درمیان تضاد کی شدت میں اضافہ کیا ہوگا۔ ان کے لئے ایسی وزارت قابل قبول تھی جو وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خان کی کٹھ پتلی ہو اور جو سندھ کی جداگانہ سیاسی، معاشی اور ثقافتی ہستی کی باتیں نہ کرے، جو صوبائی خودمختاری کا مطالبہ نہ کرے اور جو مہاجرین کی آبادکاری میں ساری مطلوبہ سہولتیں مہیا کرے۔ ان کے نزدیک مسلم قومیت اور اسلامی اخوت کا مطلب یہی تھا۔ چنانچہ 11 رنومبر کو روزنامہ ''ڈان'' نے اپنے اداریے میں مرکزی حکومت پر زور دیا کہ وہ ''سندھ میں اپنی بحالیاتی پالیسی پر خوش اسلوبی سے عمل کروائے۔ جب ستمبر اور اکتوبر میں کراچی سے 8000 مہاجرین، میرپور اور نواب شاہ میں بھیجے گئے تھے تو اعلان کیا گیا تھا کہ ان کے لئے الاٹ شدہ زمین کھڑی فصلوں سمیت انکے حوالے کر دی جائے گی مگر ابھی تک اس اعلان پر عمل نہیں ہوا۔ مرکزی حکومت کو اپنے نمائندے موقع پر بھیج کر یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کے احکامات کی تعمیل ہوئی ہے یا نہیں۔''

12 رنومبر کو مرکزی وزیر خوراک پیرزادہ عبدالستار حیدرآباد، نواب شاہ، سکھر، روہڑی، سکرنڈ اور سندھ کے بعض دوسرے علاقوں کے دورے پر روانہ ہو گیا۔ صوبائی وزیر زراعت میر رحیم بخش سومرو اس کے ہمراہ تھا۔ اس کے اس دورے کا مقصد یوسف ہارون کی وزارت کے لئے جاگیرداروں کی حمایت حاصل کرنا تھا۔ چنانچہ اس نے 14 رنومبر کو حیدرآباد میں سابق وزیر اعلیٰ پیر الٰہی بخش کے رفیق خاص قاضی محمد اکبر کے مکان پر ایک عشائیہ میں شرکت کی۔ مہمانوں میں متعدد دوسرے جاگیرداروں کے علاوہ میر غلام علی تالپور بھی شامل تھا۔ اگلے دن صبح وہ ابھی حیدرآباد میں ہی تھا کہ شہر میں پولیس کانسٹیبلوں اور ہیڈ کانسٹیبلوں نے ہڑتال کر دی۔ انہوں نے اس ہڑتال کے لئے 17 ر اکتوبر کو ایک قرارداد منظور کی تھی جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ان کی تنخواہوں اور سفر خرچ میں اضافہ کیا جائے، مفت طبی امداد مہیا کی جائے اور ان کی مفت تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔ پولیس والوں کی یہ ہڑتال اس امر کی علامت تھی کہ صوبہ میں امیر اور غریب کے درمیان فرق بڑی تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ بعض اصلی و نقلی مہاجرین اور مقامی مفاد پرست عناصر ہندوؤں کی متروکہ جائیدادوں اور مرکزی حکومت کے لائسنسوں اور پرمٹوں کی بدولت راتوں رات ''خاندانی رئیس'' بن رہے تھے جبکہ غریب عوام کے لئے زندگی تلخ سے تلخ تر ہو رہی تھی۔ مزید برآں صوبہ میں مختلف دھڑوں کے درمیان مسلسل سیاسی کشمکش کے باعث انتظامیہ کے وقار کی مٹی پلید ہو رہی تھی اور نظم و نسق کی حالت دگرگوں تھی۔ تاہم جب انسپکٹر جنرل پولیس کی طرف سے ہڑتالیوں کے مطالبات پر ''ہمدردانہ غور'' کرنے کا وعدہ کیا گیا تو یہ ہڑتال ایک ہی دن میں ختم تو ہو گئی لیکن اس سے صوبائی اور مرکزی ارباب اقتدار کے اس احساس میں اضافہ ہو گیا کہ اگر صوبہ کے سیاسی بحران پر بلا تاخیر قابو نہ پایا گیا تو حالات قابو سے باہر ہو جائیں گے۔

کھوڑو، ہارون دھڑوں کے مابین وقتی مصالحت

اور ہارون کا اسمبلی کے لئے بلا مقابلہ انتخاب

کھوڑو گروپ کے جاگیردار طبقہ کے لئے بھی یہ ہڑتال ایک زبردست انتباہ کی حیثیت رکھتی تھی کیونکہ ان دنوں بے زمین ہاریوں کی تحریک میں بھی روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ چنانچہ دونوں دھڑوں کا مشترکہ طبقاتی مفاد ان کے سیاسی مفادات پر غالب آ گیا۔ پیرزادہ عبدالستار کا

دورہ کامیاب رہا۔ دونوں دھڑوں میں وقتی طور پر مصالحت ہو گئی۔ پیرزادہ عبدالستار اس دورے سے واپس کراچی پہنچا تو 29 رنومبر کو سرکاری طور پر اعلان کیا گیا کہ اس نے سکھر کے جنوبی دیہاتی حلقہ سے صوبائی اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ اسی دن یہ اعلان بھی ہوا کہ یوسف ہارون نے اس حلقہ کے ضمنی انتخاب میں حصہ لینے کی غرض سے لیگ ٹکٹ کے لئے درخواست دے دی ہے۔ وہ واحد امیدوار ہے۔ کسی اور شخص نے اس مقصد کے لئے درخواست نہیں دی۔ کھوڑو کے رفیق خاص اور روزنامہ سندھ آبزور کے ایڈیٹر پیر علی محمد راشدی نے اعلان کر رکھا تھا کہ وہ ہر حلقہ سے یوسف ہارون کا مقابلہ کرے گا مگر اب اس کی جانب سے لیگ ٹکٹ کے لئے درخواست نہ دینے کا مطلب یہ تھا کہ اب ایوب کھوڑو کو یوسف ہارون کے بلا مقابلہ انتخاب پر کوئی اعتراض نہیں رہا تھا۔ پنجاب میں وزیر اعظم لیاقت علی خان کا منظور نظر مسلم لیگی لیڈر ممتاز دولتانہ بھی اسی دن کراچی پہنچا تھا اور اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ ممتاز دولتانہ کراچی میں لیاقت علی خان اور ایوب کھوڑو کے درمیان مصالحت کرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ حکومت پاکستان کھوڑو کے خلاف کسی پبلک عہدہ پر فائز ہونے کے خلاف جاری کردہ حکم واپس لے لے۔[27] 3 ردسمبر کو سکھر میں پیرزادہ عبدالستار کی خالی کردہ نشست کے ضمنی انتخاب کے کاغذات نامزدگی داخل ہوئے تو یوسف ہارون بلا مقابلہ منتخب ہو گیا کیونکہ اس کے خلاف کسی اور امیدوار نے کاغذات نامزدگی داخل نہیں کئے تھے۔

لاہور کا روزنامہ نوائے وقت اس خبر سے بہت برہم ہوا کیونکہ اس خبر میں یہ امکان مضمر تھا کہ پنجاب کے سرمایہ دار اور درمیانہ طبقوں کے شاونسٹوں کے خلاف وزیر اعظم لیاقت علی خان کا سیاسی محاذ کل پاکستان سطح پر مستحکم ہو جائے گا۔ لیاقت علی خان نے پنجاب، سرحد اور مشرقی بنگال میں ممتاز دولتانہ، خان عبدالقیوم خان اور نورالامین سے پہلے ہی گٹھ جوڑ کر رکھا تھا۔ اب کھوڑو کے ساتھ مصالحت سے لیاقت علی خان کی سیاسی پوزیشن بہت زیادہ مضبوط ہو سکتی تھی۔ جب تک ایوب کھوڑو اور لیاقت علی خان کے درمیان محاذ آرائی جاری رہی۔ اس وقت تک نوائے وقت میں کھوڑو کو کبھی ہدف تنقید نہیں بنایا گیا تھا کیونکہ اس اخبار کا اصول یہ تھا کہ اپنے دشمن کا دشمن اپنا دوست ہوتا ہے۔ چونکہ جنوری 1949ء میں ممدوٹ وزارت کی برطرفی کے بعد لیاقت علی خان نوائے وقت کی رائے میں ''پنجاب کا بدترین دشمن'' بن گیا تھا۔ اس لئے اس کے سندھی دشمن کھوڑو کو ''پنجابیوں'' کا عملی طور پر حلیف تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن جب ممتاز دولتانہ کی وساطت سے کھوڑو

اور لیاقت کے درمیان مصالحت کی کوششوں کی خبر آئی تو نوائے وقت کا تبصرہ یہ تھا کہ ''مسٹر محمد ایوب کھوڑو کو قائداعظم نے وزارت عظمیٰ سے برخاست کیا تھا اور مقدمہ چلانے کی منظوری بھی مرحوم ہی نے دی تھی۔ قائداعظمؒ کی وفات کے بعد حالات نے پہلا پلٹا اس وقت کھایا جب چودھری صاحب نے کھوڑو کا احسان اس طرح اتارا کہ جب مؤخرالذکر سندھ لیگ کے صدر منتخب ہوئے تو چودھری صاحب نے خاموشی کے ساتھ ان کے انتخاب پر صاد کر دیا اور اب دولتانہ صاحب کھوڑو کا احسان اس طرح اتارنا چاہتے ہیں کہ ان کی اور مسٹر لیاقت علی خان کی صلح کرانے کی کوشش کر رہے ہیں تا کہ سابق وزیراعلیٰ سندھ پر سے وہ پابندی ہٹا لی جائے جس کی رو سے وہ 3 سال تک کسی پبلک عہدہ پر فائز نہیں کئے جا سکتے۔ صلح کی کوششوں کے متعلق رپورٹ کی تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ مسٹر یوسف ہارون اور مسٹر کھوڑو جو دس روز قبل تک ایک دوسرے کے خلاف سمجھے جاتے تھے۔ اب پھر شیر و شکر ہو رہے ہیں...... جمہور کو کل تک بتایا جا رہا تھا کہ کھوڑو قائداعظم کا مغضوب ہے اور مردود ہے اور اسے سنگین بدعنوانیوں کی بنا پر پبلک زندگی سے نکالا گیا ہے، وہ کھوڑو اب راتوں رات اس قابل کیسے ہو گیا کہ آپ اس سے گلے ملنے کے لئے بے تاب ہو رہے ہیں...... مسٹر کھوڑو کے متعلق حکم 8 ماہ قبل صادر کیا گیا تھا۔ آج تک ان کے حلقے میں ضمنی انتخاب کیوں نہیں کروایا گیا تھا؟...... پیرزادہ عبدالستار نے صبح کو سندھ اسمبلی سے استعفیٰ دیا اور شام کو ان کی خالی کردہ نشست پر کرنے کے لئے ضمنی انتخاب کا اعلان کر دیا گیا۔''[28] چونکہ نوائے وقت کی صحافت و سیاست افراد کی اغراض، مصلحتوں، دوستیوں اور دشمنیوں کے اردگرد گھومتی تھی اس لئے اس کا خیال تھا کہ سندھ میں ازسرنو جو سیاسی صف بندی ہو رہی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ چودھری خلیق الزماں، ممتاز دولتانہ اور ایوب کھوڑو کو ایک دوسرے کے احسانات اتار رہے تھے۔

دراصل اس کی وجہ اتنی معمولی اور سادی نہیں تھی۔ اصل وجہ یہ تھی کہ گزشتہ ڈیڑھ پونے دو سال کے تجربے سے ثابت ہو گیا تھا کہ سندھ میں کھوڑو گروپ کی تائید و حمایت کے بغیر کوئی حکومت پائیدار نہیں ہو سکتی۔ ان دنوں کھوڑو گروپ نہ صرف سندھی جاگیرداروں کے مفادات کا علمبردار تھا بلکہ وہ سندھ کے درمیانہ طبقہ اور ہاریوں کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی تقاضوں کی بھی ترجمانی کرتا تھا۔ سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن کے طلبا اس کی حمایت میں قراردادیں منظور کرنے کے علاوہ آئے دن مظاہرے کرتے تھے۔ سندھ کی ہاری کمیٹی سندھی مفادات اور حقوق

کے بارے میں قرارداد منظور کر چکی تھی اور سندھ کے درمیانہ طبقہ کا شاونزم اس انتہا تک پہنچ چکا تھا کہ صوبہ کی ایگزیکٹو اور عدلیہ کے ارکان بھی اس سے متاثر ہو چکے تھے۔ کراچی کے اخبارات میں آئے دن خبریں شائع ہوتی تھیں کہ سندھی سرکاری اہلکار کھوڑو گروپ کے فرمانبردار تھے اور وہ مہاجرین کی آبادکاری کے کام میں رکاوٹیں حائل کرتے تھے۔ کراچی کی بار ایسوسی ایشن سندھ چیف کورٹ کے چیف جج حاتم طیب جی کے خلاف بھی صوبہ پرستی کا الزام عائد کر چکی تھی اور حیدرآباد کے اخبارنویسوں میں سندھی اور غیر سندھی کے سوال پر پھوٹ پڑ گئی تھی۔ ان حالات میں وزیراعظم لیاقت علی خان کی قومی سیاست کی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ سندھ میں کھوڑو سے صلح کر کے پہلے پنجاب کے سیاسی بحران کو حل کیا جائے۔ بقول نوائے وقت پنجاب پاکستان کا ''دل'' تھا اور پورے جسد پاکستان کو صحت مند رکھنے کے لئے اس ''دل'' کی بیماری کا فوری حل ضروری تھا۔ 3ر ستمبر 1949ء سے قبل نوائے وقت نے کبھی ایوب کھوڑو کی جاگیردارانہ سازشی سیاست کی مذمت کرتے ہوئے یہ نہیں لکھا تھا کہ وہ ''قائداعظم کا معتوب ومردود تھا'' مگر اب اس کے بارے میں اس قسم کی باتیں لکھنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس لئے نہیں کہ قائداعظم نے اسے برطرف کیا تھا اور اس کے خلاف مقدمہ چلانے کی منظوری دی تھی بلکہ اس لئے کہ اس کے اور لیاقت علی خان کے درمیان صلح ہو رہی تھی۔ 1949ء میں نوائے وقت کی صحافت وسیاست کا بنیادی اصول یہ تھا کہ جو بات لیاقت علی خان کے خلاف جاتی ہو اس کی بلا لحاظ عدل وانصاف اور آئین وجمہوریت، حمایت کرو اور جو بات لیاقت علی خان کے حق میں جاتی نظر آئے اس کی بہر صورت مخالفت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرو۔

ہارون کی تیسری وزارت کی تشکیل جس میں کھوڑو گروپ کے ارکان بھی شامل کئے گئے

تاہم فوری طور پر ایوب کھوڑو اور لیاقت علی خان کے درمیان صلح کی کوششوں کا نتیجہ بظاہر اس کے سوا کچھ نہ نکلا کہ یوسف ہارون 3ر دسمبر کو سکھر کے ضمنی انتخابات میں بلا مقابلہ کامیاب ہو گیا۔ کھوڑو نے اس کے بعد پانچ چھ ہفتے تک اپنی صوبائی لیگ کونسل کے ذریعے ہارون وزارت کو پریشان اور ہراساں کرنے کا سلسلہ جاری رکھا اور وہ اس موقف پر بھی مصر رہا کہ مسلم لیگ کے

آئین کے تحت کراچی صوبہ سندھ کا حصہ ہے اس لئے کراچی مسلم لیگ کی تنظیم اورنگرانی کا حق صرف سندھ لیگ کو حاصل ہے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق سندھ اسمبلی کے سیشن کے لئے 10 رجنوری 1950ء کی تاریخ مقرر تھی اور اس کے ایجنڈے پر پانچ آرڈیننس اور 25 سرکاری بل تھے۔ ان بلوں میں جاگیرداری کی تنسیخ اور ہاریوں کے حقوق مزارعت کے بل بھی شامل تھے لیکن مقررہ تاریخ کو یہ سیشن نہ ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ لیگ اسمبلی پارٹی دو دھڑوں میں تقسیم تھی اور وزیر اعلیٰ یوسف ہارون کو معلوم نہیں تھا۔ اسمبلی میں اسے اکثریت کی حمایت حاصل ہوگی یا نہیں؟ ہارون کی اس الجھن کو دور کرنے کے لئے 12 رجنوری 1950ء کو لیگ اسمبلی پارٹی کے 21 ارکان کا ایک غیر رسمی اجلاس ہوا جس میں پیرزادہ عبدالستار، یوسف ہارون اور ایوب کھوڑو پر مشتمل ایک سہ رکنی مصالحتی بورڈ کی تشکیل کی گئی جس کے ذمے یہ کام کیا گیا کہ وہ لیگ اسمبلی پارٹی کے مختلف دھڑوں میں سمجھوتہ کرائے گا تا کہ صوبائی وزارت کو کوئی استحکام نصیب ہو۔ پیرزادہ عبدالستار نے دو دن تک اس بورڈ کی میٹنگوں میں شرکت کرنے کے بعد یکایک اس سے علیحدگی اختیار کر لی لیکن یوسف ہارون اور ایوب کھوڑو کے درمیان مزید پانچ چھ دن تک خفیہ مذاکرات ہوتے رہے جن کے دوران یہ سودا بازی ہوتی رہی کہ یوسف ہارون کی نئی کابینہ میں کونسے دھڑے کے کتنے وزیر ہوں گے جبکہ روزانہ اخبارات میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہوتی رہیں۔ بالآخر 19 رجنوری 1950ء کو وزیر اعلیٰ یوسف ہارون، وزیر مال غلام علی تالپور اور کھوڑو گروپ کے قائد قاضی فضل اللہ نے وزیر اعظم لیاقت علی خان سے ملاقات کی جس میں 25 منٹ تک صوبہ کی سیاسی صورتحال پر بحث ہوئی۔ یہ بحث بارآور ہوئی اور 20 رجنوری کو ہارون کی پانچ رکنی تیسری کابینہ کا اعلان ہوا اس کابینہ میں مولابخش سومرو اور رحیم بخش سومرو کے نام نہیں تھے۔ ان کی جگہ کھوڑو کے نامزد کردہ دو ارکان قاضی فضل اللہ اور آغا غلام نبی پٹھان کو لیا گیا تھا۔ محکموں کی تقسیم اس طرح تھی:

1۔	وزیر اعلیٰ یوسف ہارون	خزانہ، سیاسی امور اور جنرل ایڈمنسٹریشن۔
2۔	قاضی فضل اللہ	نظم ونسق، قانون اور زراعت۔
3۔	غلام علی تالپور	مال اور لوکل سیلف گورنمنٹ۔
4۔	آغا غلام نبی پٹھان	تعلیم، صحت، خوراک اور سول سپلائیز۔
5۔	سید میران محمد شاہ	بحالیات اور تعمیرات عامہ۔

یوسف ہارون کی کابینہ میں تقریباً دس ہفتے بعد اس دوسرے ردوبدل کے پس منظر میں پالیسی کے کسی اختلاف کی کارفرمائی نہیں تھی۔ بلکہ یہ کھلم کھلا مختلف دھڑوں کے درمیان اقتدار کی کشمکش کا نتیجہ تھا۔ ہارون نے 7رنومبر 1949ء کو مرکزی ارباب اقتدار اور صوبائی گورنر کی حمایت سے اپنی کابینہ میں ردوبدل کر کے ایوب کھوڑو کو جو ہزیمت دی تھی اب اس کا ازالہ ہو گیا تھا اور کھوڑو ایک مرتبہ پھر بالواسطہ طور پر برسراقتدار تھا اور یہ بات اس امر کی علامت تھی کہ اب یوسف ہارون زیادہ دیر تک وزیراعلیٰ نہیں رہے گا۔ کھوڑو اور لیاقت علی خان کے درمیان مصالحت ہو چکی تھی۔ کراچی کے سرمایہ دار میمن فرقہ کا نمائندہ یوسف ہارون ایک ایسا گھوڑا ثابت ہوا تھا جس سے سندھ کے جاگیردارانہ سیاسی میدان میں مزید کوئی کام نہیں لیا جا سکتا تھا۔

ہاری تحریک میں شدت اور جاگیرداری کے تحفظ کی خاطر کھوڑو کا سندھی مفادات کو خیرباد کہہ کر لیاقت سے تعاون

20رجنوری 1950ء کو وزیراعظم لیاقت علی خان نے مرکزی اسمبلی میں مسئلہ کشمیر پر پاکستان کے موقف کی مفصل وضاحت کی اور کشمیری عوام کو یقین دلایا کہ ریاست جموں وکشمیر پر بھارت کا جبری قبضہ قائم نہیں رہنے دیا جائے گا۔ اگلے دن 21رفروری کو ایوب کھوڑو نے لیاقت علی خان کی اس فاضلانہ تقریر کی تعریف کی اور یقین دلایا کہ صوبہ سندھ اس سلسلے میں حکومت پاکستان کی بھرپور حمایت کرے گا اور وہ کشمیر کی آزادی کی جدوجہد میں کسی سے پیچھے نہیں رہے گا۔ کھوڑو کے اس بیان سے سمجھنے والوں نے سمجھ لیا کہ آئندہ سندھ کی سیاست کا رخ اسی طرف ہوگا جس طرف ایوب کھوڑو چاہے گا۔

فروری 1950ء کے اوائل میں پیرالٰہی بخش، میر غلام علی تالپور اور قاضی محمد اکبر نے اپنے خطوط اور بیانات میں شکایت کی کہ کھوڑو گروپ نے اپنے مخالفین پر مسلم لیگ کی رکنیت کے دروازے بند کر دیئے ہیں۔ کھوڑو جن لوگوں کو ناپسند کرتا ہے انہیں لیگ کی رکنیت کے فارم مہیا ہی نہیں کئے جاتے۔ مگر کسی نے ان کی شکایت کو درخوراعتنا نہ سمجھا۔ البتہ 9رفروری کو کھوڑو نے پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں کی جانب سے ایک خط کی وصولی کے بعد اعلان کیا کہ چونکہ پاکستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے کراچی شہر کو لیگ کی تنظیم نو کے لئے ایک الگ صوبہ قرار

دے دیا ہے اس لئے سندھ مسلم لیگ اس شہر میں لیگ کے انتخابات نہیں کرائے گی۔ کراچی سے لیگ کے جو کونسلر منتخب ہوں گے وہ 51-1950ء کے لئے سندھ مسلم لیگ کے عہدیداروں کے انتخاب میں حصہ نہیں لے سکیں گے۔ گویا بالآخر کھوڑو نے کراچی کی سندھ سے علیحدگی کو رسمی طور پر قبول کر ہی لیا اور اس طرح لیاقت۔ کھوڑو گٹھ جوڑ کے لئے راستہ بالکل ہموار ہو گیا۔

مارچ کے اوائل میں پیر الٰہی بخش نے پھر شکایت کی کہ کھوڑو گروپ اپنے مخالفین کو لیگ کی رکنیت کے فارم مہیا نہیں کرتا اور کھوڑو نے صوبہ لیگ کو ایک نجی تنظیم کی حیثیت دے دی ہے جو ہاریوں اور غریب عوام کی نمائندگی نہیں کرتی۔ اس پر کھوڑو نے 4/مارچ کو اعلان کیا کہ ''وہ عنقریب مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کر رہا ہے تاکہ پیر الٰہی بخش اس کے خلاف اس کی ان سرگرمیوں کی بنا پر انضباطی کاروائی کرنے کی تجویز پر غور کیا جائے جو اس نے مسلم لیگ کے خلاف جاری رکھی ہیں۔ پیر الٰہی بخش کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سندھ میں ایک متوازی مسلم لیگ قائم کر رہا ہے اور اس نے اپنے اس بیان سے قبل حسین شہید سہروردی سے ملاقات کی تھی...... اب وہ دفعتاً ہاریوں کا محسن بن گیا ہے حالانکہ ہاریوں کی تحریک ایک اشترا کی تحریک بن رہی ہے۔''[29] کھوڑو کے اس بیان میں دو باتیں قابل توجہ تھیں اور ان دونوں باتوں نے وزیر اعظم لیاقت علی خان کا دل موہ لیا تھا۔ اول یہ کہ وہ (کھوڑو) لیاقت علی خان کے خطرناک ترین سیاسی حریف حسین شہید سہروردی کے خلاف تھا جبکہ پیر الٰہی بخش اس کے ساتھ خفیہ گٹھ جوڑ کر رہا تھا اور دوئم یہ کہ وہ سندھ میں روز افزوں ہاری تحریک کے خلاف تھا اور وہ آئندہ اس ''اشترا کی'' تحریک کو سیاسی بلیک میل کے لئے استعمال نہیں کرے گا۔ اگست 1949ء میں اس کی جانب سے سندھ کنونشن منعقد نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہاری کمیٹی نے اس کنونشن میں زور شور سے شرکت کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کھوڑو اپنے اصلی زمیندارانہ روپ میں باہر آ گیا تھا اور اب وہ زمینداری مفادات کے تحفظ کے لئے ''سندھ کے حقوق و مفادات'' کی علمبرداری ترک کرنے پر بھی آمادہ تھا اور یہ بات وزیر اعظم لیاقت علی خان کے لئے بہت دل پسند تھی۔ سندھی اور غیر سندھی دونوں ہی ''نسلوں'' کے زمینداروں کے نقطہ نگاہ سے ہاری تحریک واقعی ''خطرناک'' صورت اختیار کر رہی تھی۔

کھوڑو کے اس بیان کے دو تین دن بعد 7/مارچ کو دادو میں ہاریوں کی جو دو روزہ کانفرنس ہوئی اس میں ہاریوں کے 200 مندوبین نے جوش و خروش سے حصہ لیا۔ اس کانفرنس کا

افتتاح پنجاب کے ایک کسان لیڈر فیروز الدین منصور نے کیا تھا اور اس میں پاکستان کمیونسٹ پارٹی، پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن، فرنٹیئر کسان جرگہ، انجمن ترقی پسند مصنفین (کراچی) اور پاکستان سوویت کلچرل ایسوسی ایشن کے پیغامات پڑھ کر سنائے گئے۔ کانفرنس کا مطالبہ یہ تھا کہ جاگیرداری اور زمینداری نظام کو بلا معاوضہ منسوخ کیا جائے، نئے قانون کے تحت ہاریوں کو مستقل موروثی حق مزارعت دیا جائے۔ پنجاب وسندھ میں پبلک سیفٹی ایکٹ کو واپس لیا جائے، دولت مشترکہ اور اینگلو امریکی بلاک سے رشتہ منقطع کیا جائے اور موجودہ غیر نمائندہ صوبائی اسمبلی توڑ کر نئے انتخابات کرائے جائیں۔

اس کانفرنس سے قبل لاڑکانہ، دادو اور سندھ کے دوسرے علاقوں کے متعدد ہاری لیڈروں کو گرفتار کرلیا گیا تھا اور ان اخبارات سے ضمانتیں طلب کی گئی تھیں جو ہاریوں کے مطالبات کی حمایت کرتے تھے۔ روزنامہ ''ڈان'' کی اطلاع کے مطابق ان سخت اقدامات کا مقصد یہ تھا کہ سندھ اسمبلی میں نظام مزارعت کی اصلاح کے لئے بل پیش کئے جانے سے پہلے ہاری لیڈروں اور کارکنوں کے حوصلے پست کئے جائیں۔ اس میں سے بہت سی باتیں نکال دی گئی تھیں جو پیرالٰہی بخش کے عہد اقتدار میں تیار کردہ مسودہ میں شامل کی گئی تھیں۔[30] پاکستان ٹائمز کی رپورٹ یہ تھی کہ ہاری لیڈروں کی گرفتاری محض اس لئے ہوئی ہے کہ حکومت سندھ کو خدشہ ہے کہ وہ نظام مزارعت میں اصلاح کے لئے جو رجعت پسندانہ قانون اسمبلی میں پیش کرنے والی ہے اس کے خلاف ہاری ایجی ٹیشن کریں گے کیونکہ اس مجوزہ قانون سے ہاریوں کی توقعات پوری نہیں ہوتیں۔ ایم۔ اے کھوڑو اب اپنے جاگیردار مخالفین کے ساتھ مل گیا ہے اور بعض وزراء بھی وزیر اعلیٰ سے زیادہ اس کے فرمانبردار ہیں لہٰذا وہ پس پردہ ہاریوں کے خلاف اپنا اثر ورسوخ استعمال کررہا ہے۔[31]

چونکہ پیرالٰہی بخش نے دادو کانفرنس سے قبل ہاریوں کے حق میں بیانات دیئے تھے اس لئے کھوڑو نے اپنے سیاسی حریف پر کاری ضرب لگانے کے ''سنہری موقع'' سے فائدہ اٹھایا۔ 8/مارچ کو سندھ اسمبلی کا بجٹ سیشن شروع ہوا تو اس سے دوسرے دن 10/مارچ کو کھوڑو نے اپنی صوبائی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس بلایا جس میں پیرالٰہی بخش کو پانچ سال کے لئے مسلم لیگ سے خارج کر دیا گیا۔ کھوڑو نے اپنا یہ اقدام کر کے ایک تیر سے تین شکار کئے تھے۔ ایک شکار تو پیرالٰہی بخش ہی تھا جس نے اپریل 1948ء میں اس کی برطرفی پر سندھ کی وزارت اعلیٰ کا

عہدہ سنبھالا تھا اور پھر فروری 1949ء میں اپنی وزارت اعلیٰ سے علیحدگی کے بعد ''شہنشاہِ سندھ'' کے لئے دردسر بنا ہوا تھا۔ دوسرا شکار میر غلام علی تالپور تھا۔ اس نے جب پیر الٰہی بخش کا حشر دیکھا تو فوراً کھوڑو سے معافی مانگی اور یقین دلایا کہ وہ صوبہ لیگ کا فرمانبردار رہے گا۔ تیسرا شکار وزیر اعلیٰ یوسف ہارون تھا جسے اس اقدام سے مزید پتہ چل گیا تھا کہ سندھ کے ''بے تاج بادشاہ'' کے سامنے اس کے اقتدار کا چراغ زیادہ دیر نہیں جل سکے گا۔

8 ر مارچ کو اسمبلی کے سیشن کے پہلے دن لاڑکانہ اور دادو میں ہاری لیڈروں کی گرفتاری کے بارے میں قاضی مجتبیٰ کی تحریک التوا پر گرما گرم بحث ہوئی تو معلوم ہوا کہ کھوڑو نے صرف مسلم لیگ کے میدان میں اپنے جاگیردار حریفوں کو ہی ہزیمت نہیں دی تھی بلکہ اس نے سرکاری میدان میں بھی ہاری لیڈروں کو اپنے تیرستم کا نشانہ بنایا تھا۔ قاضی مجتبیٰ کا الزام یہ تھا کہ ہاری زعما مولوی نذیر حسین اور عبدالوحید سومرو کی پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتاری کی وجہ یہ تھی کہ گرفتار شدگان 20 رفروری کو لاڑکانہ میں اس جگہ جلسہ کرنا چاہتے تھے جہاں کھوڑو نے اسی دن جلسہ کرنے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ حکومت پاکستان نے کمیونسٹ اور سوشلسٹ تنظیموں کو خلاف قانون قرار نہیں دیا اس لئے ان کارکنوں کی گرفتاری کا کوئی جواز نہیں جن کا رجحان کمیونزم یا سوشلزم کی طرف ہے۔ وزیر داخلہ قاضی فضل اللہ کھوڑو کا ''خاص آدمی'' تھا اس لئے اس نے اپنے لیڈر پر عائد کردہ الزام کی پرزور تردید کی اور کہا کہ ان ہاری لیڈروں اور کارکنوں کی گرفتاریاں اس لئے عمل میں آئی ہیں کہ یہ لوگ ملک کے باہر سے غیر مسلم کمیونسٹوں سے ہدایات حاصل کرتے تھے، ملک کے اندر تخریبی کاروائیوں میں مصروف تھے اور ضلع لاڑکانہ کی خفیہ پولیس کے سپرنٹنڈنٹ کی دسمبر 1948ء میں پیش کردہ ایک رپورٹ کے مطابق انہوں نے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے خلاف ''حملہ کرنے کا منصوبہ'' بنایا ہوا تھا اور اس مقصد کے لئے یہ اسلحہ جمع کر رہے تھے۔ اس نے بتایا کہ ''ان ہاری لیڈروں نے کئی مواقع پر ہاریوں کو ترغیب دی تھی کہ وہ فصل میں سے زمینداروں کو کوئی حصہ نہ دیں۔ چنانچہ ہاریوں نے زمینداروں کو کچھ نہ دیا اور اس بنا پر حکومت سندھ کو مالی نقصان ہوا۔''[32]

11 ر مارچ کو وزیر اعلیٰ یوسف ہارون نے 61.32 لاکھ روپے کا خسارے کا بجٹ پیش کیا اور بتایا کہ اس کی حکومت نے جاگیرداری نظام ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس مقصد کے لئے

مسودۂ قانون تیار ہورہا ہے۔ جب یہ قانون نافذ ہوگا تو حکومت کو مطلوبہ مزید 18 سے لے کر 20 لاکھ روپے کی آمدنی ہوگی۔ اس بجٹ پر آٹھ دس دن کی عام بحث کے دوران حکومت سندھ کے چیف پارلیمانی سیکرٹری قاضی مجتبیٰ نے صوبائی حکومت کی کارگزاری پر سخت نکتہ چینی کی۔ اس نے کہا کہ صوبائی حکومت نے عوام کو شہری آزادیوں سے محروم کر رکھا ہے۔ ہاری لیڈروں کو ناجائز طور پر گرفتار کیا گیا ہے، بڑے زمینداروں نے سرکاری حکام کے ساتھ مل کر ڈیڑھ کروڑ روپے کی اس رقم کا بیشتر حصہ خورد برد کر دیا ہے جو مرکزی حکومت نے مہاجرین کی آبادکاری کے لئے دی تھی اور ہزاروں کاشت کار مہاجرین ایک تعلقہ سے دوسرے تعلقہ میں جا کر در بدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں کیونکہ بڑے زمیندار ان کی آبادکاری کے راستے میں حائل ہوتے ہیں۔ اس دوران ہاری کمیٹی کے صدر حیدر بخش جتوئی نے بھی اس جلسہ عام میں حکومت سندھ پر اسی قسم کے الزامات عائد کئے اور ملاؤں کے اس فتوے کی مذمت کی جس میں انہوں نے کہا تھا کہ اگر زمینداروں اور جاگیرداروں کو ان کی زمینوں سے محروم کیا گیا تو یہ امر اسلام کی روح کے منافی ہوگا۔ اس نے کہا کہ صوبائی اسمبلی میں جو مزارعت بل پیش کیا جا رہا ہے اس کا مقصد ہاریوں کی فلاح و بہبود نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد محض یہ ہے کہ ہاریوں کی اشک شوئی کر کے زمینداری نظام کو جوں کا توں برقرار رکھا جائے۔ [33]

کھوڑو کی مرکزی اور صوبائی اسمبلی کی رکنیت کی بحالی اور اس کا ہاریوں کے خلاف سخت گیر رویہ

ابھی سندھ کے اس طبقاتی مسئلہ پر اسمبلی کے اندر بحث جاری ہی تھی کہ 20/مارچ 1950ء کو سندھ چیف کورٹ کے ایک سندھی جج حسن علی آغا نے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ خصوصی ٹربیونل کی رپورٹ کے پیش نظر گورنر جنرل نے ایوب کھوڑو کے خلاف پروڈا کے تحت نااہلی کا جو حکم صادر کیا تھا وہ غیر آئینی تھا اس لئے کھوڑو بدستور مرکزی اور صوبائی اسمبلی کا رکن ہے۔ اس عدالتی فیصلہ سے سندھ کی سیاست میں بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کے حق میں ایک کیفیاتی تبدیلی آ گئی اور بے چارے یوسف ہارون کی وزارت پھر ڈانواں ڈول ہوگئی۔ لاہور کے روزنامہ نوائے وقت نے اس فیصلہ پر ''مسٹر کھوڑو کی فاتحانہ مراجعت'' کے زیر عنوان تبصرہ کیا۔ اس کا اداریہ یہ تھا کہ ''یہ حقیقت ہے کہ اس وقت چودھری خلیق الزماں مسٹر کھوڑو کی دائیں جیب میں ہیں

اور سندھ کے وزیر اعلیٰ مسٹر یوسف ہارون ان کی بائیں جیب میں۔ اگر آج کھوڑو فیصلہ کریں کہ انہیں خود وزیر اعلیٰ ہونا ہے تو وہ مسٹر ہارون کو کان سے پکڑ کر باہر نکال دیں...... مسٹر کھوڑو کی برطرفی کا فیصلہ قائداعظم کے حکم سے ہوا...... قائداعظم مرحوم کی موت کے بعد زمانہ بڑی تیزی سے بدلا اور مسٹر کھوڑو پہلے صوبہ لیگ اور پھر وزارت پر چھا گئے۔"[34]

کھوڑو اس فیصلے کے اگلے دن صوبائی اسمبلی کے سیشن میں شریک ہوا تو اسمبلی پر چھا گیا اور اسی دن لیگ اسمبلی پارٹی میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ کوئی پارلیمانی سیکرٹری اپنی تقریر میں حکومت پر نکتہ چینی نہیں کر سکے گا۔ اس نے 24 / مارچ کو اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے صوبائی حکومت کی مالیاتی پالیسی کی تائید کی اور پارلیمانی سیکرٹری قاضی مجتبیٰ کے اس موقف کی سخت مخالفت کی کہ سندھ میں بڑے زمینداروں پر زرعی ٹیکس لگائے جائیں۔ اس نے کہا کہ یہ تاثر غلط ہے کہ سندھ میں مزارع کو کم ادائیگی کی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سندھی ہاریوں کو پنجاب اور سرحد کے مزارعوں سے زیادہ ادائیگی کی جارہی ہے۔ قاضی مجتبیٰ اس تقریر کا جواب دینے کے لئے کھڑا ہوا تو وزیر اعلیٰ یوسف ہارون نے کہا کہ اگر قاضی مجتبیٰ حکومت پر نکتہ چینی کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے باعزت طریقہ کار یہ ہے کہ وہ پہلے پارلیمانی سیکرٹری کے عہدہ سے مستعفی ہو جائے۔ اس پر چند منٹ کے لئے قاضی مجتبیٰ اور یوسف ہارون کے درمیان تکرار ہوئی تو اول الذکر نے اپنے استعفیٰ کا اعلان کر دیا کیونکہ وہ حکومت پر تنقید کرنے کے حق سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس کے بعد قاضی مجتبیٰ نے اپنی تقریر میں وزیر داخلہ قاضی فضل اللہ پر سنگین الزامات عائد کئے اور کہا کہ صوبائی حکومت کی آمدنی میں کمی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بڑے زمینداروں اور سرکاری حکام نے سازش کر رکھی ہے اور وہ سرکاری مالیہ کی رقم آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ سرکاری حکام بڑے زمینداروں کے زیر کاشت رقبہ کی صحیح پیمائش نہیں کرتے اس لئے سرکاری آمدنی میں کمی ہو گئی ہے۔ جب قاضی مجتبیٰ نے لاڑکانہ کے ڈسٹرکٹ کلکٹر کے بارے میں کچھ کہنا چاہا تو ایوب کھوڑو غضبناک ہو کر کھڑا ہو گیا اور اس نے ایک پوائنٹ آف آرڈر کے ذریعے قاضی مجتبیٰ کو خاموش کروا دیا۔ اس طرح جب مزید چند دن ایوب کھوڑو صوبہ لیگ اور صوبائی وزارت کے علاوہ صوبائی اسمبلی پر بھی چھایا رہا تو 31 / مارچ کو نوائے وقت کی رپورٹ یہ تھی کہ مسٹر کھوڑو کے رکن اسمبلی بننے کے گیارہ روز بعد صوبہ میں سیاسی بحران پیدا ہو گیا ہے۔ یوسف ہارون سندھ کی وزارت اعلیٰ سے مستعفی ہو جائے گا۔

3 ؍اپریل کو کراچی میں سندھ کے سابق وزیر اعلیٰ پیر الٰہی بخش کے مکان پر صوبائی عوامی مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ اس اجلاس میں مہاجرین سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا اور اعلان کیا گیا کہ یہ صوبائی تنظیم حسین شہید سہروردی کی پاکستان عوامی لیگ سے الحاق کرے گی۔ اسی دن جب صوبائی اسمبلی میں مزارعت بل پیش ہوا تو ایوان سے باہر ہاریوں نے ایوان کے سامنے مظاہرہ کر کے مطالبہ کیا کہ سندھ اسمبلی کو توڑ دیا جائے کیونکہ یہ بڑے زمینداروں پر مشتمل ہے۔ تاہم ایوب کھوڑو نے ایوان میں اس بل پر بحث کے آغاز میں ہی ایک ترمیم پیش کر کے یہ کوشش کی کہ اس مجوزہ قانون کو کم از کم مزید ایک سال کے لئے معرض التوا میں ڈال دیا جائے۔ اس کی ترمیم یہ تھی کہ اس بل کی منظوری کے بعد اس کا اس وقت تک اطلاق نہ کیا جائے جب تک یہ اسمبلی ان قواعد کی منظوری نہ دے دے جن کے مطابق اس کا اطلاق ہوگا۔ مطلب یہ تھا کہ مطلوبہ قواعد کی ترتیب میں کئی ماہ لگیں گے۔ چونکہ اسمبلی کا اجلاس سال میں ایک ہی مرتبہ ہوتا ہے اس لئے آئندہ مارچ میں ان قواعد کی منظوری ہوگی اور پھر کہیں جا کر قانون مزارعت کے اطلاق کا سوال پیدا ہوگا۔ ایوب کھوڑو کی عوام دشمنی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ وہ قرون وسطیٰ کے جاگیردارانہ نظریات کا حامل تھا۔ وہ اس مزارعت بل کے بھی خلاف تھا جس میں روزنامہ ''ڈان'' بقول ہاریوں کو کوئی قابل ذکر رعایت نہیں دی گئی تھی۔ اس کے تحت ہاری کو زمیندار کا مستقل ''سرف'' (Serf) یعنی غلام بنا دیا گیا تھا کیونکہ اس میں اس مضمون کی بھی ایک دفعہ تھی کہ اگر کوئی مزارع اپنے زمیندار کے علاوہ کسی دوسرے زمیندار کی بھی زمین کاشت کرے گا تو اس کا حق مزارعت ختم ہو جائے گا۔ بالفاظ دیگر ہر زمیندار کو اپنے مزارعوں پر بلاشرکت غیرے تسلط حاصل ہوگا۔[35]

نومبر 1949ء سے قبل سندھ میں کھوڑو کی سیاسی قوت کا سرچشمہ اس کا یہ موقف تھا کہ سندھ میں سندھی عوام پر پنجابیوں اور مہاجروں کا غلبہ قائم نہ ہونے پائے اور صوبہ سندھ کو زیادہ سے زیادہ سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی خود مختاری حاصل ہو لیکن جب ممتاز دولتانہ کی وساطت سے اس کی وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خان سے صلح ہوگئی تو اسکی سیاسی قوت کا انحصار مرکزی حکومت اور سندھی جاگیرداروں پر تھا۔ وہ جاگیرداروں کے مفادات کے تحفظ کی خاطر ہی سندھ اور سندھی عوام کی خود مختاری کے مطالبہ سے دستبردار ہوا تھا۔ اب اس کے نزدیک اس کا طبقاتی مفاد اس کے علاقائی مفاد سے بالاتر تھا۔ چونکہ صوبائی اسمبلی میں اس کا تاخیری حربہ کامیاب

ہوا جبکہ وزیراعلیٰ یوسف ہارون نے اس کی ترمیم منظور کر لی اور اپریل کو اس ترمیم کے ساتھ نام نہاد قانون مزارعت منظور کر لیا گیا۔ اس بل کی منظوری پر کھوڑو کے معتمد نائب سید علی اکبر شاہ نے وزیراعلیٰ اور سپیکر کو مبارک باد دی اور اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ بعض لوگ ملک میں معاشرتی اصلاحات کا انتہا پسندانہ نظریہ رکھتے ہیں۔ اس نے کہا کہ اسلامی سوشلزم درمیانہ راستہ ہے اور سارے صحیح الخیال ممالک کو یہی راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

بے زمین ہاریوں کے خلاف کھوڑو کی ترمیم کی منظوری کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وزیر مال میر غلام علی تالپور سمیت اسمبلی کے سارے جاگیردار ارکان اس کے حق میں تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ پیرالٰہی بخش کی جانب سے صوبہ میں عوامی مسلم لیگ کے قیام کے نتیجے میں کھوڑو۔ لیاقت گٹھ جوڑ اور بھی مضبوط ہو گیا تھا لہٰذا کٹھ پتلی وزیراعلیٰ یوسف ہارون کو کھوڑو کی حکم عدولی کی مزید جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ ان دنوں ہاری تحریک زوروں پر تھی۔ اگر ایسے موقع پر قانون مزارعت کا اطلاق کیا جاتا تو ہاریوں میں یہ تاثر پیدا ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی تحریک میں ذرا سی شدت پیدا کر کے زمینداروں سے کچھ اور بھی رعایتیں لے سکتے ہیں اور اس امر کا بھی امکان تھا کہ فصل کی تقسیم کے موقع پر جھگڑے ہوتے۔ کھوڑو کی پہلے منافقانہ اور پھر کھلم کھلا عوام دشمن سیاست کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ سندھ میں تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ سیاسی لحاظ سے بہت کمزور اور غیر منظم تھا اور ہاریوں کی تحریک ابھی ابتدائی مراحل میں ہی تھی۔

تاہم ہاری کمیٹی کی مجلس عاملہ نے صوبہ کے 30 لاکھ ہاریوں کی جانب سے 6/اپریل کو ایک قرارداد میں سندھ میں قانون مزارعت کی مذمت کرتے ہوئے اسے رجعت پسندانہ قرار دیا اور یہ رائے ظاہر کی کہ اس قانون کا مقصد محض یہ ہے کہ زمینداروں اور جاگیرداروں کی طرف سے ہاریوں کے استحصال کو دوام حاصل ہو۔ اس قانون کے تحت ہاریوں کے موروثی حقوق کے مطالبہ کو مسترد کر دیا گیا ہے اور ان کے مستقل حق مزارعت کو ایسی کئی دفعات سے مقید کر دیا گیا ہے کہ اس سے انکو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ جو ہاری اس قانون سے متاثر ہوں گے ان کا صوبہ میں تناسب 6 فیصد سے زیادہ نہیں ہوگا اور یہ تھوڑے سے ہاری بھی زمینداروں کے رحم و کرم پر ہوں گے۔

مرکزی حکومت اور مرکزی مسلم لیگ کی طرف سے حکومت سندھ کی مظلوم ہاریوں سے اس دغابازی کا کوئی نوٹس نہ لیا گیا۔ اس کی ایک وجہ تو ان دونوں کی رجعت پسندانہ سیاست میں

مضمر تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ نہ صرف چودھری خلیق الزماں نے بلکہ یو۔ پی کے بہت سے دوسرے بااثر ''نقلی مہاجرین'' نے صوبہ میں بڑے بڑے متروکہ قطعات اراضی حاصل کر لئے تھے اور اس طرح ان کے مفادات مقامی سندھی زمینداروں کے مفادات سے وابستہ ہو گئے تھے۔ اس صورتحال کے پیش نظر 8 راپریل کو بدین میں سندھی ہاریوں اور غریب مہاجروں کا مشترکہ اجلاس ہوا جس میں اس امر پر احتجاج کیا گیا کہ ضلع میں ہاریوں اور غریب مہاجروں کے مفادات کو قربان کر کے 2500 ایکڑ ''منتخب'' رقبہ اراضی کرنل خورشید عالم اور بھارت سے آئے ہوئے دوسرے زمینداروں کو دے دیا گیا ہے۔[36] نواب زادہ لیاقت علی خان کی حکومت کی اس قسم کی غلط بخشیاں اس کی ایسی پالیسی کا نتیجہ تھیں جیسی کی اٹھارھویں صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال و بہار میں اختیار کی تھی۔ اس نے سندھ اور پنجاب میں نئی زمینداریاں اس امید میں پیدا کی تھیں کہ ان کے مالکان بالکل اسی طرح اس کی حکومت کے شکر گزار اور وفادار رہیں گے جیسے کہ اس کے اپنے آباؤ اجداد برطانوی سامراج کے شکر گزار اور وفادار رہے تھے۔

13 راپریل کو مرکزی لیگ اسمبلی پارٹی کے چیف وھپ اور نائب وزیر خارجہ ڈاکٹر محمود حسین نے مرکزی اسمبلی میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء میں ترمیم کرنے کے لئے ایک بل پیش کیا جس کا مقصد سندھ اسمبلی کی مسلم نشستوں میں اضافہ کرنا تھا۔ اس بل میں کہا گیا تھا کہ چونکہ مستقبل قریب میں سندھ اسمبلی کے عام انتخابات کا امکان نہیں اس لئے مہاجرین کو نمائندگی دینے کے لئے صوبائی اسمبلی کی مسلم نشستوں میں سات ارکان کا اضافہ کیا جائے گا۔ یہ اضافہ دستور ساز اسمبلی ایک تحریک کے ذریعے کرے گی اور اس طرح صوبائی اسمبلی کے ارکان کی کل تعداد 58 سے بڑھ کر 65 ہو جائے گی اور مسلم نشستیں 33 سے بڑھ کر 40 ہو جائیں گی۔ میاں افتخار الدین، سردار شوکت حیات خان، حمید الحق چودھری، سردار اسد اللہ جان، پروفیسر راج کمار چکرورتی اور سریش چندر چٹو پادھیا نے اس غیر جمہوری بل کی مخالفت کی مگر ایوب کھوڑو اور اس کے حواری خاموش رہے۔ بالآخر 14 راپریل کو اس بل کی منظوری سے تھوڑی دیر قبل ایوب کھوڑو نے ایک ترمیم پیش کی کہ مجوزہ اضافی سات نشستیں ان لوگوں میں سے پر کی جائیں جو صوبہ سندھ میں یکم اکتوبر 1949ء سے پہلے آ کر آباد ہوئے تھے۔ حکومت نے یہ ترمیم فوراً منظور کر لی اور پھر اس بل کو کثرت رائے سے منظوری حاصل ہو گئی اور اس طرح کھوڑو اور لیاقت علی خان کے درمیان گٹھ جوڑ

مضبوط سے مضبوط تر ہو گیا۔ اب کھوڑو کو مہاجروں کے غلبہ کا خطرہ لاحق نہیں رہا تھا۔ تاہم اس گٹھ جوڑ سے غریب کاشت کار مہاجرین کو کوئی فائدہ نہ پہنچا۔

سندھ کے مزدور لیڈر قاضی مجتبیٰ کے 15 / اپریل کے بیان کے مطابق ''سندھ کے مقامی بڑے زمیندار لاڑکانہ، دادو، گڑھی یاسین اور دوسرے علاقوں میں غریب مہاجر کاشت کاروں کی آبادکاری نہیں ہونے دیتے۔ وہ مہاجرین کو دہشت زدہ کر کے متروکہ اراضی سے بھگا دیتے ہیں اور متروکہ مکانات کو منہدم کر دیتے ہیں تاکہ کوئی مہاجران کے علاقوں میں آباد نہ ہونے پائے۔ قاضی مجتبیٰ نے کہا کہ سندھ کے بڑے زمینداروں کی جانب سے غریب مہاجرین کی آباد کاری میں رکاوٹیں حائل کرنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان کے خیال میں غریب مہاجرین اور ہاریوں کا اتحاد جاگیردارانہ غلبہ کے لئے خطرہ کا باعث ہو گا۔ چونکہ مہاجرین سیاسی طور پر زیادہ باشعور ہیں اس لئے زمیندار ڈرتے ہیں کہ وہ ہاریوں کو بھی بولنا سکھا دیں گے۔''

قدرتی طور پر سندھ کے ''آمر مطلق'' ایوب کھوڑو کو قاضی مجتبیٰ کا یہ بیان پسند نہ آیا۔ چنانچہ 16 / اپریل کو اسے مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کی رکنیت سے معطل کر دیا گیا۔ الزام یہ تھا کہ قاضی مجتبیٰ نے صوبائی اسمبلی کے گزشتہ سیشن کے دوران وزیر داخلہ قاضی فضل اللہ پر جو سنگین الزامات لگائے تھے اس نے ان کا کوئی ثبوت مہیا نہیں کیا تھا۔ دوسرے دن قاضی مجتبیٰ نے ایک بیان میں اس الزام کی تردید کی اور یہ موقف پیش کیا کہ اس کے خلاف یہ کارروائی محض اس لئے کی گئی ہے کہ اس نے لاکھوں غریب ہاریوں کی طرف سے آواز اٹھائی تھی۔ وزیر اعلیٰ یوسف ہارون نے بالآخر وڈیروں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں۔

قاضی مجتبیٰ کے اس بیان کی تائید 22 / اپریل کو ہوئی جبکہ ضلع دادو کے مہر تعلقہ کی ہاری کمیٹی کے سیکرٹری اللہ رکھیو نے بذریعہ تار حکومت سندھ کو مطلع کیا کہ اس تعلقہ میں ہندو تقریباً 40 ہزار ایکڑ زمین چھوڑ کر گئے تھے۔ مگر یہ زمین ہاریوں اور غریب مہاجرین کو نہیں دی گئی۔ یہاں صرف 400 مہاجر خاندان آباد کئے گئے ہیں۔ بقیہ زمین بڑے زمینداروں اور معدودے چند بااثر ہاریوں نے ہتھیا لی ہے۔ نتیجتاً بہت سے ہاریوں کے پاس کوئی کام نہیں ہے اور وہ فاقہ کشی سے مر رہے ہیں۔ لیکن مرکزی اور صوبائی ایوان ہائے اقتدار اتنے اونچے تھے کہ وہاں تک ایک تعلقہ کی ہاری کمیٹی کے سیکرٹری کی نحیف آواز نہ پہنچ سکتی تھی اور نہ پہنچی۔

لیاقت۔کھوڑو گٹھ جوڑ کے بعد ہارون وزارت کا خاتمہ

اور کھوڑو گروپ کے اقتدار کی بحالی

28 ؍اپریل کو ایوب کھوڑو اور وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خان کی ملاقات ہوئی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ یوسف ہارون کی جگہ کھوڑو کا معتمد خاص قاضی فضل اللہ سندھ کا وزیر اعلیٰ ہوگا اور لیگ اسمبلی پارٹی 8 ؍مئی کو ایک خصوصی اجلاس میں اس نئے قائد کا انتخاب کرے گی۔ اگرچہ یوسف ہارون کی علیحدگی کے بارے میں اخباری قیاس آرائیاں 20 ؍مارچ 1950ء کے بعد سے ہی شروع ہوگئی تھیں جبکہ سندھ چیف کورٹ کے ایک جج نے کھوڑو کو پروڈا کے تحت کی گئی کارروائی سے بری کر دیا تھا لیکن اس موقع پر لیاقت علی خان اور ایوب کھوڑو کے درمیان اس فیصلہ کی فوری وجہ یہ تھی کہ اول الذکر 2 ؍مئی کو دواڑھائی ماہ کے لئے امریکہ اور کینیڈا کے دورے پر جا رہا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی غیر حاضری میں سندھ میں مزید کوئی سیاسی بحران پیدا ہو۔ چنانچہ اسی ملاقات میں یہ بھی فیصلہ ہوا کہ کھوڑو بھی بغرض سیر و تفریح دو ایک ماہ کے لئے ملک سے باہر چلا جائے گا اور پھر اگست میں وہ سندھ کے مستقل وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالے گا۔ نواب زادہ لیاقت علی خان نے قبل ازیں پنجاب میں جاگیردارانہ جوڑ توڑ کی سیاست کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اب سندھ میں کھوڑو کے ساتھ اس کا گٹھ جوڑ اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھا۔ بے چارے یوسف ہارون کی حیثیت جاگیردارانہ سیاسی بساط پر محض ایک مہرے کی تھی۔ چنانچہ یکم مئی کو ایسوسی ایٹڈ پریس نے یہ خبر دی کہ چونکہ یوسف ہارون کو آسٹریلیا میں پاکستانی ہائی کمشنر مقرر کیا گیا ہے اس لئے وہ 8 ؍مئی کے لیگ اسمبلی پارٹی کے اجلاس میں وزارت اعلیٰ کے عہدہ سے استعفیٰ دے دے گا۔

اس خبر پر 3 ؍مئی کو نوائے وقت نے ''طاقت ہی طاقت ہے'' کے زیر عنوان یہ ادارتی تبصرہ کیا کہ ''لیجئے صاحب مسٹر یوسف ہارون بھی بالآخر گئے۔ خبر یہ ہے کہ انہیں آسٹریلیا میں پاکستان کا ہائی کمشنر بنا دیا جائے گا اور وزارت اعلیٰ کی گدی پر مسٹر کھوڑو کے دست راست قاضی فضل اللہ بٹھا دیئے جائیں گے۔ مسٹر کھوڑو نے یہ کہا ہے کہ ابھی میں یہ عہدہ نہیں سنبھال سکتا۔ چار ماہ کے لئے تو میں پاکستان سے باہر جا رہا ہوں (بغرض سیر و تفریح) البتہ اگست میں اس پر غور کروں گا کہ وزیر اعلیٰ بن جاؤں یا نہیں۔ گزشتہ کئی ماہ سے وزارت دراصل کھوڑو صاحب ہی کی تھی۔

مسٹر ہارون ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھے۔ اب قاضی فضل اللہ ان کے ''خلیفہ'' ہونگے اور وہ بھی ''بلافصل''۔ مسٹر کھوڑو کے جب مزاج عالی میں آئے گا خود اس مسند پر بیٹھ جائیں گے۔ ''طاقت ہی طاقت ہے۔'' مسٹر کھوڑو نے اس ضرب المثل کو سچ ثابت کر دکھایا ہے۔ انہیں وزارت سے برخاست کیا گیا۔ دو سال کے لئے جیل بھیجا گیا۔ ممبری سے علیحدہ کیا گیا مگر اس سخت جان اور شاطر سیاست دان نے اپنے حریفوں کے دانت کھٹے کر دیئے اور اب وہ اس کے آستان پر سجدہ ریز ہیں۔ مقدموں سے بریت کے بعد کھوڑو صاحب اسمبلی میں بھی جا پہنچے۔ حکومت چاہتی تو ان کے خلاف اپیل بھی کر سکتی تھی اور عام حالات میں اسے یہی کرنا چاہیے تھا مگر ''طاقت ہی طاقت ہے'' کے مطابق مسٹر کھوڑو سے ٹکر لینے کے بجائے اس سے سمجھوتہ بہتر سمجھا گیا۔ اب مسٹر ہارون کو بھی کان سے پکڑ کر باہر نکال دیں گے۔ مسٹر کھوڑو کے سیاسی مخالفوں کو بھی ماننا پڑے گا کہ یہ شخص بڑے دل گردے کا مالک ہے۔''[37]

3 رمئی کو وزارت امور خارجہ نے اعلان کر دیا کہ یوسف ہارون کا آسٹریلیا میں بطور ہائی کمشنر تقرر کیا گیا ہے۔ اس اعلان سے کھوڑو کے سیاسی دبدبے میں اس قدر اضافہ ہوا کہ بے چارے قاضی مجتبیٰ پر دہشت طاری ہوگئی اور اس نے 6 رمئی کو قاضی فضل اللہ کے نام ایک خط میں اپنے الزامات واپس لے لئے اور اسے یقین دلایا کہ وہ (قاضی مجتبیٰ) 8 رمئی کو لیگ اسمبلی پارٹی کے اجلاس میں اس (قاضی فضل اللہ) کی مکمل حمایت کرے گا۔ قاضی مجتبیٰ نے یہ خط غالباً اس خوف کے تحت لکھا تھا کہ اگر اس نے فوراً معافی نہ مانگی تو کھوڑو گروپ کا جاگیردار طبقہ اس کی چمڑی ادھیڑ دے گا۔ اس نے یہ خط لکھنے سے پہلے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین اور صوبائی گورنر شیخ دین محمد سے بھی ملاقاتیں کر کے ''جان کی امان'' مانگی تھی۔ اب بظاہر اسے اپنی جان بے زمین ہاریوں کے مفاد سے زیادہ عزیز تھی۔ لہٰذا اسکی توبہ قبول ہوگئی اور 8 رمئی کو وزیر اعلیٰ یوسف ہارون نے ایسوسی ایٹڈ پریس کو بتایا کہ قاضی مجتبیٰ کو لیگ اسمبلی پارٹی کی رکنیت سے معطل کرنے کا جو فیصلہ کیا گیا تھا وہ واپس لے لیا گیا ہے کیونکہ اس نے یقین دلایا ہے کہ وہ آئندہ پارٹی کے نظم وضبط کا پابند رہے گا۔

باب:11

کھوڑو۔لیاقت گٹھ جوڑ اور فضل اللہ وزارت

قاضی فضل اللہ وزارت کا قیام، تنسیخ جاگیرداری قانون کا التوا اور ہاری تحریک کو کچلنے کی کوششیں

8رمئی 1950ء کی صبح کو لیگ اسمبلی پارٹی کا اجلاس ہوا جس میں پہلے ایوب کھوڑو کو پارٹی کا قائد چنا گیا مگر جب اس نے یہ ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کردیا تو قاضی فضل اللہ کا متفقہ طور پر انتخاب ہوا۔ اس اجلاس کے فوراً بعد یوسف ہارون نے صوبائی گورنر کو اپنی وزارت کا استعفیٰ پیش کردیا اور اسی وقت قاضی کی نئی کابینہ نے حلف اٹھالیا۔ قیام پاکستان کے بعد دو سال آٹھ ماہ کے عرصے میں سندھ کی یہ چھٹی وزارت تھی۔ اس کے ارکان میں محکموں کی تقسیم اس طرح تھی:

1۔قاضی فضل اللہ = ہوم اینڈ لیگل ڈیپارٹمنٹ، پولیٹیکل سروسز، جنرل ایڈمنسٹریشن اور فنانس۔

2۔میر غلام علی تالپور = ریونیو اینڈ لوکل سیلف گورنمنٹ۔

3۔سید محمد میران شاہ = بحالیات اور تعمیرات عامہ۔

4۔آغا غلام نبی پٹھان = تعلیم، صحت، زراعت، صنعت، محنت اور خوراک

روزنامہ ڈان کی رپورٹ کے مطابق ''لیگ اسمبلی پارٹی کے جس اجلاس میں قاضی فضل اللہ کا انتخاب ہوا تھا اس میں جاگیرداری کی تنسیخ کے مسئلہ پر بحث کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی کیونکہ ایوب کھوڑو کا خیال یہ تھا کہ نئی وزارت کو اس سلسلے میں اپنی پالیسی وضع کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔ سندھ اسمبلی کا اجلاس غیر معین عرصے کے لئے ملتوی نہیں کیا گیا تھا کیونکہ خیال یہ تھا کہ

جاگیرداری کے بارے میں کوئی قانون سازی ہوگی مگر اب نئی وزارت کی تحریک پر یہ اجلاس غیر معین عرصے کے لئے ملتوی ہو جانے کا امکان ہے۔ قاضی فضل اللہ نے حلف وفاداری کی تقریب کے بعد یہ اعلان کیا کہ ''میں نے خیر سگالی کے اظہار کے طور پر ہاری زعما قادر بخش اور حیدر بخش جتوئی کی سندھ سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتاری کے لئے جاری کردہ حکم واپس لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ جہاں تک مہاجرین کی آبادکاری کے کام کا تعلق ہے، میری حکومت انسان دوستی کے اس کام کو سندھ پراونشل مسلم لیگ کی پالیسی کے مطابق پایۂ تکمیل تک پہنچائے گی۔ ڈسٹرکٹ ایڈمنسٹریشن پاکستان کا ''فولادی ڈھانچہ'' ہے لہٰذا اسے مزید مضبوط بنایا جائے گا۔ سندھ، حکومت پاکستان سے بھرپور تعاون کریگا کیونکہ صرف اسی طرح یہ صوبہ ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن ہوسکتا ہے۔''[1]

گویا اب ایوب کھوڑو اور اس کے کٹھ پتلی وزیر اعلیٰ فضل اللہ کے نزدیک صوبائی خودمختاری خطرے میں نہیں تھی۔ انہیں صوبائی امور میں مرکزی حکومت کی مداخلت پر بھی کوئی اعتراض نہیں تھا اور وہ مرکزی حکومت سے بھرپور تعاون کرنے پر آمادہ تھے۔ جواباً مرکزی حکومت کو بھی اب جاگیرداری نظام کی فوری تنسیخ پر کوئی اصرار نہیں تھا بلکہ وہ اس صوبہ میں نئے جاگیردار اور زمیندار پیدا کرنے کی متمنی تھی۔ گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین 12 رفروری 1950ء کو دریائے سندھ پر کوٹری بیراج کا سنگ بنیاد رکھ چکا تھا۔ اس بیراج پر خرچ کا تخمینہ 5 کروڑ روپے تھا اور اندازہ یہ تھا کہ اس سے 2750000 ایکڑ اراضی سیراب ہوگی اور سالانہ 107 ملین یونٹ بجلی پیدا ہوگی۔ اس موقع پر گورنر جنرل نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ اس بیراج کی ''نئی زمین'' پر مہاجرین کی آبادکاری سے نہ صرف مہاجرین کا مسئلہ حل ہوگا بلکہ یہاں نئی کاریگری اور نئے پیشوں کا گراں قدر اضافہ ہوگا۔[2]

لاہور کے روزنامہ پاکستان ٹائمز کا سندھ میں آئے دن کے وزارتی ردوبدل پر تبصرہ یہ تھا کہ ''سندھ میں وزارتی ردوبدل خالصتاً موقع پرستانہ مقاصد کے تحت ہوتا ہے۔ وزارتوں کی خرید و فروخت بالکل اسی طرح ہوتی ہے جیسے بلیک مارکیٹ میں اشیائے صرف بکتی ہیں اور کابینہ اس طرح توڑی اور بنائی جاتی ہے جیسے سٹاک ایکسچینج میں سودے ہوتے ہیں......... وہاں سرکاری اہلکاروں کی تقرریاں، ترقیاں اور تنزلیاں اس بنا پر ہوتی ہیں کہ انہوں نے اعلیٰ مقامات کے لوگوں کے لئے کیا کیا ہے یا کیا نہیں کیا ہے۔ ہاری لیڈروں کو گرفتار، نظر بند اور قید، مختلف دھڑوں کے سربراہوں کی مصلحتوں کے پیش نظر کیا جاتا ہے۔ سرکاری سرمایہ کو مال غنیمت تصور کر

کے اسے آزادانہ دوستوں اور حواریوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔غرضیکہ کوئی ایسی اخلاقی قدر نہیں ہے جس کا اس صوبہ کی سیاست میں خاتمہ نہیں کیا گیا ہے۔"[3] تاہم ایوب کھوڑو اور اس کے کٹھ پتلی وزیر اعلیٰ قاضی فضل اللہ کی سیاسی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ سندھ کے درمیانہ طبقہ کی حمایت کو برقرار رکھنے کے لئے سندھی شاونزم کو بھی کسی نہ کسی حد تک زندہ رکھیں۔کھوڑو یہ تاثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ اس نے محض حصول اقتدار کے لئے اور جاگیردار طبقہ کے مفادات کے لئے سندھ اور سندھی عوام کے "حقوق ومفادات" کو واقعی نظر انداز کر دیا ہے۔ چنانچہ 14 رمئی کو سندھ یونیورسٹی سنڈیکیٹ کے اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ کراچی میں انجمن ترقیٔ اردو کی جانب سے قائم کردہ اردو کالج کا سندھ یونیورسٹی کے ساتھ الحاق نہیں ہوگا۔اس اجلاس میں پیرزادہ عبدالستار، آغا غلام نبی پٹھان، محمد ہاشم گزدر، ڈاکٹر اے۔ایم۔شیخ، پروفیسر جلیانی، کیپٹن اے۔ٹی۔شیخ، حسن علی عبدالرحمان اور اے۔ایل۔شیخ نے شرکت کی تھی اور صدارت کے فرائض وائس چانسلر اے۔بی۔ اے حلیم نے ادا کئے تھے۔اس فیصلہ پر روزنامہ ڈان نے سخت نکتہ چینی کی اور لکھا کہ "کوئی تعلیمی ادارہ اس سے زیادہ احمقانہ علاقہ پرستی کا مظاہرہ نہیں کرسکتا" لیکن حکومت سندھ کے محکمہ تعلیم نے اس تنقید کا کوئی نوٹس نہ لیا اور اس کے ایک افسر نے انکشاف کیا کہ سندھ یونیورسٹی اکتوبر 1950ء تک حیدرآباد منتقل کر دی جائے گی۔

14 رمئی کو ایوب کھوڑو کی زیر صدارت سندھ مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ کا اجلاس ہوا جس کے بعد یہ اعلان کیا گیا کہ "دستور ساز اسمبلی نے حال ہی میں سندھ اسمبلی میں جن سات مہاجر نشستوں کا اضافہ کیا ہے انہیں پورا کرنے کے لئے صوبائی پارلیمانی بورڈ کو درخواستیں بھیجی جائیں۔صوبائی بورڈ ان درخواستوں پر جو فیصلہ کرے گا اس کے خلاف مرکزی پارلیمانی بورڈ کے روبرو اپیل کی جاسکے گی۔" سندھ پارلیمانی بورڈ کا یہ فیصلہ پاکستان مسلم لیگ کے مرکزی بورڈ کے سیکرٹری سید خلیل الرحمان کے 23 راپریل کے اس بیان کے منافی تھا کہ "سندھ اسمبلی کی سات مہاجر نشستوں کے امیدوار اپنی درخواستیں 31 رمئی تک پاکستان مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سیکرٹری سید شمس الحسن کو ارسال کریں۔ہر درخواست دہندہ کے لئے لازمی ہوگا کہ وہ 500 روپے کی رقم بھی بطور زرضمانت جمع کرائے۔"[4] کھوڑو نے 2 رمئی کو مرکزی پارلیمانی بورڈ کے اس اعلان پر احتجاج کیا تھا اور یہ موقف اختیار کیا تھا کہ "مسلم لیگ کے آئین کے تحت مرکزی پارلیمانی بورڈ صوبائی

انتخابات میں مداخلت کرنے کا مجاز نہیں۔'' 14 رمئی کے بعد صوبہ لیگ اور مرکزی لیگ کے درمیان مزید چند دن تک کچھ خط وکتابت اور اخباری بحث ہوئی جس کے دوران 19 رمئی کو صوبائی اسمبلی کا اجلاس غیر معین عرصہ کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔ اس التوا کا مطلب یہ تھا کہ یوسف ہارون کی حکومت نے جاگیرداری کی تنسیخ کے لئے جو قانون تجویز کر رکھا تھا وہ کھٹائی میں پڑ گیا اور قانون مزارعت کے قواعد کی منظوری کا مسئلہ بھی ملتوی ہو گیا۔ صوبائی گورنر نے اسی دن اس قانون کی منظوری دی تھی مگر قواعد کی منظوری کے بغیر اس کا اطلاق نہیں ہوسکتا تھا۔

23 رمئی کو سندھ کے وزیر مال میر غلام علی تالپور نے جاگیرداری بل کے مسودے کے وجود سے ہی انکار کر دیا کہ ایسا بل کبھی بھی ہمارے ذہن میں نہیں تھا۔ جب اخبار نویسوں نے اس کے اس بیان پر حیرت زدہ ہو کر اسے یاد دلایا کہ ابھی کچھ عرصہ پیشتر یوسف ہارون نے اسمبلی میں یقین دلایا تھا کہ جاگیرداری کی تنسیخ کا بل تیار کیا جائے گا۔ اس پر وزیر مال نے جواب دیا کہ ''میں ہارون نہیں ہوں کہ جاگیرداری کی تنسیخ کے بارے میں لمبے چوڑے بیان دیتا پھروں۔''[5]
میر غلام علی تالپور کے اس انٹرویو کا مطلب یہ تھا کہ جاگیرداری کی تنسیخ کے بل کو سندھی شاونزم کے گڑھے میں پھینک دیا گیا تھا جبکہ صوبائی اسمبلی کے غیر معین عرصے کے لئے التوا نے نام نہاد قانون مزارعت کو وقتی طور پر دفن کر دیا تھا۔ یہ سندھ کے پسماندہ وغریب عوام کی انتہائی بدنصیبی تھی کہ انکی سیاست کی باگ ڈور ایسے طبقہ کے ہاتھوں میں تھی جس کے نزدیک کسی بھی اخلاقی قدر کی کوئی قدرو قیمت نہیں تھی۔ سندھی میروں، پیروں اور وڈیروں کی لغت میں عدل، انصاف، جمہوریت، اخلاق اور اصول جیسے الفاظ موجود ہی نہیں تھے لیکن وہ بدمعاشی، بے غیرتی اور ابن الوقتی کے فن میں بڑے ماہر تھے۔ ان کی خوش نصیبی یہ تھی کہ اس وقت تک نہ تو تقریباً 30 لاکھ غریب ہاریوں کا طبقہ اور نہ ہی مٹھی بھر درمیانہ طبقہ سیاسی قوت کی حیثیت سے ابھرا تھا۔ چونکہ سندھ میں طبقاتی کشمکش ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں ہی تھی اس لئے وہاں کا جاگیردار طبقہ بادی النظر میں بڑا طاقتور تھا اور لاہور کے اخبار نوائے وقت کو اس طبقہ کا سرغنہ ایوب کھوڑو ''بڑے دل گردے کا مالک'' دکھائی دیتا تھا۔ سندھی عوام کی پسماندگی اور مظلومیت کی حد یہ تھی کہ 1950ء میں بھی مملکت خداداد پاکستان میں انہیں نہ صرف جاگیرداروں کے متعدد ''ابواب'' اور اپنی بہو بیٹیوں کی عزت وآبرو کا ''نذرانہ'' پیش کرنا پڑتا تھا بلکہ وہ سرکاری حکام کے لئے ''رسائی'' کا بندوبست کرنے پر بھی مجبور تھے۔

نوائے وقت کی ایک رپورٹ کے مطابق حکومت سندھ کے محکمہ انسداد رشوت ستانی کے ایک انگریز افسر مسٹر بڈ(Budd) نے اپنی ایک رپورٹ میں سفارش کی ہے کہ صوبہ میں سرکاری افسروں کے لئے رسائی کی رسم کی ممانعت کر دی جائے۔ ''رسائی یہ ہے کہ سرکاری افسر جس وقت بھی دورے پر جاتے ہیں تو اپنے ماتحتوں سے خوراک اور'' دوسری اشیاء'' مفت حاصل کرتے ہیں۔ افسروں کو دودھ، مرغیاں اور انڈے مہیا کئے جاتے ہیں۔ بعض مقامات پر تو ان افسران کے لئے پچاس، پچاس میل سے برف لائی جاتی ہے...... سندھ اسمبلی میں رسائی کے خلاف وقتاً فوقتاً آواز بلند ہوتی رہی مگر عملاً یہ کبھی بند نہیں ہوئی۔ محکمہ مال میں یہ ایک کھلا راز ہے کہ تعلقہ کے رجسٹروں میں رسائی کا باقاعدہ حساب رکھا جاتا ہے۔ یہاں افسر ماہانہ اپنا حصہ وصول کرتے ہیں۔ پٹے دار محکمہ مال کا سب سے ادنیٰ ملازم ہوتا ہے۔ وہ ''زمیندار'' سے فی ایکڑ کے حساب سے حصہ لیتا ہے اور جب افسر اس کے حلقے میں کیمپ لگاتا ہے تو اس میں سے اس افسر کو باقاعدہ رسائی دیتا ہے۔ رسائی اخراجات بعض مرتبہ ہزاروں تک پہنچ جاتے ہیں۔''[6] سندھ کے گورنر شیخ دین محمد نے اس صورت حال کے پیش نظر 30 رمئی کو ڈسٹرکٹ کلکٹروں کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے ان سے ''اپیل'' کی تھی کہ وہ ''رسائی سسٹم'' بند کریں۔ اس نے کہا تھا کہ'' جب میں صوبہ کے دورہ پر جاؤں تو میرے لئے بھی ''رسائی فنڈ'' جمع نہ کیا جائے۔'' صوبائی کابینہ گورنر کی اس ''اپیل'' سے ایک دن قبل صوبہ میں رسائی کی رسم کو''منسوخ'' کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ کابینہ کے اس فیصلے کی نوعیت یہ تھی کہ ''رشوت ستانی کے اس طریقے کو ختم کرنے کے لئے عوام کی عقل سلیم سے اپیل کی جائے۔'' سندھ کے جاگیرداروں اور سرکاری حکام کی اس قسم کی بدکرداریوں اور بدعنوانیوں کے خلاف بے زمین ہاریوں کی جدوجہد کی ابتداء 40-1930ء میں شروع ہوئی تھی مگر 1947ء تک اس میں کوئی نمایاں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ تقریباً 90 فیصد قابل کاشت رقبہ پر چھ سات ہزار جاگیرداروں اور زمینداروں کا قبضہ تھا اور وہ صوبہ کی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی زندگی پر پوری طرح چھائے ہوئے تھے۔ چونکہ ہاریوں کی آبادی نہایت غیر مجتمع تھی، صوبہ کے بیشتر علاقوں میں پنجاب کی طرح کے گاؤں بھی نہیں تھے اور ذرائع آمدورفت بھی مفقود تھے اس لئے انہیں طبقاتی بنیادوں پر منظم و متحرک کرنے کا کام جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ تاہم سندھ ہاری کمیٹی نے حیدر بخش جتوئی کی زیر قیادت 50-1949ء میں اس حد تک

کامیابی حاصل کی کہ اس نے لاڑکانہ، دادو اور بعض دوسرے اضلاع میں ہاریوں کی کانفرنسیں
منعقد کیں جن میں ہزاروں ہاریوں نے شرکت کر کے اپنے حقوق کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے اس
مقصد کے لئے ہاری کمیٹی کے زیر اہتمام کراچی، حیدر آباد اور بعض دوسرے شہروں میں مظاہرے
بھی کئے اور یہ انہی جلسوں اور مظاہروں کا نتیجہ تھا کہ جاگیرداروں کی سندھ اسمبلی مارچ 1950ء
میں نام نہاد قانون مزارعت منظور کرنے پر مجبور ہوئی تھی لیکن ہاری اس قانون سے مطمئن نہیں تھے
کیونکہ حیدر بخش جتوئی کے بقول اس کا مقصد محض یہ تھا کہ ہاریوں کی اشک شوئی کر کے زمینداری
نظام کو جوں کا توں برقرار رکھا جائے۔ ہاریوں کو یہ شکایت بھی تھی کہ وزیر اعلیٰ یوسف ہارون نے
جاگیرداری نظام کو ختم کرنے کے جو بلند بانگ دعوے کئے تھے اسمبلی نے ان کی تکمیل بھی نہیں کی
تھی۔ چنانچہ 14 رجون کو ہاری کمیٹی کی مجلس عاملہ نے ایک قرارداد میں اپنے اس مطالبہ کا اعادہ کیا
کہ صوبہ میں جاگیرداری نظام کو ختم کیا جائے کیونکہ یہ نظام نہ صرف ہاریوں کے لئے مخالفانہ ہے
بلکہ اس سے صوبائی حکومت کو سالانہ تقریباً 40 لاکھ روپے کا نقصان ہو رہا ہے۔ کمیٹی نے ایک
قرارداد میں اس امر پر تشویش کا اظہار کیا کہ صوبہ میں گندم کا نرخ نو روپے بارہ آنے فی من سے کم
ہو کر چھ روپے چار آنے فی من ہو گیا ہے۔ کمیٹی کی رائے یہ تھی کہ گندم کے نرخ میں اس کمی سے
ذخیرہ اندوزوں اور سرمایہ داروں کو فائدہ پہنچے گا جبکہ کاشت کاروں اور صوبائی حکومت کو نقصان ہو
گا۔ کمیٹی نے اس امر پر بھی تشویش کا اظہار کیا کہ نام نہاد قانون مزارعت کی منظوری کے بعد
پرانے سندھی زمینداروں اور نئے مہاجر زمینداروں نے ہاریوں کی وسیع پیمانے پر بیدخلیاں
شروع کر دی ہیں اور ہاری کمیٹی کے کارکنوں کے خلاف جھوٹے مقدمات بنائے جا رہے ہیں۔

22 رجون کو سانگھڑ میں ایک ہاری کانفرنس ہوئی جس میں موجودہ سندھ اسمبلی اور
وزارت پر عدم اعتماد کا اظہار کر کے یہ مطالبہ کیا گیا کہ بالغ حق رائے دہندگی کی بنیاد پر نئے عام
انتخابات کرائے جائیں۔ اس کانفرنس میں ہزاروں بے زمین ہاریوں کے علاوہ غریب مہاجر
کاشت کاروں نے بھی شرکت کی۔ ان کا مزید مطالبہ یہ تھا کہ متروکہ اراضی کراچی اور حیدر آباد کے
غیر کاشت کار ''زمینداروں'' کو بطور عطیہ دینے کی بجائے اسے ہاریوں اور مہاجر کاشت کاروں
میں تقسیم کر دیا جائے اور جاگیرداری نظام کا فی الفور بلا معاوضہ خاتمہ کیا جائے۔ ہاریوں کے
آخر الذکر مطالبہ کی گونج 25 رجون کو لاڑکانہ ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں بھی

سنی گئی جبکہ عاملہ نے وزیر اعلیٰ قاضی فضل اللہ کی موجودگی میں جاگیرداری نظام ختم کرنے کا مطالبہ کیا اور یہ رائے ظاہر کی کہ "جاگیرداروں کی زیر تحویل زمینیں انہی کو نہ دی جائیں بلکہ جاگیری زمینیں غریب ہاریوں میں تقسیم کی جائیں۔" قاضی فضل اللہ نے اس موقع پر اپنی تقریر میں کہا کہ جاگیرداری نظام ختم کرنے کا وعدہ پورا کیا جائے گا کیونکہ یہ جاگیریں غداری کے انعام کے طور پر دی گئی تھیں لیکن زمینداری نظام کو ختم نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس طرح حکومت کے لئے مالیہ وصول کرنے کے سلسلے میں بہت سی مشکلات پیدا ہوں گی۔

چونکہ سندھ میں سندھی اور غیر سندھی جاگیرداروں اور زمینداروں کے خلاف بے زمین ہاریوں اور غریب مہاجر کاشت کاروں کے حق میں روز افزوں تحریک کا اثر پنجاب میں بھی پھیل رہا تھا اس لئے لاہور کے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ کا ایڈیٹر بہت پریشان ہوا کیونکہ اسے اس تحریک میں اشتراکیت کی بو آتی تھی۔ اس نے اپنے ادارتی مقالے میں جاگیرداری، زمینداری اور سرمایہ داری پر "اسلامی نقطۂ نگاہ" سے تبصرہ کیا۔ اس کا "فتویٰ" یہ تھا کہ "نجی ملکیت کا حق اسلامی معیشت کے بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتا ہے اور اسلام اس حق کو بہت مقدس سمجھتا ہے۔ بلاشبہ اسلام کے نزدیک نجی جائیداد کی حیثیت اس کے مالک کے پاس ایک امانت ہوتی ہے اور اس پر لازم ہوتا ہے کہ وہ اس کا بہترین استعمال کرے مگر یہ حد بندی محض اخلاقی ذمہ داری تک ہی محدود ہے۔ ریاست کی قانونی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ نجی جائیداد پر اڑھائی فیصد زکوٰۃ عائد کرسکتی ہے...... کچھ عرصہ سے جاگیرداری نظام کے بارے میں عوامی سطح پر بہت بحث ہو رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چونکہ یہ جاگیریں غیر ملکی حکمرانوں نے ملک کے مفاد کے خلاف خدمات کے انعامات کے طور پر دی تھیں اس لئے انہیں ضبط کر لینا چاہیے۔ مولانا مودودی کو اگرچہ اس تجویز سے اصولی طور پر اتفاق ہے لیکن اس نے صحیح طور پر کہا ہے کہ ہر جاگیر کے بارے میں نہایت احتیاط سے عدالتی تحقیقات ہونی چاہیے تاکہ پتہ چل سکے کہ کن حالات میں دی گئی تھی...... پاکستان میں کسوٹی اسلام ہوگا کمیونزم نہیں...... اسلام انسان کی حصول زر کی صلاحیت پر کوئی حد مقرر نہیں کرتا۔"[7]

جب سول اینڈ ملٹری گزٹ نے غیر محدود نجی ملکیت کے بارے میں مودودی کے "اسلامی مؤقف" سے اتفاق کرتے ہوئے یہ مقالہ لکھا تھا ان دنوں پاکستان کا وزیر اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان امریکی سامراج کے دربار میں حاضر ہو کر یقین دلا رہا تھا کہ اسلام کا نظریۂ زندگی، مغرب کے نظریۂ

زندگی کے عین مطابق ہے۔ لہٰذا پاکستان میں اشتراکیت کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ سندھ کا بے تاج بادشاہ ایوب کھوڑو ان دنوں اپنے پنجابی دوست ممتاز دولتانہ کے ہمراہ مری میں چھٹیاں منا رہا تھا۔ تقریباً چار ہفتے وہاں رہنے کے بعد جب وہ 9 رجولائی کو واپس کراچی پہنچا تو اس کے چند دن بعد مختلف حلقوں کی طرف سے یہ الزامات عائد ہونے لگے کہ یہ ''بے تاج بادشاہ'' مہاجروں سے نقد رشوتیں وصول کر رہا ہے۔ ایک شخص ڈاکٹر لطیف فاروقی نے ٹھٹھہ میں صوبائی وزیر بحالیات سید میران محمد شاہ کی زیر صدارت ایک جلسۂ عام میں انکشاف کیا کہ اس نے کھوڑو کو مہاجرین کے فائدے کے لئے پانچ ہزار روپے دیئے تھے اور کراچی کے ایک اخبار کی ایک اطلاع کے مطابق کھوڑو نے اس شہر کی کلاتھ مرچنٹس ایسوسی ایشن سے بھی بظاہر اس مقصد کے لئے 4750 روپے لئے تھے جن کا کوئی حساب نہیں رکھا گیا تھا۔ کھوڑو نے 16 رجولائی کو ایک بیان میں ان الزامات کی تردید کی اور پھر وہ سندھ سیکریٹریٹ کے ایک کمرے میں بیٹھ کر یہ رپورٹ لکھنے میں مصروف ہو گیا کہ کس طرح صوبائی حکومت کی انتظامیہ کے اخراجات میں تیس چالیس لاکھ روپے کی کمی ہو سکتی ہے۔ ہاری کمیٹی کی رائے یہ تھی کہ اس مقصد کے لئے سرکاری ملازمین کی وسیع پیمانے پر چھانٹی کرنے کی بجائے جاگیرداری نظام کو ختم کر کے سرکاری آمدنی میں تیس چالیس لاکھ روپے کا اضافہ کیا جائے مگر کھوڑو کے لئے یہ تجویز قابل قبول نہیں تھی اور ابوالاعلیٰ مودودی کا ''فتویٰ'' بھی اس تجویز کے خلاف تھا۔

جاگیرداری نظام کے حق میں مُلاؤں کے فتوے

روزنامہ ڈان کی رپورٹ کے مطابق مودودی نے جاگیرداری نظام کے حق میں ''فتویٰ'' 28 رجولائی کو کراچی میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے صادر کیا۔ اس نے اپنی تقریر میں پہلے تو دستور ساز اسمبلی پر عدم اعتماد کا اظہار کیا کیونکہ اس کی رائے میں یہ اسمبلی ملک کو اسلامی ریاست بنانے کی اہلیت نہیں رکھتی تھی۔ پھر اس نے کہا کہ ہر جاگیرداری اور زمینداری کی ابتدائی پوزیشن کا تعین کرنے کے بعد ہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ اسے منسوخ کیا جائے یا برقرار رکھا جائے۔ وہ جاگیرداری کے بطور انعام کے کلی طور پر منسوخ کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ ایسی جاگیریں جو عوامی خدمت کے اعتراف کے طور پر دی گئی تھیں اور جو ابتداً تاج

برطانیہ کی ملکیت تھیں انہیں برقرار رہنے دینا چاہیے۔ ایسی جاگیر کا سائز اتنا ہونا چاہیے کہ ایک جاگیردار اطمینان کے ساتھ درمیانہ طبقہ کی زندگی بسر کر سکے۔ دوسری جاگیریں منسوخ کر دینی چاہئیں۔ جو زمیندار اپنی زمین کے مالک ہیں انہیں زمین اپنی ملکیت میں رکھنے کی اجازت ہونی چاہیے لیکن ایسی زمینداریاں جن میں زمیندار محض مالیہ جمع کرتا ہے منسوخ کر دینی چاہئیں۔ حکومت کو یا تو ان ٹیکس کلکٹروں کو معاوضہ دینا چاہیے یا ان کی خدمات کو ختم کر دینا چاہیے۔ اس نے مزید کہا کہ حکومت کی جانب سے جاگیرداروں اور زمینداروں کے حقوق و مراعات کو محدود کرنا چاہیے۔[8]

جاگیرداروں اور زمینداروں کے حق میں اس قسم کا ''فتویٰ'' 1949ء کے اوائل میں کراچی کے عبدالحامد بدایونی اور دوسرے 16 ملاؤں نے بھی مشترکہ دستخط کے ساتھ صادر کیا تھا۔ لیکن ان ملاؤں کے فتوے اور مودودی کے ''فتوے'' میں فرق یہ تھا کہ مودودی نے اس سلسلے میں اپنے موقف کی مختلف تاویلیں کرنے کی گنجائش رکھی تھی۔ اس نے ہر جاگیرداری اور زمینداری کی ابتدائی پوزیشن کی تحقیقات کرنے کی جو شرط عائد کی تھی اس کا مطلب یہ تھا کہ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔

جاگیرداری نظام کے تحفظ کی خاطر کھوڑو کا مہاجرین کی آبادکاری میں لیاقت سے تعاون

وزیراعظم لیاقت علی خان امریکہ اور کینیڈا سے 73 دن کا دورہ کر کے جولائی کے دوسرے ہفتے میں واپس کراچی پہنچ چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی لیاقت۔ کھوڑو گٹھ جوڑ کو مزید مضبوط بنانے کا عمل بھی شروع ہو چکا تھا۔ اس مقصد کے لئے کھوڑو کی طرف سے پہل اس طرح ہوئی کہ 23 رجولائی کو کراچی کے اردو کالج کا ایک سال کے لئے سندھ یونیورسٹی کے ساتھ الحاق ہو گیا۔ پھر 3 راگست کو مرکزی حکومت کی طرف سے مرکزی وزیر بحالیات کی سربراہی میں ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی مقرر کی گئی جس میں ایوب کھوڑو بھی شامل تھا۔ اس کمیٹی کے ذمے کام یہ تھا کہ یہ کراچی اور سندھ میں مہاجرین کی آبادکاری کے لئے سکیمیں تیار کرے گی، ان سکیموں کو جامۂ عمل پہنانے کے لئے مناسب اقدامات کرے گی اور اس امر کا جائزہ لے گی کہ دوسری وزارتوں نے مہاجرین کی آبادکاری کے لئے اپنی سکیموں کو کہاں تک مکمل کیا ہے۔ گویا اب کھوڑو کو نہ صرف سندھ میں

مہاجروں کے غلبہ کا خطرہ نہیں رہا تھا بلکہ اسے ان کی آبادکاری کے کام میں بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ اس نے 5 راگست کو کراچی میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ تمام اضلاع اور تعلقوں کی مسلم لیگوں اور نیشنل گارڈز کو ہدایت کی جارہی ہے کہ وہ تمام مہاجرین کی آبادکاری کے کام میں سرکاری حکام سے بھرپور تعاون کریں۔ کراچی میں بھی سندھ مسلم لیگ کی ایک شاخ قائم کی جارہی ہے تاکہ اس شہر میں بھی خانماں برباد مہاجرین کی آبادکاری کے کام میں انتظامیہ کی مدد کی جائے۔ کھوڑو نے مزید بتایا کہ اس نے سندھ کے تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ ان مہاجر امیدواروں کے بارے میں معلومات فراہم کریں جنھوں نے دستور ساز اسمبلی کی سات نشستوں کے لئے صوبائی پارلیمانی بورڈ کو درخواستیں دے رکھی ہیں۔ یہ معلومات 31 راگست تک پہنچ جانی چاہئیں۔ [9] کھوڑو کا یہ بیان دراصل اس حقیقت کا ایک باقاعدہ اعلان تھا کہ وہ واقعی سندھ کا ''بے تاج بادشاہ'' تھا۔ وزیراعظم قاضی فضل اللہ محض اس کا ایک درباری تھا۔ سندھ سے دستور ساز اسمبلی کے مہاجر ارکان کا انتخاب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کی سفارشوں کی بنیاد پر ہونے والا تھا۔ وزیراعظم لیاقت علی خان کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ پھر جب 13 راگست کو چودھری خلیق الزماں پاکستان مسلم لیگ کی صدارت سے طوعاً وکرھاً الگ ہوا تو سندھ کی آئندہ کی سیاسی تصویر کے خدوخال اور بھی نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔ اب کھوڑو اور لیاقت علی خان کے مشترکہ دودھ میں کوئی بھی مکھی باقی نہیں رہی تھی۔

کھوڑو کے برادر نسبتی کو بلامقابلہ کامیاب کرانے کے لئے تاریخ کی بدترین دھاندلی

24 راگست کو سرکاری طور پر اعلان کیا گیا کہ پیرالٰہی بخش کو نااہل قرار دیئے جانے کے باعث ضلع دادو کے مرکزی دیہاتی حلقہ یعنی دادو۔ جوہی حلقہ کی جو مسلم نشست خالی پڑی ہے اس کا ضمنی انتخاب 14 رستمبر کو ہوگا۔ کاغذات نامزدگی 4 رستمبر کو وصول کئے جائیں گے اور ایسوسی ایٹڈ پریس کی ایک خبر میں یہ بتایا گیا کہ سندھ مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کے صدر ایوب کھوڑو نے دادو۔ جوہی حلقہ کے ضمنی انتخاب کے لئے لیگ ٹکٹ کے امیدواروں سے 31 راگست تک درخواستیں طلب کی ہیں۔ ان درخواستوں پر یکم ستمبر کو غور ہوگا اور اسی دن فیصلہ کا اعلان کردیا جائے گا۔ پیرالٰہی بخش نے یہ ضمنی انتخاب رکوانے کے لئے یکم ستمبر کو سندھ چیف کورٹ میں درخواست دی جو مسٹر

جسٹس حسن علی آغا نے اسی دن مسترد کر دی۔ یہ سندھی جج اس ڈویژن بنچ کا رکن تھا جس نے ایوب کھوڑو کو لائنو ٹائپ مشین کیس میں بری کیا تھا اور پھر اسی جج نے کھوڑو کے خلاف پروڈا کے تحت کی گئی کاروائی کو کالعدم قرار دیا تھا۔ جب چیف کورٹ میں پیر الٰہی بخش کی یہ درخواست مسترد ہو گئی تو ایسوسی ایٹڈ پریس نے اسی دن یہ خبر دی کہ دادو۔ جوہی حلقہ کے ضمنی انتخاب میں سندھ مسلم لیگ، سندھ ہاری کمیٹی اور سندھ عوامی مسلم لیگ کے درمیان سہ فریقی مقابلہ ہو گا مگر 4 ستمبر کو جب کاغذات نامزدگی داخل ہوئے تو دادو کے کلکٹر نے ایوب کھوڑو کے برادر نسبتی عبداللطیف کے ''بلا مقابلہ'' انتخاب کا اعلان کر دیا۔ اس پر نہ صرف سندھ کے بلکہ پورے ملک کے جمہوریت پسند حلقوں میں کہرام مچ گیا۔ قبل ازیں اخبارات میں صوبہ سرحد اور مشرقی بنگال کے ضمنی انتخابات میں دھاندلی کی اطلاعات شائع ہوئی تھیں اور اہل شعور کو پتہ چل گیا تھا کہ اس ملک میں جمہوریت کا کیا حشر ہونے والا ہے لیکن ایسی انتخابی دھاندلی کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی جیسی کہ دادو۔ جوہی حلقے میں ہوئی۔

اس دھاندلی کی تفصیل یہ تھی کہ سندھ مسلم لیگ کا امیدوار ایوب کھوڑو کا برادر نسبتی عبداللطیف تھا۔ اس کے مقابلے میں چار امیدوار تھے۔ ایک امیدوار ایک مقامی وکیل شفیع محمد تھا۔ 3 ستمبر کو ایوب کھوڑو، قاضی فضل اللہ اور آغا غلام نبی پٹھان نے اسے بلایا اور کہا کہ اسے سرکاری امیدوار کی حمایت کرنی چاہیے مگر جب اس نے انکار کر دیا تو اسے اسی رات گرفتار کر کے کوٹڑی سب جیل میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں اس کے پاس سے اس کے کاغذات نامزدگی لے لئے گئے۔ دوسرا امیدوار ہاری لیڈر حیدر بخش جتوئی تھا۔ اسے عین اس وقت سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر لیا گیا جبکہ وہ اپنے کاغذات نامزدگی داخل کرنے کے کے لئے جا رہا تھا۔ اس پر جتوئی کے کاغذات نامزدگی قاعدہ کے مطابق اس کے تجویز کنندہ اور تائید کنندہ نے داخل کر دیئے۔ مگر کھوڑو کے اعتراض پر یہ کاغذات اس عذر کے تحت منظور نہ کئے گئے کہ جتوئی کے دستخط جعلی تھے۔ اس پر حلف نامے داخل کر کے یہ باور کروانے کی کوشش کی گئی کہ اس کے دستخط اصلی ہیں۔ پیر الٰہی بخش نے بھی ان حلف ناموں کی تائید کی مگر کلکٹر نہ مانا اور اس نے یہ کاغذات مسترد کر دیئے۔ تیسرا امیدوار پیر الٰہی بخش کا بیٹا پیر شاہ نواز تھا۔ اس کے میٹرک کے سرٹیفکیٹ کے مطابق اس کی عمر 27 سال تھی مگر کھوڑو نے ایک ڈاکٹر کو کلکٹر کے دفتر میں بلا کر یہ فیصلہ صادر کروا دیا کہ اس کی عمر 25 سال

سے کم ہے لہٰذا اس کے کاغذات مسترد کر دیئے گئے۔ چوتھا امیدوار ایک شخص تاج محمد صحرائی تھا جس نے ہاری کمیٹی کے متبادل امیدوار کے طور پر کاغذات نامزدگی داخل کئے تھے مگر اس کے کاغذات اس بنا پر مسترد کر دیئے گئے کہ رائے دہندگان کی فہرست میں اس کے نام کے ساتھ اس کا تخلص ''صحرائی'' نہیں لکھا ہوا تھا۔ یہ ساری کاروائی ایک ایسے کلکٹر نے کی جسے حال ہی میں ترقی ملی تھی اور دادو سے اس کا تبادلہ ہونے والا تھا۔ اس نے برسرعام دو ایک گھنٹوں میں بطور ریٹرننگ آفیسر اپنے ''فرائض'' کو ''خوش اسلوبی'' سے انجام دیا اور پھر ایوب کھوڑو کا برادر نسبتی عبداللطیف بلا مقابلہ منتخب ہو گیا۔ اس کے لئے پھولوں کے ہار پہلے ہی سے کمرۂ عدالت میں موجود تھے۔ 5 ستمبر کو کھوڑو کی اس ''شاندار'' انتخابی کامیابی کی خبر شائع ہوئی تو 6 ستمبر کو پاکستان عوامی لیگ کے صدر حسین شہید سہروردی نے ایک پریس کانفرنس میں اس کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ اس نے الزام عائد کیا کہ ''مرکزی حکومت کو اس فقید المثال انتخابی دھاندلی کی ذمہ داری سے مبرا قرار نہیں دیا جاسکتا۔''[10] لاہور کے اخبار نوائے وقت نے اس واقعہ کو ''انتہائی شرمناک'' قرار دیا اور لکھا کہ ''اس سے بڑا فراڈ کبھی غیر منقسم ہندوستان میں بھی دیکھا نہ سنا...... یہ ایک افسوس ناک واقعہ ہے جس پر ارباب اقتدار کو شرم آنی چاہیے۔ جمہوریت کی ایسی مٹی پلید ہوتے ہوئے ہم نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ سندھ میں جو کچھ ہوا ہے وہ پاکستان کے جمہوری نام اور دامن پر ایک شرمناک دھبہ ہے۔ سیفٹی ایکٹ کے ذریعے عین وقت پر مخالف امیدواروں کو گرفتار کر لینے سے تو یہی بہتر تھا کہ انتخاب کا ڈھونگ ہی نہ رچایا جاتا۔ مسٹر کھوڑو نے اپنی اس حرکت سے پاکستانی جمہوریت کو ساری دنیا میں ذلیل کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ سب برابر کے مجرم ہیں جو اس معاملہ میں اغماض اور چشم پوشی سے کام لے رہے ہیں۔ جمہوریت کا خون ہوتے دیکھتے ہیں مگر چپ ہیں بلکہ قاتل کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ پاکستان کے مختلف گوشوں سے وقتاً فوقتاً ضمنی انتخاب اور جنرل انتخاب کے آوازے بلند ہوتے رہے ہیں۔ اگر حکومت اور رائے عامہ نے سندھ میں اس بدمعاشی کو برداشت کر لیا تو کسی انتخاب کی آزادی پر بھروسہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اس سے یہی بہتر ہوگا کہ کہیں بھی انتخاب نہ ہو اور نامزدگیوں کے ذریعے نئی اسمبلیاں قائم کر دی جائیں۔''[11] ایوب کھوڑو نے 8 ستمبر کو اپنی صفائی میں ایک طویل بیان دیا مگر اس کا عذر گناہ اس کے گناہ سے بدتر تھا۔ حتیٰ کہ نیم سرکاری اخبار روزنامہ ''ڈان'' کو بھی اپنے 9 ستمبر کے اداریے میں یہ لکھنا پڑا کہ دادو کے ضمنی

انتخاب میں جو کچھ ہوا ہے وہ شک وشبہ سے بالاتر نہیں ہے اور نہ ہی مسٹر کھوڑو کے بیان میں قائل کرنے والی کوئی بات ہے۔

حسین شہید سہروردی اور نوائے وقت کا یہ الزام بے بنیاد نہیں تھا کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان اس انتخابی دھاندلی میں ملوث تھا۔ اس کی اس معاملہ میں مجرمانہ چشم پوشی اس امر کی غمازی کرتی تھی کہ وہ خود ایک جاگیردار استبدادی حکمران تھا جو ملک میں پارلیمانی نظام رائج کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا بلکہ وہ جاگیردارانہ جوڑ توڑ کے ذریعے ایک آمر مطلق کی طرح حکومت کرنا چاہتا تھا۔ نوائے وقت نے لیاقت علی خان کے اسی منصوبے کے پیش نظر اپنی 12 ستمبر کی اشاعت میں اس شرمناک واقعہ پر ادارتی تبصرہ کرتے ہوئے استفسار کیا کہ ''کھوڑو کو اس بات کی اجازت دینا کہ وہ قانونی سقم کی آڑ لیکر نہ صرف صوبہ سندھ کے ڈکٹیٹر بن جائیں بلکہ پاکستان کی پبلک زندگی میں بھی نمایاں مقام کے مستحق سمجھے جائیں کہاں تک اخلاق و انصاف کے قرین ہے...... قانون اس کا روادار نہیں کہ دوستوں سے تو چشم پوشی کرے اور مخالفوں کو ہدف تنقید بنایا جائے...... پبلک میں اپنی عزت، اپنی ساکھ اور اپنی حکومت پر عوام کے بھروسہ کو قائم رکھنے کے لئے ارباب اقتدار کے حق میں یہی بہتر ہے کہ وہ اس سنجیدہ سوال کا جواب دیں کیونکہ ایسی خاموشی جس کی کوئی وجہ بیان نہ کی جائے ہمیشہ بدگمانیاں پیدا کرتی اور عوامی اعتماد کو زائل کرنے کا موجب بنتی ہے۔'' مگر لیاقت علی خان نے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا اور اس طرح اس نے اپنی عزت، اپنی ساکھ اور اپنی حکومت پر عوامی اعتماد کو زائل کر دیا۔ پنجابی شاونسٹوں کو اس کی اس معاملہ میں بے عملی، خاموشی اور چشم پوشی نے اس کے خلاف ایک اور ہتھیار مہیا کر دیا جسے انہوں نے اپنی آئندہ مہم کے دوران نہایت مؤثر طریقے سے استعمال کیا۔

لیگ کونسلروں کے انتخاب میں دھاندلی اور کھوڑو کا دوبارہ صدر صوبہ لیگ کے عہدے پر انتخاب

15 ستمبر کو سندھ چیف کورٹ کے جسٹس حسن علی آغا نے پیر الٰہی بخش کے رفیق خاص قاضی محمد اکبر کی درخواست مسترد کر دی جس میں درخواست دہندہ نے التجا کی تھی کہ حکومت سندھ کو سیہون۔کوٹری۔دادو ساؤتھ حلقہ میں ضمنی انتخاب کروانے سے روکا جائے۔ قاضی اکبر 1946ء

کے انتخاب میں اس حلقے سے منتخب ہوا تھا لیکن فروری 1949ء میں انتخابی ٹربیونل نے اس کے انتخاب کو ناجائز قرار دے کر اسے اسمبلی کی رکنیت سے محروم کر دیا تھا اور اس نے ٹربیونل کے اس فیصلے کے خلاف اپیل دائر کر رکھی تھی۔ اسی دن جسٹس حسن علی آغا نے محمد پریال شاہ تنواری اور شاہ محمد یعقوب کی ایک مشترکہ درخواست بھی مسترد کر دی جس میں استدعا یہ تھی کہ 17 ستمبر کو صوبہ لیگ کونسل کے اجلاس میں عہدیداروں کے انتخاب کے خلاف حکم امتناعی جاری کیا جائے کیونکہ ٹھٹھہ اور نواب شاہ میں مسلم لیگ کے ابتدائی انتخابات میں دھاندلی ہوئی ہے اور اس دھاندلی کی وجہ سے منتخب شدہ صوبائی کونسلر جس انتخاب میں حصہ لیں گے وہ جائز نہیں ہوگا۔ جسٹس آغا نے مطلوبہ حکم امتناعی جاری کرنے سے اس بنا پر انکار کیا کہ رجسٹرار نے اس مقصد کے لئے دائر کردہ درخواست کو کسی تکنیکی سقم کی وجہ سے قبول نہیں کیا تھا۔ چنانچہ پروگرام کے مطابق 17 ستمبر کو کراچی میں سندھ مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا جس میں ایوب کھوڑو کو دوسرے سال کے لئے بھی متفقہ طور پر صدر منتخب کر لیا گیا اور جنرل سیکرٹری کا عہدہ اس کے ضلع لاڑکانہ کے ایک معروف شخص عبدالفتح میمن کو دیا گیا۔ صوبہ لیگ کے دوسرے عہدیداروں کا انتخاب بھی کھوڑو کی خواہش کے مطابق متفقہ طور پر ہوا۔

کونسل کے اجلاس میں دو قراردادیں پیش کی گئیں جن میں سے ایک قرارداد میں تجویز کیا گیا تھا کہ قاضی اکبر کو دس سال کے لئے مسلم لیگ سے خارج کر دیا جائے اور دوسری قرارداد میں مرکزی وزیر خوراک پیرزادہ عبدالستار کی پالیسی پر عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے وزیر اعظم لیاقت علی خان سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ کاشت کاروں کو مشکلات سے نجات دلانے کے لئے مرکزی وزارت خوراک کی پالیسی پر نظر ثانی کرے۔ جب اسی دن شام کو کونسل کا دوسرا اجلاس ہوا تو پیرزادہ عبدالستار کی کارگزاری پر سخت نکتہ چینی کی گئی۔ آٹھ کونسلروں نے، جن میں صوبائی وزیر خوراک آغا غلام نبی پٹھان بھی شامل تھا، اپنی تقریروں میں رائے ظاہر کی کہ مرکزی وزارت خوراک کی پالیسی غیر واضح ہے اور اس کی تشکیل سے قبل صوبائی حکومت سے مشورہ نہیں کیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ملک کی غلہ منڈیوں میں بحران پیدا ہو گیا ہے اور کاشت کاروں کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ کونسلر تاج محمد کا الزام یہ تھا کہ پیرزادہ عبدالستار کی یہ پالیسی ''بعض منظورِ نظر سوداگروں'' کے لئے نہایت منافع بخش ہے لیکن سندھ کی معیشت کے لئے انتہائی نقصان دہ ہے۔

کھوڑو لیگ کی طرف سے پیرزادہ عبدالستار کے خلاف اس بھرپور حملے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ گندم کے نرخ میں دو تین روپے فی من کے حساب سے کمی ہو جانے کے باعث سندھی زمینداروں کو نقصان ہوا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ پیرزادہ صوبہ میں کھوڑو کے مخالفین کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ کیونکہ اس کے کسی ''آدمی'' کو نہ تو صوبائی وزارت میں شامل کیا گیا تھا اور نہ ہی صوبہ لیگ میں کوئی عہدہ دیا گیا تھا۔

کھوڑو۔لیاقت گٹھ جوڑ، دستور ساز اسمبلی کی مہاجر نشستوں کا انتخاب، لیاقت کا پاکستان مسلم لیگ کے صدر کے عہدے پر انتخاب

ایوب کھوڑو کا سیاسی ستارہ ان دنوں انتہائی عروج پر تھا اور اسے یقین تھا کہ پیرزادہ عبدالستار اس کے حملے کی تاب نہیں لا سکے گا۔ اب اس کے اور نوابزادہ لیاقت علی خان کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ دادو۔ جو ہی کے حلقہ میں انتخابی دھاندلی کے بارے میں لیاقت علی خان کی خاموشی اور چشم پوشی نے کھوڑو کو اس کا فریفتہ کر دیا تھا اور دونوں میں مختلف امور کے بارے میں صلاح مشورے ہوتے رہتے تھے۔ اسی مقصد کے لئے 26 ستمبر کو بھی ایوب کھوڑو اور لیاقت علی خان کے درمیان طویل ملاقات ہوئی جس میں سندھ سے دستور ساز اسمبلی کی رکنیت کے لئے سات مہاجر امیدواروں کے انتخاب کے مسئلہ پر غور کیا گیا اور اس سے اگلے دن سندھ مسلم لیگ کی جانب سے اعلان کیا گیا کہ دستور ساز اسمبلی میں سندھ کی سات مہاجر نشستوں کے لئے محمد ایوب قریشی (سکھر)، حاجی فریدالدین صدیقی (حیدرآباد)، فیض محمد (حیدرآباد)، منفعت علی (لاڑکانہ)، سید ازل حسین شاہ (نواب شاہ)، محمد عبدالعزیز (دادو) اور فیض محمدساندل (حیدرآباد) کو لیگ ٹکٹ دیئے گئے ہیں۔ صوبائی پارلیمانی بورڈ کے اس فیصلے کے خلاف مرکزی پارلیمانی بورڈ کے روبرو 4 اکتوبر تک اپیل دائر کی جا سکتی ہے۔ پارلیمانی بورڈ کی میٹنگ کے بعد کھوڑو نے ہندوستان کے مختلف علاقوں کے مہاجرین کے اعداد و شمار بتائے۔ اس کے بیان کے مطابق اس وقت تک مشرقی پنجاب سے اڑھائی لاکھ، یو۔ پی، سی۔ پی اور وسطی ہندوستان سے اڑھائی لاکھ، اجمیر اور راجپوتانہ سے دو لاکھ، بمبئی گجرات اور کاٹھیاواڑ سے ایک لاکھ اور حیدرآباد (دکن) وغیرہ سے 60 ہزار مہاجرین سندھ میں آباد ہوئے تھے۔ ان کے نمائندوں کے لئے دستور ساز اسمبلی میں

نشستوں کی تقسیم یوں کی گئی تھی۔ یو۔ پی 3، پنجاب 2، بمبئی اور کاٹھیاواڑ 1، اجمیر وراجپوتانہ 1۔

2/اکتوبر کو ایوب کھوڑو اور لیاقت علی خان کی طویل ملاقات کا ایک نتیجہ منظر عام پر آیا جبکہ پاکستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے یہ سفارش کی کہ فروری 1948ء میں پبلک عہدوں پر فائز افراد پر عائد کردہ یہ پابندی منسوخ کردی جائے کہ وہ مسلم لیگ کے عہدیدار نہیں بن سکتے۔ مزید برآں مرکزی اور صوبائی پارلیمانی بورڈوں کے ارکان کو بھی قانون ساز اداروں کا رکن بننے کی اجازت دی جائے۔ مرکزی عاملہ کی اس سفارش کا مقصد یہ تھا کہ وزیراعظم لیاقت علی خان کے پاکستان مسلم لیگ کی صدارت کے عہدے پر فائز ہونے کے راستے میں جو آئینی رکاوٹ حائل ہے اسے دور کیا جائے۔ یہ عہدہ چودھری خلیق الزماں کے مستعفی ہوجانے کی باعث 13/اگست سے خالی پڑا تھا۔ چنانچہ 7/اکتوبر کو مرکزی لیگ کونسل کا اجلاس ہوا تو ایوب کھوڑو کی تجویز پر لیاقت علی خان کو متفقہ طور پر پاکستان مسلم لیگ کا صدر منتخب کرلیا گیا اور لیاقت علی خان نے اس کے فوراً بعد لیگ کی جونئی 11 رکنی مجلس عاملہ نامزد کی اس میں سندھ سے ایوب کھوڑو اور اس کے معتمد خاص قاضی فضل اللہ کے نام شامل تھے۔ کھوڑو کو مرکزی لیگ کی قیادت کے اس نئے انتخاب سے ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ اس کے لئے بھی صوبہ سندھ کی وزارت اعلیٰ کا دروازہ کھل گیا کیونکہ مسلم لیگ کے ترمیم شدہ آئین کے تحت اس کے لئے بھی یہ ممکن ہوگیا تھا کہ وہ صوبائی لیگ کا صدر بھی رہے اور صوبہ کا وزیراعلیٰ بھی بن جائے۔ گویا آئندہ وہ سندھ کا ''بے تاج بادشاہ'' نہیں ہوگا بلکہ ''تاجدار بادشاہ'' ہوگا۔ قائداعظم جناح نے اپریل 1948ء میں اسے ''بے تاج'' کیا تھا لیکن اب مستقبل قریب میں وزیراعظم لیاقت علی خان اسے ''تاجدار'' بنائے گا۔

اس نیرنگیِ سیاست سے حیدرآباد (دکن) کے ایک مہاجر ''لیڈر'' غازی عبدالحلیم افغانی کو اس قدر خوشی ہوئی کہ اس نے 14/اکتوبر کو حیدرآباد (سندھ) کے ایک پبلک جلسہ میں ایک قرارداد کے ذریعے یہ تجویز پیش کی کہ مسٹر لیاقت علی خان کو ''قائد ملت'' کا خطاب دیا جائے اور پاکستان میں کسی اور شخص کو یہ خطاب استعمال کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ عبدالحلیم افغانی نے اس قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ لیاقت علی خان مسلم لیگ کی ازسرنو تنظیم کرکے موقع پرست عناصر کو اپنی جماعت سے نکال دے گا۔ اس نے عوام کو نصیحت کی کہ وہ اپنے ''محبوب لیڈر'' کے عظیم کام میں اس کی امداد کریں۔''[12] عبدالحلیم افغانی نے اپنی تقریر میں یہ نہ بتایا کہ اس

نے اس وقت تک سندھ کے شہری اور دیہاتی علاقوں میں اپنے اور اپنے رشتہ داروں کے نام پر کتنی جائیدادیں الاٹ کروالی تھیں اور یہ کہ ان الاٹمنٹوں کے تحفظ کے لئے کھوڑو اور لیاقت علی خان کا شیروشکر ہونا کتنا ضروری تھا؟ تاہم اس کی اس تقریر کی فوراً شنوائی ہوئی اور اسی دن سندھ اور کراچی میں مقیم ''اہل زبان'' مہاجروں کے لئے ''قائدملت'' کا خطاب لیاقت علی خان کے نام کا اسی طرح جزو بن گیا جس طرح کہ دسمبر 1938ء میں مسلمانان ہند کے لئے قائداعظم کا خطاب صدر مسلم لیگ محمد علی جناح کے نام کا جزو بن گیا تھا۔

اگلے دن 15/اکتوبر کو ڈسٹرکٹ مسلم لیگ حیدرآباد (سندھ) کے جنرل سیکرٹری قاضی محمد اکبر کو مسلم لیگ سے پانچ سال کے لئے نکال دیا گیا۔ یہ فیصلہ ایوب کھوڑو کی زیرصدارت سندھ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے کیا تھا۔ قاضی اکبر ''موقع پرست'' تھا اور اس کے خلاف الزام یہ تھا اس نے دادو۔ جوہی کے ''ضمنی انتخاب'' میں عوامی لیگ کی حمایت کی تھی لیکن اس کے خلاف اس انضباطی کارروائی کی اصلی وجہ یہ تھی کہ اس نے چند دن قبل ایک بیان میں الزام عائد کیا تھا کہ کھوڑو نے دستور ساز اسمبلی کے مہاجر امیدواروں سے اپنے اخبار ''سندھ آبزرور'' کے لئے ہزاروں روپے وصول کئے تھے۔ مجلس عاملہ نے کھوڑو کی سربراہی میں ایک 9رکنی کمیٹی بھی مقرر کی جس کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ ''صوبہ کے عوام سے متعلقہ سارے معاملات میں صوبائی حکومت کی سرگرمیوں کی نگرانی کرے گی۔''[13] کھوڑو کو یہ کمیٹی مقرر کرنے کی کیوں ضرورت محسوس ہوئی تھی؟ اس سوال کا ایک ہی جواب ہوسکتا تھا کہ 7/اکتوبر کو اس نے خود سندھ کا ''تاجدار'' بننے کا فیصلہ کرلیا تھا اور وہ اس کمیٹی کو بطور سیاسی ہتھیار استعمال کر کے قاضی فضل اللہ کو وزارت اعلیٰ کی گدی سے ہٹانا چاہتا تھا۔ غالباً یہ فیصلہ اس کی لیاقت علی خان کے ساتھ 27/ستمبر کی طویل میٹنگ میں ہی ہو گیا تھا۔ کھوڑو کی نگران کمیٹی کی سیاسی بنیاد یہ تھی کہ وزیراعظم لیاقت علی خان نے 8/اکتوبر کو پاکستان مسلم لیگ کا صدر منتخب ہونے کی بعد اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ''میں نے ہمیشہ کہا ہے اور میرا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ نہ صرف لیگ کا وجود بلکہ اس کی قوت پاکستان کے وجود اور قوت کے برابر ہے...... جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے ابتدا ہی میں فیصلہ کرلیا تھا اور آج اس کی تصدیق کرتا ہوں کہ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو لیگ کا وزیراعظم تصور کیا ہے۔ میں نے کبھی اپنے آپ کو دستور ساز اسمبلی کے ارکان کا منتخب وزیراعظم تصور نہیں کیا۔ جس دن مجھے معلوم ہوا کہ لیگ کو مجھ پر اعتماد اور بھروسہ نہیں رہا آپ

اس دن لیاقت علی خان کو پاکستان کا وزیراعظم نہیں پائیں گے۔''[14]

پھر جب 11 ؍اکتوبر کو لیاقت علی خان لاہور آیا تھا تو یہاں اس نے اخبار نویسوں کے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا ''پاکستان مسلم لیگ کی اولاد ہے۔ ماں کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچے کی اس وقت تک دیکھ بھال کرے جب تک کہ یہ جوان نہیں ہو جاتا۔'' جب اس سے پوچھا گیا کہ آیا وہ اپنی حکومت کی قوت کے سرچشمہ کے طور پر دستور ساز اسمبلی کو زیادہ اہمیت دیتا ہے یا مسلم لیگ کونسل کو زیادہ اہم سمجھتا ہے تو اس نے جواب دیا کہ ''میں پاکستان کا وزیراعظم دستور ساز اسمبلی میں مسلم لیگ کی وجہ سے ہوں اور اس پارٹی کی قوت کا سرچشمہ مسلم لیگ کی تنظیم ہے۔'' اس نے کہا کہ وہ مسلم لیگی وزیراعظم ہے اور مسلم لیگ اس کی حکومت کو کنٹرول کرتی ہے اور اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ کیا مسلم لیگ نے کسی حکومت کو کبھی کنٹرول کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ تھا کہ ''ایک مثال بھی ایسی نہیں کہ جس میں حکومت میں مسلم لیگ کی ہدایت کی تعمیل نہ کی گئی۔'' اس پر اس کی توجہ پنجاب مسلم لیگ کی اس قرارداد کی طرف مبذول کرائی گئی جس میں پبلک سیفٹی ایکٹ کی تنسیخ کا مطالبہ کیا گیا تھا تو لیاقت علی خان نے کہا کہ ''یہ مطالبہ صوبائی لیگ کی طرف سے کیا گیا ہے۔ آل پاکستان مسلم لیگ نے اس قسم کا کوئی مطالبہ نہیں کیا۔'' جب اسے بتایا گیا کہ آپ نے اپنی تقریر میں حزب اختلاف کے لیڈروں کے لئے ''ہندوستان کے کتے'' کے جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان سے بہت غم و غصہ پیدا ہوا ہے تو اس نے کہا کہ ''بعض افراد'' واقعی ''ہندوستان کے کتے'' ہیں۔ میرا فرض ہے کہ میں لوگوں کو ان سے متنبہ کروں۔ اس نے مزید کہا کہ ''میں نے یہ الفاظ کسی فرد یا افراد کا حوالہ دیکر استعمال نہیں کئے تھے بلکہ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہ الفاظ اس کے لئے استعمال کئے گئے تھے تو یہ اس کا اپنا نقطۂ نگاہ ہے۔'' اس سے پوچھا گیا کہ طاقت کے اس کے ہاتھوں میں مجتمع ہو جانے سے وہ ڈکٹیٹر تو نہیں بن گیا ہے تو اس نے کہا کہ ''ڈکٹیٹر شپ میری فطرت میں نہیں ہے۔'' اس کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کے پاکستان کی انتظامیہ کے ساتھ منسلک ہونے کا کوئی خطرہ نہیں۔'' اس کے برعکس وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کے لیگ کا صدر منتخب ہونے سے سرکاری ملازمین رائے عامہ کا پہلے سے زیادہ لحاظ رکھیں گے اور اس کے مطالبہ کی فی الفور تکمیل کریں گے۔''[15]

جی۔ایم۔سیداور مسلم لیگ کے مابین مصالحت کی ناکام کوشش

قاضی محمد اکبر اور صوبہ سندھ کی خود مختاری کے عظیم ترین علمبردار جی۔ایم سید کے درمیان دیرینہ مخاصمت تھی۔ دسمبر 1946ء میں ان دونوں کے درمیان زبردست انتخابی معرکہ ہوا تھا جس میں قاضی اکبر نے مسلم لیگی امیدوار کی حیثیت سے جی۔ایم۔سید کو شکست دے دی تھی۔ اب جب ایوب کھوڑو نے قاضی اکبر کو مسلم لیگ سے خارج کر دیا تو جی۔ایم۔سید نے غیر معمولی طور پر ایک بیان جاری کیا جس میں یقین دلایا گیا کہ ''جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے میں نے اس کی کبھی مخالفت نہیں کی اور نہ ہی اس کے نصب العین کے بارے میں کبھی شک وشبہ کا اظہار کیا ہے۔ 3/مارچ 1943ء کو سندھ اسمبلی میں پاکستان کی قرارداد میں نے ہی پیش کی تھی۔ ہمارے اختلافات صوبائی معاملات تک ہی محدود ہیں اس لئے ان کا پاکستان کے بڑے بڑے مسائل سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا......ہم نے ستمبر 1947ء میں پاکستان کے وزیراعظم کو جو خط لکھا تھا اس میں ہم نے اپنی خدمات غیر مبہم طور پر اور کسی ذہنی تحفظ کے بغیر پیش کی تھیں۔ہم نے کئی مرتبہ یہ اعلان بھی کیا ہے کہ ہم پاکستان کے استحکام، سالمیت اور خوشحالی کے لئے مسلم لیگ سے تعاون کرنے پر آمادہ ہیں۔صرف یہی نہیں بلکہ ہم نے یہ اعلان بھی کیا ہے کہ ہم قومی تعمیر کے کاموں میں موجودہ حکومت پاکستان اور اسکے یونٹوں سے تعاون کریں گے شرط صرف یہ ہے کہ ہم کسی وزارت کے بنانے یا توڑنے میں حصہ نہیں لیں گے اور تعمیری تنقید کریں گے۔''[16]

اس بیان سے تقریباً ایک ہفتہ قبل 12/اکتوبر کو نوائے وقت میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ سندھ مسلم لیگ نے پاکستان کے دشمن اور قائداعظم کے معتوب جی۔ایم۔سید سے ساز باز کر لی ہے۔ جی۔ایم۔سید نے وزیراعلیٰ قاضی فضل اللہ کو یقین دلایا ہے کہ وہ موجودہ حکومت کی مخالفت نہیں کریں گے بلکہ اسمبلی میں برسراقتدار پارٹی کی مکمل حمایت کریں گے۔مسٹر سید جلد ہی کوئی بیان شائع کر کے حکومت اور مسلم لیگ پارٹی کے بارے میں اپنے رویہ کی وضاحت کریں گے۔ اس کے عوض صوبائی لیگ ہائی کمان اس امر پر راضی ہوگئی ہے کہ مسٹر سید، جنرل حلقہ دادو۔کوٹری میں قاضی اکبر کے حلقۂ انتخاب سے سندھ اسمبلی کے متوقع ضمنی انتخاب میں حصہ لیں گے جہاں ان کی کوئی سخت مخالفت نہیں کی جائے گی۔[17] لیکن دو دن بعد نوائے وقت کی رپورٹ یہ تھی کہ

''جی۔ایم۔سید کو مسلم لیگ میں لانے کی جو کوششیں کی جارہی تھیں وہ ناکام رہی ہیں۔مسٹر سید مسلم لیگ کی بنیادی پالیسی سے ہی اختلاف کرتے ہیں'' اور پھر 20 اکتوبر کو کراچی کے سابق میئر حکیم محمد احسن نے ایک بیان میں مسلم لیگ سے جی۔ایم۔سید کے بنیادی اختلافات سے متعلقہ حالیہ بیان کا حوالہ دیکر رائے ظاہر کی کہ ''سید نے محض اپنے حلقہ سے ضمنی انتخاب لڑنے کے لئے 17 اکتوبر کے بیان میں قلا بازی کھائی ہے۔'' نوائے وقت کی ان خبروں اور جی۔ایم۔سید اور حکیم محمد احسن کے ان بیانات سے ظاہر تھا کہ جی۔ایم۔سید اور قاضی فضل اللہ کے درمیان دادو۔کوٹری کے ضمنی انتخاب کے بارے میں سودا بازی کے لئے بات چیت ہوئی تھی مگر یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔غالباً اس لئے کہ کھوڑو نے خود وزیر اعلیٰ بننے کا فیصلہ کر لیا تھا اور جی۔ایم۔سید کی اسمبلی میں موجودگی اس کے لئے خطرہ کا باعث بن سکتی تھی۔سید 1946ء میں وزارت بنانے اور توڑنے کے فن میں اپنی مہارت کا مظاہرہ کر چکا تھا اور اس کے اسی قسم کے جوڑ توڑ کی وجہ سے دسمبر 1946ء میں صوبائی اسمبلی کے دوبارہ عام انتخابات کرانے پڑے تھے۔اگرچہ کھوڑو خود ایک سیاسی درندہ تھا لیکن وہ جی۔ایم۔سید کے روپ میں ایک سیاسی لومڑی سے بہت ڈرتا تھا۔البتہ اسے ہاریوں سے کوئی ڈر نہیں لگتا تھا کیونکہ وہ انہیں محض بھیڑیں تصور کرتا تھا۔اسی لئے جب ہاری کمیٹی نے حیدر بخش جتوئی کی زیر صدارت یہ مطالبہ کیا کہ دادو۔جوہی کے حلقہ میں ازسرنو ضمنی انتخاب کرایا جائے اور کھوڑو اور فضل اللہ کے خلاف پروڈا کے تحت کاروائی کی جائے تو کھوڑو کو کوئی تشویش لاحق نہ ہوئی۔[18] اس لئے کہ اسے یقین تھا کہ لیاقت علی خان کی زیر صدارت مسلم لیگ کے نقارخانے میں ہاری کمیٹی کی طوطی کی آواز کوئی نہیں سن سکے گا۔اسے اخبارات کے مخالفانہ تبصروں کی بھی کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔وہ پرائیوٹ محفلوں میں اخبارات کے لئے بڑی حقارت کا اظہار کیا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ کتے بھونکتے ہی رہتے ہیں۔چنانچہ جب روزنامہ ''ڈان'' نے اس کی نگران کمیٹی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے اسے ''سپر گورنمنٹ'' قرار دیا اور یہ خدشہ ظاہر کیا کہ ''اس کمیٹی کے ارکان روزمرہ کی انتظامیہ میں دخل دیں گے''[19] تو کھوڑو پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور پھر جب لاہور کے اخبار نوائے وقت نے اپنے اداریہ میں قاضی محمد اکبر کے خلاف ایوب کھوڑو کے سنگین اقدام کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا کہ ''ہم مرکزی لیگ کے صدر محترم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اس معاملہ کی تحقیقات کے بعد ایک بیان جاری کریں کہ اصل واقعہ کیا ہے؟''[20] تو لیگ کے صدر محترم نے نہ تو

اس الزام کی تحقیقات کرائیں، نہ ہی کوئی بیان جاری کیا اور نہ ہی ایوب کھوڑو نے اس مطالبہ کو درخور اعتنا سمجھا۔ ان دنوں لیاقت علی خان اور ایوب کھوڑو دونوں ہی ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔

کھوڑو نے لیاقت کی اشیر باد سے فضل اللہ وزارت کے خاتمہ اور اپنی وزارت کے قیام کی راہ ہموار کر لی

چونکہ سندھ لیگ کی جانب سے سپر وائزری کمیٹی کا تقرر لیاقت اور کھوڑو دونوں کی مشترکہ اڑان کا نتیجہ تھا اس لئے وزیر اعلیٰ قاضی فضل اللہ پر یہ تکلیف دہ حقیقت بالکل واضح ہو گئی کہ اس کا ''سیاسی گورو'' اب خود صوبہ کے اقتدار کی گدی پر براجمان ہونے کا عزم رکھتا ہے اور وہ اس مقصد کے لئے عنقریب اسے بھینٹ چڑھا دے گا۔ قاضی فضل اللہ لاڑکانہ کا درمیانہ طبقہ کا وکیل تھا اور اس نے اگست 1947ء کے بعد ہر قسم کے حالات میں ایوب کھوڑو کے ساتھ اپنی وفاداری کے غیر متزلزل ہونے کا ثبوت دیا تھا لیکن اب جبکہ کھوڑو نے ہیر پھیر کے ذریعے اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی تو قاضی کے جذبۂ وفاداری میں ارتعاش پیدا ہو گیا اور غالباً اسی عالم میں اس نے اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں جی۔ ایم۔ سید سے مصالحت کی بات چیت کی تھی۔ جب اس کی یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی تو اس نے 25/اکتوبر کو ایک بیان میں سندھ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی طرف سے مقرر کردہ سپر وائزری کمیٹی کو ''غیر ضروری'' قرار دیا اور یقین دلایا کہ ''جب تک میں وزیر اعلیٰ ہوں انتظامیہ کے روز مرہ کے کام میں کسی بیرونی مداخلت کی اجازت نہیں دی جائے گی۔'' اس کے وزیر تعلیم آغا غلام نبی پٹھان نے بھی اسی دن اس سپر وائزری کمیٹی کی مخالفت کی اور کہا کہ ''میں اسے فضول سمجھتا ہوں۔''[21] اگرچہ ایوب کھوڑو نے 29/اکتوبر کو اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ اس کی کمیٹی صوبائی انتظامیہ کے روزمرہ کے کام میں مداخلت نہیں کرے گی۔ یہ صرف صوبائی حکومت اور مسلم لیگ کے درمیان رابطہ کا کام سرانجام دے گی لیکن سندھ کی سیاست کے تجربہ کار مبصرین کو یقین تھا کہ قاضی فضل اللہ اور آغا غلام نبی پٹھان کے ان بیانات سے کھوڑو اور صوبائی حکومت کے درمیان کھلم کھلا محاذ آرائی کی ابتدا ہو گی کیونکہ کھوڑو کے پاس تباہ کن گولہ باری کے لئے نہ صرف ''قائد ملت'' لیاقت علی خان کا قلعہ موجود تھا بلکہ اسے بہت سے پرانے اور نئے زمینداروں کے مورچے بھی دستیاب تھے۔ وزیر اعلیٰ قاضی فضل اللہ ''قائد ملت'' کے قلعے کو تو مسمار

نہیں کر سکتا تھا البتہ اس نے حفظ ماتقدم کے طور پر 5 رنومبر کو زمینداروں کے مورچوں پر اس طرح حملہ کیا کہ اس تاریخ سے ایک آرڈیننس کے ذریعے اس قانون مزارعت کو نافذ کر دیا جسے کھوڑو نے گزشتہ آٹھ ماہ سے طاق نسیاں پر رکھوایا ہوا تھا۔

وزیراعلیٰ قاضی فضل اللہ کے اس اقدام سے تقریباً ایک ہفتہ قبل ایوب کھوڑو نے بطور صدر مسلم لیگ ایک کمیٹی مقرر کرنے کے فیصلہ کا اعلان کیا تھا تا کہ حیدرآباد (سندھ) میں جماعت اسلامی کے ایک مولوی کی مبینہ شر انگیزی کے باعث 23 راکتوبر کو عاشورہ کے موقع پر جو فساد ہوا تھا اس کے متعلق حقائق معلوم کئے جائیں۔ اس فساد میں پولیس کی فائرنگ سے متعدد افراد ہلاک و زخمی ہوئے۔ قاضی فضل اللہ اس فساد کی وجہ سے پیدا شدہ صورت حال پر قابو پانے کی تدابیر کے بارے میں 27 راکتوبر کو وزیراعظم لیاقت علی خان سے مشورہ کرنے کے لئے لاہور گیا تھا اور پھر 30 راکتوبر کو اس نے لاہور سے واپسی پر سندھ چیف کورٹ کے جسٹس ویلانی (Velani) کی سربراہی میں حیدرآباد کے المیہ کی تحقیقات کے لئے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دی تھی۔ اس پس منظر میں وزیراعلیٰ قاضی فضل اللہ نے 8 رنومبر کو صدر صوبہ لیگ ایوب کھوڑو کے نام ایک خط لکھا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ''چونکہ حیدرآباد کے المیہ کی تحقیقات کا کام ایک عدالتی کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا ہے اس لئے صوبہ لیگ نے 29 راکتوبر کو ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرنے کا جو خیال ظاہر کیا تھا اسے ترک کر دیا جائے۔'' چنانچہ جب 14 رنومبر کو کھوڑو لاڑکانہ سے کراچی پہنچا تو اس نے لیگ کمیٹی کے ذریعے حیدرآباد کے المیہ کی تحقیقات کا خیال ترک کرنے کا اعلان کر دیا۔

کھوڑو کے اس اعلان کی کوئی سیاسی اہمیت نہیں تھی کیونکہ اس سے یہ تاثر پیدا نہیں ہوا تھا کہ وہ آئندہ صوبائی حکومت کی انتظامیہ کے روزمرہ کے کام میں مداخلت نہیں کرے گا لیکن 15 رنومبر کو ایک ایسا واقعہ ہوا جس سے اس کے سیاسی مستقبل کے بارے میں قدرے شبہ پیدا ہو گیا۔ واقعہ یہ تھا کہ مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ نے دستور ساز اسمبلی کے لئے سندھ کے ان سات مہاجر امیدواروں کی منظوری نہیں دی تھی جن کا انتخاب صوبائی پارلیمانی بورڈ نے 28 رستمبر کو کیا تھا۔ مرکزی بورڈ نے لیاقت علی خان کی زیر صدارت دو دن تک اس مسئلہ پر غور کرنے کے بعد کھوڑو کے تجویز کردہ چار امیدواروں کو مسترد کر دیا تھا اور تین کی منظوری دیدی تھی۔ مرکزی بورڈ کے منتخب کردہ امیدواروں کی فہرست حسن احمد شاہ (حیدرآباد)، قاضی احسان الحق (حیدرآباد)،

حامد حسن فاروقی (سکھر) شاہ نذر حسین (نواب شاہ)، ایم۔عثمان شاہ (نیر پور خاص)، محمد ایوب قریشی (سکھر) اور ایم۔اے عزیز (دادو) پر مشتمل تھی۔ مؤخرالذکر تین امیدواروں کو صوبائی بورڈ نے منتخب کیا تھا۔ مرکزی بورڈ کے اس فیصلے سے قدرتی طور پر سندھ میں ایوب کھوڑو کے سیاسی وقار کو صدمہ پہنچا۔ اس کے دبدبے میں یکا یک کمی ہوگئی اور صوبہ میں اس کی ''بادشاہت'' خطرے میں نظر آنے لگی۔ چنانچہ 17 نومبر کو اس کے اخبار ''الوحید'' نے مرکزی بورڈ کے اس فیصلے کی سخت مذمت کی اور یہ رائے ظاہر کی کہ مرکزی بورڈ نے اپنے اختیارات سے تجاوز کر کے ان کا انتہائی غلط استعمال کیا ہے۔ ''الوحید'' نے اس فیصلے کو ناجائز اور غیر جمہوری قرار دے کر یہاں تک لکھ دیا کہ ''ہم اسے نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ چونکہ سندھ ایک کمزور صوبہ ہے اس لئے مرکزی بورڈ نے یہ ناقابل برداشت اور غیر انسانی رویہ اختیار کیا ہے۔ اگر اس مسئلہ کا تعلق کسی اور صوبے سے ہوتا تو مرکزی بورڈ اس قسم کا ظالمانہ رویہ اختیار کرنے کی کبھی جرأت نہ کرتا۔ ہماری یہ رائے ہے کہ مرکزی بورڈ نے صوبائی بورڈ کی 50 فیصد سفارشیں مسترد کر کے نفرت کے بیج بو دیئے ہیں اور سندھ اور اس کے عوام کے خلاف دشمنی کا اظہار کیا ہے۔''[22]

''الوحید کی یہ نکتہ چینی اتنی شدید تھی کہ بعض حلقوں میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ ایوب کھوڑو اور لیاقت علی خان کے درمیان پھر محاذ آرائی شروع ہو جائے گی مگر ایسا نہ ہوا۔ 21 نومبر کو جب وزیر اعظم لیاقت علی خان نے دستور ساز اسمبلی میں مرکزی بورڈ کے منتخب کردہ سات امیدواروں کی نامزدگی کے لئے تحریک پیش کی تو اس پر کوئی لمبی چوڑی بحث نہ ہوئی۔ کھوڑو خاموش رہا البتہ ہاشم گزدر نے قائد ایوان کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی کہ راجپوتانہ کی ریاستوں کے مہاجروں کو شکایت ہے کہ انہیں دستور ساز اسمبلی میں نمائندگی نہیں دی گئی۔ اس پر لیاقت علی خان کا جواب یہ تھا کہ مہاجر نمائندوں کا انتخاب مختلف علاقوں کے مخصوص افراد کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر نہیں کیا گیا۔ چونکہ ہندوستان سے آنے والے سارے علاقوں کے مہاجرین کے مفادات مشترکہ ہیں اس لئے ہم نے علاقائی نمائندگی کے اصول کو پیش نظر نہیں رکھا۔ ہم نے صرف ان امیدواروں کا انتخاب کیا ہے جو ہماری رائے میں سب سے زیادہ موزوں تھے۔ لیاقت علی خان نے کہا کہ ''ہاشم گزدر ان ہتھکنڈوں سے آگاہ ہے جو بعض لوگ اپنے انتخاب یا نامزدگی کے لئے کرتے ہیں۔''[23] لیاقت علی خان کے آخری ریمارک کا اشارہ غالباً اس الزام کی طرف تھا کہ بعض

امیدواروں نے رشوت دے کر صوبائی بورڈ سے اپنے ناموں کی سفارش کروائی تھی۔ تاہم لیاقت علی خان کی اس تقریر کے بعد اس کی تحریک متفقہ طور پر منظور کر لی گئی۔

ایوب کھوڑو اور لیاقت علی خان کے درمیان ازسرنو محاذ آرائی شروع ہونے کا خدشہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد بالکل ہی غلط ثابت ہوا جبکہ کھوڑو نے سندھ کے وزیراعلیٰ قاضی فضل اللہ کے ساتھ مل کر صوبہ کا دورہ کیا اور سندھی زمینداروں سے اپیل کی کہ وہ پنجاب کے فلڈ ریلیف فنڈ کے لئے دل کھول کر چندہ دیں۔ اس نے یکم دسمبر کو حیدرآباد میں اخبارنویسوں کو بتایا کہ وہ اپنے اس دورے میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے جمع کرنے کی امید رکھتا ہے۔ کھوڑو کا یہ دورہ تقریباً ایک ماہ جاری رہا اور اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ سندھ سے پنجاب ریلیف فنڈ کے لئے چندہ جمع کر کے اس صوبہ میں لیاقت علی خان کی انتخابی مہم میں مدد کی جائے۔

جنوری 1951ء کے اوائل میں اس کا یہ دورہ ختم ہوا تو دو ایک ہفتے کے بعد اس مضمون کی خبریں شائع ہونا شروع ہوگئیں کہ لیاقت علی خان اور ایوب کھوڑو میں ملاقات ہوئی ہے جس میں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ مؤخرالذکر دو ایک ماہ میں سندھ کا وزیراعلیٰ بن جائے گا۔ قاضی فضل اللہ ابتداً وزارت اعلیٰ کا عہدہ چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا لیکن اب وہ پاکستان کے وزیراعظم کی خواہش کے مطابق اس عہدہ سے کھوڑو کے حق میں دستبردار ہونے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ کھوڑو کو لیگ اسمبلی پارٹی کا لیڈر منتخب ہونے میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی چونکہ اس نے لیاقت علی خان کو مسلم لیگ کا صدر منتخب کرانے میں اہم کردار ادا کیا تھا اس لئے جب وہ وزیراعلیٰ کا عہدہ سنبھالے گا تو لیاقت کی ہی مثال کے پیش نظر صوبہ لیگ کی صدارت کے عہدہ پر بھی فائز رہے گا۔[24]

لیاقت علی خان، کھوڑو کے ساتھ یہ فیصلہ کرنے کے بعد پنجاب کے انتخابی دورے پر گیا اور وہاں سے جب 7رفروری 1951ء کو واپس کراچی پہنچا تو سندھ ہاری کمیٹی کی طرف سے پورے صوبہ میں ہفتۂ مطالبات منایا گیا۔ ڈان کی رپورٹ کے مطابق ہفتہ کے دوران صوبہ کے چھ اضلاع کے ہر تعلقہ میں ہاریوں کے اجتماعات ہوئے جن میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ جاگیرداری نظام کو ختم کیا جائے۔ سیفٹی ایکٹ کو منسوخ کیا جائے، سارے سیاسی نظربندوں کو رہا کیا جائے اور وہ 50 ہزار ایکڑ اراضی ہاریوں کو رعایتی نرخوں پر دی جائے جو اگلے سال غیر ملکی کمپنیوں کے 20 سال کے پٹہ کی میعاد ختم ہونے پر ''واگزار'' ہوگی، حکومت سندھ نے یہ زمین پہلے ہی بذریعہ نیلام

زمینداروں کو دینی شروع کر دی تھی۔ پاکستان ٹائمز کی اطلاع یہ تھی کہ ہاریوں کے ان جلسوں میں یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ ہاریوں کی بیدخلیاں بند کی جائیں۔ متروکہ زرعی اراضی بے زمین ہاریوں اور غریب مہاجر کاشت کاروں میں تقسیم کی جائے، موجودہ اسمبلی کو توڑ کر بالغ رائے دہی کی بنیاد پر نئے عام انتخابات کرائے جائیں اور برطانوی کامن ویلتھ سے رشتہ توڑ کر پاکستان کو ایک آزاد جمہوری ریاست بنایا جائے۔ پاکستان ٹائمز کی مزید رپورٹ یہ تھی کہ ''ان جلسوں میں عام ہاریوں نے زمینداری نظام کے خلاف سخت نفرت کا اظہار کیا جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ہاریوں میں سیاسی شعور بڑھ رہا ہے اور وہ نہ صرف اپنے معاشی مسائل کے حل کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں بلکہ وہ سندھ کی زندگی میں اپنے سیاسی حقوق منوانے کے بھی خواہاں ہیں۔'' سندھ میں بے زمین ہاریوں کی روزافزوں سیاسی بیداری اور تنظیم کی رپورٹ سے ''قائد ملت'' لیاقت علی خان کے اس فیصلے کو تقویت ملی جو اس نے جنوری 1951ء میں پنجاب کے انتخابی دورے پر روانہ ہونے سے قبل ایوب کھوڑو کو سندھ کا وزیر اعلیٰ بنانے کے بارے میں کیا تھا۔ پاکستان ٹائمز کی رپورٹ کے مطابق اس فیصلہ پر عملدرآمد میں تاخیر محض لیاقت علی خان کی اس رائے کی بنا پر ہو رہی تھی کہ اگرچہ سندھ چیف کورٹ نے ایک قانونی سقم کی بنا پر کھوڑو کے خلاف پروڈا کی کاروائی کو کالعدم قرار دے دیا تھا تاہم گورنر جنرل نے اسے دو سال کے لئے کسی پبلک عہدہ پر فائز ہونے کا نااہل قرار دینے کے سلسلے میں جو حکم صادر کیا تھا اس کی میعاد ختم ہو جائے گی تو پورے ملک کی رائے عامہ کھوڑو کو وزیر اعلیٰ بنانے پر معترض نہیں ہو گی۔ لیاقت علی کے اس فیصلے کو جی۔ ایم۔ سید کی 17 رمارچ کے اس میٹنگ سے بھی تقویت ملی تھی جس میں مسلم لیگ کے خلاف سندھ کی ساری پارٹیوں کا ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس میٹنگ میں متعدد سیاسی کارکنوں سمیت پیر الٰہی بخش نے بھی شرکت کی تھی اور ایک متحدہ نئی پارٹی کے آئین کی ترتیب کے لئے ایک سات رکنی کمیٹی مقرر کی گئی تھی۔ جی۔ ایم۔ سید نے یہ میٹنگ اس خیال سے بلائی تھی کہ سندھ کے آئندہ عام انتخابات میں سندھ کی مخالف پارٹیاں اس طرح منقسم نہ ہوں جس طرح کہ پنجاب کی مخالف پارٹیاں منقسم رہی تھیں۔[25] ڈان کی 23رفروری 1951ء کی رپورٹ کے مطابق سندھ کے عام انتخابات مارچ 1952ء میں کرانے کا فیصلہ ہو چکا تھا اور خیال تھا کہ آئندہ صوبائی اسمبلی کی نشستیں 60 سے بڑھا کر 100 کر دی جائیں گی جن میں سے 16 نشستیں سندھ کے 8 لاکھ مہاجرین کے لئے مخصوص ہوں گی۔

باب: 12

لیاقت علی خان کے سیاسی عزائم
اور کھوڑو......دوبارہ برسرِ اقتدار

کھوڑو کو دوبارہ برسرِ اقتدار لانے میں لیاقت کا کیا مفاد مضمر تھا؟

اخبارات کی کئی دن کی قیاس آرائیوں کے مطابق 25/مارچ 1951ء کو جب پنجاب کے عام انتخابات میں پولنگ ختم ہوئی اور اسی دن کھوڑو کے خلاف متذکرہ حکم کی میعاد ختم ہوئی تو ایوب کھوڑو دوبارہ سندھ کی وزارت اعلیٰ کی گدی پر بیٹھ گیا۔ اس سے دو دن قبل وزیر اعلیٰ قاضی فضل اللہ کے مستعفی ہونے کے بعد لیگ اسمبلی پارٹی نے اس کی جگہ محمد ایوب کھوڑو کو ''متفقہ طور پر'' اپنا قائد منتخب کرلیا تھا۔ کھوڑو کی اس وزارت میں قاضی فضل اللہ کے سارے وزراء شامل تھے۔ ان کے درمیان محکموں کی تقسیم اس طرح تھی:

1۔ وزیر اعلیٰ محمد ایوب کھوڑو	=	سیاسی امور، سروسز اینڈ جنرل ایڈمنسٹریشن، خزانہ، لوئر سندھ بیراج اور اطلاعات۔
2۔ قاضی فضل اللہ	=	داخلہ، قانون اور صنعت۔
3۔ میر غلام علی تالپور	=	مال بشمول جنگلات و آبکاری، لوکل سیلف گورنمنٹ اور امداد باہمی۔
4۔ میران محمد شاہ	=	تعمیرات عامہ اور بحالیات۔
5۔ غلام نبی پٹھان	=	زراعت، خوراک، سول سپلائز، تعلیم اور صحت۔

لیاقت علی خان، ایوب کھوڑو کو اپنے اس منصوبے کے تحت دوبارہ برسر اقتدار لایا تھا کہ پہلے یکے بعد دیگرے ملک کے سارے صوبوں میں انتخابات کرائے جائیں گے اور پھر نئی دستور ساز اسمبلی کا انتخاب ہوگا۔ کھوڑو نے دادو۔ جوہی کے حلقہ اور شہداد کوٹ کمبر کے حلقہ کے دو ضمنی انتخابات میں عملی طور پر ثابت کر دیا تھا کہ وہ سندھ میں لیاقت علی خان کی مسلم لیگ کو سو فیصد کامیاب کرانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ شہداد کوٹ۔ کمبر کے حلقہ میں ضمنی انتخاب مارچ 1951ء کے تیسرے ہفتہ میں ہوا تھا اور اس انتخاب میں ایوب کھوڑو کا ''کارنامہ'' دادو۔ جوہی کے حلقہ کے ضمنی انتخاب کے ''کارنامے'' سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ دادو۔ جوہی کے حلقہ میں تو کھوڑو نے اپنے برادر نسبتی عبداللطیف کے دو مخالف امیدواروں کو نظر بند کرنے کے علاوہ پیر الٰہی بخش کے 27 سالہ بیٹے پیر شاہ نواز کے ''طبی معائنہ'' کے ذریعے ثابت کرایا تھا کہ اس کی عمر میٹرک کے سرٹیفکیٹ کے مطابق 27 سال ہونے کے باوجود ''دراصل'' 22 سال ہے اور اس بنا پر وہ انتخاب میں حصہ نہیں لے سکتا لیکن شہداد کوٹ کے حلقہ میں اس نے اپنے ایک 17 سالہ زمیندار کو جعلی سرٹیفکیٹوں کے ذریعے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اسکی عمر 25 سال ہے اور وہ انتخاب میں حصہ لے سکتا ہے۔ اس کا یہ منظور نظر امیدوار شہداد کوٹ کے ایک بہت بڑے جاگیردار کا نوعمر بیٹا احمد سلطان چانڈیو تھا۔ اسکے مقابلے میں مشہور ہاری لیڈر حیدر بخش جتوئی تھا۔ لاہور کے اخبار امروز کی ایک رپورٹ کے مطابق کھوڑو اپنے اس امیدوار کے حق میں تقریروں میں جاگیرداروں اور زمینداروں سے یہ کہتا تھا کہ ''اس ضمنی انتخاب پر مسلم لیگ کی زندگی و موت کا انحصار ہے۔'' صوبہ لیگ نے چانڈیو کی انتخابی مہم پر تقریباً 50 ہزار روپے خرچ کئے تھے اور اسکے کارکنوں نے پورے علاقے میں دہشت پھیلا دی تھی۔ لیگ کے ان کارکنوں کے علاوہ پولیس کے اہلکار بھی ہاری کارکنوں پر تشدد کرتے تھے حتیٰ کہ وہ طالب علموں کو بھی ڈراتے دھمکاتے تھے کہ وہ حیدر بخش کی انتخابی مہم میں حصہ نہ لیں۔[1]

14 / مارچ 1951ء کو اس حلقے میں پولنگ شروع ہوئی تو اس کے دو دن بعد 16 / مارچ کو کھوڑو نے خود ہی نتیجہ کا اعلان کر دیا۔ اس نے کراچی میں اخبار نویسوں کو بتایا کہ شہداد کوٹ کے حلقہ کے ضمنی انتخاب میں مسلم لیگی امیدوار کم از کم 90 فیصد ووٹ حاصل کرے گا۔ اس نے بتایا کہ 14 / مارچ کو اس کی شہداد کوٹ کے حلقہ سے روانگی سے قبل 21 / ہزار ووٹ ڈالے جا چکے تھے جن میں میں کم از کم 90 فیصد مسلم لیگی امیدوار کو ملے اور ہاری لیڈر حیدر بخش جتوئی نے 10 فیصد سے بھی

کم ووٹ حاصل کئے تھے۔[2]

20 رمارچ کو اس معرکہ کے نتیجہ کا سرکاری طور پر اعلان ہوا تو معلوم ہوا کہ کھوڑو کی پیشین گوئی بالکل صحیح تھی۔ بے چارہ حیدر بخش جتوئی ہاریوں کی سالہا سال خدمت کرنے کے باوجود 10 فیصد ووٹ بھی حاصل نہ کر سکا۔ یہ کھوڑو کا ''عظیم کارنامہ'' تھا۔ تاہم جتوئی نے اس ''انتخاب'' کے بعد کراچی میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کھوڑو کی مسلم لیگ اور قاضی فضل اللہ کی انتظامی مشینری پر انتخابی دھاندلیوں کے سنگین الزامات لگائے۔ اس نے کہا کہ یہ ضمنی انتخاب خلاف قاعدہ، غیر آئینی اور غیر جمہوری ہے۔ پہلے تو ایک نا بالغ جاگیردار کو جعلی سرٹیفکیٹوں کے ذریعے بالغ ثابت کر کے میرے مقابلے میں امیدوار کھڑا کیا گیا تھا، پھر انتخابی مہم کے دوران بہت سے ہاری لیڈروں اور کارکنوں کو زدوکوب کیا گیا اور رائے دہندگان میں دہشت پھیلائی گئی اور جب پولنگ ہوئی تو سرکاری حکام نے نہ صرف ہاری ایجنٹوں کو دھمکیاں دیں بلکہ ہاری ووٹروں سے کہا کہ اگر انہوں نے لیگی امیدوار چانڈیو کے حق میں ووٹ نہ دیئے تو انہیں جیل بھیج دیا جائے گا۔ سرکاری حکام نے چانڈیو کے جعلی ووٹروں کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی۔ چنانچہ بہت سے ایسے اشخاص کے بھی ووٹ ڈال دیئے گئے جو مدت ہوئی مر چکے ہیں۔ مزید برآں زمینداروں نے اپنے ہاریوں سے پرچیاں لے کر خود بکسوں میں ڈالیں جبکہ بے زبان ہاری حیرت زدہ ہو کر ان کا منہ دیکھتے رہے۔ جتوئی نے کہا کہ ''میں نے جو الزامات عائد کئے ہیں میرے پاس ان کے دستاویزی ثبوت موجود ہیں اور میں ان دستاویزات کی بنیاد پر انتخابی عذرداری دائر کر دوں گا۔''[3]

لیکن ستم ظریفی یہ تھی کہ جس دن حیدر بخش جتوئی نے شہداد کوٹ میں انتخابی دھاندلیوں کے یہ الزامات عائد کئے اس کے دو دن بعد کراچی کے گورنر ہاؤس میں ایوب کھوڑو کی نئی وزارت نے حلف وفاداری اٹھایا اور اسی دن یہ سرکاری اعلان ہوا کہ سندھ میں بالغ رائے دہندگی کے حق کی بنیاد پر عام انتخابات کرائے جائیں گے۔ بظاہر اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ صوبائی انتخابات سے پہلے وزارت اعلیٰ کی گدی سنبھالنے کی مطلوبہ شرائط پر پورا اترا تھا۔ اس نے دو ضمنی انتخابات میں مسلم لیگی امیدواروں کو کامیاب کرانے کے لئے عظیم کارنامے دکھائے تھے۔ اس نے کراچی کی سندھ سے علیحدگی کے خلاف ایجی ٹیشن ختم کر دی تھی۔ وہ اس فیصلے کو بھی برقرار رکھنے کے حق میں ہو

گیا تھا جو پیر الٰہی بخش کے عہد اقتدار میں اردو زبان کو سندھ کے سکولوں میں رائج کرنے کے بارے میں کیا گیا تھا۔ اس نے کراچی کے اردو کالج کا سندھ یونیورسٹی کے ساتھ الحاق بھی کروا دیا تھا۔ مہاجرین کی آبادکاری کے بارے میں بھی اسکے رویے میں بہت نرمی آ گئی تھی۔ بالخصوص وہ یو۔ پی اور حیدر آباد (دکن) کے ''خاندانی رئیسوں'' کو 250 ایکڑ فی کس کے حساب سے زمین الاٹ کرنے کے خلاف نہیں رہا تھا۔ اب وہ ان نئے زمینداروں کو سندھ کے بے زمین ہاریوں اور دوسرے غریب عوام کے خلاف اپنا طبقاتی اور سیاسی حلیف تصور کرتا تھا اور اس نے پنجاب کے عام انتخابات میں بھی لیاقت علی خان کی مسلم لیگ کی ہر ممکن طریقے سے امداد کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان ساری باتوں کے بدلے میں لیاقت علی خان نے کھوڑو کا یہ مطالبہ منظور کر لیا تھا کہ آئندہ انتخابات میں مہاجرین کے لئے نشستیں مخصوص نہیں ہوں گی، انتخابی حلقوں کی حد بندی اسکی مرضی کے مطابق ہوگی اور شہری اور دیہاتی علاقوں کے لئے الگ الگ انتخابی حلقے ہوں گے۔ سندھ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے 18 / مارچ کو اس سلسلے میں تجاویز مرتب کرنے کے لئے ایوب کھوڑو کی زیر صدارت ایک سات رکنی کمیٹی مقرر کی تھی جس میں اسمبلی کے سپیکر آغا بدر الدین کے علاوہ قاضی فضل اللہ اور میر غلام علی تالپور بھی شامل تھے۔ پنجاب اسمبلی میں مشرقی پنجاب کے مہاجرین کے لئے 40 نشستیں مخصوص کی گئی تھیں مگر سندھی وڈیرے اپنے علاقے میں آباد شدہ مہاجروں کو یہ رعایت دینے پر آمادہ نہیں تھے۔

27 / مارچ کو سندھ کے نئے وزیر اعلیٰ ایوب کھوڑو نے کراچی میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ ''انشاء اللہ صوبہ میں جاگیرداری آئندہ سال عام انتخابات سے پہلے ختم کر دی جائے گی۔ یہ عام انتخابات منصفانہ ہونگے اور ان میں حصہ لینے کے لئے حزب اختلاف کا وجود ہونا چاہیے۔'' اس نے ہاریوں کو یقین دلایا کہ وہ ان کے مسائل سے بے خبر نہیں ہے اور اسے معلوم ہے کہ بعض کاشت کاروں کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا۔ تاہم اس نے امید ظاہر کی کہ قانون مزارعت کے نفاذ کے بعد ان کی بہت سی مصیبتیں ختم ہو جائیں گی۔ اس نے مہاجرین کو بھی یقین دلایا کہ اگر انہوں نے اپنے ہر قسم کے حقوق کا مطالبہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ذمہ داریوں کے احساس کا بھی مثبت ثبوت مہیا کیا تو صوبائی حکومت انکی بھرپور امداد کرے گی لیکن اس کے اگلے دن 28 / مارچ کو وہ کراچی کے روٹری کلب میں تقریر کرتے ہوئے اپنی

پریس کانفرنس میں کہی ہوئی کئی باتوں سے منحرف ہو گیا۔ اس نے کہا کہ "سندھ میں ہاریوں کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ مسئلہ صرف بعض اخبارات کے دفتروں میں پایا جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ کوٹڑی بیراج کی تکمیل کے بعد وسیع رقبہ زیر کاشت آئے گا اور اس پر کام کرنے کے لئے تقریباً پانچ لاکھ خاندانوں کی ضرورت ہوگی۔ سندھ میں کاشت کاروں کی کمی ہے اور "بے چارے زمیندار" اب بھی ہاریوں کی خدمات حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر کوشش کرتے رہتے ہیں"[4] کراچی میں مقیم پرانے اور نئے زمیندار ایوب کھوڑو کی اس تقریر سے بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اپنی اس خوشی کا عملی اظہار 2 / اپریل کو کیا جبکہ انہوں نے کھوڑو کو کراچی کلب کا دوبارہ صدر منتخب کر لیا۔ انہیں 3 / اپریل کو مزید خوشی ہوئی جبکہ کھوڑو کی حکومت نے سندھ فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز کی ضلع دادو میں مزید ایک سال کے لئے توسیع کر دی۔ اس کی سرکاری وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ اس ضلع میں مختلف قبائل کی مجرمانہ سرگرمیاں جاری تھیں لیکن اصلی وجہ یہ تھی کہ اس ضلع میں ہاریوں کی تحریک زور پکڑ رہی تھی اور سندھ کے پرانے اور نئے زمینداروں کی نظر میں یہ ایک ناقابل معافی جرم تھا۔

10 / اپریل کو سندھ کی حکومت نے ایک سرکاری گزٹ میں بتایا کہ صوبہ کی آئندہ اسمبلی کی 107 نشستیں ہوں گی جن میں 6 جنرل ہوں گی اور 3 مسلمان عورتوں کے لئے مخصوص ہوں گی۔ اس گزٹ میں مہاجرین کی نشستوں کی تخصیص کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ بعض مہاجر حلقوں نے اس فیصلہ پر کچھ واویلا کیا مگر انکی شنوائی نہ ہوئی کیونکہ ان کا "قائد ملت" سندھ کے "مرد آہن" سے سمجھوتہ کر چکا تھا کہ سندھ اسمبلی میں مہاجروں کے لئے الگ نشستیں نہیں ہوں گی۔ جب 12 / اپریل کو دستور ساز اسمبلی میں بالغ حق رائے دہندگی کی بنیاد پر جداگانہ نیابت کے اصول کے تحت انتخابات کرانے کا بل پیش ہوا تو احمد جعفر اور عبدالوحید خان وغیرہ نے مہاجروں کے لئے الگ نشستوں کا مطالبہ کیا مگر وزیر قانون پیرزادہ عبدالستار نے اس مطالبہ کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ جو لوگ یہ مطالبہ کرتے ہیں وہ مہاجرین کے بہی خواہ نہیں ہیں۔ انہیں سندھ کے حالات کا پتہ نہیں ہے۔ یہاں سارے مہاجرین متروکہ جائیدادوں پر آباد ہوئے ہیں۔ لہٰذا سندھ میں پہلے ہی یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ یہ مہاجر دراصل ہندوؤں کے جانشین ہیں اور اس بنا پر انکے خلاف غصہ کے جذبات موجود ہیں۔ سندھیوں کا خیال ہے کہ یہ مہاجرین ایسے ہی ان کا خون پئیں گے جیسے کہ

ہندو پیا کرتے تھے۔ اگر صوبہ میں سندھیوں اور مہاجروں کے درمیان یہ تضاد برقرار رہنے دیا گیا تو یہ بات سندھ اور پاکستان کے لئے انتہائی خطرناک ہوگی۔ مہاجروں کے لئے بہترین بات یہ ہوگی کہ وہ اپنے آپ کو سندھ کے عوام میں مدغم کریں۔ [5] پیرزادہ کی اس تقریر کے بعد یہ بل منظور ہو گیا اور اس طرح سندھ میں عام انتخابات کے لئے سیاسی اور آئینی زمین ہموار ہو گئی تو 20 / اپریل کو کھوڑو نے حیدر آباد میں اعلان کیا کہ اس کی حکومت سندھ میں مقیم مہاجرین کے مفاد کا پورا تحفظ کرے گی۔ اپریل کے اواخر میں وزیر اعلیٰ کھوڑو نے صوبہ کی پریس ایڈوائزری کمیٹی کی از سرنو تشکیل کی۔ یہ کمیٹی دراصل پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز کونسل کے صدر پیر علی محمد راشدی کے مشورے کے مطابق اپریل 1950ء میں قائم کی گئی تھی مگر اب کھوڑو نے راشدی سے مشورہ کئے بغیر اس کے ارکان میں ردوبدل کر دیا تھا تا کہ اس کمیٹی کی سفارشات وزیر اعلیٰ کی خواہشات کے عین مطابق ہوں۔ چنانچہ اس کمیٹی کی پہلی سفارش یہ تھی کہ کراچی کے اردو اخبارات امروز اور انجام کو کراچی انتظامیہ کی وساطت سے متنبہ کیا جائے کہ وہ حکومت سندھ کے خلاف پروپیگنڈا بند کریں اور اس کی دوسری سفارش یہ تھی کہ روزنامہ ''حریت'' کا صوبہ سندھ میں داخلہ بند کر دیا جائے۔ پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز کونسل کے قائم مقام صدر مولانا اختر علی خان اور روزنامہ ڈان کے ایڈیٹر الطاف حسین نے کھوڑو حکومت کے اس اقدام پر سخت احتجاج کیا لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا کیونکہ پریس ایڈوائزری کمیٹی کی تشکیل نو کے ذریعے دراصل عام انتخابات کے لئے صحافتی تیاری کی گئی تھی اور وزیر اعظم لیاقت علی خان کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ''آزادیٔ صحافت'' کو سندھ کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کی کامیابی کے راستے میں رکاوٹ بننے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔

کھوڑو نے فوج میں سندھ رجمنٹ کی تشکیل کے لئے سکندر مرزا سے ملاقات کی

4 / مئی کو سندھ کے وزیر اعلیٰ ایم۔ اے کھوڑو نے اپنے وزیر داخلہ قاضی فضل اللہ کے ہمراہ حکومت پاکستان کے ڈیفنس سیکرٹری سکندر مرزا سے ایک اہم ملاقات کی جس میں اس مطالبہ پر غور کیا گیا کہ پاکستان آرمی میں ایک سندھ رجمنٹ کی تشکیل کی جائے۔ اس ملاقات کے بعد

اخبارات کو بتایا گیا کہ اس ملاقات میں جو بات چیت ہوئی وہ ابتدائی نوعیت کی تھی۔اس مسئلہ پر مفصل بحث بعد میں ہوگی۔[6]

کھوڑو کے اس مطالبہ کا پس منظر یہ تھا کہ سندھ میں قیام پاکستان کے فوراً ہی بعد یہ محسوس کیا جانے لگا تھا کہ سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کے تحفظ کے لئے ضروری ہے کہ پاکستان کی افواج میں سندھیوں کی نمائندگی ہو۔ 1947ء سے قبل برطانوی سامراجیوں کی فوج میں سندھیوں کی نمائندگی نہ ہونے کی دو تین وجوہ تھیں۔ایک وجہ تو یہ تھی کہ سندھی عوام میں کئی سو سال سے فوج میں بھرتی ہونے کی روایت نہیں تھی۔ان کے پاس زمین بہت تھی اور پانی کی بھی کمی نہیں تھی اس لئے پیشۂ سپاہ گری کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ سندھ کے میروں نے اپنے علاقے میں انگریزوں کی آمد سے قبل سکھوں، مرہٹوں اور دوسرے مقامی حکمرانوں کی طرح اپنی فوج کی تربیت کے لئے فرانسیسیوں، اطالویوں اور دوسرے یورپی ماہرین فن حرب کی خدمات حاصل نہیں کی تھیں۔ انہوں نے کبھی اپنی کوئی باقاعدہ فوج رکھی ہی نہیں تھی۔ چنانچہ 1843ء میں جب جنرل نیپئر (Napier) نے سندھ پر حملہ کیا تو اس کی کوئی خاص مزاحمت نہیں ہوئی تھی۔میروں نے اس سے جو لڑائیاں لڑی تھیں ان میں سندھی عوام نے کوئی کردار ادا نہیں کیا تھا۔میروں کے لشکر پچاس ساٹھ ہزار غیر منظم اور غیر تربیت یافتہ بلوچ قبائلیوں پر مشتمل تھے جنہیں انگریزوں کی تقریباً دس ہزار تربیت یافتہ فوج نے بآسانی شکست دے دی تھی۔دوسری وجہ یہ تھی کہ سندھ میں 1892ء میں حروں کی بغاوت کے بعد برطانوی سامراج کو سندھی مسلمانوں کی وفاداری کے بارے میں اسی طرح کا شبہ ہو گیا تھا جس طرح کہ اسے بنگالی مسلمانوں کے بارے میں تھا۔لہٰذا وہ سندھیوں کو اپنی فوج میں بھرتی نہیں کرتا تھا اور اس مقصد کے لئے شمال مغربی ہندوستان میں وہ زیادہ تر پنجابیوں کی وفادار ''مارشل قوم'' پر انحصار کرتا تھا۔تیسری وجہ یہ تھی کہ 1947ء کے بعد حکومت پاکستان نے بھی برطانوی سامراج کی اسی پالیسی کو جاری رکھا تھا۔ 1950ء کے اواخر تک حکومت پاکستان کی تینوں افواج کے سربراہ انگریز تھے اور انہوں نے کبھی بھی پاکستان کی قومی افواج میں سندھیوں کو نمائندگی دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

20/اپریل 1949ء کو لاڑکانہ میں مرکزی وزیر مواصلات عبدالرب نشتر کی زیر صدارت سندھ مسلم لیگ کی دو روزہ کانفرنس کے دوران قاضی فضل اللہ نے اپنی تقریر میں یہ

پرزور مطالبہ کیا تھا کہ ''سندھیوں کو پاکستانی فوج میں بھرتی کیا جائے کیونکہ ان میں اچھا سپاہی بننے کی ساری صلاحیتیں موجود ہیں'' مگر کسی نے اس مطالبہ پر توجہ نہ دی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سندھیوں کے لئے مرکزی سول سروسز کی طرح ملٹری سروسز کے دروازے بھی بدستور بند رہے۔ 17رجنوری 1951ء کو پاکستانی فوجی افسر جنرل محمد ایوب خان، انگریز کمانڈر انچیف کی سفارش پر کمانڈر انچیف بنا تو اس نے بھی برطانوی سامراج کے ''مارشل قوم'' کے تصور کی پوری طرح پابندی کی۔ وہ سندھیوں اور بنگالیوں کو پاکستانی افواج میں بھرتی کے قابل ہی نہیں سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سندھ اور بنگال کے عوام کی صحت، جسمانی قدوقامت اور تعلیم وتربیت ایسی نہیں کہ انہیں پاکستان کی قومی افواج میں بھرتی کیا جائے۔ پاکستانی کمانڈر انچیف کے اس فاشسٹ اور سامراجی اندازِ فکر کے پیشِ نظر سندھیوں کو بڑی مایوسی ہوئی چنانچہ سندھ مسلم لیگ کی کونسل نے 19رمارچ کو ایک قرارداد میں اس مطالبہ کا اعادہ کیا کہ پاکستانی فوج میں سندھیوں کو بھرتی کیا جائے اور کھوڑو نے اپنی دو ایک تقریروں میں سندھ رجمنٹ کی تشکیل کی بھی تجویز پیش کی مگر کسی کے کان پر جوں نہ رینگی۔ سندھ لیگ کونسل کی اس قرارداد کی بنیاد اس حقیقت پر تھی کہ جب 10رمارچ 1951ء کو راولپنڈی سازش کا انکشاف ہوا تھا تو سندھیوں، بنگالیوں، بلوچوں اور پٹھانوں میں جائز طور پر یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ زود یا بدیر ان پر پنجاب کی فوجی آمریت مسلط ہو جائے گی۔ ملک فیروز خان نون مئی 1948ء میں ہی دستور ساز اسمبلی میں اس قسم کی دھمکی دے چکا تھا اور مارچ۔ اپریل 1949ء میں مغربی پاکستان کے سارے صوبوں کو مدغم کر کے ''پنجابی سلطنت'' یا ون یونٹ قائم کرنے کی پروپیگنڈا مہم بھی شروع کی گئی تھی۔ کھوڑو اور قاضی فضل اللہ کی مرکزی سیکرٹری ڈیفنس سکندر مرزا سے ملاقات کی بنیاد ''پنجابی آمریت'' کے اسی خطرے پر تھی۔ مزید برآں اس مطالبہ کے ذریعے سندھ کے درمیانہ طبقہ کو یہ یقین دلانا مقصود تھا کہ ایوب کھوڑو بدستور سندھی حقوق و مفادات کا علمبردار ہے اس لئے سندھیوں کو اسکی تائید وحمایت جاری رکھنی چاہیے۔

ہاری رہنماؤں کی نظر بندی اور شدید عوامی ردعمل

کھوڑو نے انتخابی تیاریوں کے سلسلے میں 7رمئی 1951ء کو صوبہ کے لئے کئی ترقیاتی سکیموں کا اعلان کیا۔ اس نے بتایا کہ ''صوبائی حکومت نے چھ سالہ ترقیاتی منصوبہ بنایا ہے۔

مرکزی حکومت کو اس منصوبے کی تکمیل کے لئے 10 کروڑ روپے دینے چاہئیں۔ تین کروڑ روپے زرعی ترقیاتی سکیموں پر خرچ ہو گے اور تقریباً ایک کروڑ روپے کی رقم حیدر آباد کے نزدیک مہاجرین کے لئے نئی بستیوں کی تعمیر پر خرچ ہوں گی۔ مرکزی حکومت اس مقصد کے لئے 47 لاکھ روپے دے گی۔'' اس خوش کن اعلان کے دو دن بعد وزیر اعلیٰ ایوب کھوڑو نے ہاری کمیٹی کے صدر حیدر بخش جتوئی اور اس کے دو سینئر ساتھیوں کو سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیا۔ لاہور کے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ کا ہاری لیڈروں کی گرفتاری پر تبصرہ یہ تھا کہ ''ایک طرف تو وزیر اعلیٰ کھوڑو ہاریوں کے مسئلہ کے وجود سے ہی انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ مسئلہ محض اخبارات کا پیدا کردہ ہے اور دوسری طرف وہ ہاری کمیٹی کے ممتاز لیڈروں کو گرفتار کر کے بالواسطہ طور پر یہ اعتراف کرتا ہے کہ ہاریوں کا مسئلہ موجود ہے۔ سندھ کے وزیر اعلیٰ کو غالباً ہاریوں کے خلاف اپنے پروپیگنڈے کے بھونڈے پن کا احساس نہیں ہے۔ اس کی اس بے حسی سے نہ صرف اس کی حکومت کو بلکہ قوم کو بھی نقصان پہنچے گا۔ اگر ایک خطرناک مسئلہ کے وجود سے انکار کیا جائے یا اس کے حال کو پس پشت ڈالا جائے تو یہ بات اس امر کی علامت ہوتی ہے کہ یا تو حکومت نااہل ہے یا اس کا رویہ مطلق العنانیت کا ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں اس کا غیر مقبول ہو جانا ناگزیر ہے۔ کھوڑو ہاریوں کے بارے میں یہ رویہ اختیار کر کے اس حقیقت کو نظر انداز کر رہا ہے کہ قائداعظم ہاریوں کی فلاح و بہبود کے بے حد خواہاں تھے۔ اگر وہ زندہ رہتے تو انہوں نے اب تک یقیناً اس مسئلے کو حل کروا دیا ہوتا۔''[7]

سندھ ہاری کمیٹی کے سیکرٹری عبدالستار نے ہاری لیڈروں کی نظر بندی پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ ''کسی تخریبی کاروائی میں مصروف نہیں تھے۔ غالباً حکومت کو اس سلسلے میں کوئی غلط اطلاع ملی ہے۔'' قاضی مجتبیٰ کی رائے یہ تھی کہ ''ہاری لیڈروں کی گرفتاری سے ہاری کمیٹی اور مسلم لیگ کے درمیان مفاہمت کے امکانات کو نقصان پہنچا ہے۔'' پیر الٰہی بخش کا الزام یہ تھا کہ ''کھوڑو حکومت نے یہ گرفتاریاں آئندہ انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کی غرض سے کی ہیں۔ وہ اور اس کی پارٹی عام انتخابات سے پہلے ایسے ''غیر جمہوری'' طریقوں سے عوام الناس کو دبانا چاہتے ہیں۔ لیکن ملک کے تمام آزادی پسند عناصر ان کے ان مظالم کی سارے آئینی طریقوں سے مخالفت کریں گے'' اور میر علی احمد تالپور کا خیال یہ تھا کہ وزیر اعلیٰ کو ''سندھ کے بے رکاوٹ سیاسی

ارتقا کے مفاد میں ہاری لیڈروں کو رہا کر دینا چاہیے۔ سندھ کے دیہاتی علاقوں کے حالات معمول کے مطابق ہیں لہٰذا کسی ہنگامی اقدام کی ضرورت نہیں'' لیکن تالپور وغیرہ کو اس وقت تک غالباً یہ معلوم نہیں تھا کہ ایوب کھوڑو کے نزدیک سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے اخلاقی و جمہوری اقدار کے کوئی معنی نہیں تھے۔

20 رمئی کو حکومت پاکستان نے سندھ میں انتخابی حلقوں کی حد بندی کی سکیم تیار کرنے کے لئے اعلیٰ حکام کی ایک کمیٹی مقرر کی اور اسے ہدایت کی کہ وہ ایک ماہ کے اندر اپنی ابتدائی رپورٹ پیش کر دے۔ 24 رمئی کو سندھ کریمینل ٹرائبز ایکٹ (Sindh Criminal Tribes Act) پر نظر ثانی کرنے والی کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ پیر پگاڑو کی گدی اس کے کسی ایک بیٹے کے سپرد کر دی جائے۔ ابتداً ایوب کھوڑو اس کمیٹی کا سربراہ تھا لیکن بعد میں ہاشم گزدر نے یہ ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ اب اس کی اس سفارش کا مقصد یہ تھا کہ آئندہ انتخابات میں پیر پگاڑو کے عقیدت مندان مسلم لیگ کی حمایت کریں گے۔ کھوڑو کے 25 رمئی کے ایک انٹرویو کے مطابق یہ انتخابات دسمبر 1951ء میں متوقع تھے اور خیال یہ تھا کہ صوبائی گورنر اگست میں صوبائی اسمبلی کے سیشن کے بعد اسے توڑ دے گا۔ لیکن پھر 6 رجون کو ایوب کھوڑو نے کراچی میں ایک پریس کانفرنس کو بتایا کہ نظر ثانی شدہ پروگرام کے تحت عام انتخابات فروری اور مارچ 1952ء میں ہوں گے۔ اس نے بتایا کہ ان انتخابات میں مسلم لیگ کو بھاری کامیابی حاصل ہو گی اور اسکے 50 فیصد امیدوار ''بلا مقابلہ'' کامیاب ہو جائیں گے۔ اس نے مزید کہا کہ جس دن جی۔ ایم سید نے 30 نشستیں حاصل کر لیں وہ دن مسلم لیگ کے لئے برا دن ہو گا۔''[8]

ایوب کھوڑو کے آمرانہ دعوے پر یوسف ہارون کے اخبار ''ڈان'' نے 10 رجون کو ادارتی تبصرہ کیا۔ اداریہ میں اس حقیقت کی نشاندہی کی گئی تھی کہ ''سندھ میں وسیع پیمانے پر یہ تاثر پیدا ہو گیا ہے کہ اگر اوپر تلے تین تاج پہننے والے کے چبوترے پر خوشبو کی دھونی کی جائے تو سیاسی اور دوسری ہر قسم کی ترجیحات حاصل کی جا سکتی ہیں اور وسیع حلقوں میں یہ باور بھی کیا جاتا ہے کہ مرکز نے اس شخص کی بہر قیمت حمایت کرنے کا فیصلہ کیا ہوا ہے۔ بلاشبہ مؤخر الذکر تاثر مفاد پرست پارٹیوں نے پھیلایا ہے لیکن اسے غلط نہیں کہا جا سکتا یہ تاثر یقینا موجود ہے اور جس طریقے سے سندھ کے معاملات کو نبٹانے کی اجازت دی جا رہی ہے اس سے اس تاثر کی تائید ہوتی ہے۔

جب صوبہ میں قاضی فضل اللہ وزیر اعلیٰ تھا تو صوبہ مسلم لیگ نے حکومت کی کارگزاری کی نگرانی کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی تھی لیکن جونہی کھوڑو وزیر اعلیٰ بنا تو لیگ نے انتہائی فرمانبرداری کے ساتھ راتوں رات یہ فیصلہ کیا کہ اب حکومت کی نگرانی کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا یہ کمیٹی ختم کر دی گئی۔ آج کل سندھ پروانشل مسلم لیگ کی تنظیم کچھ اسی قسم کی ہے۔ چنانچہ یہ سوال بالاصرار پوچھا جارہا ہے کہ آیا صوبائی مسلم لیگ کی موجودہ قیادت آئندہ انتخابات جمہوریت کی حقیقی روح کے مطابق کروا سکے گی کیونکہ دادو۔ جوہی اور شہداد پور۔ کمبر کے حلقوں کے ضمنی انتخابات میں اس قیادت کا کردار غیر اخلاقی تھا اور اس نے کسی اصول اور قاعدے کا خیال نہیں کیا تھا۔ اس صورت حال کے مضمرات اتنے دوررس ہیں کہ اگر مرکزی لیگ کو اسے نظر انداز کرنے کا مشورہ دیا گیا تو وہ بہت ہی برا اور خطرناک ہوگا۔''[9] اس اداریے میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ اس کا مفہوم بالکل واضح تھا اور وہ یہ تھا کہ لیاقت علی خان نے ایوب کھوڑو سے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے اس لئے وہ اسکی ساری بدعنوانیوں اور زیادتیوں کو نظر انداز کر رہا ہے۔ اس گٹھ جوڑ کے نتیجے میں جو عام انتخابات ہوں گے ان میں ایسی ہی دھاندلی ہوگی جیسی کہ دادو۔ جوہی اور شہداد پور۔ کمبر کے حلقوں کے ضمنی انتخاب میں کی گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کھوڑو متوقع انتخابات کے نتائج کے بارے میں پہلے ہی سے بلند بانگ دعوے کر رہا تھا اور اپنے پچاس فیصد امیدواروں کو اسی طرح ''بلا مقابلہ'' منتخب کروانے کا عزم رکھتا تھا جس طرح کہ اس نے دادو۔ جوہی کے ضمنی انتخاب میں اپنے برادر نسبتی کو ''بلا مقابلہ'' کامیاب کروایا تھا۔

جی۔ ایم۔ سید کی ''عوامی جماعت'' کا قیام اور نوائے وقت کی جی۔ ایم۔ سید کے بارے میں قلابازی

بایں ہمہ 16 رجون کے نوائے وقت میں یہ خبر شائع ہوئی کہ سندھ میں ایک نئی اپوزیشن پارٹی ''عوامی جماعت'' کے نام سے معرض وجود میں آرہی ہے۔ یہ جماعت آئندہ انتخابات میں مسلم لیگ کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرے گی۔ اسکے قائد مسٹر۔ جی۔ ایم سید سابق صدر مسلم لیگ سندھ اور سابق ممبر مجلس عاملہ آل انڈیا مسلم لیگ ہیں۔ پیر الٰہی بخش سابق وزیر اعلیٰ سندھ اور کنوینر جناح عوامی مسلم لیگ اور شیخ عبدالمجید سندھی ان کے رفقائے کار ہیں۔ مسٹر سید نے اس سلسلے میں مسٹر حسین شہید سہروردی سے بھی کئی ملاقاتیں کی ہیں۔ پارٹی کے منشور میں کہا گیا ہے کہ

''مسلم لیگ عوام کے مسائل کو حل کرنے میں ناکام رہی ہے اور اب اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ مسلم لیگ چند نشۂ اقتدار میں پاگل افراد کی لونڈی بن کر رہ گئی ہے اور اس نے رواداری اور برداشت کی سپرٹ کو ختم کر دیا ہے۔ نئی پارٹی کا نصب العین یہ ہے کہ پاکستان برطانوی دولت مشترکہ سے باہر ایک آزاد جمہوری ریاست ہو اور پاکستان کے اندر خود مختار عوامی جمہوریتوں کی فیڈریشن ہو۔'' مزید بتایا گیا تھا کہ ''نئی پارٹی کے پروگرام میں ریاستوں کا خاتمہ، جاگیرداروں کا خاتمہ، تمام سرکاری زمینوں کی مفت تقسیم، بڑی زمینداریوں میں ایسی تخفیف کہ زمیندار کے پاس معقول زندگی بسر کرنے کے لئے کم از کم زمین رہ جائے اور صنعتوں کی نیشنلائزیشن شامل ہیں۔ نئی پارٹی سیفٹی ایکٹ، فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز اور ایسے تمام قوانین کے خلاف ہے۔''[10]

مسلم لیگ کے خلاف ساری مخالف پارٹیوں کا متحدہ محاذ بنانے کے بارے میں جی۔ ایم۔ سید کی یہ کوشش کوئی پہلی کوشش نہیں تھی اور نہ ہی اسکے سیاسی نظریہ میں پہلی مرتبہ کوئی بنیادی تبدیلی آئی تھی۔ اس نے مسلم لیگ کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کی پہلی کوشش خان عبدالغفار خان کے ساتھ مل کر 8/مارچ 1948ء کو کی تھی جبکہ اس نے اپنی عوامی تنظیم کے منشور کا اعلان کیا تھا۔ اس منشور کا بھی بنیادی نکتہ یہ تھا کہ پاکستان برطانوی دولت مشترکہ سے باہر ایک آزاد جمہوری ریاست ہو اور پاکستان کے اندر خود مختار عوامی جمہوریتوں کی فیڈریشن ہو مگر نوائے وقت نے 11/مارچ کو اس کوشش کی شدید الفاظ میں مذمت کر کے جی۔ ایم۔ سید اور اس کے ساتھیوں کو ''کھوٹے سکے'' اور ''دشمنان ملک وملت'' قرار دیا تھا اور اس امر کی نشاندہی کی تھی کہ ''عبدالمجید سندھی اور جی۔ ایم سید نے آخری چند سالوں میں پاکستان کی شدید مخالفت کی ہے اور آج کل سندھ میں غیر سندھی مسلمانوں کے خلاف منافرت کی تحریک کے علمبردار یہی دو اصحاب ہیں۔'' اس وقت نوائے وقت کے اس رویے کی وجہ یہ تھی کہ قائداعظم زندہ تھے اور پنجاب کے سرمایہ دار اور درمیانہ طبقوں کے وزیراعظم لیاقت علی خان اور اس کے ''حلیفوں'' کے ساتھ تضاد میں شدت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا وہ کسی جانب سے بھی مسلم لیگ کی مخالفت برداشت نہیں کرتا تھا اور ملک میں یک جماعتی اور وحدانی نظام حکومت کا علمبردار تھا۔

جی۔ ایم۔ سید نے اس سلسلے میں دوسری کوشش اکتوبر 1950ء کے دوسرے ہفتے میں کی تھی جبکہ اس نے دادو۔ کوٹری کے حلقے سے ضمنی انتخابات لڑنے کے لئے وزیراعلیٰ قاضی فضل اللہ

سے بات چیت کی تھی۔ اس کی اس بات چیت کا مقصد تو یہ تھا کہ صوبہ لیگ کے صدر ایوب کھوڑو اور وزیر اعلیٰ قاضی فضل اللہ کے درمیان جو تضاد پیدا ہو گیا ہے اس سے فائدہ اٹھایا جائے اور پھر صوبائی اسمبلی میں پہنچ کر مسلم لیگ کے خلاف متحدہ محاذ بنایا جائے کیونکہ اسے مسلم لیگ کی بنیادی پالیسی سے بدستور اختلاف تھا اور اس نے اپنے 8/مارچ 1948ء کے سیاسی موقف سے سر مو انحراف نہیں کیا تھا لیکن نوائے وقت نے غلطی سے یہ تاثر حاصل کر لیا کہ جی۔ایم۔سید کا لیاقت علی خان کی مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ اس وقت لیاقت علی خان کو پاکستان مسلم لیگ کا صدر بنے ہوئے ابھی تقریباً ایک ہفتہ ہی گزرا تھا اور پنجاب کے شاؤنسٹوں کے لیاقت علی خان اور اسکے ''تلیئروں'' کے ساتھ تضاد نے معاندانہ صورت اختیار کر لی ہوئی تھی۔ لہٰذا نوائے وقت کی 14/اکتوبر کی رپورٹ میں اس ''سمجھوتہ'' پر اس طرح ناخوشی کا اظہار کیا گیا کہ جی۔ایم۔سید کو ''پاکستان کا مشہور دشمن اور قائداعظم کا معتوب'' قرار دیا تھا۔

جی۔ایم۔سید نے تیسری کوشش 17/مارچ 1951ء کو کی جبکہ اس نے پیر الٰہی بخش اور بہت سے دوسرے سیاسی کارکنوں کو بلا کر ساری مخالف پارٹیوں کے متحدہ محاذ کی تشکیل کی تجویز پیش کی۔ چونکہ ان دنوں پنجاب کے عام انتخابات کے لئے پولنگ ہو رہی تھی اس لئے نوائے وقت اور لاہور کے دوسرے اخبارات نے جی۔ایم۔سید کی منعقد کردہ اس میٹنگ کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ پاکستان ٹائمز نے 29/مارچ کو اس میٹنگ کی خبر شائع کی اور نوائے وقت کو 14/جون 1951ء کو یہ پتہ چلا کہ ''سابق صدر سندھ مسلم لیگ اور سابق ممبر مجلس عاملہ آل انڈیا مسلم لیگ'' جی۔ایم۔سید نے ایک نئی اپوزیشن پارٹی عوامی جماعت کے نام سے قائم کی ہے جو مسلم لیگ کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرے گی۔ نوائے وقت کی اس خبر میں جی۔ایم۔سید ''پاکستان کا مشہور دشمن اور قائداعظم کا معتوب'' نہیں تھا بلکہ ''سندھ مسلم لیگ کا سابق صدر اور سابق ممبر مجلس عاملہ عمل آل انڈیا مسلم لیگ'' تھا۔ اس موقع پر وہ نوائے وقت کی نظر میں ''کھوٹا سکہ اور ملک وملت کا دشمن'' بھی نہیں تھا اور نہ ہی وہ غیر سندھی مسلمانوں کے خلاف منافرت پھیلانے کا مجرم تھا حالانکہ اسکے 8/مارچ 1948ء کے سیاسی نصب العین اور 14/جون 1951ء کے سیاسی پروگرام میں ذرا سا بھی فرق نہیں تھا۔ اس عرصے میں اگر کوئی فرق پڑا تھا تو وہ پنجاب کے سرمایہ دار اور درمیانہ طبقہ کے شاؤنسٹوں کے رویے میں تھا۔ اب ان کی نظر میں لیاقت علی خان ''پنجابیوں'' کا ''بدترین دشمن''

تھا۔ چونکہ جی۔ایم۔سید ''پنجابیوں'' کے اس ''بدترین دشمن'' کا دشمن تھا اس لئے وہ نہ تو ''ملک وملت کا دشمن'' تھا نہ ہی ''قائداعظم'' کا معتوب تھا اور نہ ہی ''کھوڑ سکہ'' تھا۔ اس نے لیاقت علی خان کے سیاسی حریف حسین شہید سہروردی سے کئی ملاقاتیں کر کے اپنے آپ کو محب وطن ثابت کر دیا تھا۔ اب ''پنجابیوں'' کو اس کی خودمختار جمہوریتوں کی فیڈریشن کی تجویز پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ اب نوائے وقت کا ادارتی تبصرہ یہ تھا کہ ''جی۔ایم۔سید کی نئی عوامی جماعت کے نصب العین اور پروگرام کو مسلم لیگ اور دوسرے مخالف فی الفور کمیونسٹ پروگرام کہہ کر نئی جماعت کے بانیوں پر غداری کا لیبل چسپاں کرنے کی کوشش کریں گے حالانکہ یہ جماعت، اس کا مقصد اور لائحۂ عمل نہ انقلابی ہے نہ ہی اشتراکی بلکہ یہ ایک ایسا پروگرام ہے جو آج پاکستان کے عوام کی کم از کم حاجت روائی کر سکتا ہے۔''[11] بالفاظ دیگر جی۔ایم۔سید کا یہ سیاسی نصب العین 8/مارچ 1948ء کو پاکستان کے عوام کی کوئی حاجت روائی نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت یہ نصب العین پاکستان کے عوام کے مفاد کے منافی تھا کیونکہ اس وقت پنجاب کے شاونسٹ عناصر پاکستان کے صوبوں کی حد بندیاں ختم کر کے اسلامی اخوت اور مسلم قومیت کے نام پر ایک ''پنجابی سلطنت'' قائم کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے لیکن اب 14/جون 1951ء کو سید کا یہی سیاسی نصب العین و پروگرام پاکستان کے عوام کی حاجت روائی کر سکتا تھا کیونکہ لیاقت علی خان نے ''پنجابیوں'' کے اس سامراجی خواب کو پریشان کر دیا تھا اور جی۔ایم۔سید کے بقول ''یو۔پی کا یہ نوابزادہ'' پاکستان میں ایک خالص ''مہاجر سلطنت'' قائم کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا اور وہ بھی اس مقصد کے لئے اسلامی اخوت اور مسلم قومیت کے نعرے لگاتا تھا۔

آمدہ انتخابات کے پیش نظر لیاقت اور کھوڑو کے جاگیردارانہ جوڑ توڑ

جس دن نوائے وقت میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ جی۔ایم۔سید نے مسلم لیگ کے خلاف ایک نئی عوامی جماعت کی تشکیل کی ہے اسی دن لاہور کے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ میں یہ رپورٹ شائع ہوئی تھی کہ پنجاب کا گورنر سردار عبدالرب نشتر، جب حج کرنے اور یورپ میں تعطیلات گزارنے کے بعد واپس آئے گا تو اسے مرکزی کابینہ میں وزیر قانون مقرر کیا جائے گا اور اسکے ذمہ یہ کام ہوگا کہ وہ آئین سازی کے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ پنجاب میں سردار نشتر کی

جگہ سندھ کے موجودہ وزیر داخلہ قاضی فضل اللہ کا تقرر ہو گا۔[12] سول اینڈ ملٹری گزٹ کی یہ رپورٹ خاصی اہمیت کی حامل تھی۔ ان دنوں یہ اخبار احمدی فرقہ کی لاہوری جماعت کے زیر اہتمام شائع ہو رہا تھا۔ چونکہ اس حیثیت سے اس کے پاکستان کے وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان سے روابط تھے اس لئے اس کی مرکزی کابینہ میں ردوبدل کی خبر کو غیر معتبر تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سردار عبدالرب نشتر پشاور کے درمیانہ طبقہ کا ایک بھلا مانس وکیل تھا۔ چونکہ صوبہ سرحد میں اس کی سیاسی بنیادیں کوئی زیادہ گہری نہیں تھیں اس لئے اس نے پاکستان کی سیاست میں اپنی ممتاز حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے وزیر اعظم لیاقت علی خان سے گٹھ جوڑ کر رکھا تھا۔ اس نے بطور گورنر پنجاب مارچ 1951ء کے عام انتخابات میں کھلم کھلا دھاندلیوں کے بارے میں جس طرح چشم پوشی کی تھی اس وجہ سے لیاقت علی خان اور اس کے درمیان ''سیاسی دوستی'' کا رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا تھا لہٰذا قدرتی طور پر لیاقت علی خان اپنے معتمد سیاسی حلیف سردار نشتر کو مرکزی کابینہ میں شامل کر کے وہاں پنجابی شاونسٹوں کے خلاف اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنا چاہتا تھا۔ چودھری محمد علی کے بیان کے مطابق لیاقت علی خان، سردار نشتر کو نائب وزیر اعظم بنانے کا بھی خواہاں تھا۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ کی اس رپورٹ کا یہ حصہ بھی اہم اور قابل اعتبار تھا کہ پنجاب میں سردار عبدالرب نشتر کی جگہ قاضی فضل اللہ کا بطور گورنر تقرر کیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سندھ کے مطلق العنان وزیر اعلیٰ ایوب کھوڑو اور اس کے وزیر داخلہ فضل اللہ کے درمیان تضاد میں شدت پیدا ہو رہی تھی اور لیاقت علی خان سندھ کے عام انتخابات سے پہلے قاضی فضل اللہ کو وہاں سے نکال کر ایوب کھوڑو کی صوبائی آمریت کے لئے راستہ بالکل ہی صاف کرنا چاہتا تھا۔

انہی دنوں ایوب کھوڑو نے انتخابی حلقہ بندی کرنے والی کمیٹی کے روبرو تجویز پیش کی تھی کہ شہری اور دیہاتی علاقوں کے لئے الگ الگ حلقے مقرر کئے جائیں اور کوئی حلقہ 45 ہزار آبادی سے کم نہ ہو۔ اس نے صوبہ سندھ کو 13 شہری اور 75 دیہاتی حلقوں میں تقسیم کیا تھا۔ عورتوں کے لئے تین اور اقلیتوں کے لئے چھ نشستیں ان کے علاوہ تھیں۔ کھوڑو کی اس تجویز کے خلاف بعض حلقوں کی طرف سے سخت احتجاج کیا گیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے سابق ارکان عبدالحئی عباسی اور محمد اعجاز احمد کا الزام یہ تھا کہ کھوڑو کی متذکرہ تجویز ہاریوں اور مہاجرین کے مفادات کے منافی ہے اور وہ انتخابی حلقوں کے حد بندی کے سلسلے میں اس طرح ہیر پھیر کر رہا ہے کہ وہ یہ کہہ سکے

کہ ''میں دیکھ رہا ہوں کہ میں سب کا بادشاہ ہوں۔''[13] لیکن لیاقت علی خان کے دربار میں اس کے اپنے ''تلمیذ روں'' کی اس فریاد کی بھی شنوائی نہ ہوئی۔ چونکہ لیاقت علی خان خود ملک کا شہنشاہ یا آمر مطلق بننے کی راہ پر گامزن ہو گیا تھا اس لئے اسے اپنے صوبوں میں کھوڑو جیسے چھوٹے بادشاہوں یا آمروں کے وجود پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ 24 رجون کو حکومت سندھ کے سرکاری گزٹ میں انتخابی حلقوں کی کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس کی زیادہ تر سفارشات وزیر اعلیٰ کی تجاویز کے مطابق ہی ہیں۔ صرف دو چار حلقوں میں معمولی سا ردو بدل کیا گیا تھا۔

3 رجولائی کو سندھ کے وزیر داخلہ قاضی فضل اللہ نے سکھر میں ایک اخباری انٹرویو میں وعدہ کیا کہ صوبہ کے آئندہ عام انتخابات میں حزب اختلاف کو ساری سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔ اس نے انکشاف کیا کہ اس نے حال ہی میں وزیر اعظم لیاقت علی خان سے ملاقات کر کے اس مسئلہ پر بات چیت کی ہے۔ اس نے مزید بتایا کہ یوسف ہارون کے آسٹریلیا سے واپس آ کر انتخابات میں حصہ لینے کا کوئی امکان نہیں۔ قاضی فضل اللہ کا یہ انٹرویو اس لحاظ سے اہم تھا کہ وہ اکتوبر 1950ء میں جی۔ایم۔سید سے صلح کی بات چیت کر چکا تھا اور اب وزیر اعلیٰ کھوڑو کے ساتھ اس کا اختلاف روز بروز شدید سے شدید تر ہو رہا تھا۔ قاضی اور سید دونوں ہی درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اس لئے ان کا کھوڑو کی مطلق العنانیت کے خلاف متحد ہو جانا بعید از امکان نہیں تھا۔ جہاں تک یوسف ہارون کا تعلق تھا وہ آسٹریلیا میں اپنا سفارتی عہدہ چھوڑ کر واپس سندھ کی سیاست میں آنے کے لئے بے تاب تھا۔ وہ حالات کا جائزہ لینے کے لئے اپریل کے دوسرے ہفتے میں چند دن کے لئے کراچی آیا تھا اور آل پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز کونسل کا وزیر اعلیٰ کھوڑو سے تنازعہ اس کی یہاں موجودگی میں ہی شروع ہوا تھا۔ قاضی فضل اللہ کی طرح یوسف ہارون کو بھی یہ شکایت تھی کہ ایوب کھوڑو نے لیاقت علی خان سے جاگیردارانہ گٹھ جوڑ کر کے نہ صرف اسے صوبہ کی وزارت اعلیٰ کی گدی سے محروم کیا تھا بلکہ اسے ''ملک بدر'' ہی کروا دیا تھا۔

کھوڑو بھی ان سارے امکانات کو پیش نظر رکھ کر انتخابی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے 15 رجولائی کو تھرپارکر میں مسلم لیگی کارکنوں کو ہدایت کی وہ صوبہ میں مسلم لیگ کی انتخابی مہم چلانے کے لئے اور مسلم لیگی امیدواروں کو مالی امداد دینے کے لئے ''پارٹی فنڈ'' جمع کریں۔ اس نے بتایا کہ وہ عنقریب صوبہ کے سرکاری اہلکاروں کو ایک ہدایت نامہ جاری کرے گا جس میں ان سے کہا

جائے گا کہ وہ انتظامی کارگردگی کے اچھے معیار کو برقرار رکھتے ہوئے مسلم لیگ سے تعاون کریں۔ اس نے بڑے زمینداروں کو مشورہ دیا کہ وہ ''ہاریوں سے اچھا سلوک کریں بصورت دیگر وہ اس ''جمہوری دنیا'' میں زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ ایک نہ ایک دن ہاری اقتدار پر قبضہ کرلیں گے۔''

کھوڑو اور الٰہی بخش کی سودابازی اور صلح

اس دوران ایوب کھوڑو نے پیر الٰہی بخش سے بھی ایک سمجھوتہ کرلیا جس کے تحت یہ قرار پایا کہ پیر الٰہی بخش نے اپنے خلاف انتخابی ٹربیونل کے فیصلے کی تنسیخ کے لئے چیف کورٹ میں جو اپیل دائر کر رکھی ہے اسے واپس لے لیا جائے گا۔ دادو۔ جوہی حلقے سے کھوڑو کے برادر نسبتی کا جو ''بلا مقابلہ'' انتخاب ہوا تھا وہ برقرار رہے گا اور ان دونوں باتوں کے بدلے میں پیر الٰہی بخش کو رائے دہندگی کا حق مل جائے گا۔ وہ اسمبلی کا رکن بن سکے گا اور وہ آئندہ انتخابات میں حصہ لے سکے گا۔ 18 رجولائی کو سندھ چیف کورٹ کے جسٹس ویلانی نے فریقین کے اس ''سمجھوتے'' کو تسلیم کرلیا اور پیر الٰہی بخش کی درخواست پر کوئی حکم صادر کئے بغیر اسے داخل دفتر کر دیا۔ پیر الٰہی بخش اور ایوب کھوڑو سندھ کی بساط سیاست پر اپریل 1948ء کے بعد سے ایک دوسرے کے ''جانی دشمن'' تھے۔ پھر ستمبر 1950ء میں دادو۔ جوہی کے حلقہ سے کھوڑو کے برادر نسبتی کے ''بلا مقابلہ'' انتخاب سے ان کی باہمی مخاصمت میں اضافہ ہوگیا تھا لیکن اب یکا یک ان دونوں میں سودابازی ہوگئی تو سیاسی مبصرین ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ یہ واقعہ اس حقیقت کا مظہر تھا کہ سندھ کی جاگیردارانہ سیاست میں کوئی چیز بھی ناممکن نہیں تھی۔ سندھی وڈیرے پنجاب کے موقع پرست جاگیرداروں کی طرح کسی سیاسی اخلاق یا اصول کے پابند نہیں تھے کیونکہ وہ اپنی سیاسی قوت کو عوام الناس کی تائید وحمایت کی بجائے محلاتی سازشوں اور جوڑتوڑ کے ذریعے برقرار رکھتے تھے۔

پاک بھارت سرحدی کشیدگی اور کھوڑو کی جانب سے سندھ رجمنٹ کی تشکیل کا مطالبہ جسے ایوب خان نے پورا نہ ہونے دیا۔

جب جولائی 1951ء کے وسط میں ہندوستان نے اپنی فوجیں مغربی پنجاب کی سرحد پر مجتمع کر دیں اور اس بنا پر پاکستان اور ہندوستان کے درمیان زبردست کشیدگی پیدا ہوگئی تو

پاکستان کے داخلی تضادات وقتی طور پر اس قومی تضاد کے بوجھ تلے دب گئے اور پھر جب 27/جولائی کو وزیراعظم لیاقت علی خان نے کراچی میں پاکستان کے مزاحمتی عزم کی علامت کے طور پر اپنا مُکا دکھایا تو پاکستان کے طول وعرض سے یہ نعرے بلند ہونے شروع ہو گئے کہ ''ہم وطن عزیز کے دفاع کے لئے کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔'' قبل ازیں ایوب کھوڑو کی سندھ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ 21 /جولائی کو ایک قرارداد میں پاکستان کے خلاف ہندوستان کے جارحانہ عزائم کی مذمت کرتے ہوئے اس یقین کا اظہار کر چکی تھی کہ پاکستان بہر قیمت اس چیلنج کا مقابلہ کرے گا۔ مجلس عاملہ نے لیاقت علی خان کی قیادت پر مکمل اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے اسے یقین دلایا تھا کہ ہر سندھی پاکستان کی علاقائی سالمیت کو برقرار رکھنے کے لئے ہر صورت حال کا مقابلہ کرے گا۔ پھر 7/اگست کو اس نے لاڑکانہ میں ایک جلسۂ عام کو خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ''ہم اپنے محبوب وطن کی آزادی اور اس کے وقار کے تحفظ کے لئے اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔ اس نے بتایا کہ سندھ میں ایسے اقدامات کئے جا رہے ہیں کہ یہ صوبہ پاکستان کے دفاع کے لئے اپنا کردار ادا کر سکے۔ سندھیوں کی ایک معقول تعداد سندھ رینجرز اور پولیس میں بھرتی کی جائے گی۔ اس نے سندھی عوام کو متنبہ کیا کہ وہ انتشار پسندوں اور چھوٹی چھوٹی پارٹیوں کے دھوکے میں نہ آئیں اور متحدہ طور پر مسلم لیگ کی حمایت کرتے رہیں۔ مسلم لیگ نے عظیم خدمات سرانجام دی ہیں اور وہ آئندہ بھی ایسا کرتی رہے گی'' اور 9/اگست کو کھوڑو نے رتو ڈیرو میں ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے پاکستانی فوج میں ایک سندھ رجمنٹ کی تشکیل کی ضرورت پر زور دیا اور مطالبہ کیا کہ سندھی نوجوانوں کے لئے ایک فوجی ٹریننگ سنٹر کھولا جائے۔ اس نے کہا کہ سندھ رجمنٹ کی تشکیل سے نہ صرف سندھیوں کی فوج سے جذباتی وابستگی کو تقویت ملے گی بلکہ ان میں جوش وجذبہ اور ''مارشل سپرٹ'' پیدا ہو گی۔ سندھی نوجوانوں کی سپاہیانہ صلاحیت کسی سے کم نہیں ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ بہت جلد اس مسئلہ پر مرکز سے بات چیت کرے گا۔[14]

کھوڑو نے یہ دونوں تقریریں صوبہ کے درمیانہ طبقہ کو یہ یقین دلانے کے لئے کی تھیں کہ وہ بدستور سندھ کے حقوق ومفادات کا علمبردار ہے۔ اگرچہ اس نے 4/مئی 1951ء کو سندھ رجمنٹ کی تشکیل کے سلسلے میں سیکرٹری دفاع سکندر مرزا سے جو ''ابتدائی'' بات چیت کی تھی اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا کیونکہ کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان اپنے اس فسطائی نظریے پر مصر

تھا کہ سندھیوں میں ''مارشل سپرٹ'' نہیں ہے اور یہ ''خداداد صلاحیت'' اولاً پنجابیوں میں اور ثانیاً ضلع کوہاٹ وغیرہ کے پٹھانوں میں ہے۔ اب اگست میں بھی اس سلسلے میں کھوڑو کی تقریروں کا کوئی مثبت نتیجہ نکلنے کی امید نہیں تھی کیونکہ میجر جنرل مقیم کے بیان کے مطابق جولائی 1951ء میں پاکستان اور ہندوستان میں فوجی کشیدگی پیدا ہونے کے فوراً ہی بعد اگست میں کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان نے امریکی امداد کی تجویز پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے اگست کے اواخر میں اپنے سٹاف افسر سے یہ کہا تھا کہ پاکستان کے دفاع کے ''مسئلہ کا ایک حل یہ ہے کہ ہمارا ایک مضبوط اور قابل اعتماد دوست ہونا چاہیے۔''[15] اس کا مطلب یہ تھا کہ جنرل محمد ایوب خان کی نظر میں وطن عزیز کے دفاع کے لئے ''غیر مارشل نسل'' کے سندھی عوام کو فوج میں بھرتی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اسے ضرورت صرف یہ تھی کہ ''ہمارا ایک مضبوط اور قابل اعتماد دوست ہونا چاہیے۔''

کھوڑو کے خلاف دوبارہ پروڈا انکوائری، لیاقت نے کھوڑو کو بچانے کیلئے ہر ہتھکنڈا استعمال کیا

ستمبر کے اوائل میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کشیدگی خود بخود کم ہوگئی تو ملک کے داخلی تضادات پھر منظر عام پر آ گئے۔ سندھ کے مختلف سیاسی دھڑوں میں تضاد کا مظاہرہ 4 ستمبر کو ہوا جبکہ پیر الٰہی بخش کے رفیق خاص قاضی محمد اکبر اور شہداد پور کے پانچ دوسرے زمینداروں نے ''پروڈا'' کے مرتب کردہ قواعد کے تحت گورنر دین محمد کو یہ مشترکہ درخواست دی کہ وزیر اعلیٰ ایوب کھوڑو کے خلاف رشوت ستانی، اقربا پروری، بدانتظامی اور دوسری بدعنوانیوں کے الزامات کی تحقیقات کرائی جائے۔ درخواست دہندگان نے اپنی اس درخواست کے ساتھ قواعد کے مطابق پانچ ہزار روپے بھی جمع کرائے اور استدعا کی کہ مطلوبہ تحقیقات کے دوران کھوڑو کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کی دفعہ 51 کے تحت برطرف کیا جائے۔ انہوں نے اپنی اس درخواست میں الزامات کی جو تفصیل لکھی تھی اس کے مطابق ایوب کھوڑو نے 26 مارچ 1951ء کو وزیر اعلیٰ بننے کے بعد تقریباً پانچ ماہ میں مبینہ طور پر رشوت ستانی، اقربا پروری اور دوسری سنگین بدعنوانیوں کے 60 جرائم کا ارتکاب کیا تھا۔

6 ستمبر کو گورنر دین محمد نے وزیر اعظم لیاقت علی خان سے ملاقات کی اور اسی دن

یوسف ہارون کے اخبار ''ڈان'' نے کھوڑو کے خلاف اس اقدام کا پرجوش خیر مقدم کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ سیاسی مصلحتیں درخواست کے بارے میں فیصلے پر اثر انداز نہیں ہوں گی۔ یہ قدرتی بات ہے کہ جن افراد کو ''پروڈا'' کی کوئی ضرب لگتی ہے وہ زوردار الفاظ میں یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ انہیں سیاسی عداوت کا شکار بنایا گیا ہے۔ جب قائداعظم نے صوبائی گورنر کی تحریک پر کھوڑو کے خلاف ایسا ہی اقدام کیا تھا تو اس نے ''ناپاک مقاصد'' کا الزام لگایا تھا۔ نواب ممدوٹ اور حمیدالحق چودھری نے بھی اپنی صفائی میں اس قسم کا موقف اختیار کیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اب کھوڑو کے خلاف درخواست دہندگان کے بارے میں بھی کہا جائے کہ انہوں نے گھٹیا سیاسی و ذاتی مقاصد کے تحت یہ اقدام کیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سلسلے میں مسلم لیگ کو بھی گھسیٹا جائے اور اس امر کا بھی امکان ہے کہ یہ کہا جائے کہ چونکہ آج کل پاکستان شدید ہنگامی حالات سے گزر رہا ہے اس لئے سندھ کے وزیراعلیٰ کی برطرفی اور اس کے خلاف الزامات کی تحقیقات کے لئے خصوصی ٹربیونل کا قیام قومی مفاد میں نہ ہوگا۔ ہمیں اس موقف سے سخت اختلاف ہے اور بلاشبہ عوام الناس کی بھاری اکثریت بھی ہماری اس رائے سے اتفاق کرے گی کہ خواہ کیسے ہی ہنگامی حالات ہوں فوجداری قانون کے تحت جرائم، جرائم ہی رہتے ہیں اور عدالتوں کا کام بند نہیں ہوتا۔ پروڈا ہمارے ملک کا قانون ہے اور اس کے تحت کاروائی کسی حالت میں بھی نہیں رکنی چاہیے۔ اگرچہ ''ڈان'' کا یہ اداریہ کھوڑو کے ہاتھوں یوسف ہارون کے ''سیاسی قتل'' کا بدلہ چکانے کے لئے لکھا گیا تھا لیکن اس سے یہ پتہ چلتا تھا کہ سندھ میں کھوڑو ایسا مطلق العنان بادشاہ نہیں تھا کہ اس کے اقتدار کو چیلنج نہ کیا جاسکے۔ ڈان کے اس اداریے کا واضح مقصد یہ تھا کہ لیاقت علی خان اپنی سیاسی مصلحت کے تحت کھوڑو کی پشت پناہی نہ کرے۔

15 ستمبر کو درخواست دہندگان نے گورنر کے روبرو کھوڑو کے خلاف عائد کردہ الزامات کے ثبوت میں بعض دستاویزات بھی پیش کیں جن سے بادی النظر میں یہ پتہ چلتا تھا کہ کھوڑو نے اپنے برادر نسبتی اور بھائی کو ناجائز فائدے پہنچائے اور اس نے اس مقصد کے لئے محکمہ پولیس اور محکمہ مال کے بعض افسروں کے ناجائز طور پر تبادلے بھی کئے تھے۔ 18 ستمبر کو درخواست دہندگان نے گورنر سے ایک اور ملاقات کی اور اسے بتایا کہ کس طرح کھوڑو نے اپنے اخبار ''سندھ آبزرور'' کے حصص فروخت کرنے کے لئے اپنے پبلک عہدہ سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور کس طرح

اب وہ سرکاری حکام پر دباؤ ڈال رہا ہے تاکہ وہ اسکے خلاف کوئی شہادت مہیا نہ کریں۔ جب ان ملاقاتیوں نے وزیر اعلیٰ کھوڑو کی برطرفی کا مطالبہ کیا تو گورنر دین محمد نے ان سے اس سلسلے میں تحریری درخواست طلب کی اور بتایا کہ "یہ درخواست مرکزی حکومت کو بھیج دی جائے گی اور یہ بھی بتایا کہ ان کی طرف سے عائد کردہ الزامات کی ابتدائی تحقیقات ہوگی اور اس کے بعد "پروڈا" کے تحت خصوصی ٹربیونل کا قیام عمل میں آئے گا" اور پھر 19 ستمبر کو سندھ کے وزیر داخلہ قاضی فضل اللہ اور وزیر مال میر غلام علی تالپور کا ایک مشترکہ بیان شائع ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ ایوب کھوڑو کو صوبائی کابینہ اور اسمبلی کا مکمل اعتماد حاصل ہے اس لئے اس کے مستعفی ہونے یا رخصت پر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صوبائی کابینہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور قاضی فضل اللہ کے لیگ اسمبلی پارٹی کے نئے قائد بننے کے امکان کی خبریں بے بنیاد ہیں۔ اسی دن وزیر اعلیٰ کھوڑو کا یہ بیان بھی شائع ہوا کہ اس کے خلاف "پروڈا" کے تحت الزامات قومی تنظیم کے بدترین دشمنوں نے گھٹیا مقاصد کی تکمیل کے لئے عائد کئے ہیں۔ درخواست دہندگان مسلم لیگ کے دیرینہ دشمن جی۔ ایم۔ سید اور ایک بدنام سیاسی یتیم پیر الٰہی بخش کے پٹھو ہیں اور انہوں نے یہ اقدام اپنے آقاؤں کے حکم کے تحت کیا ہے۔ کھوڑو کا بھی یہ دعویٰ تھا کہ اسے مسلم لیگ اسمبلی پارٹی اور صوبہ لیگ کا مکمل اعتماد حاصل ہے۔[16] تاہم گورنر نے کھوڑو کے خلاف الزامات کی ابتدائی تحقیقات کا کام اپنے سیکرٹری ایم۔ اے خان کے سپرد کر دیا جو قیام پاکستان سے قبل ریاست بھوپال کا چیف جسٹس تھا۔

20 ستمبر کو تین افراد انکوائری افسر ایم۔ اے خان کے روبرو پیش ہوئے اور انہوں نے کھوڑو کے خلاف عائد کردہ الزامات کی تردید کی لیکن اسی دن درخواست دہندگان کی طرف سے مزید 50 گواہوں اور 55 دستاویزات کی فہرست پیش کی گئی اور یہ درخواست کی گئی کہ انہیں کھوڑو کے گواہوں پر جرح کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس پر انکوائری افسر نے انہیں بتایا کہ ان کے 130 گواہوں کی شہادتیں یکم اکتوبر سے قلمبند کی جائیں گی۔ 21 ستمبر کو درخواست دہندگان نے صوبائی گورنر سے استدعا کی کہ انکوائری آفیسر نے جس طریقے سے کھوڑو کے خلاف تحقیقات شروع کی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ وہ کھوڑو کے نامعلوم گواہوں کی صفائی کے بیانات بند کمرے میں قلم بند کرتا ہے اور کسی کو ان گواہوں پر جرح کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی لیکن گورنر نے استدعا منظور نہ کی اور بتایا کہ "درخواست دہندگان کو انکوائری افسر کے طریق کار میں مداخلت کا کوئی حق حاصل

نہیں ہے۔'' لیکن درخواست گزار گورنر کے اس جواب سے مطمئن نہ ہوئے اور ان کے ایک ترجمان نے اخبارنویسوں کو بتایا کہ وہ اس سلسلے میں ''اعلیٰ ارباب اختیار'' سے رجوع کریں گے۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ ''اعلیٰ ارباب اختیار'' کی اصطلاح کا کیا مطلب ہے؟ تو اس نے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔

26 ستمبر کو ہاری کمیٹی کے صدر عبدالستار خان نے ایک بیان میں مطالبہ کیا کہ ایوب کھوڑو کو تا اختتام تحقیقات خود ہی وزارت سے مستعفی ہو جانا چاہیے اور اگر وہ رضا کارانہ طور پر مستعفی نہیں ہوتا تو مرکزی حکومت کو اس سلسلے میں مناسب فیصلہ کرنا چاہیے۔ اس نے اپنے بیان میں ہاری کمیٹی کی 24 ستمبر کی سالانہ کانفرنس کی ان قراردادوں کا اعادہ کیا کہ کھوڑو کے عہد اقتدار میں ہاریوں کی وسیع پیمانے پر بیدخلیاں ہو رہی ہیں۔ ہاری لیڈروں کو سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کیا جا رہا ہے اور ہاری کمیٹی میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

27 ستمبر کو قاضی اکبر اور دوسرے درخواست دہندگان کے وکیل جمال صدیقی نے گورنر جنرل کو ایک درخواست دی جس میں صوبائی گورنر دین محمد اور انکوائری آفیسر ایم۔اے۔ خان کے خلاف جانبداری کا الزام تھا۔ درخواست میں گزارش کی گئی تھی کہ کھوڑو کے خلاف ابتدائی تحقیقات ہائی کورٹ یا سندھ چیف کورٹ کے کسی جج سے کروائی جائے اور تا اختتام تحقیقات اسے برطرف کیا جائے۔ انکوائری آفیسر اپنا کام آزادانہ طور پر سرانجام نہیں دے رہا۔ وہ ہر وقت شہادتوں اور طریقۂ کار کے بارے میں گورنر سے ہدایات لیتا ہے کیونکہ گورنر نے حکم دے رکھا ہے کہ یہ تحقیقات اس کی براہ راست نگرانی اور کنٹرول کے تحت ہونی چاہیے۔ لہٰذا گورنر اس پوزیشن میں ہے کہ وہ چاہے تو کسی شہادت کو ترک کر دینے کی بھی ہدایت دے سکتا ہے۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ گورنر پروڈا کے قاعدہ نمبر 7 کے تحت تحقیقات نہیں کروا رہا بلکہ دراصل وہ خود ہی تحقیقات کر رہا ہے۔[17] یہ درخواست دراصل وزیراعظم لیاقت علی خان کے خلاف تھی اور اس میں اشارۃً یہ الزام تھا کہ وزیراعظم اپنی سیاسی مصلحت کے تحت ایوب کھوڑو کی حفاظت کر رہا ہے۔ پروگرام بظاہر یہ تھا کہ ابتدائی تحقیقات کے دوران ہی کھوڑو کے خلاف عائد کردہ سارے الزامات مسترد کر دیئے جائیں گے اور پھر اسے کھلی چھٹی دے دی جائے گی کہ وہ صوبہ میں مسلم لیگ کی انتخابی کامیابی کے لئے جو چاہے کرے۔ لیاقت علی خان کو دادو۔ جوہی اور شہداد کوٹ۔ کمبر کے ضمنی انتخابات کے

نتائج کے پیش نظر یہ یقین تھا کہ صرف ایوب کھوڑو ہی سندھ میں اس کے لئے انتخابی کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔کوئی اور شخص یہ کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتا۔ پاکستان ٹائمز اور ڈان کی رپورٹوں کے مطابق جی۔ایم۔سید نے ستمبر کے تیسرے ہفتے میں مسلم لیگ میں دوبارہ شمولیت پر آمادگی ظاہر کر کے لیاقت علی خان کو اپنی خدمات پیش کی تھیں اور اس نے وزیراعظم سے ملاقات کے لئے اسے ایک خط بھی لکھا تھا مگر اسکا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔کراچی کے بعض اردو اخبارات کی اطلاعات کے مطابق کھوڑو کابینہ کے دو وزراء میر غلام علی تالپور اور قاضی فضل اللہ وزیر اعلیٰ کے خلاف تھے اور نوائے وقت کی رپورٹ یہ تھی کہ کھوڑو کے خلاف ''پروڈا انکوائری کے پس پردہ قاضی فضل اللہ کے رفقا ہیں'' لیکن لیاقت علی خان کی طبقاتی اور سیاسی مصلحت اسے جی۔ایم۔سید اور قاضی فضل اللہ جیسے درمیانہ طبقہ کے عناصر سے سمجھوتہ کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔علاوہ بریں پنجاب میں لیاقت علی خان کا سیاسی حلیف ممتاز دولتانہ بھی کھوڑو کے حق میں تھا اور کھوڑو اور قاضی فضل اللہ کے درمیان مصالحت کرانے کے لئے ثالثی کے فرائض سرانجام دینے پر آمادہ تھا۔

9 را کتوبر کو ممتاز دولتانہ اس مقصد کے لئے لاہور سے عازم کراچی ہوا تو اسی دن مرکزی دارالحکومت میں سرکاری ذرائع نے ایسوسی ایٹڈ پریس کو بتایا کہ صوبائی گورنر کے سیکرٹری اور ایوب کھوڑو کے خلاف ''پروڈا'' کے تحت ابتدائی تحقیقات کرنے والے افسر ایم۔اے خان نے ''خرابیٔ صحت کی بنا پر'' استعفیٰ دے دیا ہے اور گورنر نے اس کا استعفیٰ منظور کر لیا ہے کیونکہ وہ حال ہی میں عارضۂ قلب سے روبہ صحت ہوا تھا اور پھر 10 را کتوبر کو یہ اعلان کیا گیا کہ گورنر سندھ نے اپنے اسسٹنٹ سیکرٹری ایچ۔ایم۔ بریگنزا کو ''پروڈا انکوائری افسر'' مقرر کیا ہے۔اسی دن وزیر اعلیٰ ایوب کھوڑو نے ایک مقامی ایوننگ اخبار کی اس رپورٹ کی تردید کی کہ ایم۔اے۔خان نے ''خرابیٔ صحت'' کی بنا پر استعفیٰ نہیں دیا بلکہ اسکے اچانک مستعفی ہو جانے کی وجہ یہ تھی کہ کھوڑو نے اس سے ''جھگڑا'' کیا تھا۔کھوڑو کا بیان یہ تھا کہ ''ایم۔اے خان کی عمر ساٹھ پینسٹھ برس کی تھی۔ اسے گزشتہ ماہ دل کا دورہ پڑا تھا اور 9 را کتوبر کی صبح کو اس نے اعصابی شکستگی کی وجہ سے استعفیٰ دے دیا۔یہ صحیح ہے کہ میں نے اس سے تھوڑی دیر قبل گورنر سے ملاقات کی تھی اور پھر ایم۔اے۔ خان سے پانچ منٹ کے لئے گپ شپ کی تھی لیکن میری ذات یا پروڈا انکوائری کا اس کے استعفیٰ سے کوئی تعلق نہیں۔'' لیکن ڈان، پاکستان ٹائمز اور سول اینڈ ملٹری گزٹ کھوڑو کے اس بیان سے

مطمئن نہ ہوئے۔ ان اخباروں کی متفقہ ادارتی رائے یہ تھی کہ ''ایم۔اے خان پر دباؤ ڈال کر اسے اچانک مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ غالباً اسے لئے کہ وہ کھوڑو کی حسب منشا تحقیقات کے فرائض سرانجام نہیں دیتا تھا۔'' قاضی اکبراور دوسرے درخواست دہندگان کو بھی ایم۔اے۔ خان کے استعفیٰ کی بنا پر پیدا شدہ صورت حال سے سخت تشویش ہوئی۔ چنانچہ ان کے وکیل جمال صدیقی نے 11 راکتوبر کو گورنر کے نام ایک درخواست میں ایم۔اے خان کی جگہ کلاس نمبر 2 کے ایک جونیئر افسر کے تقرر کے خلاف احتجاج کیا اور اس امر کی نشاندہی کی کہ ایچ۔ایم۔ بریگنزا کو قانون کا کوئی علم نہیں۔ وہ قانونی طریق کار سے واقفیت نہیں رکھتا اس لئے وہ وزیر اعلیٰ کھوڑو کے خلاف ابتدائی تحقیقات کے فرائض تسلی بخش طریقے سے سرانجام نہیں دے سکے گا۔ جمال صدیقی کا مطالبہ یہ تھا کہ ''اس مقصد کے لئے سندھ چیف کورٹ کے کسی جج یا کسی اور اعلیٰ جوڈیشنل آفیسر کا تقرر کیا جائے'' مگر گورنر نے یہ درخواست مسترد کر دی اور جمال صدیقی کو بتایا کہ اسے ''پروڈا کے تحت کسی بھی شخص کو انکوائری افسر مقرر کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اس لئے بریگنزا کے تقرر پر اعتراض بے جا ہے۔ اگر درخواست دہندگان نے 15 راکتوبر تک اپنی شہادتیں پیش نہ کیں تو اس کے نتیجے کی ذمہ داری ان پر عائد ہوگی۔'' گورنر کے اس جواب نے درخواست دہندگان کے اس تاثر کو اور بھی پختہ کر دیا کہ ایوب کھوڑو کے خلاف تحقیقات غیر جانبدارانہ نہیں ہوں گی۔ لہٰذا ان کی رائے یہ تھی کہ ان کی جانب سے تحقیقات کے اس ڈھونگ میں حصہ لینے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

پنجاب کے اخبارات میں وزیر اعظم لیاقت علی خان کے سیاسی حلیف ایم۔اے۔ کھوڑو کے خلاف ''پروڈا انکوائری'' کے سلسلے میں پیدا شدہ تنازعہ پر سخت تنقید کی گئی۔ پاکستان ٹائمز کا خیال تھا کہ ''ایم۔اے۔ خان نے جس طریقے سے اچانک استعفیٰ دیا ہے اور جس عجلت کے ساتھ یہ استعفیٰ منظور کیا گیا ہے اس سے اس شبہ کو تقویت ملتی ہے کہ یہ سب کچھ ایم۔اے خان کی صحت کی خرابی کی وجہ سے نہیں ہوا۔ بد قسمتی سے کھوڑو کے گزشتہ ریکارڈ اور شہرت کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ باور کرنا مشکل ہے کہ اس کا اس استعفیٰ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ایم۔اے۔خان نے عارضۂ قلب یا اعصابی شکستگی کے باعث نوکری چھوڑی ہے تو بھی سب کو معلوم ہے کہ یہ بیماریاں بیرونی عوامل کے باعث ہی ہوسکتی ہیں۔'' سول اینڈ ملٹری گزٹ کا تبصرہ یہ تھا ''کہ قابل اعتبار اطلاعات کے مطابق سندھ کے وزیر اعلیٰ ایوب کھوڑو کے خلاف ''پروڈا'' کے

تحت انکوائری آفیسر کے استعفیٰ کی وجہ یہ ہے کہ اس کے اور سندھ کے ''ڈکٹیٹر'' کے درمیان ذاتی تلخ کلامی ہوئی تھی۔ جب انکوائری شروع ہوئی تھی اس کے بعد سے اس امر کی علامتیں ملتی رہی ہیں کہ اعلیٰ حلقے مسٹر کھوڑو کو بچانے کے زبردست خواہاں ہیں۔ کھوڑو کے ماضی کے پیش نظر سب سے پہلے کاروائی یہ ہونی چاہیے تھی کہ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لئے اسے معطل کر دیا جاتا۔ اسے اپنے خلاف ہر ٹھوس شہادت کو کچلنے کے قطعی اختیارات کے ساتھ انتظامی مشینری کے اعلیٰ ترین سربراہ کے عہدہ پر فائز رکھنے کا مطلب یہ تھا کہ انصاف کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ جس عجلت کے ساتھ انکوائری آفیسر کا استعفیٰ منظور کیا گیا ہے اس سے اس تاثر کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ انکوائری محض اشک شوئی کے لئے کی جا رہی ہے...... یہ امر اسلامی اصولوں کے خلاف ہے کہ کوئی طاقتور شخص کمزوروں کے حقوق کو ملیا میٹ کرے...... اگر کبھی ریاست کو نقصان پہنچا تو ایسا ان لوگوں کے غیر اسلامی رویے کے باعث ہوگا جو اقتدار کی گدی پر براجمان ہیں۔''[18]

لیاقت کا قتل اور ''اہل زبان'' کو صدمہ

پنجاب میں لیاقت علی خان کے خلاف بہت سی وجوہ کی بنا پر سیاسی فضا پہلے ہی بہت معاندانہ تھی۔ ایم۔ اے خان کے استعفیٰ کے واقعہ نے اس کے خلاف زہریلے اور اشتعال انگیز پروپیگنڈا میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ وہ 16 راکتوبر کی صبح کو اسی معاندانہ سیاسی فضا میں بذریعہ ہوائی جہاز راولپنڈی پہنچا۔ وہ سہ پہر کو ایک جلسۂ عام کو خطاب کرنے کے لئے شہر کے ایک باغ میں گیا۔ ابھی وہ سٹیج پر تقریر کرنے کے لئے کھڑا ہوا ہی تھا کہ ایبٹ آباد کے ایک شخص سید اکبر کی گولیوں نے قائد ملت کو شہید ملت بنا دیا۔ اس سانحۂ عظیم سے کراچی اور سندھ میں مراعات یافتہ ''اہل زبان'' مہاجرین کو بے پناہ صدمہ پہنچا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ قائد ملت کی شہادت سے ملک وملت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے لیکن پنجاب میں ایسے حلقے موجود تھے جنہیں سول اینڈ ملٹری گزٹ کی اس رائے سے اتفاق تھا کہ ''اسلام کمزوروں کی حق تلفی کی اجازت نہیں دیتا'' اور ''اگر کبھی ریاست کو نقصان پہنچا تو ایسا ان لوگوں کے غیر اسلامی رویے کے باعث ہوگا جو اقتدار کی گدی پر براجمان ہیں۔''

1947-51ء میں نوابزادہ لیاقت علی خان کے عہد اقتدار میں دریائے سندھ کی زیریں

وادی کے تقریباً 50 ہزار میل پر مشتمل صوبہ سندھ کی تقریباً 40 لاکھ آبادی کے چھ سات ہزار بڑے جاگیرداروں، زمینداروں، مٹھی بھر درمیانہ طبقہ اور تقریباً 30 لاکھ مفلوک الحال ہاریوں کی سیاست کے اس ہیجانی رویے کا طویل تاریخی پس منظر تھا جس کی تفصیل جز واول میں بیان کی جا چکی ہے۔ اگر اس تاریخی پس منظر کے باوجود ان کا سیاسی رویہ اس سے مختلف ہوتا تو حیرت انگیز ہوتا۔

حوالہ جات

باب1: سندھ......انگریزوں کے قبضے تک

1- A.H. Dani, *A Short History of Pakistan, Book One*. Karachi, 1967, p. 166.

2۔ علی کوفی ۔ چچ نامہ ۔ کراچی وحیدرآباد ۔ 1963، ص ص 124, 162, 168, 175, 187-88, 203, 216, 231, 214-216, 192, 222-26, 237,

3۔ احمد بن یحییٰ، البلاذری ۔ فتوح البلدان ۔ کراچی ۔ 1962 ۔ ص ص 626-27

4۔ ایضاً ۔ ص 629

5۔ ایضاً ۔ ص ص 630-32

6- H.T Sorely, *The Former Province of Sind: Gazatteer of West Pakistan.*Lahore 1968, p.153

7- Khawajah Nizamuddin Ahmed Bakhshi, *The Tabaqat -i-Akbari*. Calcutta.1939, pp.773-81 Vol.3

8۔ میر محمد معصوم بکھری ۔ تاریخ معصومی ۔ کراچی وحیدرآباد ۔ 1959 ۔ ص ص 143-44

9۔ ایضاً ص ص 158-59

10۔ ایضاً ۔ ص ص 174, 194-97

11- H.T Sorely, *Op.cit*., p.171

12- *Ibid*., p.175

13- *Ibid*

باب2: بمبئی پریذیڈنسی کی ماتحتی اور ہندو ۔ مسلم تضاد

1- William Wilson Hunter, Sir, Bombay, 1885 to 1890: *A Study in Indian Administration*, London, 1892, p.70.

2- E.H Aitken, *Gagatteer of the Province of Sind*, Karachi, 1907, pp. 335-37.

3- W.W. Hunter *Op.cit*., pp. 468-70.

4- M.B.K Malik, *100 Years of Pakistan Railways*, Karachi, 1962, pp.41, 42

5- W.W Hunter, *Op.cit*., p.27

6- S.M. Ikram *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, Lahore, 2nd revised Ed.1970, p.313.

7- E.H Aitken, *Op.cit*., pp.335-37.

8- W.W. Hunter, *Op.cit*., p.372

9- *Ibid*., p.467.

10- *Ibid.*, pp.475-76

11- E.H. Aitken, *Op.cit*., pp.305-06.

12- *Ibid*., pp.338-39.

13- *Ibid*., p.156.

14- *Indian Round Table Conference: Proceedings of the Sub-committee No IX Sind*. Calcutta, 1931, pp.70-71.

باب3: نئے صوبہ سندھ میں مسلم جاگیردارانہ سیاست اور ہندو۔ مسلم تضاد

1- G.M Syed, *Struggle for New Sind,* Karachi, 1949, p.8

2- *Ibid*., p.18.

3۔ عاشق حسین بٹالوی۔اقبال کے آخری دو سال۔کراچی۔1961ص ص 52-151

4- G.M Syed, *Op.cit*., p.13

5- *Ibid*, p.22.

6- *Ibid*., p.23.

7- *Ibid*., p.24.

8۔ انقلاب۔13راکتوبر، 1938

9- C.H Phillips and Mary Wainwright, *The Partition of India, The Policies And Perspectives,1935-47*. London, 1970, pp.260-61.

10- G.M Syed, *Op.cit*., p.24.

11- Jamil-ud-Din Ahmad (ed). *Some Recent, Speeches And Writings of Mr.Jinnah*, Lahore, 1943, pp.57-64.

12- G.M Syed, *Op.cit.* p.24.

13- *Ibid*., p.25.

14- *Ibid*., p.51

15- *Ibid*., p.47.

16- *Ibid*., p.190-92

17- *The Civil And Military Gazette*, August 23, 1941.

18- G.M Syed *Op.cit*., p.84.

19- *The Civil And Military Gazette*, August 29, 1941.

20- *Ibid,* june 1, 1942

21- *Ibid*., july 10, 1942.

22- *Ibid*., September 3, 1942.

23- G.M Syed *Op.cit*., p.92.

24- *The Civil And Military Gezette*, October 22, 1942.

25- G.M *Op.cit*., p.94.

26- Syed Ghulam Mustafa, *Towards Understanding the Muslims of Sind*, Karachi, 1944, pp.8-9, 16-17, 25-26, 28-30 39, 41, 44-47, 59-60, 75-76, 128-29, 130-40.

باب4: جی۔ایم۔سید اور قائداعظم کے مابین اختلاف کی بنا

1- G.M Syed, *Op.cit*, p.111.

2- *Ibid*., p.112.

3۔ نوائے وقت۔3راگست، 1944

4- G.M Syed, *Op.cit*., p.112

5- *Ibid*., p.116.

6۔ محمد یامین خاں۔نامۂ اعمال۔لاہور۔1970۔ص ص 59-958۔جلد دوم

7- G.M Syed, *Op.cit*., p.114-15.

8۔ نوائے وقت۔18رنومبر، 1944

9۔ ایضاً۔22رنومبر، 1944

10۔ ایضاً۔21ردسمبر، 1944

11- G.M Syed, *Op.cit*., p.118-119

12۔ نوائے وقت۔30/دسمبر، 1944

13۔ ایضاً۔9/جنوری، 1945

14۔ ایضاً

15۔ ایضاً۔13/جنوری، 1945

16۔ ایضاً۔17/جنوری، 1945

17۔ ایضاً۔26/جنوری، 1945

18۔ بہادر یار جنگ۔ مکاتیب بہادر یار جنگ۔ کراچی۔ 1967۔ص ص,522-23
547-48

19۔ نوائے وقت۔31/جنوری، 1945

20- G.M Syed, *Op.cit*., p.126-127.

21۔ نوائے وقت۔28/فروری، 1945

22۔ ایضاً۔یکم مارچ، 1945

23۔ ایضاً۔3/مارچ، 1945

24۔ ایضاً۔7/مارچ، 1945

25- G.M Syed. *Op.cit*., p.128

26۔ نوائے وقت۔14/مارچ، 1945

27۔ ایضاً۔21/اپریل، 1945

28۔ ایضاً۔8/اپریل، 1945

29۔ ایضاً۔18/اپریل، 1945

30۔ ایضاً۔19/اپریل، 1945

31۔ ایضاً۔23/مئی، 1945

32۔ ایضاً۔26/مئی، 1945

باب5: سید۔جناح تضاد میں شدت اور سید کا لیگ سے اخراج

1۔ نوائے وقت۔یکم جون، 1945

2- G.M Syed. *Op.cit*., p.136.

3- *Ibid*., p.138.

4- *Ibid*., pp.140-141.

5- *The Daily Gazette*, September 29, 1945.

6- *Ibid*., October 2, 1945.

7- *Ibid*., October 3, 1945.

8- *The Eastern Times*, October 20, 1945.

9- G.M Syed, *Op.cit*., p.147.

10- *The Eastern Times*, November 11, 1945

11- *The Daily Gazette*, November 12, 1945

12- *Ibid*., November 13, 1945.

13- *Ibid*., December 2, 1945.

14- G.M Syed, *Op.cit*. pp.157-158.

15۔ نوائے وقت۔4رجنوری، 1946

16۔ محمد ظفر اللہ خان۔تحدیث نعمت۔ڈھاکہ۔1971۔ص389

17۔ نوائے وقت۔15ردسمبر، 1944

18۔ ایضاً۔20رنومبر، 1944

باب6: 1946ء کے انتخابات اور سندھ کی پاکستان میں شمولیت

1۔ نوائے وقت۔یکم فروری، 1946

2۔ ایضاً۔5رفروری، 1946

3۔ ایضاً

4۔ ایضاً۔12رفروری، 1946

5۔ ایضاً۔7رمارچ، 1946

6۔ ایضاً۔12/مارچ، 1946

7- G.M Syed , *Op.cit.*, p.165.

8۔ نوائے وقت۔24/مارچ،1946

9۔ ایضاً۔4/اپریل، 1946

10۔ ایضاً۔10/اپریل، 1946

11۔ ایضاً

12۔ ایضاً۔26/مئی، 1946

13۔ ایضاً۔7/جون، 1946

14۔ نوائے وقت۔26/جولائی، 1946

15- *The Statesman*, September 11, 1946.

16- *Ibid.*, September 18, 1946.

17- *Ibid.*, September 22, 1946.

18- Chaudhri Khaliquzzaman, *Pathway to Pakistan*, Lahore, 1961, pp.332-33.

19۔ نوائے وقت۔13/اکتوبر، 1946

20۔ ایضاً۔22/اکتوبر، 1946

21۔ ایضاً۔25/فروری، 1947

22۔ ایضاً۔22/مارچ، 1947

23- *The Eastern Times*, April 1, 1947.

24- *Ibid.*, April 12,1947.

25- *Ibid.*, April 25 1947.

26- *Ibid.*, April 26, 1947.

27- *Ibid.*, May 25, 1947.

28- *Ibid.*, May 26, 1947.

29- *Ibid.*, May 28, 1947.

30- *Ibid.*, June 1, 1947.

31- *Ibid.*, june 8, 1947.

32- *Ibid.*, June 14, 1947.

33- *Ibid.*

34- *Ibid.*, June 18, 1947.

35- *Ibid.*, June 24, 1947.

36- *Ibid.*, June 28, 1947.

37۔ نوائے وقت۔30/جولائی، 1947

38۔ ایضاً۔یکم اگست، 1947

باب7: صوبائی خودمختاری کی علمبردار مسلم لیگی کھوڑو وزارت کی برطرفی

1۔ انقلاب۔26/جولائی، 1946

2- Abul Kalam Azad, *India Wins Freedom*, Calcutta, 1st.Printed 1959, reprinted 1964, p.194.

3- G.M Syed, *A Nation in Chains: Sindhu Desh,* Dadu, 1974, p.12.

4- *The Constituent Assembly of Pkaistan Debates, Vol.111,No.3* May 22, 1948, pp.79-80.

5- G.M Syed, *Op.cit.*, p.116.

6- Chaudhri Muhammad Ali, *The Emergence of Pakistan,* Lahore, 1973, pp.265-66.

7- Chaudhri Khaliquzzaman, *Op.cit.*, p.412.

8- *The Pakistan Times*, November 1, 1947.

9- *Ibid.*, November 9, 1947.

10- *Ibid.*, November 13, 1947.

11- *Ibid.*, November 18, 1947.

12- Mian Iftikhar-ud-Din, *Selected Speeches And Statements,edited by Abdullah Malik*, Lahore 1971, pp.55-56.

13- *The Pakistan Times*, April 10, 1947.

14- *Ibid.*, July 15, 1947.

15- *Ibid.*, October 21, 1947.

16- *Ibid.*, November 5, 1947.

17- *Ibid.*, December 5, 1947.

18- Chaudhri Muhammad Ali, *Op.cit.*, pp.261-64.

19- *The Pakistan Times*, December 12, 1947.

20- Chaudhri Muhammad Ali, *Op.cit.*, p.267.

21- *The Pakistan Times*, December 21, 1947.

22- *Ibid.*, December 25, 1947

23- *Ibid.*

24۔ نوائے وقت۔ 2رجنوری، 1948

25۔ ایضاً۔7رجنوری، 1948

26۔ ایضاً۔8رجنوری، 1948

27۔ محمد ظفراللہ خان۔محولہ بالا۔ص ص30-529

28- H.V Hodsom, *The Great Divide*, London, 1969. p.418.

29- *The Pakistan Times*, Januaruy 11, 1948.

30- *Ibid.*, January 13, 1948.

31- *Ibid.*, January 20, 1948.

32- *Dawn*, December 25, 1976.

33- *The Pakistan Times*, January 20, 1948.

34- *Ibid.*, June 15, 1947.

35- *Ibid.*, February 2, 1948.

36- *Ibid.*, February 5, 1948.

37- *Ibid.*, February 10, 1948.

38- *Ibid.*, February 11, 1948.

39- *Ibid.*, February 14, 1948.

40- *Ibid.*, February 18, 1948.

41- *Ibid.*, February 20, 1948.

42- *Ibid.*, February 24, 1948.

43- *The Constituent Assembly (Legislature of Pakistan) Debates. Vol. 1*, March, 1948, p.63.

44- *Ibid.*, March 2, 1948, pp.120-24.

45- *Ibid.*, pp.149-53.

46- G.M Syed, Op.cit., p.168.

47- *The Pakistan Times*, March 9, 1948.

48۔ نوائے وقت۔18/مارچ، 1948

49۔ ایضاً۔11/مارچ، 1948

50- *The Pakistan Times*, March 13, 1948.

51- *Ibid.*, March 18, 1948.

52- *Ibid.*, April 17, 1948.

53- *Ibid.*

54:امروز۔18/مارچ، 1948

55:نوائے وقت۔18/اپریل، 1948

56- *The Pakistan Times*, April 16, 1948.

57- *Dawn*, April 18, 1948.

58- *The Pakistan Times,* April 20, 1948.

59- *Ibid.*, April 27, 1948.

60- *Ibid.*

61۔ سیدنوراحمد۔مارشل لاءسے مارشل لاءتک، لاہور۔1967ص ص60-359

62- Chaudhri Muhammad Ali, *Op.cit.*, pp.368-69.

63- *Ibid.*, p.368.

64- Khalid bin Sayeed, *Pakistan: The Formative Phase, 1857-1948*, 2nd. Ed. London, 1968, p.248.

باب 8: الٰہی بخش وزارت اور کراچی کی سندھ سے علیحدگی

1۔ نوائے وقت۔ 27/اگست، 1947

2۔ امروز۔8/مئی، 1948

3- *The Pakistan Times*, May 11, 1948.

4۔ امروز۔11/مئی، 1948

5۔ ایضاً۔22/مئی، 1948

6- *The Pakistan Times*, May 22, 1948.

7- *The Constituent Assembly of Pakistan Debates,* May 22, 1948 Vol-3, p.50.

8- *Ibid.*, pp.78-83.

9- *Ibid.*, p.97

10- M. Rafique Afzal (ed), *Speeches And Statements of (Quaid-i-millat Liaquat Ali Khan (1941-51)*, Lahore 2nd Impression 1975, pp.146-47.

11- *The Constituent Assembly Debates*, *Op.cit.*, p.87.

12- *The Pakistan Times*, May 25, 1948.

13- *Ibid.*

14- *Ibid.*, May 27, 1948.

15- *Ibid.*, June 5, 1948.

16- *Ibid.*, June 12, 1948.

17- *Ibid.*, June 13, 1948.

18- *Ibid.*, June 15, 1948.

19- *Ibid.*, June 17, 1948.

20- *Ibid.*, June 24, 1948.

21۔ سید نور احمد۔محولہ بالا۔ص ص66-365

22- *The Pakistan Times*, July 9, 1948.

23- *Ibid.*, July 30, 1948.

24۔ امروز۔19رنومبر، 1948

25۔ ایضاً۔7ردسمبر، 1948

26۔ نوائے وقت۔8ردسمبر، 1948

27۔ ایضاً

28- *The Pakistan Times, December* 3, 1948.

29- *Ibid*., December 11, 1948.

30- *Ibid*.

31۔ نوائے وقت۔6رجنوری، 1949

32۔ ایضاً۔8رجنوری، 1949

33۔ ایضاً۔21رجنوری، 1949

34- *The Pakistan Times, February* 1, 1949.

35- *Ibid*., February 5, 1949.

36- *Dawn*, February 5, 1949.

باب 9: قومیتی اور طبقاتی تضادات میں شدت اور ہارون وزارت

1- *The Pakistan Times*, February 16, 1949.

2- *The Civil And Military Gazette*, March 3, 1949.

3- *The Pakistan Times*, March 4, 1949.

4- *Ibid*., March 8, 1949.

5- *Ibid*., March 19, 1949.

6- *The Civil And Military Gazette*, March 24, 1949.

7- *Ibid*., March 27, 1949.

8- *Ibid*., April 1, 1949.

9- *Ibid*.

10- *Ibid*., April 12, 1949.

11- *The Pakistan Times*, April 18, 1949.

12- *The Civil And Military Gazette*, April 19, 1949.

13- *Ibid*., April 20, 1949.

14- *Ibid*., April 21, 1949.

15- *Dawn*, April 12, 1949

16- *The Civil And Military Gazette*, May 27, 1949.

17۔ نوائے وقت۔13/مارچ، 1949

18- *The Civil And Military Gazette*, March 18, 1949.

19- *Dawn*. March 27, 1949.

20- *Ibid*., May 15, 1949.

21- *The Pakistan Times,* May 18, 1949.

22- *Dawn.* May 28, 1949.

23- *The Civil And Military Gazette*, June 2, 1949.

24- *Ibid*., June 4, 1949.

25- *Dawn*, June 13, 1949.

26- *The Civil And Military Gazette*, June 12, 1949.

27- *Dawn*. June 18, 1949.

28- *The Civil And Military Gazette,* June 17, 1949.

29۔ جنگ۔20/جون، 1949

30- *Dawn*, June 25, 1949.

31- *The Civil And Military Gazette*, June 24, 1949.

32- *Ibid*., June 25, 1949.

33۔ امروز۔10/جولائی، 1949

34- *The Civil And Military Gazette*, July 15, 1949.

35- *Ibid*., July 17, 1949.

36- *The Pakistan Times*, July 19, 1949.

37- *The Civil And Military Gazette*, July 27, 1949.

38۔ زمیندار۔19/جولائی، 1949

39۔ الوحید۔22/جولائی، 1949

باب10: کھوڑو کی محاذ آرائی اور سودا بازی کی سیاست،

ہارون وزارت کا خاتمہ

1۔ جنگ۔24/جولائی، 1949

2- *The Pakistan Times*, August 22, 1949.

3- *Ibid.*, August 26, 1949.

4۔ نوائے وقت۔27/اگست، 1949

5- *Dawn*, August 30, 1949.

6- *Ibid.*, August 30, 1949.

7۔ نوائے وقت یکم ستمبر، 1949

8۔ ایضاً۔4/ستمبر، 1949

9۔ امروز۔2/ستمبر، 1949

10۔ نوائے وقت۔4/ستمبر، 1949

11- *The Civil And Military Gazette*, August 31, 1949.

12۔ امروز۔4/ستمبر، 1949

13- *Dawn*, September 22, 1949.

14- *Ibid.*, September 27, 1949.

15- *Ibid.*, September 17, 1949.

16- *Ibid.*, October 30, 1949.

17- *The Civil And Military Gazette*, November 2, 1949.

18۔ نوائے وقت۔3/نومبر، 1949

19- *Dawn*, November 6, 1949.

20۔ نوائے وقت۔31/اگست، 1949

21- *Dawn*, November 8, 1949.

22- *Ibid.*

23- *The Civil And Military Gazette*, November 8, 1949.

24۔ نوائے وقت۔9؍نومبر، 1949

25- *The Pakistan Times*, November 10, 1949.

26- *Dawn*, November 10, 1949.

27۔ نوائے وقت۔2؍دسمبر، 1949

28۔ ایضاً۔3؍دسمبر، 1949

29۔ ایضاً۔6؍مارچ، 1950

30- *Dawn*, March 8, 1950.

31- *The Pakistan Times*, March 10, 1950.

32- *Dawn*, March 9, 1950.

33- *Ibid.*, March 20, 1950.

34۔ نوائے وقت۔24؍مارچ، 1950

35- *Dawn,* March 25, 1950.

36- *Ibid.*, April 10, 1950.

37۔ نوائے وقت۔4؍مئی، 1949

باب 11: کھوڑو۔لیاقت گٹھ جوڑ اور فضل اللہ وزارت

1- *Dawn*, May 9, 1950.

2- *Ibid.*, February 13, 1950.

3- *The Pakistan Times*, May 10, 1950.

4- *The Civil And Military Gazette*, April 28, 1950.

5۔ نوائے وقت۔25؍مئی، 1950

6۔ ایضاً۔29؍مئی، 1950

7- *The Civil And Military Gazette*, June 28, 1950.

8- *Dawn*, July 29, 1950.

9- *The Civil And Military Gazette,* August 6, 1950.

10- *The Pakistan Times*, September 8, 1950.

11۔ نوائے وقت۔9؍ستمبر، 1950

12- *The Civil And Military Gazette*, October 15, 1950.

13- *Dawn*, October 16, 1950.

14- *Speeches And Statements of Liaqat Ali Khan.Op.cit*, pp.472-73.

15- *Ibid.*, pp.475-76.

16- *Dawn*, October 18, 1950.

17۔ نوائے وقت۔12/اکتوبر، 1950

18- *Dawn*, October 18, 1950.

19- *Ibid.*

20۔ نوائے وقت۔23/اکتوبر، 1950

21- *Dawn*, October 26, 1950.

22- *Ibid.*, November 26, 1950.

23- *The Pakistan Times*, November 22, 1950.

24- *Ibid.*, January 28, 1951.

25- *Ibid.*, March 29, 1951.

باب12: لیاقت کے سیاسی عزائم اور کھوڑو دوبارہ برسراقتدار

1۔ امروز۔ 14/مارچ، 1951

2- *Dawn*, March 18, 1951.

3۔ امروز۔25مارچ، 1951

4- *The Civil And Military Gazette*, March 29, 1951.

5- *Dawn*, April 13, 1951.

6- *Ibid.*, May 5, 1951.

7- *The Civil And Military Gazette*, May 11, 1951.

8- *Dawn*, June 7, 1951.

9- *Ibid.*, June 10, 1951.

10۔ نوائے وقت۔16/جون، 1951

11۔ ایضاً۔17/جون، 1951

12- *The Civil And Military Gazette*, June 16, 1951

13- *Dawn*, June 18, 1951.

14- *Ibid.*, August 10, 1951.

15۔ میجر جنرل فضل مقیم خان۔تنگ وتاز جاودانہ، پاک فوج کی کہانی۔
لاہور۔1967-ص175

16- *The Pakistan Times*, September 19, 1951.

17- *Dawn*, September 28, 1951.

18- *The Civil And Military Gazette*, October 11, 1951.


کتابیات

کتب(انگریزی)

Ahmad, Jamil-ud-din (ed), *Some Recent Speeches and Writings of Mr. Jinnah, S*h.Mohammad Ashraf, Lahore, 1943.

Aitken, E.H. *Gazetteer of the Province of Sind*, Karachi,1907.

Ali, Chaudhry Mohammad, *The Emergence of Pakistan*, Originally published by Columbia University Press, NewYork & London,1967. Reprinted by the Research Society of Pakistan, University of the Punjab, Lahore, 1973.

Azad, Abul Kalam, *India Wins Freedom*, Orient Longmans, Calcutta, 1st printed 1959, reprinted 1964.

Bakhshi. Khwajah Nizam-ud-din, *The Tabaqat-i-Akbari*, translated by Brajindranath, Royal Asiatic Society of Bengal,

Calcutta,1939.

Dani, A.H., *A Short History of Pakistan, Book one*, University of Karachi, Karachi,1967.

Hodson, H.V., *The Great Divide*, Hutchinson London, 1969.

Hunter, William Wilson (Sir), Bombay, 1885 to 1890. *A Study in Indian Administrating*, Henry Frowde, London, 1892.

Ikram, S.M., *Modern Muslim India and The Birth of Pakistan*, Sh. Mohammad Ashraf, Lahore, 2nd revised ed., 1970.

Khaliq-uz-Zaman, Choudhry, *Pathway to Pakistan*,

Longmans, Lahore, 1961

Malik, M.B.K., *100 Years of Pakistan Railways*, Government of Pakistan, Karachi, 1962.

Phillips, C.H., and Wainwright Mary, *The Partition of India, The Policies And Perspectives, 1935-47*, London,1970

Sorely, H.T., *The Former Province of Sind ; Gazetteer of West Pakistan, Published under the authority of Government of West Pakistan*, Lahore,1968.

Syed, G.M, (1) *A Nation in Chains: Sindhu Desh*, Sann Distt., Dadu,1974.

(2) *Struggle for New Sind*, Sind Observer Press, Karachi, 1949.

Syed Ghulam Mustafa, *Towards Understanding The Muslims of Sind*, Karachi, 1944.

کتب (اردو)

البلاذری، احمد بن یحییٰ۔فتوح البلدان۔نفیس اکیڈمی ۔کراچی۔1962ء

بٹالوی، ڈاکٹر عاشق حسین۔اقبال کے آخری دوسال۔اقبال اکادمی پاکستان۔کراچی 1961ء

بکھری، میر محمد معصوم۔تاریخ معصومی۔سندھ ادبی بورڈ۔کراچی وحیدرآباد۔1959ء

جنگ، بہادر یار۔مکاتیب بہادر یار جنگ۔بہادر جنگ اکادمی۔کراچی 1967ء

خان، فضل مقیم۔تگ وتاز جاودانہ، پاک فوج کی کہانی۔آسفورڈ یونیورسٹی پریس۔لاہور 1967ء

خان، محمد ظفراللہ۔تحدیث نعمت۔بے نیولینٹ پریس ایسوسی ایشن ڈھاکہ 1971ء

خان، محمد یامین۔نامۂ اعمال۔(دوجلدیں)۔آئینۂ ادب لاہور۔1970ء

علی کوفی۔چچ نامہ۔سندھ ادبی بورڈ۔حیدرآباد وکراچی۔1963ء

نوراحمد، سید۔مارشل لاء سے مارشل لاء تک۔لاہور۔1967ء

دستاویزات

Indian Round Table Conference: Proceedings of the Sub-Committe No.IX, Sind, Central Publication branch, Government of India, Calcutta, 1931.

Mian Iftikhar-ud-din, Selected Speeches and Statements, edited by Abdullah Malik, Nigarishat, Lahore, 1971.

Speeches And Statements of Quaid-i-Millat Liaqat Ali Khan (1941-51), Rfiq Afzal, M, (ed) Research Society of Pakistan, University of Punjab, Lahore, 2nd Impression, 1975.

The Constituent Assembly of Pakistan Debates, Vol-1 and Vol-III, 1948.

اخبارات

Dawn, Karachi, files of 1948,1949,1950 and 1951.

The Civil and Military Gazette, Lahore files of 1941,1942,1950 and 1951. Karachi(edition), file of 1949.

The Daily Gazette, Karachi, file of 1945.

The Eastern Times, Lahore, files of 1945 and 1947.

The Pakistan Times, Lahore, files of 1947,1948,1949,1950 and 1951.

The Statesman, Delhi, file of September 1946.

الوحید، کراچی۔فائل، جولائی1949ء

امروز، لاہور۔فائلیں1948ء1949ء، اور1951ء

انقلاب، لاہور۔فائلیں، اکتوبر1938اور جولائی1946ء

جنگ، کراچی۔فائل، جون1949ء

زمیندار، لاہور۔فائل، جولائی1949ء

نوائے وقت، لاہور۔فائلیں1944، ء1945ء، 1946ء، 1947ء، 1948ء، 1949ء، 1950ءاور1951ء

اشاریہ

آ

ا

ب

ص

ط

ظ

ع

گ

ل

م

ن

و